الکوثر فی تفسیر القرآن

محسن علی نجفی

الكوثر
في تفسير القرآن

جلد اول

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔ لاہور

مقدمۂ تفسیر
تفسیر
الفاتحۃ۔ البقرۃ

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد اول)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ: حسن علی
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: ربیع الاول ۱۴۲۵ھ/اپریل ۲۰۰۴ء
باردوم: ذی القعدہ ۱۴۲۹ھ/نومبر ۲۰۰۸ء
بارسوم: ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ/ستمبر ۲۰۱۳
مطبع: شوکت پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ”جامع الاحادیث“ تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔
نہج البلاغۃ کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغۃ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔
تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت وارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہدو تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور وفکر کرنا، اس کے رموز وحقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین ودستور ہے ۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علما نے بھی اردوزبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم وتفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم وتفاسیر انڈیا (لکھنؤ) کے مترجمین ومفسرین کی محنت کانتیجہ ہیں۔لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرامختلف ہے۔

چونکہ دنیا کاہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتاہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردوزبان کے پیش نظراورقرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اورجدید معاندانہ تحریروں اورالزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیرنظرتفسیر قرآن'' الکوثر فی تفسیر القرآن'' کی جلداول قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالیٰ کی غیرمعمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کاثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کاسایہ ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے اورانہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کاتہ دل سے شکریہ اداکرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذاکویہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزیدبرآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھربیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کوبھی پسندیدگی کی نظرسے دیکھیں گے۔ اس گوہرنایاب سے بھرپورعلمی وعملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کواپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرورمستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور۔

پاکستان

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰہ اللّٰہ فی القرآن لا یسبقکم بالعمل بہ غیرکم۔
قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ دوسرے اس
پر عمل کرنے میں تم پر سبقت لے جائیں۔ (حضرت علی علیہ السلام)[1]

آغازِ سخن

الٰہیاتی تصور کائنات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبث خلق نہیں فرمایا بلکہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے پیدا کیا اور اس مقصد تک پہنچانے کے لیے انسان کو ارتقا و تکامل کے طویل مراحل سے گزارنا بھی سنت الٰہیہ رہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ یوم میں خلق فرمایا اور چار یوم میں اس نے زمین کو انسان کے لیے قابل سکونت بنایا اور وسائل حیات پیدا کیے۔

وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ○[2] اور اسی نے چار دنوں میں حاجتمندوں کی ضروریات کے مطابق زمین میں سامان خوراک مقرر کیا۔

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے یوم ہمارے دنوں سے مختلف ہیں:

وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○[3] اور آپ کے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے مطابق یقیناً ہزار برس کی طرح ہے۔

ہر چند اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کو دفعتاً درجہ کمال تک پہنچا سکتا ہے لیکن حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے کہ ارتقا و تکامل کا یہ عمل تدریجاً ہو۔ چنانچہ زمین کو چار مرحلوں میں قابل سکونت بنایا گیا۔

---

[1] نہج البلاغۃ وصیت ۴۷ ص ۷۳۸ [2] ۴۱ فصلت: ۱۰ [3] ۲۲ حج: ۴۷

جب تکامل و ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان کی مادی ترقی احسن تقویم کی منزل تک پہنچ گئی تو اگلے مرحلے میں وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ...[1] سے انسان کا فکری ارتقا شروع ہوا۔ چنانچہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے ساتھ ہی اولاد آدم (ع) کی تعلیم و تربیت کے لیے ابتدائی درسگاہ کھول دی گئی اور نظام حیات کی ابجد سے درس شروع ہو گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں پہلی بار شریعت کی تدوین ہوئی۔

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا[2] اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔

پھر عصر خلیل علیہ السلام میں ملت اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی گئی:

مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ...[3] یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

عصر کلیم علیہ السلام میں انسانیت نے ایک اور اہم ارتقائی مرحلہ طے کیا اور امت کلیمی پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پوری ہو گئیں۔

ثُمَّ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ وَتَفۡصِيۡلًا لِّـكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً ...[4] پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تاکہ نیکی کرنے والے پر اپنی نعمت پوری کر دیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل بیان ہو اور ہدایت اور رحمت (کا باعث) ہو۔

لیکن عصر کلیم (ع) کے انسان میں شعور و ادراک کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک بچھڑے کو خدا ماننے پر آمادہ تھا۔

عصر مسیح علیہ السلام میں انسانیت کی اس تربیت گاہ کو خداوند عالم نے شریعت عیسوی کے ذریعے مزید وسعت دی اور انسانی ترقی کے نصاب میں انجیل کا اضافہ کر کے رحمت و شفقت اور انسان دوستی کی تربیت دی گئی۔

وَقَفَّيۡنَا بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ ۙ وَجَعَلۡنَا فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً[5] اور ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور انہیں ہم نے انجیل دی اور جنہوں نے ان کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور رحم ڈال دی۔

ان ادوار میں انسان ابھی عہد طفولیت میں تھا، لہٰذا اس کی تربیت و تعلیم کے لیے سمعی و بصری ذرائع سے کام لیا گیا اور انہیں ایسے معجزات دکھائے گئے جو محسوسات و مشاہدات سے متعلق تھے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۳۱ [2] ۴۲ شوریٰ ۱۳ [3] ۲۲ حج: ۷۸ [4] ۶ انعام: ۱۵۴ [5] ۵۷ حدید: ۲۷

جب انسان عقل وشعور کے لحاظ سے بلوغت کی منزل کو پہنچ گیا تو اسے محسوس معجزات کی جگہ معقول معجزہ (قرآن) دیا گیا کیونکہ انسان اس قابل ہو گیا تھا کہ اسے ایک جامع ''ضابطۂ حیات'' اور ایک ابدی ''دستور زندگی'' کا امین بنایا جائے۔ چنانچہ قرآن جیسا معجزہ عنایت فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امّت مرحومہ کو اس قابل بنایا کہ وہ اس سرمدی امانت کی حامل بن جائے۔ اس نعمت الٰہی کی معرفت اور اس کی قدردانی کی واحد صورت یہ ہے کہ کلام اللہ کو حتی الامکان سمجھا اور سمجھایا جائے۔

حقیر نے اپنی علمی بے مائیگی اور فکری افلاس کے باوجود اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت اس لیے کی کہ اگرچہ کلام رب الارباب کو اس تراب کے ساتھ کوئی نسبت نہیں، تاہم اس کلام کے مخاطب اور اس پر عمل کرنے کے مکلّف ہم ہی ہیں۔ ثانیاً ہمارے علمائے اعلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے شاگردوں نے صدر اول سے لے کر آج تک اس عظیم امانت کو ہم تک پہنچانے اور اس کی صحیح تفسیر و مفاہیم سے ہمیں آگاہ کرنے میں ہمیشہ دوسروں پر سبقت حاصل کی ہے۔ ان کے علمی سر چشموں سے چند جرعے حاصل کرنے کی جسارت مجھ جیسا بے علم بھی کر سکتا ہے۔ پھر اس چیونٹی نے مقام سلیمانی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرنا ہے۔

چون عود نبود چوب بید آوردم روئے سیہ و موئے سفید آوردم
گفتی توبہ کن کہ نا امیدی کفراست بر قول تو رفتم و امید آوردم

نیز یہ قدم اس لیے بھی اٹھایا گیا ہے:

۱۔ قرآن حقائق کا ایک بحر بیکراں ہے۔ ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال ہوا: کیا وجہ ہے کہ قرآن کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے نیز اس میں جس قدر غور وفکر کیا جاتا ہے، اسی قدر اس میں مزید تازگی آجاتی ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

ان اللّٰہ لم یجعلہ لزمان سدون زمان و لناس دون ناس ـ فھو فی کل زمان جدید وعند کل قوم غض الی یوم القیامۃ۔[۱]	اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔

۲۔ قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات فراہم کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

۳۔ جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا

---

[۱] بحار الانوار ۲: ۲۸۰

موقف بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ غیر ارادی غلطیوں کا امکان بھی موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں مجھے میری خامیوں سے آگاہ فرمائیں۔

اس ترجمے کی طرف مؤمنین کی اطمینان بخش توجہ کی وجہ سے اس کی جو افادیت سامنے آئی ہے، اس کے پیش نظر ہم نے مقدمہ اور حواشی میں قابل توجہ اضافہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ مؤمنین کو قرآنی علوم اور تفسیر سے متعلق ضروری معلومات ایک جلد میں میسر آئیں۔

اس سلسلے میں جن احباب نے میرے ساتھ تعاون فرمایا ہے ان کا شکرگزار ہوں۔ خصوصاً جناب محترم سید اظہر علی رضوی صاحب کی مخلصانہ کاوشیں نہ ہوتیں تو کتاب کی فارمیٹنگ اور طباعت میں یہ خوبصورتی ہرگز نہ آتی۔ خداوند عالم ان کی شب و روز کی زحمتیں قبول فرمائے۔ آمین

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ
محسن علی بن مولانا اخوند حسین جان رحمۃ اللہ علیہ
اسلام آباد۔ پاکستان

فضائل قرآن

بزبان قرآن۔ بزبان نبی (ص)۔
بزبان وصی (ع) ۔ بزبان زہرا (س)۔
فضائل قرآن در نہج البلاغہ ۔قرآن میں اللہ کی تجلی۔ مستقبل کے علوم۔
جامع ضابطہ حیات۔ تعلیم قرآن۔شفاعت ۔زاد آخرت ۔بے مانند نصیحت ۔
عہد و پیمان قرآن۔ عمل بالقرآن میں اغیار کی سبقت۔ ذریعہ نجات۔
قرآن اور اہل قرآن کے ساتھ سلوک۔ فضائل تلاوت قرآن۔
اسماء قرآن۔ معانی قرآن ۔ تدبر قرآن۔

بزبان قرآن

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝[1]

بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو امن وسلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور وہ اپنے اذن سے انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں راہ راست کی رہنمائی فرماتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝[2]

یہ قرآن یقیناً اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور ان مؤمنین کو جو نیک اعمال بجا لاتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝[3]

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ قرآن تمہارے پاس نصیحت اور تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے شفا اور مؤمنین کے لیے ہدایت ورحمت بن کر آیا ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ [4]

اور اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا کی ہے اسے یاد رکھو اور (یہ بھی) یاد رکھو کہ تمہاری نصیحت کے لیے اس نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی۔

۱؎ ۵ مائدہ: ۱۵-۱۶　　۲؎ ۱۷ بنی اسرائیل: ۹　　۳؎ ۱۰ یونس: ۵۷　　۴؎ ۲ بقرہ: ۲۳۱

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝[1]

یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝[2]

کہہ دیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝[3]

یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت افروز اور یقین رکھنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ...[4]

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ...[5]

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ ...[6]

اور یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل کی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝[7]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر نازل کی ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝[8]

یہ قرآن یقیناً بڑی تکریم والا ہے، جو ایک محفوظ کتاب میں ہے، جسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ[9]

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

بزبان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان هذا القرآن هو النور المبين

بے شک یہ قرآن نمایاں روشنی ہے

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۳۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل ۸۸ [3] ۴۵ جاثیہ: ۲۰ [4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲
[5] ۱۴ ابراهیم: ۱ [6] ۶ انعام: ۱۵۵ [7] ۱۶ نحل: ۸۹ [8] ۵۶ واقعہ: ۷۷ تا ۷۹ [9] ۵۹ حشر: ۲۱

و الحبل المتین	اور مضبوط رسی ہے
والعروۃ الوثقی	اور محکم وسیلہ ہے
والدرجة العلیا	بلندترین مرتبہ ہے
و الشفاء الاشفی	نہایت مؤثر شفا ہے
و الفضیلة الکبری	اور سب سے بڑی فضیلت ہے
والسعادة العظمی	اور سب سے بڑی سعادت ہے۔
من استضاء به نوره اللّٰه	جو اس کے ذریعے روشنی طلب کرے اللہ اسے منور کرتا ہے۔
و من اعتقد به فی اموره عصمه اللّٰه	جس نے اپنے امور کو اس سے مربوط کیا اللہ نے اسے محفوظ رکھا
و من تمسك به انقذه اللّٰه	اور جو اس سے متمسک رہا اللہ نے اسے نجات دی
و من لم یفارق احکامه رفعه اللّٰه	اور جس نے اس کے احکام کو نہ چھوڑا اللہ نے اسے عزت دی
و من استشفی به شفاه اللّٰه	اور جس نے قرآن سے شفا طلب کی خدا نے اسے شفا دی
و من آثره علی ما سواه هداه اللّٰه	اور جس نے قرآن کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی خدا نے اسے ہدایت بخشی
و من طلب الهدی فی غیره اضله اللّٰه	اور جس نے غیر قرآن سے ہدایت چاہی، اللہ نے اسے گمراہ کیا۔
و من جعله شعاره و دثاره اسعده اللّٰه	اور جس نے اسے اپنا شعار اور لازمہ قرار دیا اللہ نے اسے سعادت بخشی
و من جعله امامه الذی یقتدی به	اور جس نے اسے اپنا وہ امام بنایا، جس کی وہ پیروی کرتا ہے
و معوله الذی ینتهی الیه	اور اپنی وہ پناہ گاہ بنایا جسکی طرف وہ رجوع کرتا ہے
اَداه اللـه الی جنات النعیم و العیش السلیم... الخ [1]	تو اللہ تعالیٰ اسے نعمتوں والی جنت اور سکون کی زندگی سے نوازے گا۔

[1] تفسیر الامام العسکری (ع) ص۴۵۰ بحار الانوار۸۹ :۳۱ ۔کتاب القرآن

فضل القرآن علی سائر الکلام کفضل الله علی خلقه۔[1]	کلام خدا کو دوسرے کلاموں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر۔
من قرأ حرفا من کتاب اللّٰہ تعالیٰ فله حسنة و الحسنة بعشر امثالها، لا اقول الٓمّ حرف ولکن الف حرف لام حرف و میم حرف۔[2]	جو کتاب اللہ کے ایک حرف کی تلاوت کرے، اسے ایک نیکی کا ثواب دیا جائے گا اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ،لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

بزبان وصی علیہ السلام

مولائے متقیان امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ثم انزل علیه الکتاب	اللہ نے رسول کریم (ص) پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی:
نوراً لا تطفأ مصابیحه	جو ایسا نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں،
و سراجا لا یخبو توقده	ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی،
و بحرا لا یدرك قعره	ایسا دریا ہے جس کی تہ تک رسائی نہیں ہوتی،
و منهاجا لا یضل نهجه	ایسا راستہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی،
و شعاعا لا یظلم ضوئه	ایسی کرن ہے جس کی روشنی مدھم نہیں پڑتی،
و فرقانا لا یخمد برهانه	وہ حق و باطل میں ایسا امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی،
و تبیانالا تهدم ارکانه	ایسا کھول کر بیان کرنے والا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کیے جا سکتے،
و شفاء لا تخشی اسقامه	وہ سراسر شفا ہے جس کے ہوتے ہوئے (روحانی) بیماریوں کا کھٹکا نہیں،
و عزا لا تهزم انصاره	وہ سراسر عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے

---

[1] جامع الاخبار۔ تاج الدین الشعیری ص۴۰۔ بحار الانوار ۸۹:۱۷ البیان فی تفسیر القرآن، الخوئی ص ۱۸ ۔ السنن الترمذی ۵:۱۸۴۔ القرآن کی جگہ کلام اللّٰہ ہے۔

[2] السنن الترمذی ۵ : ۱۷۵۔ تفسیر القرطبی ۱ : ۷

و حقا لا تخذل اعوانه	وہ سراپا حق ہے جس کے معاون بے یار و مددگار نہیں چھوڑے جاتے۔
فهو معدن الايمان و بحبوحته	وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے۔
و ينا بيع العلم وبحوره	یہ علم کے چشموں اور سمندروں سے عبارت ہے۔
و رياض العدل وغدرانه	اس میں عدل کا چمن اور انصاف کا حوض ہے
و اثا فى الاسلام و بنيانه	اور اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے۔
و اودية الحق و غيطانه	حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے۔
وبحر لا ينزفه المستنزفون	وہ ایسا دریا ہے جس سے پانی بھرنے والے اسے ختم نہیں کر سکتے ۔
و عيون لا ينضبها الماتحون	وہ ایسا چشمہ ہے جس سے پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے۔
و مناهل لا يغيضها الواردون	وہ ایسا گھاٹ ہے جس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا۔
ومنازل لا يضل نهجها المسافرون	وہ ایسی منزل ہے جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں۔
و اعلام لا يعمى عنها السائرون	وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والوں کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔
و آكام لا يجوز عنها القاصدون	وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ جس کا قصد کرنے والے اس سے آگے نہیں گزر سکتے۔
جعله الله ريّا لعطش العلماء	اللہ نے اسے علماء کی تشنگی کے لیے سیرابی ،
و ربيعا لقلوب الفقهاء	فقیہوں کے دلوں کے لیے بہار ،
و محاجَّ لطرق الصلحاء	اور نیک لوگوں کی رہگذر کے لیے شاہراہ قرار دیا۔
و دواء ليس بعده داء	یہ ایسی دوا ہے جس سے کوئی مرض باقی نہیں رہتا۔
و نوراً ليس معه ظلمة	ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ہے۔
و حبلا وثيقاً عروته	ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں ۔
و معقلا منيعاً ذروته	ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ مضبوط ہے۔
وعزاً لمن تولّاه	جو اس سے وابستہ ہو اس کے لیے سرمایہ عزت ہے.

وسلما لمن دخله	جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لیے پیغام صلح و امن ہے۔
و هدی لمن ائتم به	جو اس کی پیروی کرے اس کے لیے ہدایت ہے۔
وعذراً لمن انتحله	جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لیے حجت ہے
وبرهانا لمن تكلم به	جو اس کی رو سے بات کرے اس کے لیے دلیل و برہان ہے۔
وشاهدا لمن خاصم به	جو اس کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرے اس کے لیے گواہ ہے۔
وفلجا لمن حاج به	جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لیے فتح و کامرانی ہے۔
و حاملا لمن حمله	جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے۔
و مطية لمن اعمله	جو اسے اپنا دستور العمل بنائے اس کے لیے وسیلہ راہ ہے۔
وآية لمن توسم	یہ حقیقت شناس کے لیے ایک واضح نشان ہے۔
و جنة لمن استلأم	جو سلاح بند ہو اس کے لیے سپر ہے۔
وعلما لمن وعی	جو فہم رکھتا ہے اس کے لیے علم و دانش ہے۔
و حديثا لمن روی	بیان کرنے والے کے لیے بہترین کلام ہے
وحكما لمن قضی۔[1]	اور فیصلہ کرنے والے کے لیے قطعی حکم ہے۔

حارث ہمدانی راوی ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو کچھ لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ (ع) نے فرمایا: واقعاً لوگوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ (ع) نے فرمایا:

امـا انـی سـمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰـه عـلیـه و آلـه و سلم یقول : ستکون فتن ۔ قلت : و ما المخرج مـنها؟ قال: کتاب اللّٰہ، کتاب اللّٰہ	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: آئندہ فتنے اٹھنے والے ہیں۔ میں نے عرض کی: راہ نجات کیا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: اللہ کی کتاب۔ اللہ کی کتاب میں

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۶ ص ۵۵۹۔

فیـه نبأ ما قبلكم و خبر ما بعدكم، و حكم ما بينكم۔ هو الفصل ليس بالهزل هو الذى من تركه من جبار قـصمه اللّٰه، و من ابتغى الهدى فى غيـره أضلـــه اللّٰـــه فهو حبل اللّٰه المتين، و هو الذكر الحكيم، و هو الـصـراط الـمستقيم،و هو الذى لا تـزيـغ بــه الأهواء، و لا تلتبـس بـه الألسـنة، و لا يشبـع منه العلماء، و لا يخلق عن كثرة الرد، و لا تنقضي عـجـائبه. و هو الذى لم ينته الجن اذ سـمعته ان قالوا : اِنَّاسَمِعْنَاقُرْاٰنًا عَجَبًا [۳]۔ هـو الـذي مـن قــال بـه صـدق، و من حكم به عدل، و من عـمـل به اجر، و من دعا اليه هدى الـى صراط مستقيم، خذها اليك يا أعور۔ [۴]

تم سے پہلوں اور بعد میں آنے والوں کی خبریں اور تمہارے اختلافات کے فیصلے موجود ہیں۔ یہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی ہے۔ فضول اور لایعنی باتیں نہیں ۔ یہ وہ کتاب ہے جسے کوئی جابر مسترد کر دے تو خدا اسے ہلاک و نابود کر دے گا۔[۱] جو اسے چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرے ، اللہ اسے گمراہ کر دے گا ۔ یہ کتاب اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ حکمت والی کتاب ہے۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ مختلف خواہشات اس میں تغیر و تبدیلی نہیں لاسکتیں۔[۲] جو زبان قرآن کے ساتھ بات کرے وہ حق و باطل میں اشتباہ نہیں کر سکتی ۔ علماء کا اس سے جی نہیں اکتاتا اور بار بار پڑھنے سے یہ فرسودہ نہیں ہوتی اور اس کے نکتہ ہائے یگانہ بے پایاں ہیں ۔ یہ وہ کتاب ہے جسے سن کر جن یوں بول اٹھے: ہم نے ایک تعجب خیز قرآن سنا۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جو اس کی رو سے بات کرے گا، سچ بولے گا۔ جو اس کے مطابق فیصلہ سنائے گا عدل و انصاف کرے گا۔ جو اس پر عمل کرے گا اسے ثواب ملے گا۔جس نے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی اس نے سیدھے راستے کی طرف بلایا۔ اے اعور! اس (حدیث) کو یاد رکھ۔

۱۔ اس جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ جابر لوگ قرآن کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے جو سابقہ کتابہائے آسمانی کے ساتھ ہوا۔ لہٰذا قرآن تحریف سے محفوظ ہے ۔

۲۔ اس جملے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن میں تحریف نہ واقع ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے ۔

۳۔ ۷۲جن : ۱

۴۔ سنن الدارمي ۲: ۵۲۶۔ سنن الترمذی ۵: ۱۷۲ کچھ فرق کے ساتھ۔ بحار الانوار ۸۹ : ۲۴ لفظی اختلاف کے ساتھ۔ البیان فی تفسیر القرآن (اردو ترجمہ) ص ۱۸۔

بزبان حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا

زعيم حق له فيكم ، و عهد قدمه اليكم، و بقية استخلفها عليكم كتاب اللّٰه الناطق، و القران الصادق، و النور الساطع و الضياء اللامح، بينة بصائره منكشفة سرائره، منجلية ظواهره، مغتبطة به اشياعه ، قائد الى الرضوان اتباعه مؤد الى النجاة استماعه، به تنال حجج اللّٰه المنورة، و عزائمه المفسرة، و محارمه المحذرة، و بيناته الجالية، و براهينه الكافيه ، و فضائله المندوبة ، و رخصه الموهوبة و شرائعه المكتوبة ..[1]

یہ قرآن تمہارے درمیان حق کا پاسدار ہے ۔ اللہ کا وہ عہد ہے جو تمہارے لیے پیش کیا گیا ہے ۔ وہ جانشین ہے جو تمہارے لیے پیچھے چھوڑا گیا ہے۔ اللہ کی ناطق کتاب اور سچا قرآن ہے ۔ چمکتا نور، روشن چراغ ہے ۔ اس کی بصیرتیں واضح، اس کے اسرار قابل انکشاف، اس کے ظواہر واضح، اس کے پیروکار قابل رشک ہیں۔ اس کی اتباع کرنے والوں کو رضائے حق کی طرف رہنمائی کرنے والا، اس کے سننے والوں کو نجات تک پہنچانے والا، اس سے اللہ کے نورانی دلائل اور اس کے واجب العمل احکام، قابل اجتناب محرمات، واضح دلائل، مکمل براہین، مطلوبہ فضائل، قابل اجازت اعمال اور واجب العمل شریعت تک رسائی ممکن ہے ۔

فضائل قرآن در نہج البلاغہ

نہج البلاغہ میں قرآن مجید کے فضائل اور اس کی قدر و معرفت کے بارے میں انمول خزانے موجود ہیں۔

قرآن میں اللہ کی تجلی

..فتجلى لهم سبحانه فى كتابه من غير ان يكونوا رأوه بما اراهم من قدرته و خوفهم من سطوته[2]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اپنی کتاب (قرآن) میں جلوہ فرمایا تو لوگوں نے اسے دیکھا نہیں مگر قدرت کی ان نشانیوں کے ذریعے، جو اس نے اپنی کتاب میں دکھائیں .....۔

مستقبل کے علوم

.... آلا ان فيه علم مايأتى و الحديث عن الماضى و دواء دائكم و نظم ما بينكم۔[4]

اس (قرآن) میں آئندہ کی معلومات گزشتہ کے واقعات،[3] تمہاری بیماریوں کا چارہ اور تمہارے باہمی تعلقات کی شیرازہ بندی ہے۔

۱۔ الاحتجاج للطبرسی ۱: ۹۹ ۔ ۲۔ نہج البلاغۃ خطبہ ۱۴۵ ص ۳۸۷ ۔
۳۔ انتہائی قابل توجہ بات ہے کہ مستقبل کے لیے ''علم'' کا لفظ استعمال فرمایا اور ماضی کے لیے ''واقعات'' کا۔ ۴۔ حوالہ سابق خطبہ ۱۵۶ ص ۴۱۵

جامع ضابطہ حیات

و اعلموا انه ليس على احد بعد القراٰن من فاقة و لا لاحد قبل القران من غنى۔[1]

جان لو کہ کسی کو قرآن کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور نہ قرآن کے بغیر کسی کی احتیاج پوری ہوسکتی ہے۔

تعلیم قرآن

تعلموا القران، فانه احسن الحديث و تفقهوا فيه فانه ربيع القلوب و استشفعوا بنوره فانه شفاء الصدور و احسنوا تلاوته فانه انفع القصص۔[2]

قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور وفکر کرو یہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کہ وہ سینوں میں چھپی ہوئی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور اس کی بہتر تلاوت کرو۔ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ مند ہیں۔

شفاعت

و اعلموا انه شافع مشفع و قائل مصدق و انه من شفع له القران يوم القيامة شفع فيه۔[3]

جان لو کہ قرآن مقبول شفاعت اور تصدیق شدہ کلام کرنے والا ہے ۔ قیامت کے روز جس کی قرآن شفاعت کرے گا وہ اس کے حق میں مانی جائے گی ۔

زاد آخرت

فانه مناد ينادى يوم القيامة الا ان كل حارث مبتلى فى حرثه و عاقبة عمله، غير حرثة القران، فكونوا من حرثته و اتباعه۔[4]

قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا: دیکھو ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں مبتلا ہے سوائے قرآن کی کھیتی بونے والوں کے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیروکار بنو۔

بے مانند نصیحت

و ان اللّٰه سبحانه لم يعظ احداً بمثل هذا القران فانه حبل اللّٰه المتين و سببه الامين و فيه ربيع القلب و ينابيع العلم و ما للقلب جلاء غيره ۔[5]

اللہ سبحانہ نے کسی کو ایسی نصیحت نہیں فرمائی جو اس قرآن کی مانند ہو ۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی اور مطمئن وسیلہ ہے اور اس میں دلوں کی بہار اور علوم کے چشمے ہیں اور صرف اس سے قلب کی جلا ہوتی ہے ۔

---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱
[2] حوالہ سابق خطبہ ۱۰۸ ص ۳۸۹۔
[3] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱
[4] حوالہ سابق ص ۴۶۲
[5] حوالہ سابق ص ۴۶۴

عہد و پیمان قرآن

و لـن تأخذوا بميثاق الكتاب حتى تـعـرفـوا الـذى نقضه... فالتمسوا ذلك من عند اهله۔[1]

تم قرآن کے عہد و پیان کے ہرگز پابندہ نہ رہ سکو گے جب تک اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو۔ جو ہدایت والے ہیں انہی سے ہدایت طلب کرو.

عمل بالقرآن میں اغیار کی سبقت

الـلّٰـه الـلّٰـه فـى الـقـران لا يسبقكم بالعمل به غير كم۔[2]

قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہیں دوسرے لوگ اس پرعمل کرنے میں تم پر سبقت نہ لے جائیں.

ذریعۂ نجات

و عـليـكـم بكتاب الله فانه الحبل الـمتيـن و الـنـور الـمبين و الشفاء الـنـافـع و الـرّيّ الـنـاقع و العصمة للمتمسّك و النجاة للمتعلق ۔[3]

تم کتاب خدا پرعمل کرو۔ وہ ایک مضبوط رسی، روشن نور، نفع بخش شفا، پیاس بجھانے والی سیرابی ہے ۔ تمسک کرنے والے کے لیے سامان حفاظت اور وابستہ رہنے والے کے لیے نجات ہے ۔

قرآن اور اہل قرآن کے ساتھ سلوک

ياتى على الناس زمان لا يبقى فيهم من القران الا رسمه[4]

لوگوں پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب ان میں قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے۔

و لـيـس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلى حق تلاوته و لا انـفـق مـنـه اذا حـرّف عـن مواضعه ... فـالكتاب يومئذ و اهله مـنـفـيـان طـريـدان و صـاحـبـان مـصـطـحبـان فـى طريق واحد لا يؤويهما مؤو۔

اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہو گی جب اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ قیمتی چیز نہیں ہو گی جب کہ اس کی آیتوں کی تحریف کی جائے۔قرآن اورقرآن والے اس وقت راندہ ہوں گے۔ ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا ۔

فـالـكـتـاب و اهله فى ذلك الزمان فـى الناس و ليسا فيهم و معهم و

وہ بظاہر لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق۔ اس

---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ص ۳۹۸ [2] حوالہ سابق، وصیت ۴۷ص ۷۳۸
[3] حوالہ سابق خطبہ ۱۵۴ص ۴۰۹ ۔ حال اهل القبور فى القيامة۔ [4] حوالہ سابق ۔کلمات قصار ۳۶۹ ص ۹۲۴

لیسا معھم، لان الضلالة لا توافق الھدیٰ و ان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقة و افترقوا الجماعة کانھم ائمة الکتاب و لیس الکتاب امامھم (۱)

لیے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہوسکتی اگرچہ وہ یک جا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پردازی پر اتفاق کیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا وہ قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن ان کا پیشوا نہیں۔

فضائل تلاوت قرآن

کس قدر سعادت کا مقام ہے کہ انسان قرآن کے کلمات اپنی زبان پر جاری کرے اور اس میں غور وفکر کرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان قدرت پر جاری فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے :

فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ [۲]

لہٰذا تم آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔

وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ [۳]

اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے۔

نیز فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۙ لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ ... [۴]

بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے ساتھ امید لگائے ہوئے ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا تاکہ اللہ ان کا پورا اجر انہیں دے بلکہ اپنے فضل سے مزید بھی عطا فرمائے۔

رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

من قرأ حرفا من کتاب اللّٰہ تعالیٰ فلہ بہ حسنة و الحسنة بعشر امثالھا، لا اقول الم حرف و لکن الف حرف و لام حرف و میم حرف ۔ [۵]

جو کتاب اللہ کے ایک حرف کی تلاوت کرے، اسے ایک نیکی کا ثواب دیا جائے گا اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ،لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے ۔

نیز آپؐ سے روایت ہے:

یااباذر علیك بتلاوة القرآن و ذکر

اے ابوذر! تم قرآن کی تلاوت اور ذکر خدا کثرت

---

۱ حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ ص ۳۳۸ ۲ ۷۳ مزمل: ۲۰ ۳ حوالہ سابق :۴ ۴ ۳۵ فاطر :۲۹ ۔ ۳۰

۵ سنن الترمذی ۵ : ۱۷۵ ۔ تفسیر قرطبی ۱ : ۷

اللّٰہ کثیراً فانہ ذکر لك فی السماء و نور لك فی الارض۔[1]

سے کیا کرو کیونکہ یہ تمہارے لیے آسمان میں شہرت اور زمین میں نورانیت کا باعث ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

من قرأ عشر آیات فی لیلۃ لم یکتب من الغافلین ، و من قرأ خمسین آیۃ کتب من الذاکرین، و من قرأ مأۃ آیۃ کتب من القانتین، و من قرأ مأتی آیۃ کتب من الخاشعین، و من قرأ ثلثمأۃآیۃ کتب من الفائزین، و من قرأ خمسمأۃ آیۃ کتب من المجتھدین، و من قرأ الف آیۃ کتب لہ قنطار من تبر۔[2]

جو ایک رات میں دس آیات کی تلاوت کرے اسے غافلین میں شمار نہیں کیا جائے گا اور جو پچاس آیات کی تلاوت کرے اسے ذکر خدا میں مشغول رہنے والوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ایک سو آیات کی تلاوت کرے اسے عبادت گزاروں میں شمار کیا جائے گا، جو تین سو آیات کی تلاوت کرے اسے کامیاب لوگوں میں شمار کیا جائے گا اور جو پانچ سو آیات کی تلاوت کرے اسے (راہ خدا میں) جہاد کرنے والوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے گا وہ ایسا ہے جیسے اس نے کثیر مقدار میں سونا راہ خدا میں دیا ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع) نے اپنے جد سے روایت کی ہے:

علیکم بتلاو ۃ القرآن فان درجات الجنۃ علی عدد آیات القرآن فاذا کان یوم القیامۃ یقال لقاری القرآن: اقرأ و ارق فکلما قرأ آیۃ رقی درجۃ۔[3]

تم قرآن کی تلاوت ضرور کیا کرو، چونکہ جنت کے درجات قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہیں، جب قیامت کا دن ہوگا قرآن کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا: پڑھ اور اپنے درجات میں اضافہ کرتا جا۔ پس جب وہ ایک آیت پڑھتا ہے تو ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل بہترین ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

الحال المرتحل قلت و ما الحال المرتحل؟ قال فتح القران و ختمہ.

بہترین عمل حال مرتحل ہے۔ میں نے عرض کی: حال مرتحل کیا چیز ہے؟ فرمایا: قرآن کا کھولنا اور ختم کرنا.

---

[1] بحار الانوار ۸۹: ۱۹۸ [2] اصول الکافی ۲:۶۱۲ [3] الامالی للصدوق ص ۳۵۹

كلما جاء باوله ارتحل فى آخره۔[1]

جب بھی قرآن کی ابتدا پر آیا، آخر کی طرف روانہ ہوا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

و البيت الذى يقرأ فيه القران و يذكر الله عز و جل فيه تكثر بركته و تحضره الملائكة و تهجره الشياطين و يضئ لاهل السماء كما يضئ الكوكب الدرى لاهل الارض و البيت الذى لا يقرأ فيه القران و لا يذكر الله فيه تقلّ بركته و تهجره الملائكة و تحضره الشياطين ۔[2]

جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور ذکر خدا ہوتا ہے اس میں وافر برکتیں ہوتی ہیں، فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ آسمان والوں کے لیے یہ گھر اس طرح چمکتا ہے جیسے زمین والوں کے لیے درخشندہ ستارے اور جس گھر میں قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی اور اللہ کا ذکر نہیں ہوتا، اس گھر کی برکت کم ہو جاتی ہے اور وہاں سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں اور شیطانوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے روایت ہے:

من قراء اٰية من كتاب الله فى صلاته قائماً يكتب له بكل حرف مأة حسنة ، فان قرأها فى غير صلاة كتب الله بكل حرف عشراً، فان استمع القراٰن كان له بكل حرف حسنة ...۔[3]

جو حالت نماز میں کھڑے ہو کر ایک آیت کی تلاوت کرے، اسے ہر حرف کے عوض سو نیکیوں کا ثواب ملے گا اور غیر نماز کی حالت میں پڑھے تو ہر حرف کے لیے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا اور اگر سنے تو ہر حرف کے عوض ایک نیکی کا ثواب ملے گا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت ہے:

و احسنوا تلاوته فانه انفع القصص ۔[4]

اور اس کی تلاوت بہترین طریقے سے کرو کیونکہ یہ مفید واقعات ہیں۔

اسمآء القرآن

اصطلاحات اور اسماء کا کسی خاص ثقافت اور فکری تشخص میں بڑا دخل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید باوجودیکہ عربی زبان میں ہے اور ایک عرب معاشرے میں نازل ہو رہا ہے، اس کے اسماء اور اصطلاحات منفرد ہیں اور دیگر عربی اصطلاحات سے متاثر نہیں ہیں، بلکہ قرآن نے اپنی فکری، علمی اقدار کی خاص نہج کو

---

[1] اصول الکافی ۲: ۶۰۵ [2] حوالہ سابق ۲: ۴۹۸

[3] بحار الانوار ۸۹: ۲۰۱ طبع بیروت [4] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۰۸ ص ۳۱۶

سامنے رکھ کر اپنی غرض و غایت کے مطابق اسمـاء اور اصطلاحات مقرر کی ہیں ۔ لہٰذا اگر قرآن کو دیوان، سورہ کو قصیدہ اور آیت کو بیت اور قصیدہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تو قرآن اس وقت کے جاہلی ماحول سے خارج نہ ہوتا۔ لہٰذا جاہلیت سے دور اسلامی ثقافت کی ترویج کے لیے جدید اسمـاء اور جدید اصطلاحات وضع کی گئیں ۔

قـرآن : کتاب خدا کے لیے یہ نام خود خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اس وقت دیا جب قرآن قلب رسول(ص) پر اترنا شروع ہوا۔

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۙ [1]

اے کپڑا لپیٹنے والے، رات کو اٹھا کیجئے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجیے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ [2]

یہ قرآن یقیناً بڑی تکریم والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ہے۔

ذکر: قرآنی اسماء میں سے ایک اسم ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ [3]

اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ... [4]

اور (اے رسول) آپ پر (بھی) ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتا دیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ [5]

اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔

کتاب: قرآن کے اسماء میں سے ایک مشہور نام کتاب ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ [6]

یہ کتاب جس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ... [7]

(اے رسول) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ جیسے اللہ نے آپ کو بتایا ہے اسی کے مطابق لوگوں میں فیصلے کریں۔

---

[1] ۷۳ مزمل: ۱ تا ۴ [2] ۵۶ واقعہ: ۷۷۔ ۷۸ [3] ۱۵ حجر: ۹
[4] ۱۶ النحل: ۴۴ [5] ۲۱ انبیاء: ۵۰ [6] ۲ بقرۃ: ۲ [7] ۴ نساء: ۱۰۵

قرآن کو کتاب کے نام سے موسوم کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن ایک ایسا دستور الٰہی ہے جو تحریر و کتابت کے ذریعے مدون رہے گا۔

ان کے علاوہ اور بھی اسماء کا ذکر کیا گیا ہے مگر یہ قرآن کے اوصاف ہیں، اسماء نہیں ہیں۔

فرقان: یہ لفظ فَرَقَ سے ماخوذ ہے۔ جیسے خَسَرَ سے خُسْران اور غَفَرَ سے غُفْران ہے۔ یہ مصدر ہے جو فاعل کے معنوں میں آتا ہے جیسے عَدْل بمعنی عادل آتا ہے۔ پس فُرْقان کے معنی نمایاں فرق کرنے والا یعنی حق و باطل کو جدا جدا کر کے ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے والا کے ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد الٰہی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا[1]

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔

قرآن کو فُرْقان کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ خود قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ[2]

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہان والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔

گویا عالمین کو حق و باطل کی پہچان کرا کر اسے تنبیہ کرنے کے لیے قرآن کو فرقان قرار دیا۔ یعنی یہ کتاب حق و باطل، ہدایت و ضلالت، راہ جنت و جہنم، حلال و حرام میں فرق واضح کرتی ہے۔

معانی قرآن

۱۔ جمع: اگر قرآن کو قَـرَءَ سے ماخوذ سمجھا جائے تو اس کے معنی جمع کے ہوں گے جیسے عربی میں یہ جملہ بکثرت استعمال ہوتا ہے: قراءت الشیء یعنی جمعته اور قرء الماء فی الحوض یعنی پانی حوض میں جمع ہو گیا۔

ممکن ہے اسے قرآن اس کے معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہو کہ یہ شعری رقت، نثری روانی، عقائد احکام، اخلاق، دنیا و آخرت کی سعادتوں اور روحانی و مادی فیوضات کا مجموعہ ہے۔

۲۔ تلاوت: بعض لوگ قرآن کو قَرَءَ سے مشتق سمجھتے ہوئے اس کے معنی ''تلاوت'' لیتے ہیں۔

---

[1] ۸ انفال: ۲۹ [2] ۲۵ فرقان: ۱ [3] ۷۵ قیامت: ۱۸

قرآن بمعنی قراءت و تلاوت خود قرآن میں استعمال ہوا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝[1]   اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

لفظ قرآن کو لفظ جمع کے ساتھ بیان کرنے کی صورت میں دونوں کا ایک ہی معنی نہیں ہوسکتا بلکہ جمعہ کے بعد قرآنہ کا معنی تلاوت ہی ہوسکتا ہے۔

۳۔ حفظ: عربوں میں کتابت رائج نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ضروری مطالب حفظ کر لیتے تھے۔ اسی وجہ سے صدر اسلام میں لفظ قرأۃ حفظ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

۴۔ مقرون: کچھ علماء قرآن کو قرن سے مشتق جانتے ہوئے اس کا معنی مقرون کا لیتے ہیں۔ یعنی اس کی آیات اور سورتیں باہم ساتھ ساتھ اور پیوستہ ہیں، اس لیے اسے قرآن کہا گیا۔ جیسا کہ حج اور عمرہ کو باہم ساتھ ادا کرنے کی وجہ سے اسے حج قِران کہتے ہیں۔

بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ لفظ قرء جو پڑھنے کے معنی میں ہے، اس کی بنیاد سریانی یا عبرانی ہے۔ چونکہ ان زبانوں میں قریانا (Qiryana) پڑھنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ وہ چرچ میں اپنی مقدس کتابوں کی تدریس کو قریانا کہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ لفظ خالصتاً عربی ہے اور قرآن قَرَءَ سے ماخوذ و مشتق ہے۔ یوں لفظ قرآن ''پڑھنے'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرینہ کے لحاظ سے دوسرے معنوں میں کم ہی استعمال میں آتا ہے۔ لہٰذا:

☆ لفظ قرآن قَرَأَ، يَقْرَأُ باب فَتَحَ، يَفْتَحُ کا مصدر ہے۔

☆ اس کے تین مصادر آتے ہیں: قَرْءٌ، قَرَاءَةٌ، قُرْاٰنٌ۔ اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوئے: ''پڑھی جانے والی کتاب''۔ چنانچہ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کتاب خوب پڑھی جائے گی۔ چنانچہ قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

تدبر قرآن

ارشاد رب العزت ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝[2]   یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبان عقل اس سے نصیحت حاصل کریں.

----

[1] ۷۵ قیامت: ۱۷   [2] ۳۸ ص: ۲۹

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝[1]

کیا لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۝[2]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لقد تجلی اللّٰه لخلقه فی کلامه و لکنهم لا یبصرون[3]

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں تجلی فرمائی ہے لیکن لوگ دیکھ نہیں سکتے۔

۱؎ ۴۷ محمد: ۲۴ ۲؎ ۴ نساء ۸۲ ۳؎ بحار الانوار ۸۹ : ۱۰۷

وَحْی

وحی کا مفہوم۔ فطری الہامات کے پوشیدہ اشارے۔ شیطانی وسوسے ۔ فرشتوں کو ملنے والا حکم۔ وحی اور الہام میں فرق۔ وحی کی امکانی صورتیں۔ انکار وحی کا ایک انداز۔ وجود روح ۔ ذات انسان۔ صفات انسان ۔ وحی اور روح۔ روح کی حقیقت ۔خود آ گاہی۔ دلیل روح۔ کیا فکر مادی ہے؟ حافظہ ۔ ابتدائی حس۔ حفظ ۔ تذکر (یادآوری) ۔تشخص ۔ مادیت کی سب سے بڑی دلیل۔ مادے کے اوصاف اور فکر۔ ادراک اور روح۔ زمان اور ادراک ۔ سچے خواب۔ وحی کا ادراک۔
تعریف قلب۔ اقسام وحی ۔خواب ۔
جبرئیل۔ براہ راست۔ آغاز وحی۔
مکی و مدنی آیات۔وحی اور
خطا ونسیان ۔ داستان غرانیق۔

وَحْی کا مفہوم

لغت میں وحی نہایت تیزی سے دیے جانے والے اشارے کو کہتے ہیں۔

راغب اصفہانی نے لکھا ہے: اصل الوحی الاشارۃ السریعہ۔

شرعی اصطلاح میں بھی لغوی معنی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ تعلیمات اسلامی میں وحی نہایت پوشیدہ اور تیزرو اطلاع کو کہتے ہیں ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حس و مشاہدے میں نہیں آ سکتا کہ وہ اپنے رسولوں سے روبرو بات کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے ہمکلام ہونے کے تین طریقے اپنائے ۔

ارشاد الٰہی ہے:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○ [1]

اور کسی بشر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی پیام رساں بھیجے، پس وہ اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے، بے شک وہ بلند مرتبہ، حکمت والا ہے۔

اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ کے کسی انسان سے ہمکلام ہونے، يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔کلام بذریعہ وحی ۲۔کلام پس پردہ ۳۔کلام بذریعہ قاصد

پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے قلب پر اپنا کلام براہ راست نازل فرماتا ہے۔

دوسری صورت میں پردے کے توسط سے، مگر یہاں پردے کو وحی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پس پردہ کلام کرنا بھی وحی ہے، مگر یہ وحی بالحجاب ہے۔ مثلاً درخت کے ذریعے کلام کرنا یا خواب میں حکمِ الٰہی کا ملنا وحی بالحجاب میں شامل ہے۔ بعض نے درخت کے ذریعے کلام کرنے کو براہ راست وحی خیال کیا ہے جو ایک اشتباہ ہے۔ کیونکہ درخت اور خواب اللہ اور بندے کے درمیان حجاب ہیں۔

تیسری صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے قاصد (فرشتے) کے ذریعے اپنے بندے سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ بھی وحی ہے مگر اس میں قاصد کی قید ہے اور اس مرتبہ قاصد کو وحی میں دخل ہے۔ فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ یعنی

----

[1] ۴۲ شوریٰ: ۵۱

یہ قاصد بحکم الٰہی وحی پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

رسول کریم (ص) پر کبھی جبرئیل وحی لے کر نازل ہوتے تھے اور کبھی اللہ تعالیٰ آپ (ص) سے براہ راست ہمکلام ہوتا تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ جبرئیل کے نزول کے وقت کیا رسول اللہ (ص) پر غشی طاری ہوتی تھی؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: نہیں، بلکہ حضور (ص) پر اس وقت غشی طاری ہوتی تھی جب اللہ تعالیٰ آپؐ سے براہ راست ہمکلام ہوتا تھا۔[1]

بعض قرآنی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ حضور (ص) وحی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ سمجھ لیتے تھے، نہ کہ صرف کانوں اور آواز کے ساتھ۔ چنانچہ ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾[2]

جسے روح الامین نے اتارا آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

اس سے واضح ہوا وحی، قلب رسول (ص) پر نازل ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ○[3]

پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو وحی بھیجنا تھی وہ وحی بھیجی جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا تو کیا جسے انہوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا ہے تم لوگ (اس کے بارے میں) ان سے جھگڑتے ہو؟

لفظ وحی قرآن مجید میں اس کے علاوہ بھی متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ فطری الہامات کے پوشیدہ اشارے: ارشاد الٰہی ہے:

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ...[4]

اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی کہ انہیں دودھ پلائیں۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ○[5]

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں گھر (چھتے) بنائے۔

۲۔ شیطانی وسوسے:

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ[6]

اور شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں یقیناً شکوک پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔

۱۔ موجز علوم القرآن ص ۱۱۱ داؤد عطار ۲۔ ۲۶ شعراء: ۱۹۳۔۱۹۴ ۳۔ ۵۳ نجم: ۱۰ تا ۱۲
۴۔ ۲۸ قصص: ۷ ۵۔ ۱۶ نحل: ۶۸ ۶۔ ۶ انعام: ۱۲۱

۳۔فرشتوں کو ملنے والا حکم:

اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ ...[۱] جب آپ کا رب فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں۔

الہام اور وحی میں فرق: الہام کسی کے دل میں کوئی بات ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے دل میں ڈالی جانے والی بات کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ الہام کا تعلق باطنی شعور سے ہے۔ الہام ایک اشراقی عمل ہے۔ الہام ماہر نفسیات کے دائرہ تجربہ میں آ سکتا ہے جب کہ وحی تجربے میں نہیں آتی اور قابل تجربہ نہیں ہے۔ الہام تحت الشعور میں ہوتا ہے جب کہ وحی شعور میں ہوتی ہے۔ الہام کا مصدر باطنی ہے، جب کہ وحی کا مصدر خارجی ہے۔ الہام کشف معنوی ہے، جب کہ وحی مشاہداتی حقیقت ہے۔ وحی میں کلام وصوت کے ذریعہ مطالب اخذ کیے جاتے ہیں، جب کہ الہام اشراقی لہروں کے ذریعے ذہن کے تصورات میں آنے والے بغیر حروف و اصوات کے مطالب ہیں۔

وحی کی امکانی صورتیں: جو لوگ مادیت کی ظلمتوں اور محسوسات کے تنگ دائروں میں رہ کر سوچنے کے عادی ہیں اور ماورائے مادہ کے ذوق سے محروم ہیں، وہ حقیقت وحی کے ادراک سے قاصر ہیں۔ چونکہ وحی عام انسانوں کے لیے نامحسوس ہے، اس لیے یہ لوگ وحی کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ ہر روز ہمارے اردگرد سینکڑوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو محسوسات پر مبنی نہیں ہوتے لیکن انہیں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مثلاً بعض جاندار ایسے ہیں جن کے نامرئی اور غیر محسوس ادراکات ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں۔ اس سلسلے کی سینکڑوں مثالوں میں سے ہم صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: مچھلی کی ایک قسم ایسی ہے کہ جب یہ پانچ سال کی عمر کو پہنچتی ہے تو مصر کے دریائے نیل سے نکل پڑتی ہے اور بحیرہ روم سے ہوتی ہوئی بحر اوقیانوس کو عبور کرتی ہے اور دو ہزار میل سے زائد سفر طے کر کے ''برمودا'' کے قریب گہرے سمندروں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں امریکہ کے دریاؤں سے آنے والی مچھلیوں میں مل جاتی ہے۔ پھر سمندر کی گہرائی میں اس مقام پر انڈے دیتی ہے جہاں پانی میں نمک کی مقدار ۳۵ % اور گہرائی بارہ سو فٹ ہوتی ہے۔ یہ دو امور انڈوں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ انڈے دینے کے بعد یہ سب مچھلیاں مر جاتی ہیں۔

جب بچے انڈوں سے نکل آتے ہیں تو نہایت قابل تعجب بات یہ ہے کہ وہ بچے جن کی مائیں افریقہ یا یورپ سے آئی ہوں، وہ وہاں جاتے ہیں اور جن کی مائیں امریکہ سے آئی ہوں، وہ امریکہ کے دریاؤں کا رخ کرتے ہیں اور دو ہزار میل سے زائد کا یہ سفر دو سال میں طے کرتے ہیں۔

ان بچوں کو اپنی بن دیکھی ماؤں کے اس وطن کا جو دو ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر موجود ہے، کیسے

---

[۱] ۸ انفال: ۱۲

پتہ چلا اور کس نے انہیں یہ راہیں دکھائیں ۔ کیا مچھلی کے ان بچوں کا یہ ادراک ہمارے لیے قابل فہم ہے؟[1] اس کے علاوہ بعض جانور ایسے ہیں جو ہائیڈروجن ایٹم کے آدھے حصے میں ہونے والی حرکت سن اور محسوس کر سکتے ہیں ۔

خود انسان میں بھی ایسی لا متناہی قوت پوشیدہ ہے جس کا انسان کو اجمالی علم ہوا ہے ۔ چنانچہ عالمی شہرت یافتہ ماہرنفسیات ''الیکسس کارل'' اپنی کتاب **Man the unknown** میں لکھتا ہے:

> زمان و مکان میں افراد کی حد بندی صرف ایک مفروضہ ہے۔[2]

یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے سے عام انسان بھی دوسروں سے غیر مرئی اور غیر مادی ارتباط قائم کر سکتا ہے یعنی مادی وسائل اور حواس خمسہ کے بغیر دماغ میں براہ راست ایک مفہوم و مطلب ڈال دیا جاتا ہے۔ اسے دماغی لہروں کا نظریہ (**Brain wave Theory**) کہتے ہیں۔

مادہ پرستوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مادے کے دائرے میں رہ کر بات کیا کریں اور صرف مادی چیزوں کے بارے میں ہی اپنا نظریہ بیان کیا کریں۔ انہیں غیر مادی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب وہ محسوسات کے علاوہ کسی چیز کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو غیر محسوسات کے بارے میں کوئی نظریہ نفیاً یا اثباتاً قائم ہی نہیں کر سکتے ۔ یعنی اگر یہ لوگ وحی کو قبول نہیں کرتے تو اس کی نفی بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ اگر یہ اس کی نفی کریں گے تو یہ غیر مادی امور میں دخل اندازی ہے جس کے یہ لوگ خود قائل نہیں ہیں۔

انکار وحی کا ایک اور انداز: وحی کا انکار کرنے والے کچھ لوگ اس کی یوں توجیہ کرتے ہیں:

> چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نابغۂ روزگار تھے جو اپنے دور کے تاریک معاشرے، اس کے انحطاط اور اس میں رائج ظلم و استحصال سے سخت نالاں تھے۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتے رہتے تھے کہ اس قوم کو کیسے نجات دلائی جائے جو ذلت و رسوائی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی ہے ۔ چنانچہ چالیس سال تک وہ اس ظلم اور تاریک معاشرے سے گریزاں اور دور رہے اور الگ تھلگ ایک غار میں بیٹھ کر سوچتے رہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ محمد (ص) اپنے ان پاکیزہ افکار کو وحی تصور کرتے تھے اور منجانب اللہ سمجھتے تھے اور اپنے خیر خواہ نفس کو جبرئیل کا نام دیتے تھے۔

---

[1] کس قدر فکر انگیز ہے حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان: یعلم عجیج الوحوش فی الفلوات ... و اختلاف النینان فی البحار الغامرات وہ (اللہ) بیابانوں میں چوپاؤں کے نالے سنتا ہے اور دریاؤں کی اتھاہ گہرائی میں مچھلیوں کی آمد و رفت کو جانتا ہے۔ نہج البلاغۃ خ ۱۹۶ ص ۵۵۵۔

[2] بحوالہ عربی ترجمہ الانسان ذلک المجھول۔

ان میں جو وجود خدا کے بھی منکر ہیں وہ وحی، ثواب، عذاب، جنت اور جہنم کے تصور کو ''مذہبی سیاست'' کا نام دیتے ہیں اور ان تمام تعلیمات کو ''دروغِ مصلحت آمیز'' گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پرانے زمانے کے لوگ خرافات پسند تھے، اس لیے انبیاء (ع) نے خرافات کو ہی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

جواب: خود قرآن مجید اس تصور کو رد کرتا ہے کہ قرآن غیر خدا کا کلام ہوسکتا ہے:

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ [1]

اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس قرآن کو اللہ کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے بنا لائے بلکہ یہ تو اس سے پہلے جو (کتاب) آ چکی ہے اس کی تصدیق ہے اور تمام (آسمانی) کتابوں کی تفصیل ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ [2]

کہہ دیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

یہ بھی ارشاد ہوا:

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ [3]

اور اگر تم لوگوں کو اس (کتاب) کے بارے میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی کوئی سورہ بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے حامیوں کو بھی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

نیز ارشاد الٰہی ہوا:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ [4]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۳۷۔۳۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۸ [3] ۲ بقرہ: ۲۳ [4] ۴ نساء: ۸۲

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس خطبات اور کلام رسول محفوظ ہے اور قرآن بھی ہمارے سامنے ہے۔ دونوں کا اسلوب سخن اور انداز کلام ہمارے سامنے ہے۔ ادب میں ایک ادنیٰ سا مقام رکھنے والا بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے ہیں یا نہیں۔ جب کہ قران مجید اور کلام رسول(ص) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کا اسلوب سخن جدا ہے۔ اگر معاذ اللہ قرآن کلام الٰہی نہ ہوتا اورخود جناب ختمی مرتبت محمد (ص) نے (معاذ اللہ) بنایا ہوتا تو لازماً حضور (ص) کے اسلوب سخن کا عکس قرآن میں بھی نظر آتا۔

وجود روح :وحی چونکہ ایک خالصتاً روحانی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق براہ راست روح سے ہے اس لیے افادہ عام کے لیے ہم یہاں وجود روح کے بارے میں قدیم و جدید فلسفیوں کے نظریات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ۔

ا۔ ذات انسان: اس انسان کا ایک باطنی وجود ہے جسے نفس کہتے ہیں اور یہی نفس انسان کی ذات کی تشکیل کرتا ہے اور یہی اس انسان کا حقیقی، اصلی، ثابت و لایتغیر وجود ہے۔ چنانچہ انسان کے ظاہری وجود، جسم پر ہزاروں تغیرات آتے رہتے ہیں لیکن اس کے ثابت وجود پر کوئی تغیر نہیں آتا اور اس چیز کو ہر انسان درک کر لیتا ہے کہ اس کی ذات اس جسم کے ماوراء کسی اور شئی کا نام ہے ۔

الف۔ ہم اپنے اس حقیقی وجود کی طرف جب اشارہ کرتے ہیں تو لفظ ''خود'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں جب کہ لفظ'' خود'' سے ذات مراد لی جاتی ہے ، نہ کہ اعضاء و جوارح ۔ یعنی اپنے خارجی اعضاء ، سر، شکم، پیر وغیرہ مراد نہیں لیتے اور اعضاء داخلی قلب، جگر وغیرہ بھی مراد نہیں لیتے بلکہ لفظ'' خود'' سے صرف ذات مراد لیتے ہیں جو داخلی و خارجی اعضاء سے ماوراء شے ہے ۔

ب۔ انسان سے صادر ہونے والے تمام افعال ذات انسان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: میں نے کہا، میں نے مارا، میں نے کھایا، میں نے بات کی ۔ ان افعال کو اپنے اعضاء و جوارح کی طرف نسبت نہیں دی جاتی اور یہ نہیں کہتے: میرے ہاتھ نے مارا، میری زبان نے کہا وغیرہ۔

ج ۔ ہم نے اگر کسی سے خطاب کرنا ہو یا کسی کی مدح و مذمت کرنی ہو تو ذات انسان کو سامنے رکھتے ہیں ، اس کے جسم کو نہیں ۔ مثلاً کسی کو مارنے کا حکم دینا ہے تو ہاتھ کو مخاطب نہیں کرتے ، کسی کو متنبہ کرنا ہے تو متعلقہ اعضاء کو مخاطب نہیں کرتے بلکہ ذات انسان کو مخاطب کرتے ہیں۔

د ۔ انسان اپنے اعضاء سے غافل ہوسکتا ہے لیکن اپنی ذات سے ایک لحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جن چیزوں سے غافل ہوسکتا ہے وہ بنیادی چیز نہیں ہے اور جس چیز سے غافل نہیں ہوسکتا وہی انسان کی حقیقی ذات ہے ۔ دوسرے لفظوں میں غافل اور ہے اور مغفول اور ہے ۔ لہٰذا ذات انسان اور ہے اور جسم، جس سے غافل ہوسکتا ہے، اور ہے

۲۔صفات انسان: جسم انسان کے تمام اجزاء تغیر و تبدل کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ جسم انسان ہر سات سال میں مکمل بدل جاتا ہے ۔ اس تغیر و تبدل میں جسم میں نمایاں حالات پیدا ہوتے ہیں۔ صحت، مرض، کمزوری، قوت، طفولت، جوانی، بڑھاپا وغیرہ ۔

اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایسے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں جو ثابت اور لا یتغیر ہیں اور خواہ کتنی ہی جسمانی تبدیلیاں آ جائیں ان اوصاف میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آتی ۔ جیسے محبت، عداوت، شجاعت، سخاوت وغیرہ ۔

انسان کے جسمانی ارتقا و انحطاط اور روحانی ارتقا و انحطاط میں نمایاں فرق ہے بلکہ یہ دو مختلف خطوط پر چلتے ہیں ۔ انسان جوانی میں جسمانی اعتبار سے ارتقا کے آخری درجہ کمال پر فائز ہوتا ہے، لیکن روحانی طور پر کمزور ہوتا ہے اور اس کے بعد جب بڑھاپا شروع ہوتا ہے تو جسمانی طور پر کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے، لیکن فکری اور عقلی طور پر وہ کمال پر فائز ہو جاتا ہے۔

یہاں سے ان دونوں میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے ۔ ایک انحطاط کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا کمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وحی اور روح: سولہویں صدی تک تو مغربی دنیا وحی کی قائل تھی مگر سائنسی ترقی کے بعد وحی کو خرافات میں شمار کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وحی کے ساتھ روح کے وجود کی بھی منکر ہوگئی ۔ یوں اس نے وحی اور روح کے انکار کو سائنسی ترقی کا شعار قرار دے دیا۔

لیکن بعد کی تحقیقات کے نتیجے میں وجود روح کے آثار ظاہر ہونے کی وجہ سے نظریہ روح نے دوبارہ قوت حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی وحی کا تصور بھی قابل توجہ قرار دیا۔

روح کی حقیقت: روح کی حقیقت اور جسم کے ساتھ اس کے ربط اور تعلق کے بارے میں اب تک کوئی بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا ۔ پھر بھی علم نفسیات اور فزیالوجی کی تحقیقات اور انکشافات نے بہت سی اہم باتوں سے پردہ ضرور اٹھایا ہے ۔اگرچہ ان تحقیقات کا مطمع نظر جسم و روح میں ربط کا انکشاف کرنا نہیں تھا مگر ان تحقیقات سے بعض حقائق از خود سامنے آئے ہیں۔

اسلامی فلسفے میں روح اور حرکت مادہ کا مسئلہ ملا صدر الدین شیرازی نے کافی حد تک حل کر دیا ہے اور اس کے بارے میں بہت سے پیچیدہ مسائل کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ صدر الدین شیرازی سے پہلے حرکت صرف مادے کے اوصاف میں ہی منحصر سمجھی جاتی تھی۔ یعنی مادہ صرف کیفیاتی، کمیاتی، مکانی اور محوری حرکت رکھتا ہے۔ لیکن صدر الدین شیرازی نے حرکت جوہری کا اصول روشناس کراتے ہوئے حقیقت مادہ کی حرکت کو ثابت کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں:

جیسا کہ کائنات میں ایک سطحی اور ظاہری محسوس حرکت موجود ہے، اسی طرح

ایک ایسی حرکت بھی موجود ہے جو اس کائنات کی گہرائیوں میں ہے اور محسوس نہیں ہوتی اور یہ کائنات کی جوہری حرکت ہے اور یہ حرکت باقی سب حرکتوں کی اصل او ربنیاد ہے اور اسی حرکت کے نتیجے میں مادی اجسام کی مختلف اقسام وجود میں آتی ہیں۔ روح بھی قانون حرکت کا ایک نتیجہ ہے اور مادہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنی آغوش میں ماورائے مادہ کی پرورش کرے۔ درحقیقت مادہ اور غیر مادہ میں کوئی خاص منافات نہیں ہے اور غیر مادہ درحقیقت مادے کی ارتقائی منازل کا ثمر ہے۔

واضح رہے حرکت سے قطع نظر روح مادے کا نتیجہ نہیں، بلکہ حرکت کا نتیجہ ہے اور حرکت مادے اور روح میں رابطہ ہے۔

ملاّ صدر الدین شیرازی کی ان عظیم علمی تحقیقات کے بعد روح وجسم میں ربط قابل فہم ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست روح کو مادے کے اجزا کے باہمی ارتباط کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور روح کو بھی مادے کی خاصیتیں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملا صدر الدین کے مطابق روح ارتقائے مادہ کی آخری منزل کا ثمر ہے۔ لہٰذا روح مادے سے جدا بھی ہے اور یہ دونوں ایک بھی نہیں ہیں، بلکہ روح مادے کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود اپنا مستقل غیر مادی وجود رکھتی ہے۔

روح کے غیر مادی ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے صرف ایک ایسی دلیل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو جدید علم نفسیات کی روشنی میں بھی قابل قبول ہے اور فلسفے کی اصطلاحات کی پیچیدگیوں سے بھی صاف ہے۔

خود آگاہی: یہ بات سب کے لیے ایک واضح حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کا شعور رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ ''میں موجود ہوں'' اور کائنات میں سب سے واضح حقیقت ہر شخص کے لیے اپنی ذات کا وجود ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ البتہ اس وجود کی تہ تک پہنچنا دوسری بات ہے۔ اس حقیقت کی گہرائیوں کا ادراک کرنے کے لیے تو دلیل اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ مگر اپنی ذات کے وجود کو جاننے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا کبھی کسی کو اس بات پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ ''میں موجود ہوں''۔

اب یہ ''خود'' جو ہر شخص کے لیے واضح ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ مادی ہے یا غیر مادی؟ اس بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں:

پہلا نظریہ: مادیت۔

دوسرا نظریہ: نظریہ مابعد الطبیعیات۔
پہلا اس حقیقت کو مادی اور دوسرا غیر مادی سمجھتا ہے۔
مادیت کا نظریہ یہ ہے کہ "خود" ایک ثابت شے نہیں ہے بلکہ اس میں ہر آن ایک تسلسل سے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اس نظریے کے حامی کہتے ہیں: یہ کہنا درست ہے کہ "میں ہوں اور میں نہیں بھی ہوں"۔ وہ اس کے لیے نہر کی مثال پیش کرتے ہیں کہ نہر کا پانی ہر آن بدلتا رہتا ہے اور ہر لحظہ مختلف پانی سامنے آتا ہے۔ اس کے باوجود نہر ایک ہے، لہٰذا وہ ان مسلسل ادراکات کو جو ایک تسلسل کے ساتھ قائم رہتے ہیں "خود" کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "چونکہ انسان اپنی خودی کا ادراک کرتا ہے" اس لیے "میں ہوں" کہنا درست ہے اور کیونکہ یہ "خودی" ہر آن بدلتی رہتی ہے، لہٰذا "میں نہیں ہوں" کہنا بھی درست ہے۔

دلیل روح: مابعد الطبیعیاتی نظریہ یہ ہے کہ "خود" اس حقیقت کا نام ہے جو تمام حالات میں موجود رہتی ہے اور ناقابل تغیر ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارۃً ذکر کیا گیا ہے کہ اب سائنس میں یہ بات مسلم ہے کہ انسانی جسم کے تمام خلیے بدلتے رہتے ہیں، یوں تقریباً چھ سال میں جسم انسانی کے اکثر خلیے تبدیل ہوجاتے ہیں اس طرح ستر (۷۰) سالہ شخص کا جسم اپنی زندگی میں کئی مرتبہ بدل چکا ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود "خود" نہیں بدلتا اور وہ شخص سمجھتا ہے کہ میں وہی ہوں جو آج سے پچاس سال پہلے تھا۔

پس جو بدلتا ہے وہ مادہ ہے یعنی "جسم"۔
اور جو نہیں بدلتا وہ غیر مادہ ہے یعنی "روح"۔

کیا فکر مادی ہے؟ مارکس ازم کا ڈائلکٹیکل میٹریل ازم یعنی جدلیاتی مادیت چونکہ ماورائے مادہ کی نفی کرتی ہے اور ہر مادہ کو متحرک اور متغیر سمجھتی ہے، لہٰذا اس کے نزدیک فکر بھی مادہ ہے اور ہر مادہ ہمیشہ حرکت میں ہے اور کسی مادے میں سکون و جمود نہیں ہے۔ گویا مادہ پرستوں کے نزدیک فکر اور سوچ بھی غیر مادی نہیں بلکہ مادی ہے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ کیا فکر مادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اس میں تغیر آتا ہے یا نہیں ؟ یا دوسرے لفظوں میں فکری مفاہیم بدلتے ہیں یا نہیں؟

قدیم فلسفی بعض مفاہیم کو دائمی اور بعض کو غیر دائمی جانتے تھے، جب کہ مارکس ازم کے نزدیک کوئی مفہوم دائمی نہیں ہے۔ حالانکہ خود مارکس ازم بعض مفاہیم کو دوام بخشتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ "مادہ ہمیشہ متحرک ہے اور بدلتا ہے" تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی مفہوم دوسرے آن میں ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم کسی بھی گذشتہ واقعہ کا تصور ایک لمحہ بعد ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ واقعہ اسی آن میں صادق ہوگا جس میں یہ واقع ہوا ہے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ مارکس ایک انقلابی شخصیت تھا، صرف اسی وقت میں صادق ہو سکتا ہے جس میں وہ انقلابی تھا۔ اس طرح گذشتہ واقعات کے بارے میں اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً تاریخ

کا مفہوم بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ فکر غیر مادی ہے اور مادہ (مغز و اعصاب) فکر کے لیے آلہ کار ہیں ۔ اگر فکر مادی ہوتی تو مادہ کے خواص اس میں موجود ہونے چاہئیں جب کہ وہ اس میں نہیں پائے جاتے۔

مثلاً مادہ قابل تقسیم ہے لیکن فکر تقسیم نہیں ہوتی ۔ اسی طرح مادے کے اجزا ہو سکتے ہیں، جب کہ فکر کے اجزا نہیں ہوتے۔ اسی طرح مادے کی دیگر خاصیتیں جیسے وزن، جگہ گھیرنا بھی فکر میں نہیں ہوتیں۔

حافظہ: دوسری دلیل یہ ہے کہ فکر یا علم و ادراک مادہ ہو تو ہمیشہ تغیر میں رہے۔ لہٰذا جو چیز ایک سال پہلے ذہن میں آئی تھی اسے اب ختم ہو جانا چاہیے تھا اور اگر فکر و ادراک صرف دماغ ہی سے عبارت ہے تو دماغی سیل (خلیے) بدلتے رہتے ہیں اور ان خلیوں کے بدلنے سے فکر و ادراک کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ چونکہ ان خلیوں کے علاوہ یہاں کچھ اور تو ہے نہیں، لہٰذا ایک لمحہ پیشتر فکر میں آنے والی بات دوسرے لمحے میں موجود نہیں ہونی چاہیے ۔حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ بیسیوں سال کی ہزاروں معلومات انسانی دماغ میں محفوظ رہتی ہیں اور اسے حافظہ کہتے ہیں۔

اگر کسی نے بچپن میں اژدھے کو دیکھا ہے تو سالہا سال گزرنے کے بعد بھی اس کی شکل وصورت اس کے ذہن میں محفوظ رہتی ہے اور ہر مناسب وقت پر وہ اژدھا اسے یاد آتا ہے اور یاد آنے پر اژدھے کی صورت ذہن میں دوبارہ حاضر ہو جاتی ہے جب کہ اس وقت دوبارہ اس نے اژدھے کو دیکھا نہیں ہے ۔ دیکھا تو صرف پہلی مرتبہ ہی تھا۔ اب اس کی صورت اور شکل بن دیکھے ہی ذہن میں حاضر ہو جاتی ہے۔

ماہرین نفسیات اس بارے میں کہتے ہیں کہ انسان خارجی عوامل کے تحت اپنے حواس سے کسی ایک شے کا ادراک کرتا ہے اور بعد میں خارجی عوامل کے بغیر عین اسی چیز کو ذہن میں حاضر کر لیتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں اسے چار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے:

۱۔ ابتدائی حس: یعنی پہلے جب ایک شے حواس میں آجائے تو پھر اسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو خارج سے اپنے حواس کے ذریعے ایک شے کا ادراک ہوتا ہے۔

۲۔ حفظ: جو چیز ذہن میں وارد ہو جاتی ہے جب تک عیناً وہی چیز ذہن میں باقی نہ ہو، کسی خارجی عامل کے بغیر اس کا دوبارہ ذہن میں آنا ممکن نہیں ہے۔

۳۔ تذکر (یادآوری): یعنی گذشتہ واقعات کا ذہن میں دوبارہ حاضر کرنا۔

۴۔ تشخص: یعنی اس بات کی تشخیص کرنا کہ یہ بات جو اب یاد آئی ہے عیناً وہی بات ہے جو پہلے کسی وقت ذہن میں آئی تھی۔ دوسری مرتبہ یہ بات خارج سے ذہن میں نہیں آئی اور نہ ہی یہ کوئی نیا خیال ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پہلی بار ذہن میں آنے سے لے کر دوسری مرتبہ یاد

آنے تک وہ بات ذہن میں کیسے محفوظ رہتی ہے اور مناسب وقت پر یاد آنے سے پہلے اس کی نگہداری کیسے ہوتی ہے؟

چنانچہ جدلیاتی مادیت کے حامی کہتے ہیں کہ اس وقت وہ دماغ کے کسی ایک خلیے میں اس طرح محفوظ رہتی ہے جس طرح آواز، کیسٹ میں محفوظ ہوتی ہے اور اس کے محفوظ رہنے کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی مگر جب دماغ کے ان خلیوں میں تحریک ہوتی ہے تو اس وقت پرانی بات دوبارہ ادراک میں آ جاتی ہے۔ یعنی یاد آنا دوسرا ادراک ہے، عیناً پہلا ادراک نہیں ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر پرانی بات دماغی خلیوں ہی میں محفوظ رہتی ہے تو یہ خلیے تو بدلتے رہتے ہیں۔ جن خلیوں میں یہ بات آئی تھی وہ خلیے اب موجود نہیں ہیں۔ یعنی کیسٹ کی وہ ریل اب موجود نہیں ہے، اس کی جگہ دوسری ریل آ گئی ہے۔ چنانچہ ستر سالہ شخص کا دماغ کئی مرتبہ بدل چکا ہوتا ہے، اس کے باوجود اسے اپنے بچپن کی باتیں کیسے یاد رہتی ہیں اور کہاں محفوظ رہتی ہیں؟

نیز یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ بیرونی عوامل سے تحریک صرف ان خلیوں ہی میں کیوں ہوتی ہے جن میں معلومات محفوظ ہیں۔ یہ تحریک دوسرے خلیات میں کیوں نہیں ہوتی۔

اگر دماغی خلیے نہ بھی بدلیں پھر بھی انسانی دماغ میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ تمام معلومات اپنے خلیوں میں محفوظ رکھ سکے۔ کیونکہ انسانی دماغ کے خلیوں کی تعداد بارہ ارب سے زائد نہیں ہے، جب کہ سائنسدانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان اپنے حافظے میں دس لاکھ ارب معلومات محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اب بارہ ارب معلومات تو دماغی خلیوں میں سما سکتی ہیں باقی کہاں محفوظ رہتی ہیں؟

واضح رہے کہ سائنسی طور پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور ثابت ہے کہ چھ سال میں انسانی جسم کے تمام خلیے بدل جاتے ہیں اور نئے خلیے ان کی جگہ لیتے ہیں۔

خود جدلیاتی مادیت کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ ''مادہ ہر آن متحرک رہتا ہے''۔ اس کے حامی کہتے ہیں: خلیات بدلتے ضرور ہے مگر دوسرے خلیے ان کی جگہ لیتے ہیں اور ذہنی معلومات دوسرے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں جیسا کہ نہر کے بہتے ہوئے پانی میں انسان اپنی صورت برابر دیکھتا رہتا ہے جب کہ جس چیز میں وہ اپنی صورت دیکھ رہا ہوتا ہے وہ ہر آن بدلتی رہتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس بات سے تو خود ڈائلکٹیکی قانون قائم نہیں رہتا، کیونکہ یہ لوگ ذہنی معلومات کے بدلنے کے قائل تھے۔ اب کہتے ہیں کہ پانی میں نظر آنے والی تصویر کی طرح فکر بدلتی نہیں ہے۔

یہ مثال ایک شاعرانہ مثال تو ضرور ہے مگر حقیقت سے اس مثال کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جاری پانی میں ہم اپنی صورت کو ساکن اس لیے دیکھتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے خیالی ادراک میں باقی ہے، ورنہ حقیقت

میں مختلف صورتیں یکے بعد دیگر ے بلا فاصلہ دیکھنے میں آتی ہیں اور فاصلہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا خیال اسے ایک ہی صورت سمجھتا ہے جس طرح پردے پر نمودار ہونے والی فلمی تصاویر ایک ہی صورت کی طرح ہمیں دکھائی دیتی ہیں جب کہ درحقیقت یہ متعدد تصاویر ہوتی ہیں ،جن کے یکے بعد دیگرے آنے کی وجہ سے ہم انہیں ایک تصویر سمجھتے ہیں۔

مادیت کی سب سے بڑی دلیل: فکر وادراک کے مادی ہونے کی مارکس ازم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر فکر مادی نہ ہوتی تو دماغ پر پڑنے والے اثرات سے متاثر نہ ہوتی حالانکہ دماغ پر پڑنے والے اثرات فکر کو براہ راست متاثر کرتے ہیں ، جن کی وجہ سے دماغی امراض سے حافظہ ختم ہو جاتا ہے ۔جنگوں میں دماغی صدمہ سہنے والے چند افراد جب اپنے وطن واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے شہر اور اپنے ماں باپ کو نہیں پہچانا، حتیٰ کہ وہ اپنا نام تک بھول چکے تھے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فکر مادہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فکر اگر چہ غیر مادی ہے اور علم وادراک ماورائے مادہ میں محفوظ ہوتے ہیں مگر یاد آوری ایک عمل ہے اور یہ بات اسلامی فلسفے میں واضح ہے کہ روح اپنے عمل میں آلہ واوزار کی محتاج ہے۔ لہٰذا فراموشی خواہ درازی مدت کی وجہ سے ہو یا دماغی خلل کی وجہ سے، اس سے ذہنی معلومات بالکل ختم نہیں ہوتیں بلکہ اپنے آلۂ عمل کے فقدان کی وجہ سے روح ان معلومات کو صفحہ ذہن پر دوبارہ حاضر کرنے سے عاجز ہوتی ہے ۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب دماغی امراض کا علاج معالجہ ہوتا ہے اور آلات کار درست ہو جاتے ہیں تو روح دوبارہ پرانی معلومات کو صفحہ ذہن پر حاضر کر سکتی ہے اور معلومات کا یہ عود کر آنا اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب پرانی معلومات ذہن میں موجود ہوں۔

جدید ماہرین نفسیات نے بھی اس بات کی تائید کر دی ہے کہ معلومات ذہن سے مٹ نہیں جاتیں بلکہ انہیں دوبارہ ذہن میں حاضر کرنے (یاد کرنے) کی قوت روح سے سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ متعدد نفسیاتی تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ بعض حالات میں جب روح پر غیر معمولی دباؤ پڑتا ہے تو بہت سے فراموش شدہ واقعات یاد آ جاتے ہیں۔

کچھ حضرات نے تو یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انسان کو نزع روح کے وقت زندگی کے تمام واقعات یاد آ جاتے ہیں۔

مادے کے اوصاف اور فکر: فکر کے غیر مادی ہونے پر ایک واضح دلیل یہ ہے کہ مثلاً ایک باغ ہے جس کا طول ایک سو میٹر اور عرض بھی ایک سو میٹر ہے اور زید نے اسی باغ کا مشاہدہ کیا ۔ مشاہدے کے بعد اس باغ کی تصویر اس کے ذہن میں نقش ہوگئی یعنی زید کی فکر میں باغ موجود ہے۔ باغ کا مادی وجود 100 x 100 میٹر ہے لیکن ذہن میں باغ کا غیر مادی وجود یعنی اس کا علم و ادراک 100 x 100

میٹر نہیں ہے بلکہ اس علم و ادراک کا کوئی طول و عرض نہیں ہے، یعنی مادی نہیں ہے۔
چند روسی دانشور اپنی کتاب ''جدلیاتی مادیت'' میں لکھتے ہیں:

احساس، ادراک، تصور اور فکر ایسے امور ہیں جنہیں نہ دیکھنا ممکن ہوتا ہے، نہ سونگھنا، نہ چھونا اور نہ ہی ان کی آواز سننا۔ فکر کو ہم کسی زمان و مکان کی حدود میں نہیں دیکھ سکتے۔ نہ اس کا طول و عرض ہوتا ہے اور نہ وزن۔ دوسرے مادی اجسام کی طرح فکر و ادراک میں فزیکل خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔

ادراک اور روح: اگر ادراک صرف اعصابی عمل اور خارجی عوامل سے عبارت ہے، بہ الفاظ دیگر ادراک اگر آواز کی اعصاب کے ذریعے دماغ تک رسائی کا نام ہے تو جب بھی اعصاب کے ذریعے آواز دماغ تک پہنچ جائے، ادراک وجود میں آنا چاہیے، حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی بات میں منہمک ہو تو اسے دیگر آوازوں کا ادراک ہی نہیں ہوتا جب کہ آواز کا ارتعاش اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ روح متوجہ نہیں ہوتی۔ پس ادراک کرنے والی درحقیقت روح ہوتی ہے جب کہ اعصاب و دماغ فقط ذریعۂ ادراک ہیں۔

زمان اور ادراک: ادراک کے غیر مادی ہونے پر ایک دلیل یہ ہے کہ ادراک زمانے کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ ادراک صفحۂ ذہن پر دوبارہ تکراراً وجود میں آتا ہے اور جو چیز زمانی ہو وہ کبھی تکرار نہیں ہوتی۔ جو وقت درکار ہوتا ہے وہ خود ادراک کے لیے نہیں بلکہ آلۂ ادراک کے لیے درکار ہوتا ہے۔

سچے خواب: خواب میں انسانی روح اپنے طبیعیاتی عمل سے استفادہ کیے بغیر از خود سماعت و بصارت کی قوت رکھتی ہے۔ خواب کی حالت میں انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، کانوں سے کوئی آواز نہیں ٹکراتی، اس کے باوجود جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا اور سنا وہ سچا ہوتا ہے۔

وحی کا ادراک: رسول کریم (ص) کے لیے وحی کا ادراک ایک وجدانی کیفیت ہے، جس میں شک و تردید، اشتباہ اور غلطی کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا، کیونکہ رسول کریم (ص) وحی کو حواس ظاہری مثلاً بصارت و سماعت جیسے جائز الخطاء ذرائع سے نہیں لیتے تھے، اگرچہ رسول کریم (ص) کے ظاہری حواس بھی جائز الخطاء نہیں تھے، تاہم یہ ذرائع تو سب کے پاس موجود ہیں، بلکہ آپ (ص) وحی کو عینی مشاہدے اور محسوسات سے زیادہ واضح طور پر اپنے پورے وجود کے ساتھ درک کرتے تھے، جیسا کہ عام انسان اپنے وجود، اپنے شعور اور اپنے وجدانیات میں شک و تردید کا شکار نہیں ہوتے۔ رسول کریم (ص) کے لیے وحی کا مسئلہ اس سے واضح تر تھا۔ اگرچہ بفرض محال کبھی کبھار کوئی عاقل انسان اپنے وجود کے بارے میں کسی شک و تردید کا شکار ہو بھی سکتا ہو مگر رسول کریم (ص) وحی کے بارے میں کبھی بھی کسی شک و شبہے میں نہیں پڑے۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝[1]

جسے روح الامین نے اتارا آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

نیز ارشاد ہوا

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝[2]

پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو وحی بھیجنا تھی وہ وحی بھیجی، جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا تو کیا جسے انہوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا ہے تم لوگ (اس کے بارے میں) ان سے جھگڑتے ہو؟

تعریف قلب: انسان کے اندر مختلف پہلو اور متعدد جہات ہیں اور یہ تمام جہتیں ایک ہی مرکز سے مربوط ہیں۔ حتیٰ کہ عقل بھی انہی جہات میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مرکز سے مربوط رہے۔ اس مرکزی قوت کو قرآن نے قلب کہا ہے۔ قلب یعنی نفس اور روح۔

پس قلب رسولؐ پر وحی نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی کا ادراک رسول کریم (ص) علم حضوری کے طور پر اپنے وجود سے کرتے تھے، نہ کہ محسوسات کی طرح صرف حواس خمسہ سے اور نہ ہی معقولات کی طرح صرف عقل سے، بلکہ ان دونوں سے واضح تر اپنے پورے وجود سے وحی کو حاصل کرتے تھے، یعنی رسول کریم (ص) کو جس طرح اپنے وجود کا ادراک ہوتا تھا اس سے بھی واضح اور بیّن طور پر وحی کا ادراک ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ (ع) پر ابتدا میں جب وحی نازل ہو رہی تھی اس وقت حضرت موسیٰ (ع) کو بتایا گیا کہ یہ وحی اللہ کی جانب سے ہے:

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ...[3]

اور میں نے آپ کو منتخب کر لیا ہے لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے اسے سنیں، میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں...۔

نیز اس بات کو باور کرانے کے لیے کہ وحی اللہ کی طرف سے ہے اور حضرت موسیٰ (ع) کو رسول بنایا جا رہا ہے۔ پہلے خود حضرت موسی (ع) کو دو نشانیاں دکھائی گئیں: عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا۔

لیکن حضور ختمی مرتبت (ص) پر ابتدا میں جب وحی نازل ہوئی تو شواہد و آیات کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوئی، صرف حکم نازل ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ...[4]

پڑھیے! اپنے پروردگار کے نام سے۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ بات کرنے والے کو مخاطب اگر نہیں جانتا تو بات کرنے والا پہلے اپنا تعارف

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۹۳۔۱۹۴ [2] ۵۳ نجم: ۱۰ تا ۱۲ [3] ۲۰ طہ: ۱۳۔۱۴ [4] ۹۶ علق: ۱

کراتا ہے، پھر بات شروع کرتا ہے اور اگر بات کرنے والا مخاطب کے سامنے ہمیشہ حاضر ہے تو تعارف کے بغیر حکم کر دیتا ہے۔

حضرت علی(ع) سے روایت ہے:

وَ لَمْ يَجْمَعْ بَيْتٌ وَاحِدٌ يَوْمَئِذٍ فِي الْإِسْلَامِ غَيْرَ رَسُولِ اللَّهِ وَ خَدِيجَةَ وَ أَنَا ثَالِثُهُمَا أَرَى نُورَ الْوَحْيِ وَ الرِّسَالَةِ وَ أَشُمُّ رِيحَ النُّبُوَّةِ وَ لَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِينَ نَزَلَ الْوَحْيُ عَلَيْهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔[1]

اس وقت اسلام کے زیر سایہ ایک گھر میں رسول اللہؐ اور خدیجہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور میں ان میں تیسرا شخص تھا۔ وحی و رسالت کے نور کا مشاہدہ کرتا اور نبوت و رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ میں نے حضور (ص) پر وحی نازل ہوتے وقت شیطان کی چیخ سن لی۔

اقسام وحی: ۱۔ خواب: وحی سچے خواب سے شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین (ع) سے روایت ہے:

رؤیا الانبیاء وحی۔[2]
انبیاء کے خواب وحی ہیں۔

البتہ قرآن خواب کی صورت میں نازل نہیں ہوا۔

۲۔ جبرئیل: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ان جبرائیل کان اذا اتی النبی صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم لم یدخل علیہ حتی یستأذنہ، فاذا دخل علیہ قعد بین یدیہ قعدۃ العبد۔[3]

جب جبرائیل رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اجازت لے کر داخل ہوتے اور داخل ہونے کے بعد آپ کے سامنے ایسے بیٹھ جاتے جیسے ایک غلام بیٹھتا ہے۔

۳۔ براہ راست: قلب رسالتمآب پر وحی اکثر براہ راست نازل ہوا کرتی تھی اور جب آپ (ص) براہ راست اللہ سے ہمکلام ہوتے تو آپ (ص) کا رنگ متغیر ہو جاتا، آپ پر غشی طاری ہو جاتی اور پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ جو لوگ اس وقت حضور (ص) کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان پر بھی ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو جاتی اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہتے۔

ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا۝[4]

عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

نزول وحی کے دوران حضور اکرم (ص) جس حالت استغراق میں ہوتے اس سے دشمنان اسلام، بالخصوص مستشرقین نے آپ (ص) کی رسالت کو مشتبہ بنانے کی ناکام کوشش کی اور کہا کہ حضور (ص) نعوذ باللہ مرگی کی بیماری میں مبتلا تھے اور جب آپ (ص) کو اس بیماری کا دورہ پڑتا تو ہوش اور شعور سے محروم ہو جاتے،

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ ص ۵۳۴ [2] الامالی للطوسی ص ۳۳۸
[3] بحار الانوار ۱۸: ۲۶۰۔ کمال الدین۔ للشیخ الصدوق ۱: ۸۵ [4] ۷۳ مزمل: ۵

پسینے میں شرابور ہو جاتے اور جب ہوش میں آتے تو اپنے مریدوں سے کہتے کہ مجھ پر وحی نازل ہو رہی تھی اورانہیں کچھ باتیں سنا دیتے تھے۔

و شھد شاھد من اھلھا کے مصداق خود مستشرقین میں سے ایک شخص ان کی اس شرارت کا جواب اس طرح دیتا ہے: چنانچہ سرولیئم میور (Sir William Muir) اپنی کتاب ''حیات محمد'' (Life of Mohammad) میں لکھتے ہیں:

> وحی کی جو کیفیت محمد پر طاری ہو جاتی تھی اس کی غلط توجیہ کرنا علمی اور سائنسی لحاظ سے ایک فاش غلطی ہے کیونکہ جب مرگی کے مرض کا دورہ پڑتا ہے تو اس اثنا میں قوت حافظہ سرے سے کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور مریض کو کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس دوران اس پر کیا گزری، کیونکہ اس حالت میں فکر وشعور ماند پڑ جاتے ہیں ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو اس مرض کے بارے میں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک بات بھی رسول کریم (ص) کو اثنائے وحی عارض نہیں ہوتی تھی ، بلکہ اس دوران ان کے پورے حواس بطور احسن کام کرتے تھے اور پھر جو وحی نازل ہوتی تھی اسے اپنے اصحاب کے لیے بیان کرتے تھے۔[1]

آغاز وحی: اس بات میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں کہ قرآن کا نزول ماہ مبارک رمضان کی شب قدر میں ہوا ہے جیسا کہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ...[2] — رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

لیکن یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

۱۔ علمائے امامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسالتمآب(ص) ماہ رجب میں مبعوث بہ رسالت ہوئے۔آغاز وحی اور آغاز بعثت مختلف اوقات میں کیسے قابل تصور ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آغاز وحی اور بعثت کا ایک ہی وقت میں ہونا ضروری نہیں، عین ممکن ہے کہ وحی کے نزول کا سلسلہ پہلے شروع ہو چکا ہو اور ابھی مبعوث بہ رسالت نہ ہوئے ہوں. چنانچہ نزول قرآن اور بعثت کے درمیان ایک وقفہ موجود تھا۔ اس دوران آپ (ص) پر وحی نازل ہوتی تھی مگر تبلیغ کا حکم بعد میں ملا ۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ (ص) کو تبلیغ رسالت کا حکم ملا:

---

[1] بحوالہ تاریخ القرآن از محمد حسین علی الصغیر ص ۲۱ [2] ۲ بقرہ: ۱۸۵

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ○[1]	آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کریں اور مشرکین کی اعتنا نہ کریں۔

۲۔ قرآن کا نزول تیئس (۲۳) سالوں پر محیط ہے تو قرآن کا صرف ایک رات میں نازل ہونے کا مطلب کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن قلب رسول (ص) پر شب قدر میں نازل ہوا ہے یعنی رسول کریم (ص) کو علم قرآن بیک وقت دیا گیا۔ البتہ قرآنی آیات کی تبلیغ و ارشاد کے لیے بذریعہ وحی تازہ احکامات مل جایا کرتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَ قُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰہُ لِتَقۡرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکۡثٍ وَّ نَزَّلۡنٰہُ تَنۡزِیۡلًا ○[2]	اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے رکھا ہے تاکہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ شب قدر میں نزول قرآن کا مطلب آغازِ نزول ہے۔ چنانچہ ہر اہم واقعے کا آغاز بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔

مکی و مدنی آیات: آیات اور سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ اس بارے میں تین نظریات ہیں:

۱۔ مدینہ پہنچنے سے پہلے نازل شدہ آیات اور سورتیں ''مکی'' ہیں جب کہ مدینہ پہنچنے کے بعد کی آیات اور سورتیں ''مدنی'' ہیں۔

اس نظریے کے مطابق ہجرت سے پہلے نازل شدہ آیات خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا غیر مکہ میں یا اثنائے ہجرت میں مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی ہوں، سب ''مکی'' قرار پائیں گی اور مدینہ پہنچ جانے کے بعد نازل شدہ آیات ''مدنی'' قرار پائیں گی، خواہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں یا سفر میں یا جنگوں میں، حتیٰ کہ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر خود مکہ میں نازل شدہ سورتیں بھی ''مدنی'' قرار پائیں گی۔

۲۔ جو آیات و سورتیں مکہ اور اس کے آس پاس (خواہ ہجرت کے بعد) نازل ہوئی ہوں وہ ''مکی'' ہیں اور جو مدینہ اور اس کے آس پاس نازل ہوئی ہوں وہ ''مدنی'' ہیں اور جو ان دونوں شہروں سے دور دوسرے علاقوں میں نازل ہوئی ہیں، وہ نہ ''مکی'' ہیں نہ ''مدنی''۔

۳۔ جن آیات کے مخاطب اہل مکہ ہیں وہ ''مکی'' ہیں اور جن آیات میں مدینہ والوں سے خطاب ہے وہ ''مدنی'' ہیں۔ مکہ میں نازل ہونے والی آیات کا آغاز یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ سے

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۴ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۰۶

ہوتا ہے کیونکہ اکثر اہل مکہ کافر تھے، جب کہ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات کا آغاز یَاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے ہوتا ہے۔ کیونکہ مدینہ والوں میں ایمان والوں کی اکثریت تھی۔

آیات کے مکی و مدنی ہونے کے لیے جو معیار بنائے گئے ان میں مختلف نظریات قائم ہونے سے متعدد آیات کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ بہرحال محققین کے نزدیک پہلا نظریہ صائب اور قریب بہ حقیقت ہے۔

وحی اور خطا و نسیان: جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، وحی کا ادراک رسول کریم (ص) کے لیے ایک ایسی وجدانی کیفیت ہے جس میں کسی شک و تردید اور غلطی و اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ رسول کریم (ص) عینی مشاہدہ سے بالاتر اپنے پورے وجود کے ساتھ وحی کو درک کرتے تھے۔ اس لحاظ سے رسول کریم (ص) معصوم عن الخطا ہیں۔ اگر کسی صورت بھی غلطی کی گنجائش رہ جاتی تو وحی پر سے بالعموم اور قرآن پر سے بالخصوص اعتماد اٹھ جاتا۔ عدم خطاء کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے ۔ ارشاد رب العزت ہے:

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ[1] ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

داستان غرانیق: طبری نے اپنی تفسیر اور جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور ۴ :۳۶۶ ۔ ۳۶۸) میں اور دیگر علمائے اہل سنت نے صحیح السند روایات میں ذکر کیا ہے:

> رسول کریم (ص) مشرکین مکہ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ کاش قرآن میں کوئی ایسا مطلب نازل ہو جائے جس سے قوم میرے نزدیک آ جائے ۔ چونکہ رسول اللہ (ص) کو اپنی قوم سے قطع تعلقات پر دکھ تھا اور چاہتے تھے کہ قربت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اتنے میں سورہ نجم نازل ہوئی ۔ آپ (ص) اسے تلاوت فرمانے لگے۔ جب یہاں پہنچے:
>
> اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی ۙ بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟ اور
>
> وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ۙ[2] پھر تیسرے منات کو بھی۔
>
> تو شیطان نے آپ (ص) کے ذہن میں درج ذیل الفاظ ڈال دیے:
>
> تلك الغرانيق العلی و ان شفاعتهن لترجی۔ ایسے بلند مرتبہ بت ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے۔
>
> رسول کریم (ص) نے قریش کے سامنے ان کی تلاوت فرمائی۔ بعد میں آپ (ص)

---

(۱) ۸۷اعلیٰ : ۶ (۲) ۵۳ نجم : ۱۹۔ ۲۰

نے سجدہ کیا۔ آپ (ص) کے ساتھ مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرکین نے بھی سجدہ کیا اور آپ (ص) کی طرف سے اپنے خداوٴں کی تعظیم وتکریم پر وہ بہت خوش ہوئے۔ مہاجرین حبشہ تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی واپس مکہ چل دیئے۔ جب رات ہوئی تو جبرئیل نازل ہوئے اور سورہ پڑھنے کا حکم ہوا۔ آپ (ص) نے ان دونوں کلمات کی بھی تلاوت کی۔

جبرئیل نے کہا: یہ دونوں کلمات آپ (ص) کہاں سے لے آئے؟ اس پر رسول اللہ (ص) کو سخت ندامت ہوئی کہ اللہ پر کذب و افترا ہو گیا۔ اس پر سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ عَنِ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ لِتَفۡتَرِیَ عَلَیۡنَا غَیۡرَہٗ ٭ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا ۝[1]

اور (اے رسول) یہ لوگ آپ کو اس وحی سے منحرف کرنیکی کوشش کر رہے تھے جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے تا کہ آپ وحی سے ہٹ کر کوئی اور بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کریں، اس صورت میں وہ ضرور آپ کو دوست بنا لیتے۔

اس سے رسول اللہ (ص) کو بہت زیادہ رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ۝[2]

اور (اے محمد) آپ سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ نبی مگر جب اس نے (کامیابی کی) تمنا کی تو شیطان نے اس کی اس آرزو میں خلل اندازی کی لیکن اللہ شیطان کے خلل کو نابود کرتا ہے پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر طبری ۱۷: ۱۳۱ ـ ۱۳۴ ـ درمنثور ۴: ۳۶۶ ـ ۳۶۸ ـ فتح الباری شرح صحیح بخاری ۸: ۳۳۲

اس خود ساختہ داستان کو دشمنان اسلام، خاص طور سے مستشرقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسالتمآب (ص) کی عصمت کو مخدوش اور دین اسلام کو مطعون کرنے کے لیے اسے خوب اچھالا۔[3]

حالانکہ یہ داستان عقل و نقل کے اعتبار سے نہایت ہی ناقابل توجہ اور سراسر کذب و بہتان پر مبنی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں:

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۳ [2] ۲۲ حج: ۵۲ [3] بروکلمین کی تاریخ، عربی ترجمہ ص ۳۴

۱۔ داستان خود صریحاً قرآن کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۙ[1]	وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

نیز ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّ عِبَادِىۡ لَـيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ ...[2]	جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری (یعنی شیطان کی) بالادستی نہ ہوگی۔

نیز فرمایا:

قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ ۚ[3]	(اے رسول) کہہ دیجیے: مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اسے بدل دوں، میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔

۲۔ یہ روایت زیادہ تر تابعین سے منقول ہے۔ اصحاب میں سے صرف حضرت ابن عباس کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے اور ابن عباس بھی ہجرت سے صرف تین سال قبل پیدا ہوئے تھے، لہٰذا وہ بھی اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔

۳۔ یہ عصمت رسول (ص) کے خلاف ہے جو اجماع مسلمین سے ثابت ہے۔

۴۔ آیات کا سیاق و سباق ان کلمات اور اس داستان کے خلاف ہے۔

اَفَرَءَيۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰى ۙ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰى ○ اَلَـكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الۡاُنۡثٰى ○ تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰى ○ اِنۡ هِىَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهۡوَى الۡاَنۡفُسُ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰى ؕ ○[5]	بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟ اور پھر تیسرے منات کو بھی؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں؟ یہ تو پھر غیر منصفانہ تقسیم ہے۔[4] دراصل یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے گھڑ لیے ہیں اللہ نے تو اس کی کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔ یہ لوگ صرف گمان اور خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔

---

[1] ۵۳ نجم: ۳۔۴ [2] ۱۵ حجر: ۴۲ [3] ۱۰ یونس: ۱۵
[4] یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عرب ان بتوں کو تو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو ننگ و عار سمجھ کر زندہ دفن کر دیتے تھے۔
[5] ۵۳ نجم: ۱۹ تا ۲۳

بھلا درج بالا سیاق وسباق کے ربط میں اس عبارت کا کوئی جوڑ ہے کہ ''یہ تو بہت بلند وبالا بت ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔'' حالانکہ ان آیات میں تو ان بتوں کی مذمت موجود ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ ان تمام امور کے باوجود عصمت قرآن اور عصمت رسول (ص) کے منافی اس روایت کو ابن حجر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری کی جلد ۸ ص ۳۳۳ پر صحیح تسلیم کیا ہے اور لکھتے ہیں:

> سعید بن جبیر کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ براین یہ ایک طریقے سے مستقلاً بسند صحیح بھی نقل ہوا ہے۔

اسی طرح امام الفقۃ و التفسیر طبری نے اپنی تفسیر میں سورہ حج آیت ۵۲ کے ذیل میں اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ امام جصاص اور زمخشری نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ اس روایت کے کذب پر خود اس کے اندر بڑے شواہد موجود ہیں۔

چونکہ روایت کے مطابق سورہ نجم ہجرت حبشہ کے زمانے میں نازل ہوئی۔ ہجرت حبشہ سنہ ۵ نبوی میں واقع ہوئی ہے اور اس روایت میں ذکر ہوا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت سے رسول اللہ (ص) کی سرزنش کی گئی ہے اور سورہ بنی اسرائیل ظاہر ہے معراج کے موقع پر نازل ہوئی ہے اور معراج نبوت کے گیارہویں سال واقع ہوا ہے اور سورہ حج مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کے نزول کے زمانوں اور داستان غرانیق میں تضادات موجود ہیں

اس خودساختہ داستان نے رشدی جیسے شاتم رسول کے لیے ماخذ فراہم کیا ہے۔ فتنۂ رشدی کے بعد مسلمانوں کو اس ضمن میں سوچنا چاہیے کہ شان رسالت (ص) کے منافی مواد کے بارے میں انہیں متحدہ موقف اختیار کرنا ہوگا اور احادیث کے رد وقبول کے سلسلے میں اس صدی کے مسلمان دماغوں کو سوچنے، تحقیق کرنے اور فیصلہ کرنے کا حق دینا ہوگا، ورنہ رشدی جیسے شاتم رسول کو یاوہ گوئی کا موقع ملتا رہے گا۔

معجزہ

تعریف ۔ معجزے کی ضرورت۔ قرآن ابدی معجزہ ۔ قرآن کا چیلنج۔
چیلنج کا رخ۔ قرآن کا علمی چیلنج ۔ قرآن کا رسالتی چیلنج۔ قرآن کا تنظیمی چیلنج ۔
قرآن کا دعویٰ۔ بلاغتِ قرآن ۔ دعوتِ فکر۔ آفاق میں تفکر و تعقل ۔ آسمانوں کے
بارے میں غور وفکر ۔ طریقہ غور وفکر ۔ قرآن کا طرز استدلال ۔ تعقل اور
جذبات و احساسات کا امتزاج۔ قرآن کا طرز استدلال

قرآن مجید وہ کلامِ الٰہی ہے جسے رسول خاتم (ص) پر ایک ابدی شریعت کے ساتھ نازل کیا گیا۔ یہ دائمی سعادت کا بشارت دہندہ، ایک احسن نظام کے لیے اساس اور انسانیت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے ایک درس انقلاب ہے۔

قرآن مجید کے لا تعداد پہلو ہیں اور ہر پہلو خود ایک ابدی معجزہ ہے۔ معجزہ کیا ہے اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس باب میں ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

تعریف: معجزے کی یہ تعریف کی گئی ہے:

أن یأتی المدعی لمنصب من المناصب الالهیة بما یخرق نوامیس الطبیعة ، ویعجز عنه غیره، شاهداً علی صدق دعواه۔[1]

کسی الٰہی منصب کا دعویدار اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے قوانین طبیعت کو توڑ کر ایسا عمل انجام دے جس سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔

اس تعریف کے مطابق معجزے کے لیے درج ذیل امور ضروری ہیں، ورنہ وہ معجزہ نہیں ہوگا:

۱۔ یہ عمل الٰہی منصب کا دعویٰ رکھنے والے سے صادر ہو۔ اگر کوئی اور شخص ایسا عمل انجام دیتا ہے جسے جہالت کی وجہ سے دوسرے لوگ انجام نہیں دے سکتے تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔

۲۔ معجزہ کے لیے لازم ہے کہ قوانین طبیعت کے مطابق نہ ہو، کیونکہ اگر طبیعی قوانین کے مطابق کوئی عمل سرانجام پاتا ہے تو یہ بھی معجزہ نہ ہوگا۔

۳۔ دوسرے لوگ اس قسم کا عمل سرانجام دینے سے عاجز ہوں۔ لہٰذا اگر کوئی تجربہ فطری قوانین کے تحت طبیعت کو مسخر بنا دے تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ زمین وآسمان کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے:

---

[1] البیان فی تفسیر القرآن ۔ امام خوئی دام ظلہ ص ۳۳

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً[1]
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل کر دی ہیں۔

معجزے کی ضرورت: انسانی ہدایت کے لیے رسولوں کا مبعوث ہونا از روئے عقل و نقل ضروری ہے اور جب تک انبیاء کے پاس اپنے دعوے پر شاہد کے طور پر ایک مضبوط اور ٹھوس دلیل نہ ہو لوگ انہیں قبول نہیں کرتے اور اللہ کی طرف سے اتمام حجت بھی نہیں ہوتی۔

چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت فرمایا:

وَ قَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ ○[2]
اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

تو فرعون نے دلیل مانگی:

قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ○[3]
(فرعون نے) کہا: اگر تم سچے ہو اور کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اسے پیش کرو۔

ظاہر ہے کہ وہ نشانی اور حجت معجزے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ دلیل اگر عاجز کر دینے والی (معجزہ) نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دوسرے لوگ بھی ایسی ہی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ یوں ہر شخص کے لیے دعوئ نبوت کرنا آسان ہو جائے گا اور اگر یہ دلیل صرف معجزہ میں منحصر ہو جائے تو جھوٹے دعویداروں کی قلعی کھل جائے گی۔

دوسری طرف ہدایت الٰہیہ اور خدائی دعوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان عقائد و نظریات، روایات و عادات اور مذاہب و دیانات کو ترک کر دیں جو ابًا عن جدٍّ انہیں وراثت میں ملی ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں کہ کسی کے کہنے پر لوگ مروجہ عادات و رسوم ترک کر کے کوئی اور عمل سرانجام دیں۔

پھر انبیاء علیہم السلام کی طرف سے دعوت جبر و اکراہ کے ساتھ نہیں ہوتی کیونکہ لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ[4] نہ ان جدید نظریات کو طاقت کے ذریعے مسلط کیا جاتا ہے، لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ[5]، بلکہ انبیاء کی دعوت دلیل و منطق کے ساتھ محبت اور ہمدردی پر مبنی ہوتی ہے۔ نبیؐ لوگوں کی ایذا رسانی کے جواب میں انتقام کی بجائے دعائے ہدایت کرتا نظر آتا ہے:

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون[6]
اے اللہ! میری قوم کی ہدایت فرما کہ یہ جانتے نہیں۔

---

[1] ۳۱ لقمان: ۲۰ [2] ۷ اعراف: ۱۰۴ [3] ۷ اعراف: ۱۰۶
[4] ۲ بقرہ: ۲۵۶۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ [5] ۸۸ غاشیہ: ۲۲۔ آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔
[6] منقول ہے کہ کفار قریش کی طرف سے ایذا رسانی پر حضرت رسول اکرم (ص) یہ جملے ارشاد فرماتے تھے۔ بحار الانوار ۳۵: ۱۷۷

چونکہ یہ تو عقائد و نظریات کا معاملہ ہے جو دلوں سے مربوط ہے۔ اگر جسموں پر تسلط ہو بھی جائے تو بھی نظریات دل میں جاگزیں نہیں ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انبیاءؑ اپنے دعوے کی سچائی کے لیے معجزہ پیش کریں۔

قرآن ابدی معجزہ: قدیم امتیں عقل و فہم کے لحاظ سے اس قابل نہ تھیں کہ انہیں ایک ابدی شریعت کا امین بنایا جائے۔ وہ صرف محسوسات کے ادراک کے قابل تھیں۔ اس لیے وہ لوگ اپنے معبود کو بھی محسوس یعنی بت کی شکل میں لاتے تھے۔ ان کی طرف انبیاء بھیجے گئے تو انہیں جو معجزے دیئے گئے وہ بھی محسوس معجزات تھے۔ عصائے موسیٰ (ع)، ید بیضا، شق دریا اور مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ محسوس معجزات تھے۔

انسانیت جب عقل و ادراک کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس قابل ہو گئی کہ ایک ابدی شریعت اور دائمی دستور حیات کی امین بنائی جائے تو اسے جو معجزہ قرآن کی شکل میں دیا گیا، وہ معجزہ بھی ہے، ہدایت و رحمت بھی ہے اور شفا بھی اور ساتھ ایک نظام حیات بھی۔

معجزے کی اہمیت و عظمت دعوے کی اہمیت و عظمت سے مربوط ہے۔ ان دونوں میں تناسب بھی ضروری ہے۔ اگر دعویٰ محدود ہے تو معجزہ بھی محدود ہی ہوگا۔ اگر دعویٰ وقتی ہے تو معجزہ بھی وقتی ہوگا۔ لیکن اگر دعویٰ ابدی ہے تو معجزہ بھی ابدی ہوگا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) کو اپنے دور کا معجزہ دیا گیا۔ یعنی سحر و ساحری کا توڑ۔ حضرت عیسیٰ (ع) کو ان کے زمانے کا معجزہ دیا گیا یعنی طب و مسیحائی۔ مگر چونکہ ان کے دعوؤں میں ابدیت نہ تھی، اس لیے ان کا معجزہ بھی انہی کے زمانے تک محدود تھا۔

لیکن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت ایک ابدی اور ہمہ گیر رسالت تھی، اس لیے آپ (ص) کو ایسا معجزہ عطا ہوا جو کسی حد بندی میں محدود نہیں۔ لہٰذا معجزۂ رسول (ص) یعنی قرآن افراد، زمان، مکان اور موضوع کے اعتبار سے جامع، ہمہ گیر اور ابدی ہے۔ دیکھیے:

۱۔ افراد کے اعتبار سے صرف ایک قوم یا ایک گروہ ہی نہیں بلکہ ہر فرد بشر قرآن کا مخاطب ہے اس میں مذہب، زبان اور رنگ و نسل کا کوئی لحاظ نہیں:

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَۨا ...[۱]	کہدیجیے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

اور قرآن کہتا ہے:

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾[۲]	اور (اے محمد) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۱۔ ۷ اعراف: ۱۵۸   ۲۔ ۲۱ انبیاء: ۱۰۷۔

۲۔ زمانے کے اعتبار سے قرآن اپنے نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک دستور انسانیت ہے:

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ[۱]

اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تا کہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

۳۔ مکانی اعتبار سے بھی ہر مقام اور خطے کے انسان دعوتِ قرآن کے مخاطب ہیں۔ خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، آسمان میں ہوں یا زمین میں اور اس کرہ زمین پر ہوں یا کسی سیارے پر۔ ارشاد ہوا:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾[۲]

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے فقط بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۴۔ موضوع کے اعتبار سے بھی قرآن انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ایک جامع نظام حیات عطا کرتا ہے:

وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ...[۳]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی بنا کر نازل کی ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ ...[۴]

ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔

لہٰذا جہاں رسول کریم (ص) نے ایک جامع، ابدی اور ہمہ گیر دین کا دعویٰ کیا ہے، وہاں اسی مناسبت سے ایک جامع، ابدی اور ہمہ گیر معجزہ درکار تھا جو آپ (ص) نے پیش فرمایا ہے اور وہ معجزہ ہے قرآن مجید۔

قرآن کا چیلنج: قرآن کے ابدی اور زندہ معجزہ ہونے پر اس سے واضح اور بین ثبوت کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے چیلنج کی آواز پندرہ صدیوں سے علم و ادب اور فکر و نظر کی وسیع فضاؤں میں گونج رہی ہے اور آج تک دنیا کا کوئی نابغہ، مفکر، ادیب اور دانشور اس چیلنج کے سامنے ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ کسی ملت میں بھی تاب مقاومت نہیں ہوئی۔ قرآن مجید نے اس چیلنج کو بار بار اور مختلف صورتوں میں دھرایا ہے۔

کبھی ارشاد ہوا:

فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۴﴾[۵]

پس اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام بنا لائیں۔

۱۔ ۶ انعام: ۱۹ ۲۔ ۳۴ سبا: ۲۸ ۳۔ ۱۶ نحل: ۸۹ ۴۔ ۶ انعام: ۳۸ ۵۔ ۵۲ طور: ۳۴

کبھی دس سورتوں کا مطالبہ فرمایا:

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ ...[1]

کہدیجیے: اگر تم سچے ہو تو اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں بنا لاؤ۔

کبھی ایک مختصر سورت ہی کی دعوت دی:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ ...[2]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہدیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ۔

ایک اور مقام پر اس چیلنج کو پھر دہرایا:

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ...[3]

اور اگر تم لوگوں کو اس (کتاب) کے بارے میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسا کوئی سورہ بنا لاؤ۔

اتنے غیر مبہم الفاظ میں ایسی وضاحت کے ساتھ کسی چیلنج میں اس سے زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔

چیلنج کا رخ: نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے چیلنج کا رخ کسی ایک وقت، ایک صنف، ایک جماعت، ایک علاقے یا ایک زمانے کے افراد کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی ہی طرح ایک ابدی اور لازوال چیلنج ہے، جس کی گونج قیام قیامت تک باقی رہے گی اور بنی نوع انسان کے تمام افراد اس میں شامل ہیں بلکہ قرآن میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر تم انفرادی طور پر اس قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بیشک اجتماعی کوشش کر دیکھو اور اللہ کو چھوڑ کر دنیا بھر کی مدد لے لو اور ہو سکے تو جنوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو۔

ارشاد فرمایا:

قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ وَلَوۡ کَانَ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ ظَہِیۡرًا ۝[4]

کہدیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

اس کے لیے کوئی تاریخ اور وقت مقرر نہیں بلکہ یہ ایک کھلا چیلنج ہے اور اس کی آواز ہر زمانے کی فضاؤں میں گونجتی اور دعوت مبارزت دیتی رہے گی۔

قرآن کا علمی چیلنج: درج بالا چیلنج کے علاوہ قرآن نے علمی اعتبار سے بھی چیلنج دیا کہ

---

[1] ۱۱ ھود: ۱۳ [2] ۱۰ یونس: ۳۸ [3] ۲ بقرہ: ۲۳ [4] ۱۷ اسراء: ۸۸

دیکھواس میں ہر شے کا بیان موجود ہے:

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ...[1]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی بنا کر نازل کی ہے۔

پھر فرمایا:

وَ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○[2]

اور کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے جو کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔

قرآن کا رسالتی چیلنج: قرآن نے حضور گرامی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کو بھی چیلنج کے طور پر پیش کیا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی قوم میں زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا بلکہ مکہ کے معاشرے میں تو کوئی عالم بھی موجود نہ تھا اور تو اور حجاز کبھی علمی مرکز بھی نہیں رہا۔

اس کے باوجود آپ(ص) کا ایک ایسا جامع نظام حیات پیش کرنا جس کی نظیر لانے سے نہ صرف اس زمانے کے لوگ عاجز رہے بلکہ آج تک کوئی ایسا نظام پیش نہ کر سکا اور نہ ہی آپ(ص) کے لائے ہوئے نظام میں کوئی نقص ثابت کر سکا۔ یہ سب کچھ خود ایک کھلا چیلنج ہے اور اسے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○[3]

کہد یجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر نہ سناتا اور نہ ہی اللہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا اس سے پہلے میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

چنانچہ چالیس سال آپ(ص) نے اس قوم میں زندگی بسر کی اور اس عرصے میں آپ(ص) نے نہ کوئی شعر کہا، نہ خطبہ دیا اور نہ کوئی اور غیر معمولی ہنر دکھایا اور پھر دفعتاً قرآن جیسی عظیم کتاب اور اسلام جیسا جامع نظام حیات پیش کر دیا۔ ایسی مثال، جو اس جہاں میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔

قرآن کا تنظیمی چیلنج: رسول کریم (ص) نے یہ قرآن تیئیس سال کی مدت میں پیش فرمایا۔ اس دوران آپ(ص) مختلف حالات سے گزرے۔ مکی دور میں ظلم و تشدد کا مقابلہ کیا اور فاقہ کشی اور تنگدستی سے بھی دوچار رہنا پڑا۔ ایک مدت تک شعب ابی طالب میں پوری دنیا سے منقطع ہو کر زندگی گزاری۔ مدنی زندگی میں قدرے بہتر حالات تھے مگر مختلف جنگوں سے دوچار تھے۔

ان بدلتے ہوئے حالات میں اگر محمد(ص) عربی صرف انسانی اور بشری حیثیت سے یہ قانون دے رہے ہوتے تو یقیناً اس طویل عرصے میں دیے جانے والے قانون کے اجزا اور مختلف شقوں میں اختلاف اور

---

[1] ۱۶ النحل: ۸۹　[2] ۶ انعام: ۵۹　[3] ۱۰ یونس: ۱۶

تضاد آ جاتا۔

اہل دانش و بینش غور کریں پورے قانون اسلام اور بیان قرآن میں کہیں بھی کوئی تضاد نہ ملے گا اور اس بارے میں بھی قرآن کا چیلنج ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝[1]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے ۔

بلاغت قرآن: قرآن کی فصاحت و بلاغت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آج تک کوئی اس جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکا۔ جب کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور یہ زبان سلاست الفاظ اور جزالت معانی کے اعتبار سے دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ پر مایہ زبان ہے۔

نیز فصاحت و بلاغت کے میدان میں عربوں میں نابغہ افراد کی بھی کوئی کمی نہ تھی اور اس کے ساتھ ساتھ فراغت بھی حاصل تھی۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ ایک چھوٹی سی سورت بنانے سے بھی عاجز تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام الٰہی میں ایک لفظ کی جگہ بدلنے سے بھی نہ صرف آیت کے معنی درہم برہم ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی طرز اور روح کلام بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی بات کلام الٰہی کے معجزہ ہونے کا معیار ہے۔

غیر اللہ کے کلام میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ آنے سے ممکن ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت میں اضافہ ہو جائے اور اس کے طرز کلام اور روح کلام کا وزن بھی متاثر نہ ہو، مگر کلام الٰہی میں ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہاں تو فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر ہے۔ اس لیے تبدیلی الفاظ سے اس کا معیار گر تو سکتا ہے مگر اونچا نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایک شخص نے سورۂ حمد کا مقابلہ کرنے کی ایک سعی لاحاصل کی اور اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے اللّٰہ نکال کر الرحمٰن رکھ دیا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰنِ ۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی جگہ کہا رَبِّ الْاَكْوان اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی بجائے مٰلِكِ الدَّيَّان کہا اور یوں عبارت تشکیل دی:

الحمد للرحمن ۔ رب الاکوان ۔ ملك الديان ۔ لك العبادة و بك المستعان ۔ اهدنا صراط الايمان ۔

حالانکہ اللّٰہ اسم ذات ہے جو تمام اوصاف کا مجموعہ ہے، لہٰذا حمد کی نسبت اس ذات کی طرف ہوتی ہے جس میں تمام اوصاف موجود ہوں، نہ کہ کسی ایک صفت کی طرف۔ اسی طرح لفظ رب کی اضافت عالمین کی بجائے الاکوان کی طرف درست نہیں، کیونکہ الاکوان، کون کی جمع ہے اور کون وجود و حدوث

----

[1] ۴ نساء: ۸۲

پر دلالت کرتا ہے۔ وجود و حدوث کی طرف لفظ خــلـق کی اضافت تو درست ہو سکتی ہے، یعنی خــالـق الاکوان کہنا تو کسی قدر درست ہو سکتا ہے مگر رب الاکوان کہنا کسی طور پر درست نہیں ۔ جب کہ عـالمین کی طرف رب کی نسبت میں اتنے اسرار و رموز ہیں جو اس وقت ہمارے دائرہ بیان سے باہر ہیں۔[1]

دعوت فکر: اسلام کی حقانیت پر دیگر ہزاروں دلائل کے علاوہ یہ بات بھی ایک بین دلیل ہے کہ قرآن مجید انسان کو فکر و تدبر، تحقیق و تدقیق اور عقل سے کام لینے کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ اس عمل کو عبادت قرار دیتا ہے اور اسے ترک کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔

اگر اسلام حق و حقیقت پر مبنی نہ ہوتا تو لوگوں کو فکر و تحقیق سے دور رکھنے کی کوشش کرتا، نہیں تو کم از کم اس عمل کی ترغیب تو نہ دیتا۔ کیونکہ فکر و تعقل سے امر واقع کا انکشاف ہوتا ہے، حقائق سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ...[2] — کہہ دیجیے: تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ خلقت کی ابتدا کیسے ہوئی۔

سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ دعوت مشاہدہ ہے۔ قرآن اور سائنس دونوں مشاہدے کو معارفِ انسانی کی اساس قرار دیتے ہیں۔

فَانۡظُرُوۡا : عقل سے کام لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشاہدات و محسوسات کی بنیاد پر عقل کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ۔ اللہ نے پہلی بار مخلوق کو کیسے پیدا کیا۔

اس آیت سے ایک حیرت انگیز یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن اس طرز استدلال کو صحیح قرار دیتا ہے جس میں محسوسات اور مشاہدات پر مبنی عقلی استدلال اور نتیجہ گیری ہو۔ صرف مشاہدہ یا صرف عقلی استدلال سے کسی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا:

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ ...[3] — کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے ہو جاتے؟

اس آیت میں دلوں کے تعقل کو سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡض کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو کہ نہایت قابل توجہ امر ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے : البیان فی تفسیر القرآن از امام الخوئی ص ۹۵ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲۰ [3] ۲۲ حج: ۴۶

آفاق میں تفکر و تعقل

الف۔ نباتات:

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ۙ اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ۙ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ۙ وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ۙ وَّ زَيۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ؕ[1]

پس انسان کو اپنے طعام کی طرف نظر کرنی چاہیے کہ ہم نے خوب پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو خوب شگافتہ کیا پھر ہم نے اس میں دانے اگائے نیز انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوے اور چارے بھی جو تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست ہیں۔

اور

اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَ يَنۡعِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ○[2]

ذرا اس کے پھل کو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو۔ اہل ایمان کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں نباتات اور میوہ جات کے بارے میں غور و فکر کے لیے درج ذیل مراحل بیان فرمائے گئے ہیں اور ان کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے:

۱۔ آبیاری: اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا

۲۔ زمین کی شگافتگی: ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا

۳۔ پودے کی پرورش: فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا

۴۔ پھل کا آنا: اِذَاۤ اَثۡمَرَ

۵۔ پھل کی تیاری: وَ يَنۡعِهٖ

ب۔ آسمانوں کے بارے میں غور و تعقّل:

اَوَلَمۡ يَنۡظُرُوۡا فِىۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ ...[3]

کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان میں غور نہیں کیا۔

قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ[4]

کہدیجیے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۲۴ تا ۳۲ [2] ۶ انعام: ۹۹ [3] ۷ اعراف: ۱۸۵ [4] ۱۰ یونس: ۱۰۱

وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ[1] — اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا۔

طریقہ غور وفکر:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ○[2] — تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے نظمی نہیں دیکھے گا، ذرا پھر پلٹ کر دیکھو کیا تم کوئی خلل پاتے ہو؟ پھر پلٹ کر دوبارہ دیکھو تمہاری نگاہ عاجزانہ طور پر تھک کر لوٹ آئے گی۔

اس آیت میں خداوند عالم نے تحقیق اور غور وفکر کا ایک اہم اصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے اور اس کے بارے میں نفی یا اثبات کا کوئی نظریہ قائم کرنے کے لیے بار بار اس کو زیر مطالعہ لانا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ تجربے میں ایک مرتبہ کامیاب ہو جانا بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس کی تطبیق میں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی ہوگی۔ یونہی عقلی دلائل میں بھی غلطی اور لغزش فکری کا امکان برقرار رہتا ہے۔ قرآن نے اپنی دعوت میں انسانوں کو یہ طریقہ بھی بتلایا ہے کہ بار بار غور وفکر کر کے دیکھو تاکہ یقین کے مرحلے تک پہنچو۔

اس کے علاوہ متعدد آیات میں خداوند عالم اپنی دعوت فکر کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرماتا ہے:
نظر۔ تدبر۔ تعلم۔ تفقّہ۔ تعقل۔ تیقّن۔
مثال کے طور پر چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

تدبر: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○[3] — کیا لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

تعلّم: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ[4] — اہل علم کے لیے ہم نے اپنی آیات کھول کر بیان کی ہیں

تفقّہ: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ[5] — ہم نے صاحبان فہم کے لیے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔

تعقّل: كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ[6] — عقل رکھنے والوں کے لیے ہم اس طرح نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۹۱ [2] ۶۷ ملک: ۳۔۴ [3] ۴۷ محمد: ۲۴
[4] ۶ انعام: ۹۷ [5] ۶ انعام: ۹۸ [6] ۳۰ روم: ۲۸

تیقّن: قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ [1] ہم نے تو اہل یقین کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کی ہیں۔

قرآن تعقل کو سعادت اور نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ [2] اور وہ کہیں گے: اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمیوں میں نہ ہوتے۔

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات درج ذیل حوالوں سے دعوتِ فکر دیتی ہیں:

عقل: اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ [3] کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [4] اگر تم لوگ عقل رکھتے ہو۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [5] شاید تم عقل سے کام لو۔

لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [6] غور وفکر سے کام لینے والوں کے لیے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [7] شاید وہ فکر کریں۔

اولوا الالباب (صاحبان عقل): اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ [8] نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

اولی النُّهٰی (صاحبان عقل): اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى [9] صاحبان عقل کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔

قرآن کا طرز استدلال: قرآن کا موقف یہ ہے کہ ہر نظریے کے لیے دلیل، ہر فکر کے لیے برہان اور ہر عقیدے پر علمی ثبوت فراہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن غیر اسلامی عقائد ونظریات رکھنے والوں سے ایسا ہی مطالبہ کرتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ [10]

کہدیجیے: کیا تم نے انہیں (کبھی) دیکھا بھی ہے جنہیں اللہ کے سوا تم پکارتے ہو؟ مجھے بھی دکھاؤ انہوں نے زمین کی کون سی چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں میں ان کی شرکت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی باقیماندہ علمی (ثبوت) میرے سامنے پیش کرو۔

۱؎ ۲ بقرہ: ۱۱۸　۲؎ ۶۷ ملک: ۱۰　۳؎ ۳۶ یٰسین ۶۸

۴؎ ۲۶ شعراء: ۲۸　۵؎ ۲۴ نور: ۶۱　۶؎ ۱۰ یونس: ۲۴

۷؎ ۷ اعراف: ۱۷۶　۸؎ ۱۳ رعد: ۱۹　۹؎ ۲۰ طہ: ۵۴ و ۱۲۸　۱۰؎ ۴۶ احقاف: ۴

قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَا ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ ○[1]

کہد یجیے : کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے لا سکو؟ تم تو صرف گمان کے پیچھے چلتے ہو اور یہ کہ تم فقط قیاس آرائیاں کرتے ہو۔

قرآن اندھی تقلید کی مذمت کرتا ہے اور مطلب کو قبول یا رد کرنے کے لیے علم کو معیار قرار دیتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے :

وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ[2]

اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے ۔

قرآن توحید کا یہ خاصہ بیان کرتا ہے کہ یہ نظریہ دلیل و برہان پر قائم ہے اور دوسرے نظریات رکھنے والوں کو چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے تو اس پر دلیل و برہان قائم کرو۔

وَ مَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ ...[3]

اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے ۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○[4]

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہد یجیے: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم لوگ سچے ہو۔

قرآن جہاں علم و یقین کو دلیل کی اساس قرار دیتا ہے وہاں غیر علمی اور غیر یقینی چیزوں کو دلیل سمجھنے کو جاہلیت کا وطیرہ قرار دیتا ہے:

یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَیۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِیَّةِ ؕ[5]

وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کر رہے تھے.

وَ مَا یَتَّبِعُ اَكۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ؕ[6]

ان میں سے اکثر محض ظن کی پیروی کرتے ہیں جب کہ ظن انسان کو حق (کی ضرورت) سے ذرہ برابر بے نیاز نہیں کرتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا كَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ[7]

اے ایمان والو! بہت سے بدگمانیوں سے بچو۔ بعض بدگمانیاں یقیناً گناہ ہیں ۔

اپنے اسی موقف کی بنیاد پر قرآن سطحی فکر کی مذمت کرتا ہے:

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ○[8]

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کچھ سننے یا سمجھنے کے لیے تیار ہیں؟ (نہیں) یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں ۔

۱۔ ۶ انعام: ۱۴۸ ۔ ۲۔ ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۶ ۔ ۳۔ ۲۳ مومنون : ۱۱۷ ۔ ۴۔ ۲۷ نمل : ۶۴
۵۔ ۳ آل عمران : ۱۵۴ ۔ ۶۔ ۱۰ یونس : ۳۶ ۔ ۷۔ ۴۹ حجرات: ۱۲ ۔ ۸۔ ۲۵ فرقان : ۴۴

رسول اکرم (ص) سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

فکرة ساعة خیرٌ من عبادة سنة۔[1] کچھ دیر کے لیے غور وفکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لا عبادة کالتفکر فی صنعة اللّٰه عزو جل۔[2] اللہ کی مخلوقات پر غور وفکر سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللّٰه تبارك و تعالیٰ خصّ عباده، بآیتین من کتابه: ان لا یقولوا حتی یعلموا، و لایردوا ما لم یعلموا۔ قال اللّٰه عز و جل: اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ....۔[3] و قال تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۔[4]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے بندوں کے ساتھ دو آیتیں مخصوص فرمائی ہیں: علم سے پہلے کسی بات کے قائل نہ ہوں اور نہ علم سے پہلے کسی بات کو رد کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: کیا ان سے کتاب کا میثاق نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ بھی نہ کہیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علم میں نہیں ہے اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں کھلا.

عقل اور جذبات و احساس کا امتزاج

ذہنی و قلبی لحاظ سے انسان میں دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک فکری اور دوسرا جذباتی یا احساساتی ۔فکر کا تعلق عقل سے اور احساسات کا تعلق ضمیر اور وجدان سے ہوتا ہے ۔فکر کی منزل حق وحقیقت ہے کہ حق کے متلاشی فکر و عقل سے کام لیتے ہیں، جب کہ احساسات کا ہدف جذبات کو ابھارنا، ذہنی فرحت اور روحانی غذا بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ فلسفی اور مفکر عقل کی باتیں کرتے ہیں اور حقائق کو کھول کر سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ اس بات کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے کہ ان کا کلام کس قدر خشک، پھیکا، پیچیدہ اور تھکا دینے والا ہے۔ جب کہ شعراء سننے والوں کے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کی شیرینی سے سامعین کے ذوق سماعت کو محظوظ کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے استعاروں اور تشبیہات سے ان کے ضمیر اور وجدان کو سیراب کرتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ باتیں حقیت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ وہ دوسروں کو رلاتے ہیں خود نہیں روتے، دوسروں کو وجد میں لاتے ہیں خود وجد میں نہیں آتے۔

---

[1] بحار الانوار ۶۱ : ۳۲۵
[2] الامالی للطوسی ص ۱۴۶
[3] ۷ اعراف : ۱۶۹
[4] ۱۰ یونس: ۳۹. اصول الکافی ۱: ۴۳

ہر بات کرنے والا ان دونوں میں سے ایک طرز تکلم کو اختیار کرتا ہے بلکہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے ایک ہی طرز کو اختیار کر سکتا ہے۔

بوعلی سینا کو دیکھیے جب وہ فکر کی باتیں کرتے ہیں تو بہترین فلسفی ہیں اور بہت سے حقائق کو کھول کر سامنے رکھتے ہیں ۔ جب وہ احساساتی طرز اختیار کرتے ہیں تو تخیلات اور جذبات کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک کلام میں بیک وقت حقیقت نمائی اور احساسات کی سیرابی دونوں نہیں پائی جاتیں۔ یہ صرف کلام الٰہی کا معجزہ ہے جس میں یہ دونوں باتیں بیک وقت ملتی ہیں۔عقل کی آبیاری اور ذوق سماعت کی تسکین ، ایک ہی جملے میں برہان اور عقلی دلیل کے ساتھ کلام میں شیرینی اور بیان میں لطافت بھی موجود ہے۔ایک ہی عبارت میں عقل وخرد کو بھی جھنجھوڑا ہے اور اس کے ساتھ ہی احساسات و جذبات کو بھی ابھارا ہے ۔ یہ کلام خدا کا معجزہ ہے کہ اس نے ایک ہی لمحے میں عقل اور دل دونوں سے گفتگو کی ہے اور حقائق کے ساتھ ذوق جمالیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً قرآن جب اسلاف کے واقعات بیان کرتا ہے تو عقل کا حق بھی ادا ہوتا ہے او رقلب کو بھی اپنا حصہ مل جاتا ہے۔

قرآن کے تازہ ترین معجزات

زمین ۔حرکت زمین ۔زمین خلا میں ۔زمین، قدرت کا ریکارڈر۔
استخوان ۔عناصر کی مقدار۔اضافت ۔نظام زوجیت۔ عالم غیر مرئی۔
تسبیح ایک آفاقی فریضہ۔صدر المتألہین شیرازی کا نظریہ۔سائنسی نظریہ۔
فضائے آسمان ۔مواقع نجوم ۔آسمانوں کی زندہ مخلوقات ۔کائنات کی
وسعت۔مخمور آنکھیں ۔مادہ اولین ۔نطفۂ امشاج ۔
عفت و پاکدامنی ۔مضغہ غیر مخلقہ ۔مضغہ مخلقہ ۔

زمین

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝[1] اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

ماہرین ارضیات (جیالوجسٹ) اپنی سالہاسال کی تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین ابتدا میں ایک آتشیں کرہ تھی۔

- اس کے بعد تدریجاً سرد ہونا شروع ہوئی۔
- پھر بارش کا دور شروع ہوا۔
- پھر اس کے بعد سبزہ اگنا شروع ہوا۔

چنانچہ قرآن مجید زمین کے ارتقائی مراحل کو اس طرح بیان کرتا ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝[2]

کیا تمہارا خلق کرنا زیادہ مشکل ہے یا اس آسمان کا جسے اس نے بنایا ہے؟ اللہ نے اس کی چھت اونچی کی پھر اسے معتدل بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن کیا اور اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا، اس نے زمین سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

اس آیہ مبارکہ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے:

پہلا مرحلہ: رات اور دن کا سلسلہ

دوسرا مرحلہ: دحو الارض (زمین کو حرکت دینا)

تیسرا مرحلہ: سبزہ اگایا جانا

زمین کے ارتقائی مراحل کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ

کہہ دیجیے: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو اور اس کے لیے مدمقابل قرار دیتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا؟ وہی تو عالمین کا پروردگار ہے اور اسی

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۲۰ [2] ۷۹ نازعات: ۲۷ تا ۳۱

الْعٰلَمِيْنَ ۝٩ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝١٠ [1]

نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکات رکھ دیں اور اس میں چار دنوں میں حاجتمندوں کی ضرورت کے برابر سامان خوراک مقرر کیا۔

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے درج ذیل چیزوں کو ترتیب وار خلق فرمایا:

۱۔ پہلے زمین کو خلق فرمایا

۲۔ اس کے بعد اس میں پہاڑ گاڑ دیے۔

۳۔ اس کے بعد زمین کو قابل سکونت بنایا: بٰرَكَ فِيْهَا ۔

۴۔ زمین پر بسنے والوں کے لیے روزی (قوت) مقرر کی۔

حرکت زمین : اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ [2]

اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا۔

مفسرین نے دحو کا ترجمہ وتفسیر ''بچھانا'' کیا ہے کیونکہ قدماء کے لیے حرکت ارض ایک نا قابل تصور وتوجیہ امر تھا۔

تاج العروس میں دحو کے یہ معنی لکھے ہیں:

دحا السیل بالبطحاء: دحی و المطر الداحی الذی یدحو الحصی عن وجه الارض بنزعه دحی الرمی بقهر۔

یعنی سیلاب نے کنکروں کو دور پھینک دیا۔ اس بارش کو المطر الداحی کہتے ہیں جو کنکروں کو زمین سے اکھاڑ پھینکتی ہے طاقت کے ساتھ دور پھینکنے کو الدحی کہتے ہیں۔

المنجد میں تحریر ہے:

دحی الحجر بیده، رمی بیده۔

دحی الحجر بیده کا معنی ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ سے پتھر پھینکا۔

یوں لغت کی رو سے مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہو سکتے ہیں: اس کے بعد اس نے زمین کو حرکت دے دی۔

البتہ الدَّحْوُ بچھانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ آیت حرکت زمین پر صراحتاً دلالت کرتی ہے۔

دوسری جگہ زمین کی حرکت کے بارے میں ایک اور لطیف اشارہ ملتا ہے:

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ... [3]

جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا۔

---

[1] ۴۱ حم سجدہ ۹-۱۰	[2] ۷۹ نازعات: ۳۰	[3] ۲۰ طہ: ۵۳

گویا زمین کو گہوارے سے تشبیہ دے کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ زمین انسانوں کے لیے گہوارہ اس لیے ہے کہ اس کی حرکت میں سکون اور گردش میں لذت اور جنبش میں تنوع ہے۔

زمین کی حرکت کو مزید وضاحت کے ساتھ قرآن و سنت میں اس لیے بیان نہیں کیا گیا کہ قرآن ایک ایسے زمانے میں نازل ہو رہا تھا جس میں حرکت زمین کسی اعتبار سے بھی نا قابل فہم بات تھی۔ اگر لوگوں کی فکری سطح سے ہٹ کر کوئی مفہوم بیان کیا جائے تو اصل مقصد کو چھوڑ کر اس بات کو سمجھانے اور اس کا دفاع کرنے اور اس کی توجیہ کرنے میں ہی وقت اور قوت صرف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم (ص) کا ارشاد ہے:

أُمِرْنَا أن نُكَلِّمِ الناس على قدر عقولهم۔[1]

ہمیں حکم ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کریں۔

ممکن ہے زمین کو اس کی حرکت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس پر بسنے والوں کے لیے آرام دہ اور سکون بخش ہونے کی وجہ سے گہوارہ کہا گیا ہو۔

زمین خلا میں: قرآن مجید جس زمانے میں نازل ہوا، اس وقت زمین کے بارے میں لوگوں کا نظریہ اس حد تک خرافاتی تھا کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ زمین کو ایک گائے اپنے سینگ پر اٹھائے ہوئے ہے یا زمین پشتِ نہنگ پر واقع ہے۔ ایسے ماحول میں عام فکر سے ہٹ کر قرآن نے یہ واضح کیا:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝[2]

اللہ آسمانوں اور زمین کو یقیناً تھامے رکھتا ہے کہ یہ اپنی جگہ چھوڑ نہ جائیں اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ جائیں تو اللہ کے بعد انہیں کوئی تھامنے والا نہیں ہے، یقیناً اللہ بڑا بردبار، بخشنے والا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں يُمْسِكُ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی تھامنے کے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت امام علی علیہ السلام سے روایت ہے:

انشأ الارض فامسكها من غير اشتغال و ارساها على غير قرار واقامها بغير قوائم... و حصنها من الاود والاعوجاج و منعها من التهافة والانفراج۔[3]

وہ (اللہ) زمین کو وجود میں لایا اور بغیر اس کام میں الجھے ہوئے اسے برابر تھامے رکھا اور بغیر کسی چیز پر ٹکائے ہوئے اس نے اسے برقرار کیا اور بغیر ستونوں کے اسے قائم کیا، کجی اور جھکاؤ سے اسے محفوظ رکھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے اور بکھرنے سے اسے بچائے رکھا۔

---

[1] اصول الکافی ۸: ۲۶۸ [2] ۳۵ فاطر: ۴۱ [3] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۸۴ ص ۴۹۷

قرآن ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ۙ[1]　　کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کے لیے کِفَات نہیں بنایا۔

تاج العروس میں مرقوم ہے:

کفت الطائر وغیرہ ، یکفت کفتاً و کفاتاً ککتاب و کفیتاً کامیر۔ اسرع فی الطیران۔

کفات سرعت سے پرواز کرنے کو کہتے ہیں۔

صحاح اللغۃ میں لکھا ہے:

عدو کفیت و کفات ای سریع۔　　تیزی سے دوڑنے کو کفیت یا کفات کہتے ہیں۔

زمین کی پرواز قدماء کے لیے قابل فہم نہ ہونے کی وجہ سے کِفَات کے معنی انہوں نے "جمع" کے لیے اور آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے: کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا۔

کفاتاً مصدر ہے یا مفعول مطلق ہے، فعل محذوف ہے یعنی تکفت کفاتا اور کفاتًا بمعنی اسم فاعل بھی آ سکتا ہے۔ اس صورت میں احیاءً و امواتًا حال بنے گا یا مفعول بہ یعنی زندوں اور مردوں کو لے کر پرواز کرنے والی زمین۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب کِفَات بمعنی پرواز اس وقت کے لوگوں کے لیے قابل فہم نہیں تھا تو اللہ ایسی بات کیسے کرسکتا ہے جو مخاطبین کے لیے قابل فہم نہ ہو۔

اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ القرآن یفسرہ الزمان۔ ہر زمانے میں قرآن کے جدید معانی و مطالب سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ زمان نزول کے لوگوں کے لیے بے معنی ہیں، وہ بھی اپنے زمانے کے مطابق مطالب اخذ کر سکتے ہیں۔

زمین۔ قدرت کا ریکارڈر: قیامت کے دن زمین کی طرف سے انسانی اعمال کی گواہی اور انسان کا ان اعمال کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۙ[2]　　اس دن وہ (زمین) اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ اس کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

قدماء کے لیے خود عمل دکھائے جانے کا تصور نا قابل فہم تھا اس لیے انہوں نے "تجسم اعمال" کے ساتھ اس کی تاویل کی اور کہا:

---

[1] ۷۷ مرسلات: ۲۵ ۔ ۲۶　　[2] ۹۹ زلزلۃ: ۴ ۔ ۵

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝[1] پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔

سے مراد ہے کہ عمل کی جزا اور سزا دیکھے گا۔ خود عمل تو دنیا میں ہو چکا، وہ دوبارہ دیکھنے کے قابل نہیں۔ حالانکہ قرآن میں اس آیت سے پہلے صراحتاً کہا گیا ہے:

... لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ[2] تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

اس صراحت کی بھی وہ تاویل کرتے تھے کہ اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔

لیکن آج تاویل کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اعمال بصورت انرجی باقی رہتے ہیں اور فضائے زمین سے ناپید نہیں ہوتے، بلکہ فضائے زمین انسانی حرکات وسکنات کو اور اقوال و افعال کو اپنے اندر ضبط اور محفوظ کر لیتی ہے نیز ارشاد الٰہی ہے:

وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝[3] اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

مفسرین نے یہاں بھی تاویل کی کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال مجسم ہو کر سامنے موجود ہوں گے۔ یہ تاویلات اس لیے تھیں کہ علمائے قدیم کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ یہ زمین ایک کتاب کی طرح ہے جس میں خود عمل ثبت ہوتا رہتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝[4] (انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے۔

چنانچہ جب انسان اس آفاقی کتاب کا بروز قیامت مشاہدہ کرے گا تو کہے گا:

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا[5] ہائے ندامت! یہ کیسا نامہ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے.

انسان اپنے خود عمل کو قیامت کے دن کیسے دیکھ سکے گا؟ یہ بات قرآن مجید میں بڑے واضح پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝[6] بے شک تو اس چیز سے غافل تھا، چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے، لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

---

[1] حوالہ سابق: ۷ ـ ۸ [2] حوالہ سابق: ۶ [3] ۱۸ کہف: ۴۹
[4] ۵۰ ق: ۱۸ [5] ۱۸ کہف: ۴۹ [6] ۵۰ ق: ۲۲

تجسم اعمال کی دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سائنسی اعتبار سے جیسا کہ مادہ انرجی میں بدل جاتا ہے اور انرجی مادے میں بدل جایا کرتی ہے، لہٰذا انسانی اعمال اگرچہ آج انرجی ہیں، کل بروز قیامت یہ اعمال مادے کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ چنانچہ بعض روایات سے بھی اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ انسانی تسبیح وتمجید جنت میں خشت و خاک کی صورت اختیار کرلے گی۔ جس سے قصور ومحلات تعمیر ہوں گے۔

استخوان: جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ہڈیاں اعصاب پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں اور تولید نسل میں بھی ہڈیوں کا بڑا دخل ہے۔ ہڈیوں میں غذائی مواد کا ایک ذخیرہ موجود ہوتا ہے جس سے جسم ہنگامی ضرورت پوری کرتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ خون میں موجود سرخ جثیموں سے انسانی جسم میں خون اپنا فعال کردار ادا کرتا ہے، جس کی وجہ سے ہر منٹ میں ۱۸۰ میلین جثیمے استعمال ہوکر ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ تازہ دم جثیمے پیدا کرنے کی ذمہ داری ہڈیوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہڈیوں سے بہت سے قدیم مسائل کے حل میں مدد لی جاتی ہے۔ سائنسدان مردوں کی ہڈیوں سے ان کی عمریں، مرض، جنس، قد، نژاد، جرم غرض ان کی زندگی اور ماحول وغیرہ کی پوری تاریخ کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔

خالق اکبر ہڈیوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اَ یَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ[1]	کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟
وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ[2]	پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں۔

عناصر کی مقدار: کائنات میں موجود عناصر ایک خاص مقدار میں تشکیل پاتے ہیں۔ عناصر کی اپنی ذاتی تشکیل یا دوسرے عناصر کے ساتھ اتحاد دونوں باتیں ایک معینہ مقدار اور ایک آفاقی محکم قانون کے تحت انجام پاتی ہیں۔

عناصر کی تشکیل میں ایک جامع آفاقی نظام کے انکشاف کے بعد سائنسدانوں نے دیکھا کہ مختلف عناصر کے درمیان کچھ کڑیاں غائب ہیں جو موجود ہونی چاہئیں۔ ان کی تلاش ضروری ہے۔ چنانچہ بعد میں عین اسی تسلسل کے مطابق مزید عناصر کا انکشاف ہوا اور تشکیل عناصر کے آفاقی نظام کے تحت کڑیاں مل گئیں۔

چنانچہ شمسی نظام کے تحت مشتری اور مریخ کے درمیان کڑیاں نہیں ملتی تھیں اور سائنسدانوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ان دونوں سیاروں کے درمیان ایک اور سیارہ ہونا چاہیے اور اسے تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ

۱؎ ۷۵ قیامت: ۳　　۲؎ ۲ بقرہ: ۲۵۹

بعد میں اس سیارے کا انکشاف ہوا اور یہ کڑی بھی مل گئی۔

قرآن مجید نے اس آفاقی نظام اور کائنات کے حسابی قوانین کی طرف کس جامع اور لطیف انداز میں دولفظوں میں ارشارہ فرمایا ہے:

وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝[1] اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مقدار ہے۔

اضافت: نیوٹن کی طرف سے کشش ثقل کے انکشاف کے بعد یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ فوق اور تحت مطلق وجود نہیں رکھتے بلکہ یہ دونوں اضافتی مفہوم ہیں کہ ایک جگہ کچھ لوگوں کے لیے تحت ہے اور عیناً وہی جگہ کچھ دوسرے لوگوں کے لیے فوق ہے۔

لیکن ایک اور سائنسدان آئن سٹائن نے نظریہ اضافت قائم کر کے یہ بھی ثابت کردیا کہ دنیا میں ہر شے اضافتی ہے۔ یہ کائنات یک گونہ نہیں ہے۔ منجملہ زمان بھی مطلق نہیں، بلکہ اضافتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی چیز نور کی رفتار سے زیادہ سرعت سے سفر کرے تو اس کا وقت اور سفر نہ کرنے والی دوسری اشیاء کا وقت مختلف ہوگا۔

بعض سائنسدانوں کی تحقیقات کے مطابق اگر کوئی شخص خلائی جہاز میں نور کی رفتار سے سفر کرے تو جب اس مسافر کو سفر کرتے ہوئے صرف ۲۹ سال گزریں گے تو زمین والوں کے لیے تین ملین یعنی ۳۰ لاکھ سال گزر چکے ہوں گے۔[2]

اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت ہماری توجہ مرکوز کرتی ہے:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝[3]

وہ آسمان سے زمین تک امور کی تدبیر کرتا ہے، پھر یہ امر ایک ایسے دن میں اللہ کی بارگاہ میں اوپر کی طرف جاتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس آیت کی تفسیر نظریۂ اضافت سے کر رہے ہیں، بلکہ ایک امکانی صورت اور توجہ کے لیے ہے۔ نظریہ اضافت ایک تھیوری سے زیادہ نہیں ہے۔

نظام زوجیت: نزول قرآن سے پہلے عام خیال یہ تھا کہ زوجیت کا نظام حیوانات اور نباتات میں بھی قائم ہے۔ لیکن قرآن کریم کے انکشاف کے مطابق زوجیت ایک کائناتی نظام ہے اور ہر شے زوجیت پر قائم ہے۔ حتیٰ کہ کائنات کی سب سے چھوٹی مخلوق (ایٹم) بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] ۱۳ رعد: ۸

[2] Martin Gardener Relativity For Million ترجمہ فارسی از محمود مصاحب۔ طبع تہران

[3] ۳۲ سجدہ: ۵

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ○[1] — اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

ایک اور آیت میں اللہ نے نظام زوجیت کو تین مختلف عوالم میں تقسیم فرمایا ہے:

۱۔ عالم نباتات
۲۔ عالم انفس
۳۔ عالم مجہولات

ارشاد الٰہی ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ○[2] — پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے ان چیزوں سے جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنہیں یہ جانتے ہی نہیں۔

نظام زوجیت ان چیزوں میں بھی موجود ہے جنہیں انسان جانتے تک نہیں۔ حتیٰ کہ کل کائنات کا جوڑا اینٹی (Anti) کائنات تلاش کیا جا رہا ہے۔

عالم غیر مرئی: یوں تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کی تفسیر میں بہت سے عالمین کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن شاید ان سب میں سب سے اہم تقسیم یہ ہو: عالم مرئی اور عالم غیر مرئی (ان دیکھا جہاں)۔

عالم مرئی میں ہر وہ چیز آ جاتی ہے جو طبعی یا مشینی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہو۔ عالم غیر مرئی تو شاید زیادہ پر اژدھام، بارونق اور زیادہ شور وشغب کا حامل ہوگا۔ ریڈیائی لہروں، کشش کی لہروں، رنگوں اور جراثیم کے علاوہ لاکھوں غیر مرئی موجودات اس کائنات میں موجود ہیں جن کا عشر عشیر بھی انسان کے حیطۂ انکشاف میں نہیں آیا۔ قرآن اس ان دیکھی دنیا کی طرف ایک خفیف اشارہ فرماتا ہے:

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ○[3] — پس مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے ہو۔

تسبیح ایک آفاقی فریضہ: ارشاد الٰہی ہے:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ[4] — اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

مفسرین نے یہاں پر ہر شے کی تسبیح سے مراد یہ لیا ہے کہ ان چیزوں کا وجود ذات باری تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتا ہے یا ان کے وجود میں جو حکمت الٰہیہ مضمر ہے، یعنی ہر چیز بزبان حال بتاتی ہے کہ ان

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۹ [2] ۳۶ یسین: ۳۶ [3] ۶۹ حاقہ: ۳۸ ۔ ۳۹ [4] ۱۷ اسراء: ۴۴

حکمت آمیز اشیاء کا خالق ہر نقص و شرک سے پاک ہے۔
مگر یہ تفسیر درج ذیل وجوہ کی بنا پر قابل قبول نہیں ہے:
۱۔ اس آیت میں فرمایا گیا: لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ "تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو"۔ لیکن اگر تسبیح سے مراد یہی تکوینی تسبیح ہے تو اسے تو ہم سمجھ بھی رہے ہیں اور بیان بھی کر رہے ہیں۔
۲۔ دوسری جگہ پر ارشاد ہوا ہے کہ یہ اشیاء اپنی دعا و تسبیح کا علم بھی رکھتی ہیں۔ اگر یہ تکوینی تسبیح ہے تو خود اشیاء کو اس کا علم نہیں ہوسکتا۔
ملاحظہ ہو آیت مجیدہ:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ[1]	کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی؟ ان میں سے ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔

۳۔ قرآن کریم نے ان میں سے بعض کی تسبیح کے لیے وقت بھی بتایا ہے کہ پہاڑ صبح و شام تسبیح پڑھتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝[2]	ہم نے ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا تھا، یہ صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

اگر تسبیح سے مراد تکوینی تسبیح ہے تو اس کا کوئی وقت نہیں ہوتا بلکہ یہ تو غیر ارادی طور پر خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ لیکن آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی تسبیح کا وقت بھی مقرر ہے اور معین وقت کی تسبیح کبھی بھی بلاشعور نہیں ہوسکتی ہے۔

صدر المتألہین شیرازی کا نظریہ: اس عظیم فلسفی کا نظریہ اس ضمن میں یہ ہے کہ انسان سے لے کر نباتات و جمادات، ہر شے میں کسی حد تک شعور و ادراک موجود ہے، مگر ایک جیسا نہیں، بلکہ کچھ تفاوت کے ساتھ اور اس کا کلیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ موجودات میں جہاں مادیت کا پہلو قوی ہو گا وہاں حیات و شعور کا پہلو کمزور ہو گا اور جہاں مادیت کا پہلو کمزور ہو گا، وہاں حیات و شعور کا پہلو قوی ہو گا۔ اپنے اس نظریے کے لیے وہ مذکورہ بالا آیات سے ہی استدلال کرتے ہیں۔
سائنسی نظریہ: جدید سائنسی تحقیقات بھی اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ پودوں میں بھی شعور و ادراک موجود ہے۔ چنانچہ یہ امر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پودوں میں ڈر، خوشی، سرمستی اور دیگر قسم کے شعور موجود

---

[1] ۲۴ نور: ۴۱ [2] ۳۸ ص: ۱۸

ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اس سلسلے میں مزید انکشافات ہوں گے۔ یوں قرآن ہر دور میں اپنا تازہ ترین معجزہ پیش کرتا رہے گا۔

فضائے آسمان: قرآن مجید نے فضائے آسمان کی کیفیت اس زمانے میں بتائی جب لوگوں کو ابھی یہ بھی علم نہ تھا کہ اگر انسان اس میں بلند ہو جائے تو کیسے حالات سے دوچار ہوگا۔

لیکن اس صدی کے انسان کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انسان زمین سے جتنا بلند ہوتا جاتا ہے، ہوا اتنی ہی رقیق سے رقیق تر ہوتی جاتی ہے۔ زیادہ بلندی پر پہنچ جانے کی صورت میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے انسان کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سے مزید بلند ہونے پر انسان تنگی تنفس سے ہلاک ہو سکتا ہے۔

یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد درج ذیل آیت میں قرآن کا پیش کردہ مفہوم واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے:

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ [۱]

پس جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔

مواقع نجوم: ہم زمین کی محدود مسافتوں کو ناپنے کے لیے میل، فرسخ یا کلومیٹر وغیرہ کو پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن لامتناہی کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار ستاروں اور کہکشاؤں کے فاصلوں کو ناپنے کے لیے ہمارے یہ محدود پیمانے نہایت ناکافی ہیں۔ لہٰذا اس چیز کو پیمانہ قرار دیا گیا جو اب تک کی انسانی معلومات کے مطابق کائنات میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہے اور وہ ہے نور کی رفتار۔ نور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر مسافت طے کرتا ہے اور سال میں ساٹھ کھرب ($6x10^{12}$) میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس لیے ساٹھ کھرب میل کو ایک نوری سال کہتے ہیں۔

سورج کا نور ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم سے نزدیک ترین ستارے کا نور ہم تک چار نوری سالوں میں پہنچتا ہے۔ کچھ ستارے ہم سے تین سو نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں اور کچھ اس سے بھی زیادہ فاصلے پر ہیں۔ اس کے بعد کہکشاؤں کی باری آتی ہے کہ کچھ کہکشائیں ہم سے بیس لاکھ یعنی دو ملین، کچھ دس ملین اور کچھ سو ملین نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اب تک لاکھوں کہکشاں دریافت ہو چکی ہیں اور ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے موجود ہیں۔

ماضی قریب میں ایک ایسی کہکشاں کا انکشاف ہوا ہے جو ہم سے پانچ ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر موجود ہے۔

---

[۱] ۶ انعام: ۱۲۵

ارشاد ربانی ہے:

فلا اُقسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۝ وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ ۝ [1]	میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے۔

خدایا! ہم تیری عظمت اور تیری مخلوقات کی عظمت کو کیا سمجھیں! ہاں! جس حد تک ہم نے سمجھا اور جانا ہے، واقعاً یہ تیری بہت بڑی قسم ہے۔

آسمانوں کی زندہ مخلوقات: اگرچہ سائنسدانوں کو یہ توقع ہے کہ دیگر سیاروں پر زندگی کے آثار موجود ہو سکتے ہیں لیکن آج تک انسان سوائے ظن و تخمین کے کسی آسمانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا مگر قرآن نے پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ آسمانوں میں زندہ مخلوقات موجود ہیں:

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَثَّ فِیۡہِمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ ؕ وَ ہُوَ عَلٰی جَمۡعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ ۝ [2]	اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور وہ جاندار جو اس نے ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں اس کی نشانیوں میں سے ہیں اور وہ جب چاہے انہیں جمع کرنے پر خوب قادر ہے۔

اس آیہ شریفہ میں ان مخلوقات کے آئندہ ایک جگہ جمع ہونے کی پیشین گوئی بھی ہے۔ لہٰذا جب انسان آسمانی مخلوق سے آشنائی پیدا کرے گا اور یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں گے تو اس وقت قرآن مجید وَ ہُوَ عَلٰی جَمۡعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ کے الفاظ میں تازہ ترین معجزہ پیش کر رہا ہوگا۔

کائنات کی وسعت: یہ کائنات متناہی ہے یا لامتناہی۔ یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن اب تک انسان نے اس کائنات کی وسعت کے بارے میں جو علم حاصل کیا ہے، وہ اگرچہ حقیقت کائنات کے مقابل تو ہیچ ہے، لیکن پھر بھی اس سے کائنات کا ایک عظیم نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس وسیع کائنات میں ابھی کئی کہکشائیں ایسی بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک نہیں پہنچی۔ یعنی کھربوں سال سے ان کی روشنی مسافت طے کر رہی ہے مگر ابھی تک وہ زمین پر نہیں پہنچ سکی۔

علم فلکیات کا یہ نظریہ اب ماہرین کے ہاں مسلمہ قرار پا چکا ہے کہ یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور کہکشائیں ہم سے دور ہٹ رہی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں جب آئن سٹائن نے اضافت عمومی کی مساوات کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس نے ثابت کیا تھا کہ یہ کائنات یا تو سکڑ رہی ہے یا پھیل رہی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کے ماہرین کائنات کو ثابت اور غیر متحرک سمجھتے تھے۔ اس وقت نظریے کو اپنے نظریہ اضافت عمومی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے آئن سٹائن نے مجبوراً ''مستقل کائنات'' کا نظریہ قائم کیا جو خود اس کے اپنے نظریے

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۷۵۔۷۶ [2] ۴۲ شوریٰ: ۲۹

سے متصادم تھا۔ چنانچہ بعد میں اس نے خود اعتراف بھی کیا کہ میری زندگی میں یہ سب سے بڑی سائنسی غلطی کا ارتکاب تھا۔ بعد میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ کائنات بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور کہکشائیں دور ہٹ رہی ہیں اور مزید یہ انکشاف بھی ہوا کہ کسی کہکشاں کے دور ہٹنے کی رفتار اس فاصلے سے متناسب ہے جو ہمارے اور اس کہکشاں کے درمیان ہے۔

خالق کائنات نے اس کا پہلے ہی یوں اعلان کر رکھا ہے:

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۝ [1]	اور آسمان کو ہم نے اپنی طاقت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔

گویا:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے مسلسل صدائے کُن فَیَکُون
(اقبال)

مخمور آنکھیں: آسمان کی خلاؤں میں روشنی مختلف رنگوں میں یوں رقص کیا کرتی ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں کسی جادو کا شکار ہوگئی ہیں۔

آرتھر کلارک نے اپنی کتاب ''انسان اور خلا'' میں اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے ایک باب مخصوص کیا ہے جس میں اس نے خلانوردوں کے بیانات تحریر کیے ہیں کہ جب وہ خلائے بسیط میں پہنچے تو انہوں نے وہ عجب رنگا رنگ، چمک دمک اور اس سے ایک ہم آہنگی دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور انہیں محسوس ہوا کہ گویا ان پر نشہ طاری ہوگیا ہے یا ان کے آنکھوں کو جادو کر دیا گیا ہے۔[2]

اب ذرا اس آیت کا ارشاد سنیے:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۝ [3]	اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ روز روشن میں اس پر چڑھتے چلے جائیں تو یہی کہیں گے: ہماری آنکھوں کو یقیناً مدہوش کیا گیا ہے بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آیت کی تفسیر یہی ہے بلکہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خلا میں سب سے پہلے خلانورد کے الفاظ وہی تھے جو قرآن نے فرمائے ہیں

مادہ اولین: ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۷ [2] Man and Space by Arthur Clark [3] ۱۵ حجر: ۱۴۔۱۵

وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ ...[1]

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

عرش خدا کا حاکمیت، تدبیریت کے معنوں میں لیا جانا ہی آیت کے سیاق وسباق سے مناسبت رکھتا ہے۔ یوں عرش خداوندی کے پانی پر ہونے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت، جب اللہ آسمانوں اور زمین کو بنا رہا تھا تو اس وقت اس کی حاکمیت وسلطنت پانی پر تھی۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک موقع پر سوال کیا گیا کہ عرشِ الٰہی کتنی مدت پانی پر رہا؟ تو آپ(ع) نے فرمایا:

لو ان الارض من المشرق الی المغرب و من الارض الی السماء حب خردل ثم کلفت علی ضعفك ان تحمله حبة حبة من المشرق الی المغرب حتی أفنیته لکان ربع عشر جزء من سبعین ألفِ جزء من بقاء عرش ربّنا علی الماء قبل ان یخلق الارض و السماء، ثم قال : انما مثلت لك مثالا۔[2]

اگر کرۂ ارض مشرق سے مغرب تک اور زمین سے آسمان تک رائی کے دانوں سے بھر دیا جائے اور پھر تیری ناتوانی کے باوجود تجھے یہ حکم ملے کہ ان دانوں کو ایک ایک کر کے مشرق سے مغرب تک لے جاؤ تو ان دانوں کو ختم کرنے پر جو وقت صرف ہو گا وہ ستر اجزا میں سے دس اجزا کا چوتھائی (اس مدت کا اٹھائیسواں) حصہ ہو گا جو مدت آسمان و زمین کی خلقت سے پہلے ''عرش خدا'' کو پانی پر گزری ہے۔ پھر فرمایا: میں نے تو تمہارے لیے صرف ایک مثال پیش کی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

و خلق الشیء الذی جمیع الاشیاء منه و هو الماء الذی خلق الاشیاء منه فجعل نسب کل شی ء الی الماء و لم یجعل للماء نسبا۔[3]

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے وہ مادہ خلق فرمایا جس سے تمام چیزیں وجود میں آئیں اور وہ پانی ہے جس سے سب چیزوں کو خلق فرمایا۔اس طرح ہر چیز کی تخلیق پانی سے ہوئی اور پانی کسی چیز سے خلق نہیں ہوا۔

---

[1] ۱۱ھود: ۷ [2] البرهان فی تفسیر القرآن للبحرانی ٤ : ۸۰ ۔ بحار الانوار ۱۰: ۱۲۷ میں مختلف عبارت ہے۔
[3] اصول الکافی ۸ : ۹۴

نطفۂ امشاج: صلب پدر سے رحم مادر کی طرف مادہ منویہ کا سفر خدا شناسی اور خود شناسی کے لیے حیرت انگیز درس ہے۔ یہ امانت عظمیٰ جب صلب پدر سے آمادہ سفر ہوتی ہے تو مختلف غدود کو بڑی تیزی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ راستے کو پیشاب کی عفونت وغیرہ کے مضر اثرات سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ یہ غدود اپنے چھڑکاؤ کے ذریعے آن واحد میں تمام راستوں کی صفائی کرتے ہیں تاکہ یہ امانت صحیح طور پر اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

کروڑوں جرثوموں پر مشتمل یہ جماعت رحم میں موجود تخم کے پاس جانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان جرثوموں کو معلوم ہے کہ تخم رحم کے آخری سرے پر ایک نلی میں موجود ہے اور ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ادھر یہ تخم بھی اپنے تخم دان سے نکل کر اس نلی تک ایک سفر کر کے پہنچ جاتا ہے۔ جرثومے اور تخم دونوں کو معلوم ہے کہ یہ نلی ہی ان کا حجلۂ عروسی ہے۔ تخم کو خلیات کی ایک جماعت کی محافظت میں حجلۂ عروسی میں پہنچایا جاتا ہے۔ جرثوموں کی ایک معتدبہ تعداد تخم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی امید میں تخم میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ تخم میں داخل ہونے کے لیے تیز دھار سر کی ضرورت ہے، چنانچہ ایک جرثومہ اپنی نوک سر کے ذریعے تخم میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسی وقت دیگر تمام ناکام جرثوموں کا داخلہ ممنوع قرار پاتا ہے اور انہیں باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ تخم کامیاب جرثومے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اس کے ساتھ شادی رچاتا ہے اور اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ واضح رہے انسان کے جسم میں موجود جسمانی خلیے کا مرکزہ ۴۶ کروموسومز (Chromosomes) پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مستقل سیل (Cell) ہے، لیکن جنسی خلیے کے مرکزہ میں ۲۳ کروموسومز (Chromoso mes) ہوتے ہیں جو جسمانی خلیے کا نصف ہیں۔ چنانچہ انسانی تخلیق کے لیے ایک مستقل سیل (نطفہ) تشکیل دینے کے لیے مرد و زن میں سے ہر ایک ۲۳ کروموسومز فراہم کرتے ہیں، جس سے ایک مستقل سیل بہ اصطلاح قرآن نطفہ امشاج (مخلوط نطفہ) وجود میں آتا ہے:

اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِیۡہِ فَجَعَلۡنٰہُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ○ [1]

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں، پس ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا۔

عفت و پاکدامنی: جب ایک جرثومہ تخم میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں تو تخم کی پاکدامنی اور عفت دیکھیے کہ وہ کسی اور جرثومے کو قریب آنے کی اجازت نہیں دیتا اور دوسرے کروڑوں خواستگاروں پر اپنی جاذبیت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

امشاج کا لفظ جمع ہے اور اس کا مفرد مشج ہے۔ نطفة امشاج میں نطفة موصوف اور امشاج صفت ہے۔ امشاج جمع ہونے کی صورت میں نطفة کو بھی جمع مان لینا پڑے گا کیونکہ عربی گرائمر

---

[1] ۷۶ انسان: ۲

کے تحت مفرد کی صفت مفرد اور جمع کی صفت جمع ہی آتی ہے۔ نطفہ اس حالت کو کہتے ہیں جس میں ۲۳ پدرانہ اور ۲۳ مادرانہ کروموسومز کا ملاپ اور اختلاط ہو۔

لہٰذا جدید ترین نظریہ اس آیت کے ساتھ صحیح مطابقت رکھتا ہے۔

مضغۂ غیر مخلقه: ارشاد ربانی ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ...[1]

اے لوگوں! اگر تمہیں موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں شبہ ہے تو (سوچو) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی تخلیق شدہ اور غیر تخلیق شدہ بوٹی سے تاکہ ہم (اس حقیقت کو) تم پر واضح کریں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک مقررہ وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[2]

پھر ہم نے لوتھڑے کو بوٹی کی شکل دی۔ پھر ہم نے بوٹی سے ہڈیاں بنادیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔

مندرجہ بالا آیات کے مطابق انسان کے مراحل تخلیق یہ ہیں:

۱۔ تراب — مِّنْ تُرَابٍ
۲۔ نطفۂ امشاج — مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ
۳۔ لوتھڑا (چمٹنے والا) — مِنْ عَلَقَةٍ
۴۔ بوٹی — مِنْ مُّضْغَةٍ
۵۔ ہڈی — فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا
۶۔ گوشت — فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا
۷۔ خلق آخر — ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ

مضغۂ مخلقه: مفسرین، مترجمین نے مُّخَلَّقَةٍ کا ترجمہ پوری اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ کا ترجمہ

---

[1] ۲۲ حج: ۵
[2] ۲۳ مومنون: ۱۴

ادھوری کیا ہے جو بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مُّخَلَّقَةٍ اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ اس مُّضْغَةٍ کی صفت ہے جس سے انسان خلق ہو رہا ہے۔ ادھوری سے تو خلق نہیں ہوا کرتا۔

جدید نظریات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مُضْغَۃ کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک تو بچے کی تخلیق اور دوسرے اس کی حفاظت۔ مضغہ مخلقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچے کے اعضاء بنائے، جب کہ مضغہ غیر مخلقہ کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس کے لیے غذا کا انتظام کرے۔ چنانچہ ظلماتِ ثلاث میں بند اس نازک مخلوق کے لیے شش جہت سے غذا بہم پہنچائی جاتی ہے۔

مُضْغَۃ کے وسط میں ایک خاص شے ہوتی ہے جس نے آئندہ دماغ اور حرام مغز بننا ہوتا ہے اور اس کے پہلو میں چند قطعے ہوتے ہیں جن سے ریڑھ کی ہڈی تشکیل پاتی ہے۔ پھر پورے جسم کی ہڈیاں بنتی ہیں پھر ان پر گوشت کا لبادہ چڑھایا جاتا ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

جمع قرآن

کتابت اسلام سے پہلے۔ کتابت اسلام کے بعد۔ وسائل کتابت۔ قرآن میں کتابت کا ثبوت۔ کاتبان وحی۔ جمع و تدوین قرآن۔ حفظ قرآن۔ حافظان قرآن کی تربیت ۔ اجتماعی حفظ۔ قوت حافظہ ۔ حافظان قرآن کا مقام۔ نماز اور قرآن۔ تعلیم قرآن۔ دار القراء ۔ عشق قرآن ۔ دقیق نظر۔ تدوین قرآن۔ ترتیب آیات۔ ترتیب آیات و ترتیب نزول۔ ترتیب سورہ ہائے قرآن۔ جمع قرآن در عصر رسول (ص) ۔ فریضہ الٰہی۔ قرآن سے کتابت قرآن کا ثبوت۔ شیوۂ رسول (ص)۔ عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن ۔ اصحاب کا عرضۂ قرآن۔ ختم قرآن۔ جبرئیل کا دورہ قرآن۔ فاتحۃ الکتاب۔ قرآن کا دفعۃً نزول۔ تواتر قرآن۔ وصیت رسول (ص)۔ اصناف سورہ ہائے قرآن ۔ ترتیب آیات کا توقیفی ہونا۔ عصر رسالت میں قرآنی نسخے۔ جمع قرآن بعد از رسول (ص) ۔ چند حقائق ۔ تواتر قرآن اور دو گواہ ۔ زید بن ثابت۔ دیگر قرآنی نسخے ۔ مصحف علی (ع) ۔ وصیت رسول (ص)۔ نسخہ محمدی کی جمع و تدوین۔ اس نسخہ کی افادیت۔ یہ نسخہ امت کو پیش کیا گیا۔ یہ نسخہ کہاں ہے؟ اختلاف قراءت اور نسخہ ۔ یہ نسخہ ربعہ میں۔ تضادات۔ عصر حضرت ابوبکر میں جمع قرآن۔ عصر حضرت عثمان اور قرآن۔ آرمینیا کی جنگ۔ علمائے امت کا فیصلہ۔ کمیٹی کی تشکیل۔ سرکاری مداخلت۔ ایک حرف کا تغیر۔ حضرت عثمان جامع قرآن نہیں ہیں۔ حضرت علی (ع) کا مؤقف ۔ موجودہ قرآن ۔

کتابت، اسلام سے پہلے: اسلام سے پہلے عرب قوم کتابت اور تحریر و تدریس سے بالکل نابلد تھی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے مکہ میں صرف ایک فرد کتابت سے واقف تھا[1] جس کا نام حرب بن امیہ بن عبد الشمس تھا۔ دوران مسافرت اس نے مکہ سے باہر متعدد لوگوں سے کتابت سیکھی۔ ان میں بشر بن عبد الملک صاحب دومۃ الجندل بھی شامل ہے۔ یہ مکہ میں بھی آیا اور یہاں لوگوں کو کتابت سکھائی۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کے اس عمل کو سراہتے ہوئے کہا:

ولا تجحدوا نعماء بشر علیکم و   فقد کان میمون النقیبة ازهرا
اتاکم بخط الجزم حتی حفظتمو   من المال ما قد کان شتی مبعثرا[2]

جب حضور (ص) کی بعثت ہوئی تو اس وقت مکہ میں سترہ افراد کتابت جانتے تھے۔

کتابت اسلام کے بعد: کتابت چونکہ حصول علم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسلام نے علم اور قلم کو باہم مقرون کیا۔ چنانچہ ابتدائے وحی میں جس چیز کا سب سے پہلے ذکر آیا ہے وہ قرائت، علم اور قلم ہیں:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾[3]	پڑھیے! اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

حدیث نبوی (ص) میں ہے:

اذ کان یوم القیامة وزن مداد العلماء بدماء الشهداء فیرجح مداد العلماء علی دماء الشهداء۔[4]	قیامت کے دن علماء (کے قلم) کی سیاہی کا وزن شہداء کے خون کے ساتھ کیا جائے گا تو علماء (کے قلم) کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزنی ثابت ہوگی۔

جنگ بدر میں ساٹھ مشرکین قیدی بنے تو رسول اکرم (ص) نے ان قیدیوں میں سے ہر ایک کا فدیہ دس مسلمانوں کو کتابت سکھانا قرار دیا۔ یوں آپ (ص) نے کتابت اور خواندگی کو آزادی کا ہم پلہ قرار دیا۔ اس واقعہ سے اسلامی تمدن کی تشکیل اور اسلام اور علم کے درمیان رشتے کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے

---

[1] مناهل العرفان ۱: ۲۵۵   [2] زنجانی۔ تاریخ القرآن ص ۳۱   [3] ۹۶ علق: ۳-۴   [4] الامالی للصدوق ص ۱۶۸

وسائل کتابت: عصر رسالت میں تدوین کتب اور رسل و رسائل کے لیے درج ذیل اشیاء لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں:

۱۔ العسب ۔ کھجور کی چھال
۲۔ لخاف۔ سفید باریک پتھر
۳۔رقاع ۔ چمڑے کے ٹکڑے
۴۔ کتف۔ بکری کے شانوں کی ہڈی
۵۔قتب ۔ پالان کی لکڑی
۶۔ شظاظ۔ وہ لکڑی جس سے بورے کا منہ باندھتے ہیں
۷۔اشار ۔ چیرے ہوئے تختے
۸۔قضیم۔سفید چمڑا
۹۔رق۔ پتلا چمڑا
۱۰۔ حریر۔ ریشمی کپڑا
۱۱۔ قراطیس۔کاغذ

زیادہ تر کتابت کاغذوں اور چمڑوں پر ہوتی تھی۔ چنانچہ رسول اکرم(ص) کی طرف سے جاری شدہ امان نامے اور مختلف حکمرانوں کو لکھے جانے والے خطوط چمڑوں پر لکھے ہوئے ہیں۔اس زمانے میں چین کاغذ سازی میں سب سے آگے تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی کاغذ بنتا تھا جو یمن میں فروخت ہوتا تھا۔ رومی بھی کاغذ بناتے تھے جو شام میں بکتا تھا اور ایرانی بھی کاغذ تیار کرتے تھے۔یہ عراق میں بھی ملتا تھا۔

زمانہ رسالتمآب(ص) میں مندرجہ بالا اشیاء پر کتابت ہوا کرتی تھی اور ان پر لکھے گئے قرآن کو صحیفہ کہتے تھے اور جب ان مختلف ٹکڑوں کو کتابی شکل میں جمع کیا جاتا تو اسے مصحف کہتے تھے۔

حضرت عثمان کے دور میں غیر سرکاری مصاحف کے جلا دیے جانے والے واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن کاغذوں پر تحریر کیا جاتا تھا۔

مـــابيـــن الـدفتيـن: کھال سے بنی ہوئی جلد کو دف کہتے ہیں۔قدیم زمانے میں اہم دستاویزات ان پر لکھی جاتی تھیں بعد میں کاغذ پر لکھا جانا شروع ہوا اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے چمڑے کی دو جلدوں کے درمیان باندھ دیا جاتا تھا۔ ان دونوں جلدوں کو دفتیـــــن اور ان میں محفوظ کیے گئے کتابت شدہ موضوع کو مابین دفتین کہا جاتا تھا۔

خود قرآن مجید سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صدر اسلام میں کتابت کے لیے لچکدار اشیاء موجود تھیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ [1]	اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹتے ہیں۔

نیز ارشاد فرمایا:

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ ... [2]	اور (اے رسول) اگر ہم کاغذوں پر لکھی ہوئی کوئی کتاب بھی آپ پر نازل کرتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے۔

مزید فرمایا:

اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [3]	جو تم کرتے تھے ہم اسے لکھواتے رہتے تھے۔

قرآن میں کتابت قرآن کا ثبوت: یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور(ص) کسی کاتب کو بلا لیتے اور لکھنے کا حکم فرماتے اور املاء کرانے کے بعد کاتب سے فرماتے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنائے۔ کاتب سنا دیتا۔ اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو آپ(ص) اس کی اصلاح فرما دیتے۔ [4]

مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسول اکرم(ص) لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والی سورہ فرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِىَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا [5]	اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھ رکھی ہیں اور جو صبح وشام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ آغاز نزول ہی سے قرآن ضبط تحریر میں آتا رہا ہے. چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والی سورہ بینہ میں ارشادہ ہوتا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً [6]	اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

اور سورہ عبس میں خود قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ [7]	ہرگز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحت ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں ہیں۔ جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۱۰۴ [2] ۶ انعام: ۷ [3] ۴۵ جاثیہ: ۲۹ [4] مجمع الزوائد ص ۴۰ [5] ۲۵ فرقان: ۵ [6] ۹۸ بینہ: ۲
[7] ۸۰ عبس: ۱۱ تا ۱۴

مزید فرمایا:

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ[1] قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی ایک کشادہ ورق میں۔

کاتبان وحی: قرآن مجید ایک درمیانے حجم کی کتاب ہے جو تئیس (۲۳) برسوں میں بتدریج قلب رسول (ص) پر نازل ہوتی رہی۔ بظاہر ایک دو کاتب اس کی کتابت کے لیے کافی تھے، لیکن صاحب تاریخ دمشق نے کاتبان کی تعداد تئیس بتائی ہے۔ بعض مورخین کے ہاں یہ تعداد ۴۳ یا ۴۵ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ حضرت علی (ع) اور مدنی زندگی میں حضرت زید بن ثابت کا نام سننے میں آتا ہے۔

مورخین نے جن ۴۳ یا ۴۵ افراد کے نام کاتبین وحی کے زمرے میں درج کیے ہیں، ان میں سے اکثر کے کاتب وحی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ بعض اصحابؓ جو کتابت و قراءت قرآن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان میں سے کچھ کے بارے میں تو یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زمان رسول (ص) ہی میں قرآن جمع کر لیا تھا، ان کے نام کاتبین وحی کے فہرست میں نہیں ملتے۔ مثلاً انس بن مالك، منذر بن عمرو، اسید بن حضر، رافع بن مالك، ابو عبیده بن جراح، سعد بن عبید اور ابو الدرداء و غیرهم۔

اس کی ایک توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ کاتبان وحی سے مراد وہ حضرات ہیں جو رسول اللہ (ص) کے لیے لکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر نسخہ محمدی (ص) کی تدوین کرنے کے لیے لکھتے تھے۔ ہر قرآن لکھنے اور اسے جمع کرنے والے کو کاتب وحی نہیں کہا جاتا تھا۔

ایک کاتب وحی عبد اللہ بن سعد بن ابی السرح مرتد ہو گیا تھا۔ یہ ان چھ افراد میں شامل تھا جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ (ص) نے حکم فرمایا تھا کہ انہیں ہر حال میں قتل کر دیا جائے۔ مگر اس کے رضاعی بھائی نے اسے امان دلوا دی۔

کاتب وحی ہونا چونکہ ایک قابل فخر مقام تھا اس لیے کچھ لوگوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنا نام بھی اس فہرست میں شامل کروا دیا۔ مثلاً معاویہ نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، یعنی حضور (ص) کی وفات سے صرف دو سال چھ ماہ قبل وہ مسلمانوں میں شامل ہوا، مگر اس کے باوجود ابن حجر اپنی کتاب الاصابہ میں معاویہ کو کاتبین وحی میں شامل کرتے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے یزید، ابوسفیان اور حصین بن نمیر (قاتل امام حسینؑ) کو بھی کاتبین وحی میں شامل کیا ہے۔

جمع و تدوین قرآن: قرآن کی جمع و تدوین نہایت اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث و تحقیق کی ضرورت ہے کہ قرآن قلب رسول (ص) سے امت کی طرف کیسے منتقل ہوا؟ کیونکہ رسالتمآبؐ

---

[1] ۵۲ طور: ۱ تا ۳

کے وصال کے بعد پیش آنے والے سیاسی و اجتماعی حالات نے اس حقیقت کو بھی غیر واضح کر دیا کہ قرآن کی جمع و تدوین کی کیا صورت تھی؟ ذیل میں ہم اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

لفظ جمع کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ لوح قلب میں حفظ کر لینے کو بھی ''جمع'' کہتے ہیں۔ چنانچہ حفاظ قرآن کو جماع القرآن بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ آیات اور سورتوں کو بلحاظ ترتیب نزول کتابت کر کے کتابی شکل میں لانا۔

۳۔ آیات اور سورتوں کو بالترتیب کتابت کر کے کتابی صورت میں مدون کرنا۔

۴۔ متعدد قرائتوں میں سے صرف ایک قراءت پر ہی لوگوں کو متفق رکھنا۔

پہلے معنی کے مطابق قلب رسول اکرم(ص) اور قلوب آل و اصحاب رسول(ص) میں قرآن جمع اور محفوظ تھا۔

دوسرے معنی کے مطابق عصر رسالت(ص) میں جمع کردہ قرآن مختلف صحیفوں میں تحریر تھا۔

تیسرے معنی کے مطابق بھی عصر رسالتمآب(ص) میں قرآن جمع اور مدون ہوا تھا۔

چوتھے معنی کے اعتبار سے قرآن کو عصر حضرت عثمان میں ایک ہی قراءت پر مجتمع کیا گیا۔

اب ان موضوعات پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

حفظ قرآن: جمع قرآن بمعنی حفظ، عہد رسالت(ص) میں یقیناً ہوتا رہا ہے اس میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔ البتہ ہم یاد دہانی کے لیے چند شواہد کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ جمع و حفظ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۝[1]

(اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان علينا جمعه و قرآنه عليك حتى تحفظه و يمكنك تلاوته فلا تخف فوت شي منه ۔[2]

قرآن کا جمع کرنا اور آپ کو پڑھانا ہمارے ذمے ہے تاکہ آپ قرآن کی تلاوت کر سکیں لٰہذا آپ قرآن کے کسی حصے کے رہ جانے کی فکر نہ کریں۔

---

[1] ۷۵ قیامت: ۱۶۔ ۱۷
[2] تفسیر مجمع البیان للطبرسی ۱۰: ۵۰۴

نیز قرآن میں ارشاد ہوا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ○[1]

اور آپ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں اور کہدیا کریں: پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ○[2]

(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

حضور (ص) پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ (ص) وحی کے مکمل ہونے سے قبل ہی آیت کی تلاوت شروع کر دیتے تا کہ آیت رہ نہ جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

۲۔ سینۂ رسول (ص) میں قرآن محفوظ ہونے اور اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے خود اپنے ذمے لینے کے بعد دوسرا مرحلہ سینۂ رسول سے امت کے سینوں میں اس کی منتقلی کا تھا۔ اس مرحلے میں تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے رسول اسلام (ص) نے متعدد اقدامات فرمائے۔

الف۔ حافظان قرآن کی تربیت: رسالتمآب (ص) نے قرآن مجید کو امت کے سینوں میں منتقل کرنے کے لیے حافظان قرآن کی وسیع پیمانے پر تربیت فرمائی۔

چنانچہ عصر رسالت (ص) میں ہی حافظان قرآن کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ نام بنام انہیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔[3]

بعض محققین کے مطابق عصر رسول (ص) اور اس سے متصل زمانے میں حافظان قرآن کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اجتماعی حفظ: جو لوگ پورے قرآن کو حفظ نہیں کر سکتے تھے وہ آپس میں مل کر قرآن کو تقسیم کر لیتے اور ہر فرد چند سورتیں حفظ کر لیتا تھا اور بعد میں مل کر ختم قرآن کرتے تھے۔[4]

مستشرق بلاشر حفظ قرآن اور جمع قرآن میں اشتباہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حافظان قرآن کی تعداد سات سے زیادہ نہیں تھی، حالانکہ متعدد روایات سے جامعین قرآن کی تعداد عصر رسالت (ص) میں سات معلوم ہوتی ہے، جب کہ حافظان قران کی تعداد تو حد و شمار سے باہر ہے۔

چنانچہ سن ۴ ہجری میں رسول اللہ (ص) نے قبیلہ بنی عامر کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اپنے اصحاب میں سے ستر افراد کو روانہ فرمایا تھا جو سب کے سب حافظان قرآن تھے۔ حافظان قرآن کا یہ قافلہ جب بئر معونہ کے مقام پر پہنچا تو کفار نے انہیں گھیر کر سب کو شہید کر دیا۔ اس واقعے سے حضور (ص) کو اس

۱۔ ۲۰ طہ: ۱۱۴	۲۔ ۸۷ اعلیٰ: ۶	۳۔ البیان امام خوئی ص ۲۴۶	۴۔ رامیار ۔ تاریخ القرآن

قدر صدمہ ہوا کہ آپ(ص) ایک ماہ تک قنوت نماز میں قاتلوں پر نفرین فرماتے رہے۔ یہیں سے نماز میں قنوت بھی سنت قرار پائی۔

اسی سال حضور(ص) نے دس حافظان قرآن کو بنی عضل و قارہ میں قرآن کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ رجیع کے مقام پر پہنچے تو کفار نے انہیں گھیر لیا اور شہید کر دیا۔ اسی طرح غزوہ احد میں چوہتر (۷۴) مسلمان شہید ہوئے جن میں خاصی تعداد حافظان قرآن کی تھی۔

حضرت ابوبکر کے عہد حکومت میں جنگ یمامہ میں ستر (۷۰) حافظان قرآن شہید ہوئے تھے۔ جب کہ ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد چار سو تھی۔ لیکن ابن کثیر کا خیال ہے کہ یہ تعداد پانچ سو تھی۔[1]

بعض مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ صفین میں تیس ہزار (۳۰۰۰۰) قاریان قرآن شریک تھے۔[2]

قوت حافظہ: عربوں کی قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ ساٹھ ستر بند پر مشتمل اشعار دو یا تین مرتبہ سننے کے بعد حفظ کر لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سادہ، غیر متمدن اور صحرائی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگیوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی اور نہ ہی اس سادہ اور باقی دنیا سے منقطع ماحول میں ان کے اذہان میں معلومات کا کوئی اژدھام تھا۔ اس لیے قرآن پاک جیسے پرکشش اور روح پرور کلام کا حفظ کرنا ان کے لیے نہایت آسان کام تھا۔

حافظان قرآن کا مقام: عصر رسالتمآب(ص) میں حافظان قرآن کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ چنانچہ اگر جنگ میں کوئی حافظ قرآن شہید ہو جاتا تو سب سے پہلے اسے دفن کیا جاتا تھا۔ امام جماعت کے لیے قراءت قرآن معیار تھا بلکہ اس سے بھی قابل توجہ بات یہ ہے کہ حفظ قرآن کے معیار پر سالار لشکر بنایا جاتا تھا۔

> جب رسول خدا (ص) نے اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنایا تو بعض صحابہ نے تعجب کیا اور کہا کہ وہ اس نوعمری میں اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتا تو حضور (ص) نے اسامہ کے اس منصب کے اہل ہونے کے اوصاف بیان فرمائے جن میں سے ایک یہ تھا کہ اسامہ کو قرآن کا ایک حصہ حفظ ہے۔[3]

اسی طرح عثمان بن ابی العاص کو قرآن حفظ ہونے کی وجہ سے طائف کا امیر مقرر کیا گیا۔

ب۔ نماز اور قرآن: حضور(ص) نے تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے اور اسے امت کے سینوں میں محفوظ رکھنے کے لیے قراءت قرآن کو نماز کے ساتھ جو کہ دین کا ستون ہے، مربوط فرمایا۔ چنانچہ خود رسالتمآب(ص) نمازوں میں بالعموم اور نماز تہجد کی صرف ایک رکعت میں بالخصوص سورہ بقرہ اور آل عمران

---

[1] فضائل القرآن ص ۹ [2] منقری ۔ صفین ص ۱۸۸ [3] ابن سعد طبقات ۲:۱۳۶ قسم اول

جیسی طویل سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے[1]۔ حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک شب میں نے حضور (ص) کے ساتھ نماز پڑھی تو رسول اللہ(ص) نے سورہ بقرہ سے تلاوت شروع فرمائی۔ پھر سورہ نساء کی تلاوت فرمائی، پھر سورہ آل عمران کی تلاوت فرمائی۔ حضور(ص) نماز میں اس قدر قرآن کی تلاوت فرماتے تھے کہ پاؤں پر ورم آ جاتا تھا[2]

صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ رات ہو یا دن جب بھی فرصت میسر ہوتی آپ(ص) قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی اور سواری کی پشت پر بھی تلاوت قرآن فرمایا کرتے۔[3] محاذ جنگ پر بھی آپ(ص) بآواز بلند تلاوت قرآن فرماتے تھے۔[4]

چنانچہ تلاوت قرآن کو سب سے افضل عبادت قرار دیا گیا۔

ج۔ تعلیم قرآن: دعوت اسلامی کے ساتھ ساتھ تعلیم قرآن کا عمل بھی نہایت اہتمام سے شروع ہوا۔ بیعت عقبہ کے بعد حضور(ص) نے مصعب بن عمیر کو مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے معلم قرآن کے طور پر متعین فرمایا۔[5]

بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم مامور ہوئے۔ بعد میں عمار اور بلال کو تعلیم قرآن کے لیے بھیجا گیا۔[6]

مدینہ میں تعلیم قرآن کے عمل کو وسیع پیمانے پر آگے بڑھایا گیا اور معلم اول کے طور پر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب کرام کو بذات خود قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود نے کوفہ میں اپنے ساتھیوں سے کہا:

میں نے خود رسول اللہ (ص) سے ستر(۷۰) سورتیں پڑھی ہیں۔[7]

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں:

رسول اللہ(ص) ہمیں تشہد کی تعلیم اس طرح دیتے تھے جس طرح قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ابی بن کعب کہتے ہیں:

میں مسجد میں داخل ہوا تو ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

تمھیں کس نے قرآن پڑھایا؟ اس نے بتایا: خود رسول اللہ(ص) نے۔[8]

شیخ طوسی اپنی کتاب الامالی میں لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے ستر(۷۰) سورتیں خود رسول اللہ(ص) سے تعلیم پائیں اور باقی قرآن حضرت علی علیہ السلام سے۔[9]

۱۔ رامیار۔ تاریخ القرآن　۲۔ صحیح البخاری: باب تہجد　۳۔ و ۴۔ رامیار: تاریخ قرآن ص۲۲۴ بحوالہ مفتاح کنوز السنة
۵۔ ابن ہشام السیرة النبویة۲: ۷۶　۶۔ زنجانی۔ تاریخ القرآن ص۴۶　۷۔ تفسیر طبری ۱: ۲۸
۸۔ العطار، موجز علوم القرآن　۹۔ الامالی للطوسی ص۶۰۶۔ بحار الانوار ۸۹: ۷۲

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ (ص) اپنے شاگردوں کو قرآن پڑھانے کے بعد ان سے سنا بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اصحاب، رسول اللہ (ص) کی خدمت میں پورا قرآن بھی ختم کیا کرتے تھے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے مجھ سے فرمایا:

اقرأ عَلَيَّ قال فَفَتَحْتُ سورة النساء ... الی آخر۔ — مجھے قرآن پڑھ کر سنا دو پس میں نے سورۂ نساء کو کھولا[1]

اور جب اس آیت پر پہنچا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا[2] — اس دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

تو رسول اللہ (ص) کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور فرمایا:

حسبك الآن۔[3] — اب بس کرو۔

مسجد رسول (ص) ہمیشہ قاریانِ قرآن سے بھری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ حضور (ص) کو کہنا پڑتا کہ لوگو! قرآن آہستہ پڑھو تا کہ آوازوں میں اختلاط پیدا نہ ہو۔

دار القراء: مدینے میں قاریان قرآن کی تعداد میں بکثرت اضافے سے مسجد اور صفہ میں گنجائش نہ رہی تو قاریانِ قرآن مخرمہ کے گھر جمع ہونے لگے۔ چنانچہ اس گھر کا نام ہی دار القراء پڑ گیا۔ یہ تاریخ میں سب سے پہلا دار القراء ہے۔

عبادہ بن ثابت ناقل ہیں کہ جب رسول اللہ (ص) خود تعلیم نہیں دیتے تھے تو ہم میں سے کسی کو حکم فرماتے کہ دور سے آنے والوں کو تعلیم قرآن دیں۔ (۴)

آپ (ص) نے تعلیم قرآن کو اس قدر اہمیت دی کہ عورتوں کے حق مہر بھی قرآن کی ایک یا چند سورتوں کی تعلیم قرار دی جانے لگی تھی۔

عشق قرآن: شاگردان رسول (ص) کے دلوں میں قرآن مجید نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ قرآن کی تلاوت جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک واقعہ اس امر پر شاہد ہے:

> ایک جنگ میں ایک مسلمان نے ایک عورت کو اسیر بنایا جس کا شوہر موقعے پر موجود نہ تھا۔ شوہر کو جب پتہ چلا تو اس نے قسم کھائی کہ محمد (ص) کے ساتھیوں سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ چنانچہ وہ لشکر رسول (ص) کے تعاقب میں نکلا۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم عصر رسالتمآب میں کتابی شکل میں موجود تھا ورنہ ''کھولا'' کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔

[2] ۴ نساء: ۴۱ [3] مستدرك الوسائل ۴: ۲۳۸۔العطار، موجز علوم القرآن ص ۴۶ [4] مسند احمد بن حنبل

ادھر رسول اللہ(ص) کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک درے میں رات گزارنے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ آپ(ص) نے حضرت عمار اور عباد بن بشر انصاری کو درے کی محافظت سونپی۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ آدھی رات عباد محافظت کریں گے اور باقی آدھی رات عمار۔ چنانچہ عمار آرام کرنے لگے اور عباد عبادت میں مشغول ہو گئے ۔ وہ کافر مسلمانوں کے تعاقب میں اس درے تک پہنچ گیا۔ اس نے عباد کو نماز کی حالت میں دیکھ کر ایک تیر ان کی طرف پھینکا جو ان کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ عباد نے تیر کو جسم سے نکالا اور نماز کو جاری رکھا ۔ اس کافر نے ایک اور تیر پھینکا، وہ بھی ان کے جسم میں پیوست ہو گیا ۔ انہوں نے اسے بھی جسم سے نکالا مگر نماز جاری رکھی۔ جب تیسری بار بھی تیر لگا تو عباد نے جلدی جلدی سے رکوع و سجود کو پورا کیا اور عمار کو بیدار کیا۔ ان کے بیدار ہوتے ہی کافر نے راہ فرار اختیار کی۔ عمار نے اپنے ساتھی کو خون میں لت پت دیکھ کر کہا کہ مجھے شروع میں ہی بیدار کر لیتے۔ عباد نے جواب دیا: میں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور اسے قطع کرنا میرے لیے ناگوار تھا، لیکن جب تیر پے درپے آنا شروع ہوئے تو میں نے نماز جلدی تمام کی اور آپ کو بیدار کیا۔ خدا کی قسم اگر حکم رسول(ص) کی خلاف ورزی کا خوف اور قوم کی پاسبانی میں کوتاہی کا ڈر نہ ہوتا تو چاہے میری جان چلی جاتی میں سورت کی تلاوت کو قطع نہ کرتا۔[1]

دقیق نظر: عمر بن عامر انصاری راوی ہے کہ حضرت عمر نے اس آیت کی یوں تلاوت کی:

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ...۔[2]

اس میں انہوں نے الانصار کی راء کو پیش دے دیا اور الذین سے پہلے واؤ کا ذکر نہ کیا تو حضرت زید بن ثابت نے تصحیح کی اور وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَان پڑھا تو حضرت عمر نے کہا: امیر المؤمنین بہتر جانتے ہیں اور کہا ابی بن کعب کو بلایا جائے۔ ابی بن کعب سے دریافت کیا تو انہوں نے واؤ کے ساتھ و الذین پڑھا، تو دونوں نے ایک دوسرے کی ناک کی طرف اشارہ کیا، تو اُبی نے کہا: خدا کی قسم رسول اللہ(ص) نے یہ آیت اس وقت مجھے پڑھائی

---

[1] حیات القلوب ۲:۳۸۹ و رامیار، تاریخ القرآن ص ۲۴۱ [2] ۹ توبہ: ۹۹

جب تو گندم بیچ رہا تھا۔[1]

عصر رسول(ص) کے مؤمنین جب رسول اللہ(ص) سے ایک آیت یا سورہ سنتے تو اسے بار بار پڑھتے، پھر رسول خدا (ص) کی خدمت میں حاضر ہو کر سناتے اور تصدیق کراتے۔ چنانچہ خارجہ بن زید نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ(ص) مدینہ تشریف لائے تو اس وقت تک میں نے سترہ سورتیں یاد کر لی تھیں۔ میں نے وہ رسول اللہ(ص) کی خدمت میں پڑھیں تو آپ نے تحسین فرمائی۔[2]

تدوین قرآن: کوئی کلام کسی متکلم کی طرف اس وقت منسوب ہو سکتا ہے جب کلمات اور ان کی ترکیب و تنظیم اس کی طرف سے ہو۔ اگر منتشر کلمات کسی طرف سے اور تنظیم و ترتیب کسی اور کی جانب سے ہو تو یہ کلام اس کا شمار ہوگا جس نے اسے ترتیب دیا ہوگا۔

اسی طرح قرآن مجید کے کلمات بھی اللہ کی جانب سے ہیں اور ان میں موجود ترتیب و تنظیم بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، بلکہ قرآن کے معجزۂ الٰہی ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ قرآن کے کلمات اور اس کی ترتیب و اسلوب میں وہ ہم آہنگی ہے جو کسی بشر سے صادر ہونا ممکن نہیں۔

لیکن کس قدر مقام افسوس ہے کہ اس کے باوجود غیر شیعہ علماء فرماتے ہیں:

عبد اللہ بن مسعود نے کہا: سورہ قارعہ میں العھن کی جگہ الصّوف پڑھ سکتے ہیں۔[3]

اسی طرح وہ حضرت ابو بکر کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

جاء سکرۃ الموت بالحق کی جگہ جاء سکرۃ الحق بالموت پڑھ سکتے ہیں۔[4]

یا

طعام الاثیم کی جگہ طعام الفاجر پڑھا جا سکتا ہے۔[5]

یہاں تک کہ مؤلف کتاب المصنف نے جلد ۱۱ کے ص ۲۱۹ پر یہ تک کہدیا کہ بغرض وضاحت کلمات قرآن تبدیل کرنا جائز ہے۔

ترتیب آیات: قرآن کے جمع و ترتیب کے چند مراحل ہیں۔ چونکہ قرآن سورہ سورہ نازل نہیں ہوا بلکہ آیہ آیہ نازل ہوا ہے، لہٰذا جمع و ترتیب میں پہلے آیات کی ترتیب پر تحقیق کی جانی چاہیے بعد ازاں سورتوں کی ترتیب پر۔

اس بات پر نہایت قابل توجہ دلائل موجود ہیں کہ ترتیب آیات توقیفی ہے یعنی بحکم خدا خود رسول

---

[1] زنجانی۔ تاریخ القرآن ص ۴۳ [2] حوالہ سابق ص ۴۵ [3] ابن قتیبہ۔ تاویل مشکلات القرآن ص ۱۹
[4] تفسیر الطبری ۲۶: ۱۶۰ [5] تفسیر الطبری ۲۶: ۱۰۰

اکرم (ص) کی طرف سے آیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور یہی ترتیب بہ تواتر ہم تک پہنچی ہے:

ا۔ حضور (ص) کاتبانِ وحی کو صرف آیات کی کتابت کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ ساتھ ہی ترتیب بھی بتا دیتے تھے کہ کس آیت کو کس جگہ لکھنا ہے۔

ابن عباس راوی ہیں:

کان جبرئیل اذا نزل علی النبی بالوحی یقول له ضع هذه الآیة فی سورة کذا فی موضع کذا۔[1]

جب جبرئیل وحی لے کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھیے۔

ابن عباس ہی سے روایت ہے:

فکان اذا نزل علیه الشیء دعا من کان یکتب فیقول:ضعوا هذه الآیات فی السورة التی فیها کذا و کذا۔[2]

جب حضورؐ پر وحی نازل ہو جاتی تو کاتب کو بلا کر فرماتے: ان آیات کو اس سورے میں رکھا جائے جس میں فلاں فلاں (چیز کا) ذکر ہے۔

ابن عباس اور سدی کے نزدیک سب سے آخری آیت وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡهِ اِلَی اللّٰهِ ....[3] ہے مگر جبرئیلؑ یہ حکم لائے کہ اسے سورۂ بقرہ کی دوسو اسّی ویں آیت کے بعد لکھا جائے۔[4]

احمد بن حنبل اپنی مسند میں ایک صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں:

> میں رسول خدا (ص) کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ حضور (ص) نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی، پھر نگاہ سیدھی کر کے فرمایا: ابھی میرے پاس جبرائیل نازل ہوئے اور یہ حکم سنایا کہ میں آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی .[5] کو اس سورے کے فلاں مقام پر رکھوں۔ چنانچہ آپ نے اس آیت کو سورۂ نحل میں آیۂ شہادت اور آیۂ عہد کے درمیان ثبت کر دیا۔[6]

۲۔ اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آیہ کی تعیین وتحدید کہ فلاں جملہ ایک مکمل آیہ ہے یا نہیں، توقیفی ہے۔ یعنی رسول کریم (ص) کے ارشاد پر موقوف ہے کہ فلاں عبارت ایک مکمل آیت ہے یا نہیں۔ کسی اجتہاد اور رائے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

چنانچہ الٓمّٓ، حٰمٓ، الٓمّٓصٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ اور طٰسٓمّٓ حروف مقطعات ہیں اور یہ سب مستقل آیت شمار ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مستقل آیہ ہونے پر رسول کریم (ص) کی صراحت موجود ہے۔ جب کہ اسی

۱و۲ تاریخ یعقوبی ۲: ۳۶ ۳ ۲ بقرہ: ۲۸۱ ۴ طبرسی مجمع البیان ۱: ۳۹۴ ۵و۱۶ نحل: ۹۰

۶ مسند احمد بن حنبل ۴: ۲۱۸۔ اسی مضمون سے قریب تر دیگر احادیث مسند احمد جلد اول ص ۵۷۔ ۶۹۔ سنن ابوداؤد ۱: ۲۰۹، مستدرك حاکم ج ۲ ص ۲۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں

قسم کے دوسرے حروف مقطعات مثلاً الٓرٰ ، طٰسٓ ، صٓ ، قٓ اور نٓ وغیرہ مستقل آیات نہیں ہیں۔ یہ نص وصراحت رسول (ص) ہے جس کی وجہ سے حٰمٓ ایک مستقل آیت ہے اور الٓرٰ اور طٰسٓ مستقل آیات نہیں ہیں۔مزید برآں طٰسٓمٓ اور کٓھٰیٰعٓصٓ صرف ایک ایک آیت شمار ہوتی ہے، جب کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ دو آیات شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بھی حروف مقطعات ہی ہیں۔

۳۔ اس بات پر بھی تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ نماز میں جس سورے کی بھی تلاوت ہو اسے موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ اگر یہ ترتیب ملحوظ نہ رکھی جائے تو نماز باطل ہے۔

اگر ترتیب توقیفی نہ ہوتی تو پھر اصولاً یہ مسئلہ اجتہاد پر مبنی ہوتا۔

۴۔ قرآنی سورتوں میں آیات کی تعداد کے بارے میں بھی رسول کریم (ص) کی طرف سے بعض صراحتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ مثلا سورۂ فاتحہ کے بارے میں کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے۔ پس عدد آیات توقیفی ہونے کی صورت میں ترتیب کا توقیفی ہونا بھی قرین عقل ہے۔

ترتیب آیات و ترتیب نزول: یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ قرآن میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں وہ ترتیب نزولی کے مطابق نہیں ہے کیونکہ:

> ترتیب نزولی، وقت نزول کے تقاضوں کے مطابق ہے اور ترتیب قرآن، نظام قرآن کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

اس کی وضاحت کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ شروع میں شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کے لیے ایک سال کی عدت واجب تھی اور پورا سال شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہ تھا نیز عورت کو شوہر سے میراث میں صرف ایک سال کا خرچہ ہی ملتا تھا۔ اس کا حکم اس طرح نازل ہوا تھا:

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَـوۡلِ غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ[1]

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں (نان ونفقہ سے) بہرہ مند رکھا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

مذکورہ بالا آیت کا حکم اسی سورہ کی اس سے پیشتر آنے والی ایک آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا جس میں ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ[2]

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۴۰ [2] ۲ بقرۃ: ۲۳۴

ترتیب نزولی کے مطابق منسوخ پہلے اور ناسخ بعد میں نازل ہوئی ہے، جب کہ موجودہ ترتیب میں ناسخ کا پہلے اور منسوخ کا بعد میں ذکر ہے۔

۲۔ ابن عباس، سدی، جبائی اور بلخی کے مطابق آیہ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [1] کے بعد کوئی فرض حکم نازل نہیں ہوا۔ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ سدی کے الفاظ یہ ہیں:

لم ینزل بعدها حلال و لا حرام [2] اس آیت کے بعد حلال وحرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا.

حالانکہ یہ آیت اب سورہ مائدہ میں درج ہے اور اس کے بعد بے شمار آیات احکام موجود ہیں .

۳۔ آیہ: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ... [3] صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کے لیے حج کرنا ممکن ہوا، جب کہ یہ آیت سورہ بقرہ میں درج ہے جو کہ مدینے میں نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ ہے۔

۴۔ آیہ: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ .... [4] بقولے سب سے آخر میں اتری ہے اور اگر سب سے آخر میں نہیں تو اواخر میں یقیناً ہے، جب کہ اب یہ سورہ بقرہ کی ۲۸۱ ویں آیت ہے۔

ترتیب سورہ ہائے قرآن : گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کی آیات کی ترتیب عہد رسالت (ص) میں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور یہ بات بھی عیاں ہوگئی ہے کہ سورتوں کے نام اور ان کی آیات کی تعداد بھی اسی عہد بابرکت میں طے پا چکی تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

و انما كان يعرف انقضاء السورة بنزول بسم اللّٰه الرحمن الرحيم ابتداء لاخرى [5]

کسی سورت کے ختم ہونے کا اس وقت پتہ چلتا تھا جب کسی اور سورت کی ابتدا کے لیے بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم نازل ہو جاتی تھی۔

لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا سورہ ہائے قرآن کی ترتیب توقیفی ہے؟ یعنی خود رسول اللہ (ص) نے بحکم خدا سورتوں کو ترتیب دیا ہے یا عصر رسالت (ص) کے بعد اصحاب نے اپنے اجتہاد سے انہیں مرتب کیا ہے؟

ایک نظریہ تو یہ ہے کہ چونکہ عصر رسالت (ص) میں ہنوز سلسلۂ وحی جاری تھا، اس لیے قرآن کو ایک

---

[1] ۵ مائدہ : ۳۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا.

[2] سیوطی ۔ الدرمنثور ۲ : ۲۵۹

[3] ۲ بقرۃ : ۱۵۸۔ صفا و مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔

[4] ۲ بقرۃ : ۲۸۱

[5] مستدرك الوسائل ۴ : ۱۶۵

مصحف کی شکل دینا قبل از وقت تھا۔ اس کام کو بعد از رسالت انجام پانا تھا۔ چنانچہ بعد میں اپنے اپنے سلیقے کے مطابق لوگوں نے سورہ ہائے قرآن کو مرتب کیا۔

اس پر مزید دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اصحاب کے پاس متعدد قرآن موجود تھے۔ ہر مصحف کی ترتیب دوسرے مصحف سے مختلف تھی اور کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا مصحف ترتیب نزول کے مطابق تھا، جب کہ دیگر اصحاب کے مصاحف اس سے مختلف تھے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب و تدوین خود عہد رسالتمآب (ص) میں مکمل ہوگئی تھی۔ جس طرح آیات کی ترتیب آپ (ص) نے خود اپنی نگرانی میں مقرر فرمائی تھی، اسی طرح سورتوں کی ترتیب کو بھی آپ (ص) نے ہی مقرر فرمایا تھا۔ سید مرتضیٰ علم الهدیٰ متوفی ۴۳۶ ھ فرماتے ہیں:

موجودہ شکل میں قرآن کی جمع آوری عصر رسالت (ص) میں ہی ہوگئی تھی۔

لیکن یہ موقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ترتیب سورہ ہائے قرآن توقیفی نہیں ہے۔ کیونکہ سورہ ہائے قرآن کی ترتیب اور کسی سورے کے مقدم اور مؤخر ہونے میں نظم قرآن کے ساتھ ربط نہیں ہے۔ اس لیے نماز میں آیات کو موجودہ ترتیب کے ساتھ تلاوت کرنا ضروری ہے، جبکہ سورہ ہائے قرآن کو موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی مؤخر سورہ نماز میں مقدم اور مقدم سورہ مؤخر کر کے بھی دوسری رکعت میں پڑھنا درست ہے۔

جمع قرآن در عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کہا جاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مدون نہیں تھا، البتہ بعد از رسول (ص) عصر ابی بکر میں زید بن ثابت کی سربراہی یں صرف دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر جمع ہوا۔

اس نظریے پر ہم بعد میں تحقیقی نظر ڈالیں گے۔ پہلے ہم اس بات کی تحقیق کریں گے کہ کیا عصر رسالت (ص) میں قران کتابی شکل میں مدون تھا؟

اس بات پر بے شمار دلائل موجود ہیں کہ قرآن مجید عصر رسول (ص) میں ہی کتابی شکل میں مدون تھا۔ ہم ان میں سے چند ایک دلائل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ فریضۂ الٰہی: جس طرح خود رسول کریم (ص) کو لوگوں کے گزند سے بچانے کا کام خداوند عالم نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا:

وَ اللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ...[1] اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

بالکل اسی طرح قرآن کو جمع اور محفوظ کرنا اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا:

---

[1] ۵ مائدہ: ۶۷

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ [1]

(اے رسول) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

نیز یہ ارشاد الٰہی بھی ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝ [2]

(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

۲۔ کاتبان وحی: قرآن مجید ایک متوسط حجم کی کتاب ہے جو ۲۳ سالوں میں رسول خدا پر نازل ہوئی۔ بظاہر ایک دو کاتب اس کی کتاب کے لیے کافی تھے مگر بعض مورخین کے ہاں اس کے کاتبوں کی تعداد چالیس تک بیان کی گئی ہے۔

رسول کریم (ص) وحی کو اہتمام کے ساتھ بالالتزام لکھوایا کرتے تھے۔ جو کچھ لکھا جاتا تھا کیا اسے ہر کاتب وحی اپنے ساتھ لے جاتا تھا؟ اور کیا قرآن متعدد کاتبان وحی کے پاس منتشر اور متفرق صورت میں موجود تھا؟ اور کیا رسول اللہ (ص) کے پاس قرآن مدون شکل میں موجود نہ تھا؟ یہ باتیں نہایت بعید از عقل و قیاس ہیں۔

کاتبان وحی سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ (ص) کے لیے کتابت کیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر اپنے لیے کتابت قرآن کرنے والوں کو کاتبان وحی کا منصب نہیں دیا جاتا۔

زید بن ثابت کہتے ہیں:

کنا حول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم نؤلف القرآن من الرقاع. [3]

ہم رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن کی جمع و تدوین کیا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ قرآن خانہ رسول (ص) میں موجود تھا اور آپ (ص) نے اپنی وفات کے قریب حضرت علی (ع) کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یا علی القران خلف فراشی فی الصحف و الحریر و القراطیس فخذوہ و اجمعوہ و لا تضیعوہ۔ [4]

اے علی (ع) قرآن میرے بستر کے عقب میں مختلف صحیفوں پر ابریشم اور کاغذوں کی صورت میں موجود ہے۔ پس اسے لے لو اور جمع کر لو اور اسے ضائع نہ ہونے دو۔

ابو عبد اللہ محاسبی کہتے ہیں:

خانہ رسالتمآب (ص) میں کچھ اوراق پائے گئے جن پر قرآن مجید تحریر تھا کسی نے

---

[1] ۷۵ قیامت: ۱۶۔۱۷ [2] ۸۷ اعلیٰ: ۶ [3] حاکم مستدرک ۲: ۳۴۹
[4] بحار الانوار: کتاب القرآن ۸۹: ۴۸۔ تفسیر قمی ۲: ۴۵۱

انہیں جمع کیا اور ایک دھاگے میں سب اوراق کو پرو دیا تا کہ کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔[1]

۳۔قرآن سے کتابت قرآن کا ثبوت: مشرکین مکہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ رسول اکرم(ص) کاتبوں سے قرآن لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

وَ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۝[2]

اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھ رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

دیگر قرآنی آیات سے بھی اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ آغاز نزول قرآن سے ہی قرآن ضبط تحریر میں آنے لگا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والے سورۂ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۝[3]

اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

اور سورۂ عبس میں فرمایا گیا:

كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۝[4]

ہرگز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحت ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں ہیں جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔

اور سورۂ طور میں ارشاد الٰہی ہے:

وَالطُّوْرِ۝ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ۝ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ۝[5]

قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی، ایک کشادہ ورق میں۔

قرآن کی کتابت اور تدوین آغاز وحی کے ساتھ ہی مکہ میں ہی شروع ہو جانے پر خود قرآنی شواہد کے علاوہ بے شمار تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور(ص) کسی ایک کاتب کو بلا کر لکھنے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ املا فرمانے کے بعد کاتب سے فرماتے: ''جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنا دے''۔ کاتب سنا دیتا۔ اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو حضور(ص) اصلاح فرما دیتے۔[7]

حضرت عمر نے اپنی بہن کے گھر میں دو صحیفے پائے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ ان صحیفوں کو کسی سے پڑھوایا اور انہیں سن کر اسلام قبول کیا۔

---

[1] البرھان ۱: ۲۳۸۔ ان راویوں کا شیوہ امانت فی النقل کے خلاف ہے کہ اس ہستی (علی علیہ السلام) کا نام لینا گوارا نہیں کرتے جس نے قرآن کو ضائع ہونے سے بچایا ہے

[2] ۲۵ فرقان: ۵ [3] ۹۸ بینہ: ۲ [4] ۸۰ عبس: ۱۱ تا ۱۴ [5] ۵۲ طور: ۱ تا ۳ [7] مجمع الزوائد

۴۔ **شیوۂ رسول:** رسول کریم (ص) اپنے ہمراہ ایسے کاتبین رکھتے تھے جو معاہدوں اور قرض وغیرہ کو ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کاتبوں کو حکم دیا گیا کہ صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کرنے والوں کے اسماء کا اندراج کر کے ایک فہرست مرتب کی جائے تو حضرت معاذ نے ایک ہزار پانچ سو افراد کے نام درج کیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور (ص) قرآن مجید سے کم اہمیت والی چیزوں تک کو ضبط تحریر میں لانے اور محفوظ کرنے کا اہتمام فرماتے تھے تو کیا آپ (ص) نے اس ابدی معجزے کی تدوین و کتابت کا انتظام نہیں فرمایا ہو گا۔

۵۔ **عصر رسول کے جامعین قرآن:** رسول کریم (ص) اور اصحاب کرام کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ قرآن مجید عصر رسالت مآب (ص) میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ ہم ذیل میں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ **حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام:** آپ (ع) نے عہد رسالت میں قرآن اپنے سینے میں حفظ کر لیا تھا اور جمع بھی کیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

۲۔ **اُبی بن کعب بن قیس:** آپ کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج سے تھا۔ یہ کاتب و حافظ قرآن تھے۔ ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابو المنذر تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اما نحن فنقرأ علی قراءۃ اُبی۔[1] ہم ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں۔

صحیح بخاری اور الفہرست لابن ندیم میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۳۔ **معاذ بن جبل بن اوس:** یہ بھی انصار میں سے تھے اور حضور (ص) نے انہیں یمن میں تعلیم قرآن کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ صحیح بخاری اور فہرست میں انہیں بھی عصرِ رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۴۔ **زید بن ثابت:** ان کا ہم آئندہ بھی ذکر کریں گے۔ یہ کاتب رسول (ص) تھے اور ان کا یہ قول مشہور ہے:

کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع.[2] ہم حضور (ص) کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

دوسرے مصادر کے علاوہ صحیح بخاری اور الفہرست، الاتقان اور مناھل العرفان میں انہیں عصر

---

[1] اصول الکافی ۲: ۶۳۴ وسائل الشیعہ ۶: ۱۶۳۔ فَنَقْرَؤُہٗ کے ساتھ [2] سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۵

رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۵۔ عبد اللہ بن عمر: نسائی نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر سے روایت درج کی ہے کہ انہوں نے کہا:

جمعت القرآن فقرأت به کل لیلة ، فبلغ النبی صلی الله علیه و آله وسلم فقال : اقرأه فی شهر۔[۱]	میں نے قرآن جمع کیا اور ہر رات کو ختم کیا کرتا تھا۔ رسول اللہ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ایک ماہ میں ختم کیا کرو۔

٦۔ ابو ایوب انصاری: سیوطی نے الاتقان میں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ ابو الدرداء: صحیح بخاری اور الفهرست میں انہیں بھی عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۸۔ عبادہ بن صامت: سیوطی نے الاتقان میں انہیں عصر رسالت کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

۹۔ ابو زید ثابت بن زید بن النعمان: صحیح بخاری اور الفهرست میں عہد رسول (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

۱۰۔ سعد بن عبید انصاری: انہیں الفهرست میں جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۱۱۔ عبید بن معاذ یا عتید بن معاذ جزری: الفہرست میں عصر رسالت (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

۱۲۔ مجمع بن جاریہ یا حارثہ: الاتقان اور تاریخ القرآن زنجانی میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۱۳۔ ام ورقہ بنت عبد اللہ بن حارث: رسول اللہ (ص) اس خاتون کو شہیدہ کہکر پکارتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں اس خاتون کو ان کے اپنے غلام اور کنیز نے شہید کر دیا۔ سیوطی نے الاتقان میں انہیں جامعین قرآن میں شمار کیا ہے.

۱۴۔ سالم مولی ابی حذیفہ: زرکشی نے البرہان میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

۱۵۔ عبد اللہ بن مسعود: آپ قرآن کے جلیل القدر معلم ہیں۔ عصر رسول (ص) میں ہی آپ نے قرآن جمع کیا تھا۔[۲]

۱۔ حوالہ سابق ۱: ۱۴۴۔ مناهل العرفان ۱: ۲۳۷ ۲۔ البرهان ۱: ۲۳۹

۱۶۔عقبہ بن عامر :آپ کو البرہان میں عصر رسول(ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے.

۶۔ جبرائیل کا دورۂ قرآن: امامیہ، غیر امامیہ روایات سے ثابت ہے کہ رسالتمآب (ص) ہر سال جبرئیل کے ساتھ قرآن کی بازخوانی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

سمعنا رسول اللّٰہ یقول: جبرئیل کان یعارضنی بالقرآن فی کل سنة مرة و انه عارضنی به العام مرتین و لا اراه الا و قد حضر اجلی۔[۱]

ہم نے رسول اللہ(ص) کو فرماتے سنا کہ جبرئیل ہر سال ایک بار میرے ساتھ قرآن کا دورہ کیا کرتے تھے لیکن اس سال دو مرتبہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ میرا وقت وصال قریب ہے۔

صحیح بخاری کے باب فضائل القرآن میں دورۂ قرآن کے بارے میں جناب سیدہ فاطمہ زہراء (س) کی یہی روایت اس طرح منقول ہے:

قال مسروق : عن عائشة عن فاطمة علیها السلام [۲]: اسرّ الیّ النبی صلی الله علیه (و آله) و سلم ان جبرئیل یعارضنی بالقرآن کل سنة و انه عارضنی العام مرتین الا حضر اجلی ۔[۳]

مسروق کہتے ہیں: حضرت عائشہ نے جناب فاطمہ(س) سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ (ص) نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا کہ جبرئیل ہر سال مجھ سے قرآن کا دورہ (باز خوانی) کرتے ہیں مگر اس سال انہوں نے مجھ سے دو بار دورہ کیا ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت روانگی قریب ہے۔

۷۔ اصحاب کا عرضۂ قرآن: اصحاب رسول(ص) میں سے جو حضرات قراء ت قرآن میں ممتاز مقام رکھتے تھے وہ آپ(ص) کی خدمت میں قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے تھے اور بازخوانی ہوتی تھی۔ آخری بازخوانی عرضۂ اخیر یا دورہ اخیر کے نام سے مشہور ہے۔

راغب، اُبی بن کعب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ لوگوں نے ان کی قراء ت کو اس لیے قبول کیا کہ وہ آخری فرد تھے جنہوں نے رسول اللہ(ص) کی خدمت میں قرآن کی بازخوانی کی۔

ابن عباس کہتے ہیں:

> میں رسول خدا (ص) کے آخری کلام اور عمل کو معیار قرار دے کر اسے اختیار کرتا ہوں۔

---

[۱] بحار الانوار ۴۳ : ۵۱ ۔ ارشاد القلوب ۱ : ۳۳ ۔ الامالی للصدوق ص ۵۹۵ ۔ کنز العمال ج ۱۲ حدیث ۳۴۲۱۴

[۲] واضح رہے کہ صحیح بخاری میں اٹھائیس (۲۸) مقامات پر جناب سیدہ کے اسم مبارک کے ساتھ ''علیہا السلام '' درج ہے ۔ اسی طرح صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر ائمہ اھل بیت کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی ''علیہ السلام '' درج ہے ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ صرف شیعہ ایسا کرتے ہیں، جہالت پر مبنی ہے

[۳] صحیح بخاری ۴ : ۱۹۱۱ ۔ باب کان جبرائیل یعرض القرآن ۔

ابن مسعود کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ بھی عرضۂ اخیر میں موجود تھے۔
عرضۂ اخیر کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول کریم (ص) نے قرآن کو آخری شکل دے کر اسے امت کے حوالے کیا ہے۔

۸۔ختم قرآن: اصحاب رسول(ص) میں ایسے افراد کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے جنہوں نے حضور (ص) کی خدمت میں قرآن ختم کیا۔ وہ خود انفرادی طور پر پورا قرآن ختم کیا کرتے تھے، جس کے لیے حضور (ص) نے مدت کا بھی تعین فرمایا کہ کتنی مدت میں قرآن کا ختم کرنا مناسب ہے ۔جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ حضور (ص) نے عبداللہ بن عمر سے فرمایا کہ ایک ماہ میں قرآن ختم کیا کرو۔

اس کے علاوہ عصر رسول (ص) کے مؤمنین اجتماعی طور پر بھی ختم قرآن کیا کرتے تھے۔یعنی قرآن کی سورتوں کو آپس میں تقسیم کرتے اور ہر فرد چندسورے پڑھ لیتااور یوں ختم قرآن ہو جاتا۔[۱]

رسول اللہ(ص) کے حکم پر اصحاب، قرآن کو دس روز یا چھ روز یا کم سے کم پانچ روز میں بھی ختم کیا کرتے تھے۔[۲]

اگر قرآن کتابی شکل میں ایک مجموعے کے طور پر لوگوں کے پاس نہ ہوتا تو صرف تلاوت کا ذکر ہو سکتا تھا، ختم قرآن کے الفاظ بے معنی ہوتے۔

رسول اکرم(ص) نے فرمایا:

احب الاعمال الی اللہ الحال المرتحل ۔[۳] اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل الحال المرتحل ہے۔

روایت ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی ایک بار پوچھا گیا کہ بہترین عمل کیا ہے ؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: الحال المرتحل ۔ اس کی تشریح پوچھی گئی تو فرمایا:

فتح القرآن و ختمہ کلما جاء باولہ ارتحل فی آخرہ۔[۴] قرآن کا کھولنا اورختم کرنا۔ جب بھی قرآن کی ابتدا پر آیا، آخر کی طرف روانہ ہوا۔

شیخ طوسیؒ درج ذیل امور کو عدم تحریف قرآن کی دلیل سمجھتے تھے:

۱۔ختم قرآن مجید کا ثواب۔
۲۔قرآن کوایک رات میں ختم کرنے کی ممانعت۔
۳۔قرآن کوکم از کم تین روز میں ختم کرنے کی ہدایت ۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں :

اصحاب کی ایک جماعت مثلاً عبد اللہ بن مسعود، اُبی بن کعب اور دیگر افراد نے

۱۔رامیار : تاریخ القرآن ۲۔حوالہ سابق ۔بحوالہ ابن سعد ۳۔المحجة البیضاء ۲ :۲۶۴ ۴۔اصول الکافی ۲ : ۶۰۵

رسول اللہ(ص) کی خدمت میں کئی بار قرآن ختم کیا تھا۔[1]

اس قسم کی متعدد دیگر روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول (ص) سے ہی کتابی شکل میں مدون تھا، جس کا ایک معین آغاز اور اختتام بھی تھا اور اس کے ختم کرنے کے آداب بھی بیان کیے گئے تھے۔

۹۔ فاتحۃ الکتاب:

- فاتحۃ الکتاب کے معنی ہیں دیباچۂ کتاب یا افتتاحیۂ کتاب۔
- یہ نام عصر رسول(ص) میں ہی اس سورے کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔
- قرآنی سورتوں کے نام خود رسول اللہ(ص) ہی معین فرمایا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عہد رسالت(ص) میں ہی ایک کتابی شکل میں مرتب تھا جس کا ایک افتتاحیہ بھی تھا۔

۱۰۔ لفظ الکتاب کا اطلاق: عہد رسالت(ص) میں قرآن الکتاب کے نام سے موسوم تھااور خود قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر اسے الکتاب کہا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حدیث شریف میں بھی مجموعۂ قرآن کوالکتاب فرمایا گیا ہے۔

حدیث ثقلین میں، جو شیعہ اور سنی دونوں طرق سے متواتر ثابت ہے، حضور (ص) نے فرمایا:

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی۔

میں تم میں دوگراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت۔

یہاں کتاب سے مراد یہی مجموعہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

نیز حضور (ص) نے اپنی وفات سے کچھ دیر قبل حضرت علی علیہ السلام سے جو کچھ بیان فرمایا اس کے بارے میں ابو رافع بیان کرتے ہیں:

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم قال فی مرضه الذی توفی فیه لعلی : یا علی! ھذا کتاب اللّٰہ خذہ الیك۔[2]

رسول اللہ(ص) نے جس مرض میں آپ (ص) کا انتقال ہوا، اس میں علی(ع) سے ارشاد فرمایا: یا علی! یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔

یہاں بھی اس مجموعہ قرآن کو ''کتاب'' کہا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہے کہ قرآن عہد رسالت (ص) میں کتابی شکل میں مرتب ہو چکا تھا۔

۱۱۔ قرآن کا دفعۃً نزول: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ(ع) نے

---

[1] طبرسی مجمع البیان ۱: ۱۵
[2] التمہید ۱: ۲۲۷ و بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵

فرمایا:

اے مفضل! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ(ص) کو قرآن ماہ رمضان میں عنایت فرمایا تھا مگر اس کی تبلیغ وقت کی مناسبت پر موقوف تھی۔ رسول کریم(ص) امر و نہی کے مواقع پر قرآن کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ جبرئیل صرف اسی مقصد کے لیے نازل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ [1] یعنی قرآن کو جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے۔[2]

ابن عباس بیان کرتے ہیں:

انہ انزل فی رمضان لیلة القدر جملة واحدة ثم انزل علی مواقع النجوم رسلا فی الشھور و الایام.[3]	قرآن ماہ رمضان میں دفعتاً نازل ہوا ہے اور اس کے بعد مختلف مواقع پر مہینوں اور دنوں میں بتدریج بھی نازل کیا گیا۔

ان احادیث سے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصرِ رسول اکرم(ص) میں ایک مجموعہ کی شکل میں موجود تھا۔

۱۲۔ تواتر قرآن: اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ یہ قرآن رسول کریم (ص) سے تواتراً نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچا ہے۔ تواتر کے لیے ضروری ہے کہ عصر رسول(ص) میں پورا قرآن اصحاب میں سے اتنی تعداد کے پاس موجود ہو جتنی کہ تواتر کے لیے ضروری ہے۔

اس سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصر رسالتمآب(ص) میں جمع ہو چکا تھا۔

۱۳۔ وصیت رسول(ص) اَلْقُرْآنُ خَلْفَ فِرَاشِي: رسول کریم (ص) نے حضرت علی علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ قرآن میرے بستر کے عقب میں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں مروی ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی المصحف والحریر و القراطیس فخذوه واجمعوه و لا تضیعوه[4]	رسول اللہ (ص) نے حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا: اے علی! قرآن میرے بستر کے پیچھے مختلف صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں پر موجود ہے آپ اسے لے جائیں اور جمع کریں اور ضائع نہ ہونے دیں۔

۱۴۔ اصناف سورہ ہائے قرآن: تفسیر عیاشی میں سعد الاسکاف سے مروی ہے:

سمعت ابا جعفر علیه السلام	میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا کہ

---

[1] ۷۵ قیامۃ: ۱۶ [2] بحار الانوار ۸۹: ۴۸ [3] سیوطی اتقان ۱: ۸۳ [4] بحار الانوار ۸۹: ۴۸

یقول: قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم : اعطیت الطوال مکان التوراة و اعطیت المئین مکان الانجیل، و اعطیت المثانی مکان الزبور، وفضلت بالمفصل سبع و ستین سورة ۔ [۲]	رسول اللہ (ص) نے فرمایا: مجھے توریت کی جگہ طوال ، انجیل کی جگہ مئین سورتیں اور زبور کی جگہ مثانی عنایت کی گئی ہیں اور مزید مجھے سورہ ہائے مفصل [۱] جو کہ ستاسٹھ سورتیں ہیں، عطا کر کے فضیلت دی گئی۔

یہی روایت معمولی فرق کے ساتھ اہل سنت کے ہاں بھی منقول ہے ۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ عصر رسول (ص) میں قرآن ایک کتابی شکل میں لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھا جس کے ابواب وفصول یعنی سورتوں کی تفصیل بھی لوگوں کو معلوم تھی۔

۱۵۔ ترتیب آیات کا توقیفی ہونا: یہ بات ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہے۔ یعنی خود رسول اکرم (ص) نے بحکم الٰہی آیات قرآن کو اسی موجودہ ترتیب کے مطابق رکھا ہے اور اسی ترتیب سے آیات کو مرتب کرنے کا نام جمع قرآن ہے اور یہی ترتیب تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔

انصاف یہ ہے کہ صرف آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول (ص) ہی میں مدوّن ہو چکا تھا۔ کیونکہ آیات قرآن کو ترتیب دینا ہی جمع و تدوین قرآن ہے نیز اس کا کوئی مدعی نہیں ہوسکتا کہ آیات قرآن کی ترتیب اجتہادی ہے، موجودہ ترتیب کے علاوہ کسی اور ترتیب سے قرآن کی تلاوت ہوسکتی ہے اور نظم آیات کی موجودہ حیثیت ضروری نہیں ہے ۔

۱۶۔ عصر رسالت میں قرآنی نسخے: فضائل قرآن، تلاوت قرآن، آداب تلاوت قرآن، احکام مصحف اور دیگر قرآنی موضوعات کے بارے میں وارد شدہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عصر رسالت میں کتابی شکل میں مدون اور ہر شخص کی دسترس میں تھا۔

الف۔ حضور (ص) نے فرمایا:

تعلموا الکتاب و تعاهدوه و اقتنوه۔ [۳]	کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کرو، اس کے ساتھ عہد باندھو اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھو۔

ب۔ حفظ کرنے کی نسبت قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرنے میں زیادہ ثواب ہے ۔ اس سلسلے میں امامیہ، غیر امامیہ کی کتب میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔

---

[۱] طوال پہلی سات طویل سورتوں کو کہتے ہیں۔ مئین سو یا زائد آیات والی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔ مثانی وہ سورتیں ہیں جو سو سے کم آیات والی ہوں۔ جب کہ مفصل آخر قرآن کی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔

[۲] تفسیر عیاشی ۱ : ۲۵

[۳] اعلام الدین ص ۱۰۰ ۔ اس میں اقتنوا کی جگہ افشو ہے۔

ج۔ خود قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

النظر فی المصحف عبادة[1] مصحف میں دیکھنا عبادت ہے۔

د۔ رسالتمآب (ص) نے مشرکین کے علاقوں میں قرآن مجید ہمراہ لے جانے سے منع فرمایا۔

ان کے علاوہ بیسیوں ایسی احادیث اور احکام موجود ہیں جو عصر رسالت (ص) میں قرآن کے کتابی شکل میں موجود ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

جمع قرآن بعد از رسول (ص): رسالتمآب (ص) کی رحلت کے بعد عصر ابی بکر میں جو جمع قرآن مشہور ہے، اس کے بارے میں ہم ارباب نظر اور صاحبان تحقیق کی خدمت میں چند حقائق پیش کرتے ہیں۔ صرف یقینی دلائل نے ہمیں ان حقائق کو پیش کرنے پر مجبور کیا ہے۔ امید ہے کہ تحقیقی ذوق اور مایۂ علمی رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے اور مذہبی تنگ نظری کی بنیاد پر ان حقائق کو مسترد نہیں کریں گے۔

سب سے پہلے ہم وہ مشہور قصہ بیان کرتے ہیں جس کا تذکرہ اسی سلسلے میں کیا جاتا ہے:

کہا جاتا ہے کہ جنگ یمامہ میں متعدد قاریان قرآن کی شہادت کے بعد حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا: اے ابوبکر! اس جنگ میں بہت سے قاریان قرآن شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دیگر جنگوں میں بھی یہی ہوتا رہا تو قرآن کا ایک معتدبہ حصہ ضائع ہو جائے گا۔[2]

چنانچہ حضرت عمر نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار تاکید کی کہ ہمیں قرآن کو جمع کرنا چاہیے۔

خود حضرت ابوبکر کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی ۔[3] حضرت عمر بار بار مجھ سے کہتے رہے۔

حضرت عمر کے اصرار پر حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت انصاری کو بلایا اور ان سے کہا:

انك رجل شابٌ عاقل لا نتهمك قد کنت تکتب الوحی لرسول اللّٰہ فتتبع القرآن فاجمعه ۔[4] تم عقلمند اور قابل بھروسہ جوان ہو اور تم رسول اللہ (ص) کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔ جاؤ قرآن کی جستجو کرو اور اسے جمع کرو۔

زید نے ایک سوال اٹھایا اور حضرت ابوبکر سے کہا:

کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول اللّٰہ۔[5] آپ وہ کام کیسے کریں گے جسے رسول اللہ (ص) نے انجام نہیں دیا ہے۔[6]

آخرکار زید نے اس امر کی سنگینی کے اظہار کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ ایک

---

[1] مستدرک الوسائل ۹: ۱۵۳ [2] تا [5] بحار الانوار ۸۹: ۷۵

[6] مستشرقین مثلاً نولڈکے (Noldeke) وغیرہ اسی لیے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ص) کے زمانے میں قرآن جمع نہیں ہوا تھا اور آپ قوم کو کوئی شے کتابی شکل میں نہیں دے کر گئے تھے۔ کیونکہ اگر قرآن رسول (ص) کے زمانے میں جمع شدہ اور کتابی شکل میں ہوتا تو ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پچیس رکنی کمیٹی تشکیل دی اور اعلان کیا کہ جس نے بھی رسول اللہ(ص) سے قرآن کا کچھ حصہ اخذ کیا ہو وہ ہمارے پاس جمع کرائے اور جب تک اس کے قرآن ہونے پر دو گواہ پیش نہ ہوتے ،وہ اسے قرآن کے طور پر قبول نہ کرتے سوائے حزیمہ بن ثابت انصاری کے کہ ان کی پیش کردہ آیتوں کو بلا گواہ قبول کرتے تھے کیونکہ رسول اللہ(ص) نے ان کی ایک گواہی کو دو گواہوں کا مرتبہ دیا تھا۔

اسی اثنا میں حضرت عمر یہ عبارت لے کر آئے:

الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموها البتة نکالاً من اللہ

زید نے حضرت عمر کی پیش کردہ عبارت کو قرآن کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ حضرت عمر کے پاس مطلوبہ گواہ موجود نہ تھے۔[1]

اسی طرح زید بن ثابت نے جمع قرآن کا عمل مکمل کیا اور اس نسخے کو ایک صندوق میں یا بالفاظ روایت ایک ''ربعہ'' میں محفوظ کر لیا۔

چند حقائق: مذکورہ بالا واقعہ، جمع قرآن سے متعلقہ اہل سنت کی کتب میں بکثرت پایا جاتا ہے اور اسے ایک مسلمہ حقیقت خیال کیا جاتا ہے۔لیکن اس واقعے کے بارے میں چند حقائق کا ذکر ناگزیر ہے۔

۱۔ تواتر قرآن اور دو گواہ: اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور اگر تواتر سے ثابت نہیں تو قرآن نہیں ۔ زید نے دو گواہوں کی بنیاد پر قرآن جمع کیا اور حد یہ ہے کہ بعض آیات کے لیے دو گواہ بھی نہ تھے۔ چنانچہ صرف ایک گواہ کی بنیاد پر ہی بطور قرآن قبول کر لیا۔

دوسری بات جو اس سے لازم آتی ہے وہ ہے تحریف قرآن۔ کیونکہ یہاں بہت سی آیات ہیں جو دو سے زیادہ گواہوں سے ثابت ہیں، لیکن موجودہ قرآن میں ان آیات کا وجود نہیں ہے ۔ مثلاً آیہ رجم، سورہ الحفد اور سورہ الخلع وغیرہ۔ پس ان کا شامل نہ کرنا جب کہ یہ بھی دو سے زائد گواہوں سے ثابت ہیں مذکورہ اسلوب کی رو سے تحریف قرآن ہے، جس کی تفصیل ہم تحریف کے موضوع میں بیان کریں گے ۔

۲۔ زید بن ثابت: حضرت ابو بکر نے اس تاریخی اور نہایت اہمیت کے حامل کام کی انجام دہی کے لیے حضرت زید کو ہی کیوں منتخب کیا ؟ زمانہ رسول (ص) میں جن افراد کو حفظ اور قراءت قرآن میں ایک ممتاز مقام حاصل تھااور بقول صاحب صحیح بخاری، جن شخصیات کی طرف تعلیم قرآن کے لیے رجوع کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ عبد اللہ بن مسعود، اُبی بن کعب ، معاذ بن جبل اور سالم ہیں۔ ان میں زید کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ابن مسعود کا مقام سب پر واضح تھا۔ اُبی بن کعب کو سید القراء کہتے تھے۔ معاذ بن جبل کو امام

---

[1] سیوطی۔الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۸

العلماء کا لقب ملا تھا۔ حضرت زید گو کتابت وحی میں شہرت رکھتے تھے مگر حفظ و قراءت میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔

ابو وائل کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے ہمارے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں انہوں نے کہا:

کیا تم مجھے زید بن ثابت کی قراءت کی پیروی کرنے کو کہتے ہو جب کہ میں نے خود رسول اللہ(ص) کی زبان سے ستر سورتوں سے زائد اخذ کی ہیں۔ اس وقت زید بچوں کے ساتھ پھرتا تھا اور اس کے سر پر دو چوٹیاں ہوتی تھیں۔[1]

البتہ زید میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہیئت حاکمہ کو ان پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار خود حضرت ابو بکر نے بھی کیا کہ لا نتھمك ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔ اس اعتماد کی وجہ یہ تھی کہ زید بن ثابت، انصار کا ایک فرد ہونے کے باوجود سقیفہ میں مہاجرین کے موقف کا حامی تھا۔ چنانچہ انہوں نے بروز سقیفہ اپنا سیاسی موقف ان الفاظ میں بیان کیا:

ان رسول اللّٰہ کان من المھاجرین و کنّا انصارہ و انما یکون الامام من المھاجرین و نحن انصارہ۔[2]

خود رسول اللہ(ص) مہاجرین میں سے تھے اور ہم ان کے انصار تھے اور آج امام بھی مہاجرین میں سے ہوگا اور ہم ان کے انصار ہوں گے۔

شاید اسی سیاسی موقف کا اثر تھا کہ یہ نہایت ثروت مند ہو گئے اور اپنے پیچھے دیگر مال و دولت کے علاوہ ایک لاکھ دینار مالیت کا سونا اور چاندی بھی چھوڑا، جو کلہاڑے سے کاٹ کر تقسیم کیا گیا۔[3]

۳۔ دیگر قرآنی نسخے: سب سے اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کیونکہ اس وقت قرآن کے متعدد قابل توجہ نسخے امت کے ہاتھوں میں موجود تھے۔

چنانچہ ابن اثیر کہتے ہیں:

دمشق میں اُبی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف موجود تھا۔ کچھ لوگوں نے تو اپنے اپنے قرآنی نسخوں کے نام بھی تجویز کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود کے مصحف کو دیباج القرآن اور ابو موسیٰ کے مصحف کو لباب القلوب کہا جاتا تھا۔[4]

ذیل میں ہم ان قرآنی نسخوں (مصاحف) کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضرت ابو بکر کے زمانے میں موجود تھے۔

۱۔ مصحف علی علیہ السلام: حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] سنن نسائی ۳: ۴۳۱۔ المصاحف ص ۱۵
[2] ابن عساکر۔ تہذیب ۵: ۴۴۶
[3] مسعودی مروج الذھب
[4] مسعودی مروج الذھب

و لقد کنت اتبعه اتباع الفصیل اثر امه، یرفع لی فی کل یوم من اخلاقه علما و یأمرنی بالاقتداء به، ولقد کان یجاور فی کل سنة بحراء فأراه ولا یراه غیری، ولم یجمع بیت واحد یومئذ فی الاسلام غیر رسول الله و خدیجة و انا ثالثهما ، اری نور الوحی و الرسالة ، و اشم ریح النبوة، و لقد سمعت رنة الشیطان حین نزل الوحی علیه (ص) فقلت: یا رسول الله ماهذه الرنة؟ فقال: هذا الشیطان قد أیس من عبادته، انک تسمع ما اسمع و تری ما أری الا انک لست بنبی و لکنک وزیرٌ و انک لعلی خیر۔[1]

اور میں آپ (ص) کے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ آپ ہر روز میرے لیے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند فرماتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور ہر سال کچھ عرصے کے لیے (غار) حرا میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں آپ (ص) کو میرے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا تھا اس وقت رسول اللہ (ص) اور (ام المؤمنین) خدیجہ (س) کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار دیواری میں اسلام نہ تھا اور میں ان میں کا تیسرا تھا۔ میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ جب آپ (ص) پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی، جس پر میں نے آپ (ص) سے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ص) یہ آواز کیسی ہے؟ تو آپ (ص) نے بتایا: یہ شیطان ہے جو اب اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علی) جو میں سنتا ہوں وہ تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں وہ تم بھی دیکھتے ہو، فرق بس اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر و جانشین ہو اور یقیناً بھلائی کی راہ پر ہو۔

جبیر بن مطعم کہتے ہیں:

قال ابی مطعم بن عدی لنا و نحن صبیان بمکة: الا ترون حب هذا الغلام یعنی علیاً۔ لمحمد و اتباعه له دون ابیه۔[2]

مکہ میں ہمارے بچپنے کی بات ہے کہ ہمارے والد نے ہم سے کہا: اس بچے (علی) کو دیکھو، اسے محمد (ص) سے کتنی محبت ہے کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر ان کی کیسی اتباع کرتا ہے۔

سلیمان بن اعمش راوی ہے:

قال علی: ما نزلت آیة الا و انا

حضرت علی (ع) نے فرمایا: کوئی آیت ایسی نہیں اتری

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ ص ۵۳۳۔ شرح نہج البلاغة ابن ابی الحدید ۱۳ : ۱۹۷
[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ۱۳ : ۲۰۰

علمت فیمن نزلت و این نزلت و علی من نزلت، ان ربی وھب لی قلبا عقولا و لسانا طلقاً[1]

مگر یہ کہ مجھے علم ہے کہ کس سلسلے میں اتری اور کہاں اتری اور کس کے بارے میں اتری. یقیناً میرے رب نے مجھے ایک عقلمند دل اور فصیح زبان عنایت فرمائی ہے۔

نیز آپ (ع) نے یہ بھی فرمایا:

سلونی عن کتاب اللہ فانہ لیس من آیة الا و قد عرفت بلیل نزلت ام بنھار أو فی سھل أو فی جبل۔[2]

مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھ لو کیونکہ کوئی آیت ایسی نہیں کہ جسے میں نہ جانتا ہوں کہ رات کو نازل ہوئی ہے یا دن میں اور میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

ابن مسعود کہتے ہیں:

ان القرآن انزل علی سبعة احرف ما منھا حرف الا و لہ ظھر و بطن و ان علی بن ابی طالب عندہ علم الظاھر و الباطن۔[3]

قرآن سات حروف (معانی) پر نازل ہوا ہے ان میں سے کوئی حرف ایسا نہیں جس کے لیے ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو اور علی (ع) کے پاس ان حروف کے ظاہر اور باطن دونوں کا علم موجود ہے۔

وصیت رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم: حضرت علی علیہ السلام ہی وہ واحد شخص ہیں جنہیں رسول اکرم (ص) نے قرآن کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اگرچہ قرآن عصر رسالت (ص) ہی میں امت کے حوالے ہو چکا تھا اور پورا قرآن امت کے پاس موجود تھا لیکن اس کا محمدی نسخہ بیت مصطفیٰ (ص) میں محفوظ تھا۔ اس نسخے کے وارث علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ اسی لیے رسالتمآب (ص) نے مرض الموت میں ارشاد فرمایا:

یا علی ھذا کتاب اللہ خذہ الیك، فجمعه علی فی ثوب فمضی الی منزلہ فلما قبض النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلس علی فالفه کما انزل اللہ و کان بہ عالماً۔[4]

اے علی! یہ کتاب خدا ہے، اسے اپنے پاس لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت علی (ع) اسے ایک کپڑے میں جمع کر کے اپنے گھر لے گئے۔ رسول اللہ (ص) کی وفات کے بعد آپ (ع) نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا جیسے اللہ نے اسے نازل فرمایا تھا اور آپ (ع) ہی اسے بخوبی جانتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ

رسول اللہ (ص) نے حضرت علی (ع) سے فرمایا: اے

---

[1] تفسیر العیاشی ۱: ۱۷۔ بحار الانوار ۸۹: ۹۷　[2] تفسیر العیاشی ۲: ۲۸۳

[3] حلیة الاولیاء ابو نعیم الاصبھانی ۱: ۶۵　[4] بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵ و ۸۹: ۵۱۔ التمھید ۱: ۲۲۷۔

و سلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی الصحف و الحریر والقراطیس فخذوه و اجمعوه ولا تضیعوه ۔[1]

علی! قرآن میرے بستر کے پیچھے صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں میں موجود ہے، آپ (ع) اسے لے جا کر جمع کر لیں اور ضائع نہ ہونے دیں۔

نسخہ محمدی کی جمع و تدوین: محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ (ص) نے رحلت فرمائی تو علی علیہ السلام نے فرمایا:

آلیتُ ان لا آخذ عَلَیّ ردائی الا لصلوٰۃ جمعة حتی اجمع القرآن. فجمعه۔[2]

میں نے قسم کھا لی ہے کہ میں نماز جمعہ کے علاوہ اپنی عبا زیب تن نہ کروں گا (گھر سے باہر نہ نکلوں گا) جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں۔ چنانچہ انہوں نے اسے جمع فرما لیا۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

اتفق الکل علی انه اول من جمعه۔[3]

سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو سب سے پہلے علی (ع) نے جمع کیا۔

اور زرقانی کہتے ہیں:

واذن لا یضرنا فی هذا البحث ان یقال :ان علیا اول من جمع القرآن بعد رسول الله ۔[4]

اور ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ رسول اللہ (ص) کے بعد سب سے پہلے علی (ع) نے قرآن جمع کیا ہے۔

اس نسخہ کی انفرادیت: عکرمہ کہتے ہیں

لواجتمعت الانس و الجن علی ان یؤلفوه ذلك التالیف ما استطاعوا[5]

اگر جن و انس جمع ہو کر اس طرح قرآن کی جمع و ترتیب کریں تو وہ نہیں کر سکتے۔

ابن جزی کلبی کہتے ہیں:

لو وجد مصحفه علیه السلام لکان فیه علم کثیر۔[6]

اگر مصحف علی علیہ السلام میسر آ جاتا تو ایک علم کثیر ہاتھ آ جاتا۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

لو اصبت ذلك الکتاب کان فیه علم۔[7]

اگر یہ کتاب میسر آ جاتی تو اس میں سے علم حاصل ہو جاتا۔

---

[1] تفسیر القمی ۲: ۴۵۱۔ بحار الانوار ۸۹: ۴۸
[2] السیوطی۔ الاتقان ۱: ۵۹
[3] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ۱: ۲۷
[4] مناهل العرفان ۱: ۲۴۷
[5] السیوطی۔ الاتقان ۱: ۵۹
[6] التسهیل لعلوم التنزیل ۱: ۴
[7] الطبقات الکبری ابو عبد الله البصری ۲: ۳۳۸

شیخ مفید نے کتاب الارشاد میں فرمایا:

ان علیا قدم فی مصحفه المنسوخ علی الناسخ و کتب فیه تاویل بعض الآیات و تفسیرها بالتفصیل۔

حضرت علی (ع) نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا تھا اور بعض آیات کی تاویل وتفسیر بھی تفصیل سے رقم کی تھی۔

فیض کاشانی نے کتاب الوافی میں لکھا ہے:

حضرت علی (ع) نے قرآن کی تفسیر، شان نزول آیات خود رسول اللہ (ص) کی املا سے لکھی تھیں۔

چنانچہ خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ولقد جئتهم بالکتاب مشتملا علی التنزیل و التاویل۔[1]

میں ان کے پاس وہ قرآن لایا تھا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھا۔

ان نصوص سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ صرف تنزیل پر منحصر نہ تھا، جیساکہ باقی مصاحف ہیں۔ یعنی صرف قرآن کی آیات پر ہی مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں کچھ تفسیر و تاویل بھی تھی۔

یہ نسخہ امت کو پیش کیا گیا: حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کو زرد ریشم پر تحریر فرمایا اور ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں موجود اصحاب کے سامنے پیش کیا اور فرمایا:

قال رسول الله: انی مخلف فیکم ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا، کتاب الله و عترتی اهل بیتی، و هذا الکتاب و انا العترة[2]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا تھا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسری میری عترت اہل بیت (ع)۔ لہٰذا یہ ہے کتاب اور میں ہوں عترت۔

جواب ملا: اگر آپ (ع) کے پاس کتاب ہے تو ہمارے پاس بھی کتاب ہے۔ چنانچہ آپ (ع) حجت تمام کر کے واپس تشریف لے گئے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ امت کے پاس قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہ ہو، اس کے باوجود اصحاب اس نسخہ محمدی کو رد کر دیں؟

اگر قرآن کا کوئی نسخہ امت کے پاس موجود نہ تھا تو اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ناقابل فہم ہے اور اگر دیگر قرآنی نسخے موجود تھے تو یہ کہنا کہ قرآن زید بن ثابت نے جمع کیا، ناقابل فہم ہے۔

اگرچہ فی الواقع دونوں صورتوں میں اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ایک المیہ ضرور ہے۔ زرقانی کہتے ہیں:

لا ضیر فی هذا البحث ان یقال: ان

اس بحث میں اس بات کے ماننے میں کوئی حرج

---

[1] آلاء الرحمن ۱: ۲۵۷ [2] بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵

علیا اول من جمع القرآن بعد رسول الله۔[1] نہیں کہ رسول اللہ (ص) کے بعد سب سے پہلے علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا ہے۔

کس قدر مقام تعجب ہے کہ جس طرح مستشرقین یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن زمانہ رسول (ص) میں جمع نہیں ہوا تھا، لفظ جمع، سے جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ (ص) کے زمانے میں قرآن جمع ہوا تھا، حفظ مراد لیتے ہیں۔ یعنی عصر رسول للہ (ص) میں قرآن حفظ ہوا تھا، جمع نہیں ہوا تھا، بالکل اسی طرح بعض علمائے اسلام حضرت علی علیہ السلام کے جمع قرآن کے بارے میں جو روایات میں لفظ جمع آیا ہے اسے حفظ کے معنی میں لیتے ہیں۔ یعنی آپ (ع) نے سینے میں حفظ کر لیا تھا۔[2] تاکہ یہ ثابت ہی نہ ہو سکے کہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا تھا اور اسے رد کیا گیا۔ و لیست ھذہ اول قارورۃ کسرت فی الاسلام، حالانکہ حضرت علی علیہ السلام نے نسخۂ محمدی کی تدوین کے بعد ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں اسے اصحاب کے سامنے پیش کیا تھا اور اس واقعے کو تمام مؤرخین نے لکھا ہے اور ڈاکٹر آتھر جفری بھی مانتے ہیں کہ علی (ع) نے قرآن کی تدوین فرمائی تھی۔[3]

یہ نسخہ کہاں ہے؟: پوری ذمہ داری کے ساتھ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب حضرت علی علیہ السلام کا مصحف کہاں ہے۔ لیکن ایسے کچھ نسخے محفوظ تھے یا ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے تحریر کردہ ہیں۔

ابن ندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں لکھا ہے:

> میں نے اپنے زمانے ۳۷۷ ھ میں ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن کا ایک نسخہ دیکھا جس کے کچھ اوراق موجود نہ تھے۔ یہ قرآن حضرت علی ابن ابی طالب کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا اور یہ اولاد حسن میں پشت در پشت میراث میں چلا آ رہا ہے۔

مقریزی کہتے ہیں:

> ۵۱۶ھ میں فاطمی وزیر مامون بطائحی نے ایک قرآن جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، جامع عتیق مصر میں محفوظ کر لیا۔[4]

> علاوہ ازیں ترکی میں کتابخانہ ایا صوفیہ میں حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک قرآن دو جلدوں میں موجود ہے۔
>
> نجف اشرف میں روضۂ امیر المؤمنین علیہ السلام میں ایک نسخۂ قرآن آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا جو بعد میں ضائع ہو گیا۔[5]

---

[1] مناھل العرفان ۱: ۲۴۷ [2] ملاحظہ کیجیے مقدمہ تفسیر بیضاوی وغیرہ [3] مقدمہ المصاحف ص۵
[4] خطوط مقریزی بحوالہ رامیار تاریخ القرآن ص۳۷۴۔ [5] حوالہ سابق

جناب زنجانی اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھتے ہیں:

و رأیت فی شهر ذی الحجة سنة ۱۳۵۳ه فی دار الکتب العلویة فی النجف الأشرف مصحفاً بالخط الکوفی کتب علی آخره : کتبه علی بن ابی طالب فی سنة اربعین من الهجرة، لتشابه ابی و ابو فی رسم الخط الکوفی قد یظن من لا خبرة له انه کتب علی بن ابو طالب بالواو۔

۱۳۵۳ھ کے ماہ ذی الحجۃ الحرام میں نجف اشرف کے دارالکتب العلویہ میں خط کوفی میں ایک قرآن میں نے دیکھا جس کے آخر میں تحریر تھا کہ اسے ۴۰ھ میں علی ابن ابی طالب نے لکھا۔کوفی رسم الخط میں ابی اور ابو تقریباً ایک جیسے ہی لکھے جاتے ہیں اس لیے بے خبر لوگ اسے ابوطالب پڑھتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے مصحف کے علاوہ درج ذیل اصحاب کے مصاحف لوگوں کی دسترس میں تھے۔

۲۔سالم مولیٰ: سالم، ابو حذیفہ کی زوجہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔آپ کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا ہے۔آپ کا ایک مصحف تھا۔

۳۔ ابو زید قیس بن سکن: مالک بن انس کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول خدا (ص) کے زمانے میں ہی قرآن جمع کیا تھا۔

۴۔معاذ بن جبل: ان کا مصحف شام اور حمص میں شہرت رکھتا تھا۔

۵۔ ام ورقہ بنت عبد اللہ: آپ نے بھی عصر رسول(ص) میں ہی قرآن جمع کر لیا تھا۔

۶۔سعد بن عبید: یہ عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار ہوتے ہیں۔

۷۔ اُبی بن کعب: ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابو المنذر ہے۔اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں ہوتا تھا اور کتب عہدین پر عبور تھا۔ان کا مصحف سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے دوسرے مصاحف سے مختلف تھا۔

۸۔عبد اللہ بن مسعود: یہ چھٹے شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔اسی لیے انہیں سادس ستة یعنی چھ میں سے چھٹا کہتے تھے۔ان کے مصحف کو نہایت شہرت حاصل تھی۔

۹۔ ابو الدرداء: ان کا شمار بھی عصر رسول(ص) کے جامعین قرآن میں ہوتا ہے۔

۱۰۔ مقداد بن اسود: ان کا قرآن حمص اور شام میں مشہور تھا۔

۱۱۔ ابو موسیٰ اشعری: ان کا مصحف بصرہ میں رائج تھا اور یہ خود بصرہ کے حاکم بھی رہ چکے تھے۔ان کے

مصحف کولباب القلوب کہا جاتا تھا۔

۱۲۔ حضرت حفصہ بنت عمر: کہتے ہیں کہ حضرت حفصہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں ۔ انہوں نے بحکم رسول خدا (ص)حضرت لیلی بنت عبد اللہ بن عبد شمس سے کتابت سیکھی تھی۔ انہوں نے اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔ یہ اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا اور حضرت عمر کی وفات کے بعد وہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔

۱۳۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر: متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ نے بھی اپنے لیے ایک مصحف تیار کرایا تھا اور اس میں کچھ آیات دوسرے مصاحف سے مختلف تھیں۔

۱۴۔ حضرت ام سلمہ : آپ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ آپ نے خود اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔

۱۵۔ زید بن ثابت: ان کا یہ مصحف اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا۔ اس بات کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ زید رسول کریم (ص) کے حضور آخری دورۂ قرآن میں حاضر تھے۔ لہٰذا ان کا قرآن بھی عرضۂ اخیر میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

۱۶۔ مجمع بن جاریہ: کہتے ہیں کہ ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔ انہوں نے عہد رسول (ص) میں پورا قرآن حفظ کرلیا تھا۔ صرف دو سورتیں رہ گئیں تھیں جو انہوں نے بعد رسول (ص) حفظ کیں۔

۱۷۔ عقبہ بن عامر: ان کا بھی اپنا مصحف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصحف چوتھی صدی ہجری تک موجود تھا۔

۱۸۔ عبد اللہ بن عمر: ان کا شمار بھی زمانہ رسول (ص) میں قرآن جمع کرنے والوں میں ہوتا ہے.

۱۹۔ انس بن مالک: ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔

یہ ہیں وہ قرآنی نسخے جو عہد رسول (ص) میں جمع کر لیے گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں ضیاع قرآن کا سرے سے کوئی خطرہ نہ تھا۔[1]

اختلاف قراءت اور نسخہ: سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابو بکر نے اپنے زمانے میں قرآن کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے زید بن ثابت سے قرآن جمع کروایا تھا تو یہ نسخہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کیوں نہ تھا؟ کیونکہ بعد میں جب عہد عثمان میں قراءت کا اختلاف پیدا ہوا تو اس نسخے کے معاصر دوسرے نسخوں کا ذکر آتا ہے، مگر اس نسخے کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا کہ کچھ لوگ اس مصحف کے مطابق بھی قراءت کر رہے ہوں۔ جیسا کہ کہ دمشق میں ابی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف رائج تھا۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ قرآن ڈاکٹر رامیار

یہ نسخہ ربعہ میں : اگر قرآن کو ضیاع سے بچانا ہی مقصود تھا اور لوگوں کے پاس قرآن محفوظ نہ تھا تو زید بن ثابت کے سرکاری نسخے کو عام کرنا چاہیے تھا، جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ نسخہ ایک صندوق میں بند رہا۔ بقول روایات ایک ربعہ میں بند کر دیا گیا۔ صرف حضرت عثمان کے دور میں ایک مرتبہ یہ نسخہ ربعہ سے نکالا گیا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کے پاس آیا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ پھر ان کی وفات کے بعد مروان بن حکم والی مدینہ نے اسے جلا دیا۔[1]

شاید یہ نسخہ تیار کروانے کی اصل وجہ یہ ہو کہ دیگر اصحاب کے علاوہ حضرت علی (ع) کے پاس تو قرآن کا ایک جامع نسخہ موجود تھا، لیکن ہیئت حاکمہ کے پاس کوئی قرآنی نسخہ موجود نہیں تھا۔

اس سرکاری نسخے کے بارے میں مصر کے مشہور مؤلف ڈاکٹر محمد عبد اللہ دراز اپنی کتاب مدخل الی القرآن الکریم ص ۳۸ میں لکھتے ہیں:

و لکن رغم قیمة هذا المصحف العظیمة ورغم ما یستحقه من العنایة التی بذلت فی جمعه فان مجرد بقائه محفوظاً بعنایة عند الخلیفتین الاولین اسبغ علیه الطابع الفردی او الشخصی بعض الشیء و لم یصبح وثیقة للبشر کافة۔[2]

اس نسخے کی بہت بڑی قدر و قیمت اور اس کے جمع کرنے پر صرف ہونے والی توجہ قابل قدر ہونے کے باوجود اس نسخے کا صرف دونوں خلفاء کے پاس محفوظ رہنے سے اس پر ذاتی اور شخصی تأثر کسی حد تک قائم رہا اور تمام لوگوں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔

ڈاکٹر محمد عبد اللہ کا تبصرہ بالکل درست ہے کہ اس نسخہ کا امت کے ساتھ کوئی ربط نہ رہا اور امت کے پاس اس نسخے کے علاوہ بہت سے نسخہ ہائے قرآن موجود تھے۔

تضادات: حضور (ص) کے بعد قرآن کے بارے میں جو روایات اہل سنت نے اپنی کتب میں بکثرت درج کی ہیں، ان میں اس قدر تضادات موجود ہیں کہ کسی ایک روایت پر بھی اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ ان تضادات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب البیان فی تفسیر القرآن کا مطالعہ کافی رہے گا جہاں اس موضوع کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں جنگ یمامہ میں چار سو قاریان قرآن شہید ہونے کی وجہ سے ضیاع قرآن کا خطرہ لاحق ہوا۔ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ میں تین ہزار قاریان قرآن شریک تھے۔ ان میں سے صرف چار سو کے شہید ہونے سے قرآن کے ضیاع کا خطرہ کیسے لاحق ہو سکتا ہے؟

عصر ابوبکر میں جمع قرآن: بالفاظ دیگر سرکاری نسخہ تیار کرنے کے واقعے سے مستشرقین کو یہ

---

[1] المصاحف ص ۲۱ ۔ ڈاکٹر جیفرے مقدمہ المصاحف ص ۵
[2] ڈاکٹر جیفرے مقدمہ المصاحف

موقع ملا کہ وہ یہ نظریہ قائم کریں کہ رسول خدا (ص) کی رحلت کے وقت کوئی نسخہ قرآن امت کے ہاتھوں میں موجود نہ تھا، ورنہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکر کو ضیاع قرآن کا خوف لاحق نہ ہوتا۔[1]

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ضیاع قرآن کے خوف کا کوئی سبب موجود نہ تھا اور نہ ہی سرکاری نسخے نے قرآن کا تحفظ کیا ہے۔ البتہ اس خوف کی کوئی دوسری وجوہ ہو سکتی ہیں یا اس قول کی نسبت ان کی جانب درست نہیں کہ کسی خوف کا اظہار ہوا تھا۔

عصر عثمان اور قرآن: حضرت عثمان کے زمانے میں اسلام کرۂ ارض کے ایک وسیع خطے پر پھیل گیا تھا اور غیر عرب قومیں بھی اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف قرآن کی مختلف قرائتیں رائج تھیں اور اس وسیع و عریض مملکت کے ہر شہر اور ہر علاقے میں ایک قراءت رائج ہو گئی تھی۔ قراءت مختلف ہونے کا مطلب تلفظ میں اختلاف ہے۔ مثلاً یَطْھُرْنَ ایک قراءت ہے جس کا معنی ہے ''پاک ہونا'' جب کہ یَطَّھَّرْنَ دوسری قراءت ہے جس کا معنی ہے ''پاک کرنا''۔

آرمینیا کی جنگ: ان دنوں حضرت حذیفہ[2] (صاحب سر رسول(ص)) آذربائیجان میں جنگ آرمینیا میں شریک تھے۔ اس جنگ میں شام اور عراق کے سپاہی لڑ رہے تھے۔ شام والے اُبی بن کعب کی قرائت پر قرآن پڑھتے تھے اور عراق والے ابن مسعود کی قرائت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ ہر ایک کو دوسرے کی قرائت اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اہل شام اور اہل عراق ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔

حضرت حذیفہ اس صورت حال سے خاصے پریشان ہو گئے وہ آذربائیجان سے سیدھے کوفہ آئے اور یہاں موجود اصحاب رسول(ص) سے اس مسئلے کے بارے میں مشورہ کیا۔ تمام اصحاب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ قرآن کی ایک ہی قرائت پر لوگوں کو مجتمع کیا جائے۔ صرف عبد اللہ بن مسعود نے اختلاف کیا۔[3]

علمائے امت کا فیصلہ: یہ فیصلہ لے کر حضرت حذیفہ مدینہ پہنچے اور گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان کے پاس حاضر ہو کر دہائی دی: میں ہی واحد پیغام لانے والا ہوں۔ میں خبردار کرتا ہوں۔ حضرت عثمان نے پوچھا: بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے فرمایا: اے خلیفہ! لوگوں کی فریاد کو پہنچو۔ حضرت عثمان نے پھر پوچھا: کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا:

---

[1] حوالہ سابق

[2] حضرت حذیفہ بن یمان عراقی الاصل تھے اور سابقین فی الاسلام میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ رسالتمآب (ص) کے رکابدار تھے۔ جب حضور (ص) جنگ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو منافقین کی ایک جماعت تاک میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر رسول (ص) خدا کو شہید کیا جائے، مگر اچانک بجلی چمکنے پر رسول خدا (ص) اور حذیفہ نے ان سب کو دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ حضور (ص) نے حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ چنانچہ حذیفہ وہ واحد صحابی تھے جو منافقین کو جانتے تھے اسی لیے انہیں صاحب السر کہا جاتا تھا۔

[3] ابن اثیر الکامل ۳ : ۵۵

لوگوں نے کلام خدا میں اختلاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مسلمانوں کا حشر بھی وہی نہ ہو جو یہود و نصاریٰ کا ہوا ہے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں:

فجمع عثمان الصحابة واخبرهم الخبر، فاعظموه، ورأوا جميعا ما رأى حذيفة۔[1]	چنانچہ حضرت عثمان نے اصحاب کو جمع کیا اور انہیں اس خبر سے آگاہ کیا۔ اصحاب نے اس کو بڑا سانحہ قرار دیا اور سب نے حذیفہ کی تائید کی۔

کمیٹی کی تشکیل: چنانچہ اس مقصد کے لیے اصحاب رسول (ص) پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی.

حضرت عثمان نے اس کمیٹی سے کہا:

يا اصحاب محمدؐ اجتمعوا فاكتبوا للناس اماماً۔[2]	اے اصحاب محمد (ص)! متفق طور پر اس امت کے لیے ایک رہنما نسخہ تیار کرو۔

ابتدائی مرحلے میں چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱۔ زید بن ثابت	۳۔عبد اللہ بن زبیر
۲۔سعید بن عاص قرشی	۴۔عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام[3]

زید بن ثابت اس کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کے ارکان علمی قابلیت کے فقدان کی وجہ سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے سے عاجز رہے۔ چنانچہ نئی کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس میں درج ذیل افراد کو شامل کیا گیا:

۱۔ أبي بن كعب	۵۔ كثير بن افلح
۲۔ عبد الله بن عباس	۶۔ مصعب بن سعد
۳۔ انس بن مالك	۷۔ عبد الله بن فطيمه[4]
۴۔ مالك بن ابی عامر	

اس کمیٹی کی سربراہی اُبی بن کعب کر رہے تھے۔

ابو العالیہ کہتے ہیں:

انهم جمعوا القرآن من مصحف ابی بن كعب، فكان رجال يكتبون يملی عليهم ابی بن كعب۔	انہوں نے قرآن کو ابی بن کعب کے مصحف سے جمع کیا۔ چنانچہ ابی بن کعب املا کراتے تھے اور کچھ لوگ لکھتے تھے۔

۱۔ ابن اثير الكامل ۳: ۵۵ ۲۔ سیوطی الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۰
۳۔ تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی ۴۔ التمهيد ۱: ۲۸۱

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اما نحن فَنَقْرَؤُہٗ علی قراء ۃ اُبی۔[1]

ہم بھی ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق (قرآن) پڑھتے ہیں۔

سرکاری مداخلت: امت قرآن کو ایک ہی قراءت پر متحد کرنے کی تحریک حضرت حذیفہ کی جانب سے چلی اور اصحاب رسول (ص) نے ان سے اتفاق کیا اوران کی تائید کی۔ حضرت عثمان نے اپنی مرضی کے چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی جو کام نہ کرسکی۔ بعد میں اہل افراد سامنے آئے اورانہوں نے اس عظیم کارنامے کو بطوراحسن انجام دیا۔ اس طرح وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[2] کا الٰہی وعدہ پورا ہوگیا۔

ایک حرف کا تغیر: چنانچہ حکومت اس سلسلے میں اس حد تک بے دخل ہوگئی تھی کہ ایک حرف کے تغیر وتبدل پر بھی قادر نہ تھی۔

علباء بن احمد سے روایت ہے:

ان عثمان بن عفان لما اراد ان یکتب المصاحف ارادوا ان یلغوا الواو التی فی براءۃ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ ... فقال لهم ابی: لتلحقنها اولاضعن سیفی علی عاتقی فالحقوها[4]

حضرت عثمان جب قرآن لکھوا رہے تھے تو سورہ برائت کی آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ کی واوٗ کو حذف کرانا چاہتے تھے مگر اُبی بن کعب[3] نے کہا: یہ واوٗ رہے گی ورنہ ہم تلوار اٹھائیں گے چنانچہ اس واوٗ کو رہنے دیا۔

بعد میں قرآن مجید کے دیگر نسخوں کو نذر آتش کرنے پر لوگوں نے حضرت عثمان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا تو انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے خودکو اس عمل میں دوسروں کا تابع بتایا۔ ملاحظہ ہو ان کا یہ قول:

و انما انا فی ذلك تابع لهؤلاء۔[5]

میں تو اس معاملے میں صرف ان لوگوں کا تابع رہا ہوں۔

حضرت عثمان جامع قرآن نہیں ہیں: حارث محاسبی کہتے ہیں:

المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و لیس کذلك، انما حمل عثمان الناس علی القراءۃ بوجه واحد۔[6]

لوگوں میں مشہور ہے کہ عثمان جامع قرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ عثمان نے تو لوگوں کو صرف ایک ہی قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۶: ۱۶۳ [2] ۱۵ حجر: ۹

[3] مستشرقین کا یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ ابی بن کعب حضرت عمر کے دور میں وفات پا چکے تھے بلکہ تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے تک زندہ تھے اور آرمینیا کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

[4] سیوطی در المنثور ۳: ۴۱۹ [5] تاریخ طبری ۱: ۲۵۲ [6] السیوطی الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۱

قاضی ابو بکر اپنی کتاب الانتصار میں لکھتے ہیں:

لم یقصد عثمان قصد ابی بکر فی جمع نفس القرآن بین لوحین، وانما قصد جمعهم علی القراء ات الثابتة المعروفة عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم والغاء ما لیس کذلك، و اخذهم بمصحف لا تقدیم فیه و لا تاخیر و لا تاویل۔[1]

حضرت عثمان نے حضرت ابو بکر کی طرح قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو ان قرائتوں پر مجتمع کیا جائے جو رسول کریم (ص) سے ثابت ہیں اور جو ثابت نہیں، انہیں متروک کیا جائے اور لوگوں کو ایسے قرآن پر مجتمع کیا جائے جس میں نہ تقدیم و تاخیر ہو اور نہ تاویل۔

حبیب الرحمٰن صدیقی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں فرماتے ہیں:

و ما اشتهر ان جامعه عثمان فهو علی ظاهره باطل لانه انما حمل الناس سنة ۳۵ ھ القراءة بوجه واحد۔[2]

اور یہ جو شہرت ہوئی ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، یہ بات بظاہر باطل ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو ۳۵ ہجری میں لوگوں کو صرف ایک قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام **کا موقف:** علامہ حلی اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں:

حضرت عثمان نے حضرت علی (ع) سے بھی منظوری لی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی مشہور ہے جو آپ (ع) نے دور عثمان میں لوگوں کو ایک ہی قرآن پر مجتمع کرنے کے عمل کے انجام پانے کے بعد فرمایا:

لا یهاج القرآن بعد الیوم[3]

آج کے بعد قرآن کبھی مضطرب نہ ہو گا۔

ایک اور مقام پر آپ (ع) نے فرمایا:

ان القرآن لا یهاج الیوم ولا یحول۔[4]

آج قرآن کو قرار آ گیا ہے اور یہ ناقابل تغیر ہو گیا ہے۔

حضرت عثمان کے عہد خلافت میں جب لوگوں کو ایک مصحف پر مجتمع کرنے کی مہم چل رہی تھی تو اس وقت جناب طلحہ نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ (ع) نے رسول اللہ (ص) کی وفات کے بعد جو قرآن جمع کیا تھا، جسے اس قوم نے مسترد کر دیا تھا، کیا آج آپ (ع) اس قرآن کو دوبارہ پیش نہیں کر سکتے؟ آپ (ع) نے اس کا جواب نہ دیا۔ طلحہ نے ہر چند اصرار کیا مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ آخر طلحہ نے کہا: اے ابو الحسن (ع) آپ مجھے اس بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

---

[1] حوالہ سابق [2] مقدمہ تفسیر بیضاوی
[3] طبرسی۔ تفسیر مجمع البیان ۹ : ۲۱۸ [4] تمہید ۱ : ۲۸۹

اے طلحہ! میں نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا تھا۔تم خود بتاؤ کہ لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا یہ قرآن نہیں ہے؟ کیا اس میں غیر قرآن بھی ہے؟ طلحہ نے جواب دیا کہ ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یہ سب کا سب ضرور قرآن ہے، تو آپ(ع) نے فرمایا: اگر تم نے اسی قرآن کو لے لیا تو تمہیں آتش جہنم سے نجات مل جائے گی اور جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔طلحہ نے کہا کہ اگر قرآن یہی ہے تو بس کافی ہے۔[1]

موجودہ قرآن

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جو قرآن اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے، وہ:

۱۔ نہ حضرت علی علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن ہے،

۲۔ نہ عصر ابی بکر میں جمع شدہ قرآن ہے،

۳۔ نہ حضرت عثمان نے کوئی قرآن جمع کیا تھا،

بلکہ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن موجود ہے، وہ عصر رسول (ص) کا تدوین شدہ قرآن ہے جو کہ عصر رسالت (ص) میں ہی امت کے ہاتھوں میں موجود تھا اور عصر رسالت (ص) کے بعد وہی قرآن مختلف نسخوں میں امت کے پاس موجود رہا۔ یہ مختلف نسخے، جس طرح ہمارے زمانے میں چند ایک کمپنیوں کی طرف سے طبع شدہ نسخے رائج ہیں اسی طرح چند ایک اہم نسخے مختلف علاقوں میں رائج ہو گئے۔ چنانچہ:

۱۔ ابی بن کعب کا نسخہ دمشق میں

۲۔ مقداد کا نسخہ حمص میں

۳۔ عبداللہ بن مسعود کا نسخہ کوفہ میں

۴۔ ابوموسیٰ کا نسخہ بصرہ میں رائج تھا۔

ان نسخوں کی قراءتیں بھی قدرے مختلف تھیں جو آگے چل کر وجہ نزاع بن گئیں۔ حضرت حذیفہ رضوان اللہ علیہ کی تحریک پر عصر عثمان میں ان تمام نسخوں کو جمع کیا گیا اور ایک قراءت پر مشتمل ایک نسخہ بنا دیا گیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

---

[1] کتاب سُلیم بن قیس الھلالی ص ۶۵۷ و بحار الانوار ۳۱: ۴۲۶

نسخ

نسخ کی تعریف۔ بداء ۔ اقسام نسخ ۔ نسخ تلاوت۔ نسخ حکم۔ تاویل۔ تفسیر اور تاویل میں فرق۔ کیا تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے ۔ نفاذ اور انطباق۔ شان نزول۔ نسخہ ہائے قرآن ۔ طبع قرآن ۔ نقطہ نگاری ۔ اعراب ۔

قرآن انسان سازی کا ایک دستور ہے اور یہ قانون فطرت ہے کہ ارتقا و تکامل دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا قوانین و احکام قرآن میں بھی تدریج و تغیر ضروری تھا۔ خصوصاً اس انقلابی اصلاح کا آغاز جس قوم سے کیا جا رہا تھا وہ جاہلیت و وحشت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چونکہ ایک متوحش اور غیر مہذب قوم کی اصلاح دفعتاً نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے تشریع اسلامی میں نسخ کا ہونا لازمی اور ضروری تھا۔

نسخ کی تعریف: شریعت مقدسہ میں ایک ثابت حکم کو دوسرے حکم کے ذریعے اٹھا لینا۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص حکم کو کسی مصلحت کے تحت مقررہ مدت کے لیے نافذ فرماتا ہے، مگر از راہ مصلحت و حکمت اس امر کا اظہار نہیں کرتا کہ یہ حکم ایک خاص معینہ مدت کے لیے محدود ہے۔ بعد میں نسخ کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ اس حکم کی مدت ختم ہو گئی ہے۔

لہٰذا نسخ میں صرف ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے سے یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ حکم صرف ایک خاص مدت کے لیے محدود ہے اور اس نہ بتانے میں بہت سے مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اس نہ بتانے کی وجہ سے اس حکم کے دائمی ہونے کا جو تصور لوگوں کے ذہن میں قائم ہوتا ہے، حقیقت میں اس تصور کا نسخ ہے، نہ کہ حکم واقعی کا نسخ۔ پس نسخ کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کا نظریہ بدل گیا ہے۔

بداء: جیسا کہ نسخ میں بیان کیا گیا ہے کہ حکم شرعی پہلے ہی سے اللہ کے نزدیک ایک خاص وقت کے لیے مخصوص تھا، لیکن کسی مصلحت کی بنیاد پر اس کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ بعد میں نسخ کے ذریعے اظہار ہوا تو لوگوں کے تصور کے مطابق سابقہ حکم اٹھا لیا گیا۔ بالکل اسی طرح بداء بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پہلے سے طے ہوتا ہے، لیکن اس فیصلے کا اظہار نہیں کیا جاتا تو لوگوں کے اذہان میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ پہلے سے طے شدہ فیصلے کا اظہار فرماتا ہے تو لوگوں کو بداء یعنی تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا بداء کسی امر کے بارے میں لوگوں کے تصور کی تبدیلی ہے، نہ کہ واقعی حکم اور فیصلے کی تبدیلی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ما بدا للّٰہ فی شیء الا کان فی علمه قبل ان یبدو له۔[1]	اللہ کو کسی شے کے بارے میں بداء نہیں ہوتا مگر یہ کہ اللہ کو اس کا پہلے سے علم ہوتا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۱: ۱۴۸ باب البداء

پس بداء کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کا نظریہ بدل گیا ہے۔ بداء اور نسخ میں فرق صرف یہ ہے کہ نسخ تشریعی امور میں ہوتا ہے اور بداء تکوینی امور میں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ [1]

اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

عقیدۂ بداء سے اللہ تعالیٰ کی طرف جہالت کی نسبت لازم نہیں آتی بلکہ بداء کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جیسے چاہتا ہے کائنات میں تصرف کرتا ہے۔

یہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ بے بس ہے۔ روز ازل اس نے جو فیصلہ کر دیا اسے نہ بدل سکتا ہے نہ اس میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ یعنی قضا و قدر کے ذریعے روز ازل جو فیصلہ کر دیا ہے، اس فیصلے کے خلاف اور کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہود کے اس باطل نظریے کو قرآن نے رد کیا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ... [2]

اور یہود کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، خود ان کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر لعنت ہو اس (گستاخانہ) بات پر بلکہ اللہ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

عقیدہ بداء سے ہی انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہی عطا و بخشش والا ہے۔ انسان دست سوال دراز کرتا ہے کہ وہ کریم ہے اور پھر اپنی پوری زندگی میں ذات الٰہی سے وابستگی اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک پر امید زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر عقیدہ بداء نہ ہو اور انسان یہ سمجھے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہو کر رہے گا اور انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے تو وہ یاس و ناامیدی میں مبتلا رہے گا اور پھر اللہ کی بارگاہ میں تضرع اور انکساری کے ساتھ رجوع نہیں کرے گا۔ اسی طرح دعا و صدقات کا فلسفہ بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقیدہ بداء سے علم خدا اور علم بشر کا فرق بھی سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے لیکن بشر کو معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کی مشیت کیا ہے۔ اس لیے بندہ ہمیشہ مشیت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معصوم (ع) سے روایت ہے:

ما عبد اللّٰہ بشیء مثل البداء۔ [3]

اللہ کی پرستش کے لیے بداء سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ لفظ بداء صحیح بخاری میں بھی وارد ہوا ہے۔ ابو ہریرہ راوی ہے:

سمع رسول اللّٰہ یقول: ان ثلاثۃ فی

انہوں نے رسول کریم (ص) کو فرماتے سنا کہ بنی

---

[1] ۱۳ رعد: ۳۹ [2] ۵ مائدہ: ۶۴ [3] اصول الکافی باب البداء ۱: ۱۴۶

بنی اسرائیل ابرص و اقرع و اعمی بـدا لـلّٰه ان یبتلیهم فبعث الله الیهم ملکاً۔[1]

اسرائیل میں تین شخص ایسے تھے جن میں ایک مبروص، دوسرا اندھا اور تیسرا کوڑھی تھا۔ اللہ تعالیٰ کو بداء ہوا کہ ان کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔

صحیح ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں ہے:

قـال رسـول الـله:لا یرد القضاء الا الدعاء و لا یزید فی العمر الا البر۔

رسول اللہ(ص) نے ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی کو صرف دعا روک سکتی ہے اور نیکی ہی سے عمر دراز ہوتی ہے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی اعلی اللہ مقامہ بداء کی تشریح و توضیح کے بعد فرماتے ہیں:

و انهم نسبوا الی الشیعة ماهم براءٌ مـنـه ، وانهـم لم یحسنوا فی الفهم ولـم یـحسـنـوا فـی النقد ، ولیتهم اذلـم یـعـرفـوا تثبتوا او توقفوا کما تـفـرضـه الامـانة فـی النقل و کما تـقـتـضیـه الـحیـطة فـی الحکم و الورع فی الدین۔[2]

انہوں نے شیعوں کی طرف اس چیز کی نسبت دی ہے جس سے وہ بری الذمہ ہیں۔ انہوں نے نہ تو درست سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی تنقید کا صحیح اصول اپنایا۔ کاش مطلب واضح نہ ہو سکنے پر یہ لوگ تحقیق سے کام لیتے یا کچھ توقف کرتے (تا کہ حق ان پر واضح ہوجائے)، پھر کسی کا عقیدہ ونظریہ بیان کرنے میں امانت فی النقل کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ فیصلے کرنے سے پہلے آگاہی حاصل کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا چاہیے (مگر ان لوگوں نے بہتان طرازی میں جلدبازی سے کام لیا)۔

اقسام نسخ: علمائے اہل سنت نے نسخ قرآن کی چند اقسام بیان کی ہیں۔ ذیل میں ہم ان اقسام کا ذکر کریں گے اور ساتھ امامیہ کا نقطۂ نظر بھی بیان کریں گے۔

۱۔ نسـخ الـحـکـم و التلاوة : یعنی قرآن کی آیت کو بھی اٹھا لیا گیا اور حکم کو بھی۔ بایں معنی کہ بعض آیات قرآن کا حصہ تھیں اور مسلمان ان آیات کو بطور قرآن تلاوت کیا کرتے تھے نیز ان میں ایک شرعی حکم بھی موجود تھا لیکن بعد میں ان آیات کو قرآن سے حذف کر دیا گیا اور حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

امـا نسـخ الحکم و التلاوة جمیعاً فـقـد اجـمـع علیه القائلون بالنسخ من المسلمین۔[3]

جہاں تک حکم وتلاوت کے نسخ کا مسئلہ ہے تو مسلمانوں میں سے جو لوگ نسخ کے قائل ہیں ان سب نے اس مسئلے میں اجماع کیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ۲: ۳۶۱ طبع دار الاشاعت کراچی
[2] البیان فی تفسیر القرآن امام الخوئی، ص ۳۸۳
[3] زرقانی، مناهل العرفان فی علوم القرآن ۲: ۱۱

امامیہ کے نزدیک اس قسم کا نسخ باطل ہے اور کتاب خدا اس سے بالاتر ہے کہ اس کی بعض آیات کو قرآن کا حصہ قرار دینے کے بعد حذف کر دیا جائے یا اٹھا لیا جائے ۔ امامیہ کے نزدیک صرف وہ آیات قرآن کا حصہ ہیں جو تواتر سے ثابت ہوں۔

علمائے اہل سنت اس قسم کی کچھ آیات کو بھی قرآن کا حصہ مانتے ہیں جو غیر متواتر احاد روایات کے ذریعے منقول ہیں۔ پھر ان آیات کو موجودہ قرآن میں نہیں پاتے تو نسخ تلاوت کا نظریہ قائم کرتے ہیں اور یہ نظریہ اس لیے قائم کرتے ہیں کہ یہ روایتیں کتب صحاح میں موجود ہیں جنہیں قبول کرنا اہل سنت نے اپنے مذہب میں لازمی قرار دے رکھا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم اور صحیح ابن حبان میں یہ روایت درج ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا:

کان فیما انزل من القرآن "عشر رضعات معلومات یحرمن " ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللّٰہ و ھن فیما یقرأ من القرآن ۔[1]

قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی کہ" واضح طور پر دس مرتبہ دودھ پلانے والیاں حرام ہو جاتی ہیں" پھر یہ آیت پانچ مرتبہ دودھ پلانے کے حکم سے منسوخ ہو گئی، حالانکہ رسول کریم (ص) کی وفات کے وقت تک یہ آیات قرآن میں تلاوت کی جاتی تھیں ۔

اس روایت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت رسول خدا (ص) کی وفات تک قرآن میں موجود تھی اور آپ (ص) کی وفات کے بعد ہی قرآن سے حذف کر دی گئی اور بقول ان حضرات کے ایسا حضرت ابوبکر کے زمانے میں ہوا جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی مقدمۂ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں:

نعم اسقط زمن الصدیق مالم یتواتر و نسخت تلاوتہ۔

ہاں حضرت صدیق کے زمانے میں ان آیات کو حذف کر دیا گیا جو غیر متواتر تھیں اور ان کی تلاوت بھی منسوخ کر دی گئی۔

امامیہ کے نزدیک یہ قرآن کی عظمت کے خلاف بڑی جسارت ہے اور اس نظریے سے تحریف قرآن لازم آتی ہے کہ عصر رسالت (ص) کے بعد قرآن کا کچھ حصہ اس میں سے حذف کر دیا گیا۔

امامیہ کے نزدیک قرآن عصر رسالت (ص) میں مدون تھا اور ہر سال قرآن کی بازخوانی ہوتی تھی اور رسول خداؐ کی وفات کے بعد کوئی آیت حذف نہیں کی گئی جب کہ یہ خدا کا وعدہ بھی ہے کہ قرآن کے ساتھ کوئی دست درازی نہیں ہوسکتی۔

صرف امامیہ ہی نہیں بلکہ خود اہل سنت کے ایک معتدبہ گروہ نے بھی اس نظریے کو یہ کہہ کر رد کر دیا

---

[1] صحیح مسلم ۲: ۱۰۷۵۔ صحیح ابن حبان ۱۰: ۳۶

ہے کہ یہ عظمت قرآن کے منافی ہے اور اس سے تحریف قرآن ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ نسخ تلاوت: یعنی قرآن سے ایک آیت کو اٹھا لیا جائے مگر حکم باقی رکھا جائے۔ اس قسم کے نسخ کو بھی علمائے امامیہ نے اجماعی طور پر مسترد کیا ہے۔ علمائے امامیہ کا نظریہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قرآن صرف تواتر کے ذریعے ہی ثابت ہوسکتا ہے۔ خبر واحد سے چونکہ قرآن ثابت ہی نہیں ہوتا، اس لیے نسخ بھی قرآن کے ثبوت پر موقوف ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ کسی آیت کو قرآن کا حصہ تسلیم کر لینے کے بعد خبر واحد کے ذریعے اس کے منسوخ ہونے کا نظریہ عیناً تحریف قرآن کا نظریہ ہے۔

مگر مقام حیرت ہے کہ تقریباً تمام علمائے اہل سنت نے اتفاق کیا ہے کہ نسخ تلاوت واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آمدی متوفی ۶۳۱ ھ لکھتے ہیں:

اتفق العلماء علي جواز نسخ التلاوة دون الحکم۔[1]

تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حکم کے بغیر صرف تلاوت منسوخ ہوسکتی ہے۔

اس قسم کے نسخ کے لیے وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر تحریف قرآن کے مسئلے میں تفصیل سے ہوا ہے۔ مثلا آیہ رجم اور یہ کہ سورہ احزاب، سورہ بقرہ کے برابر تھی وغیرہ۔[2]

حالانکہ کسی آیت کا منسوخ یا غیر منسوخ ہونا تو بعد کی بات ہے، پہلے تو اس کا جزو قرآن ہونا ثابت ہونا چاہیے اور وہ بھی تواتر سے، خبر واحد کے ذریعے نہیں، خواہ وہ واحد روایت کتنی ہی صحیح السند کیوں نہ ہو۔ پھر اگر آیت جزو قرآن ثابت ہو جائے تو اسے منسوخ قرار دینے کے لیے بھی خبر واحد کافی نہیں، یہ بھی تواتر سے ہونی چاہیے۔

لیکن مقام تعجب ہے کہ غیر امامیہ کے وہ محققین بھی جو نسخ کی پہلی قسم کو مسترد کرتے ہیں، اس قسم کے نسخ کے قائل ہیں، حالانکہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ان دونوں کے تسلیم کرنے سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔

اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کچھ آیات کو جزو قرآن تسلیم کر کے تلاوت منسوخ کرنا عیناً تحریف قرآن کا نظریہ قرار پاتا ہے۔ اس لیے اہل سنت کے کچھ دانشور اس نظریے کو تقدس قرآن کے خلاف تصور کرتے ہوئے اسے مسترد کرتے ہیں۔[3]

۳۔ نسخ حکم: یعنی آیت برقرار رہے اور اس کا حکم منسوخ ہو جائے تو اسے نسخ حکم کہتے ہیں۔ اس قسم کے نسخ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ بس ایسا ہی نسخ قرآن مجید میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا کہ جب کوئی شخص رسول خدا (ص) سے تخلیہ میں سرگوشی کرنا چاہے تو پہلے صدقہ دے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] الاحکام للآمدی فی اصول الاحکام ۳: ۱۵۴

[2] زرقانی ۔ مناهل العرفان فی علوم القرآن

[3] صبحی صالح۔ مباحث فی علوم القرآن ص ۲۶۵

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ...[1]

اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک دینار کے دس درہم لیے۔ ایک ایک درہم صدقہ فرماتے اور رسول کریم (ص) سے سرگوشی کرتے۔ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص نے صدقہ دے کر اس آیت پر عمل نہیں کیا۔[2]

اس حکم کے بعد لوگوں کی سرگوشیاں رک گئیں اور کسی نے اس آیت پر عمل نہ کیا سوائے علی علیہ السلام کے۔ آخر کچھ عرصے بعد درج ذیل آیت کے ذریعے صدقہ دینے کا حکم منسوخ ہو گیا اور ساتھ سرزنش بھی ہوئی:

ءَ اَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ..[3]

کیا تم اپنی سرگوشیوں سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے ہو؟ اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تو تم نماز قائم کرو....

قرآن مجید میں متعدد احکام ایسے ہیں جنہیں دوسری قرآنی آیات کے ذریعے منسوخ کیا گیا ہے۔ ناسخ و منسوخ کا جاننا علم القرآن کا اہم ترین باب ہے۔ ہمارے علماء نے اسی موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔

سب سے پہلے اس موضوع پر ابو محمد عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن الاصم المسمعی نے رسالۃ الناسخ و المنسوخ کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ آپ حضرت امام جعفر صادق (ع) کے شاگرد تھے۔

تاویل: اس کا مشہور مفہوم تو یہ ہے کہ ظاہر کلام سے جو مطلب اذہان میں آتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور دقیق مطلب مراد لیا جائے جو عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو۔ مثلاً اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ[4] ''کیا وہ زمین میں سیر نہیں کرتے'' کا مطلب یہ لیا جائے۔ اولم ینظروا الی القرآن ''کیا وہ قرآن کو نہیں دیکھتے؟'' وغیرہ۔

تاویل کی یہ تشریح اہل تحقیق کے نزدیک ہرگز درست نہیں ہے، بلکہ تاویل کا مطلب ہے کہ ہر حکم اور عمل کا منطقی محور، جس پر قرآنی احکام و قوانین کا دار و مدار ہوتا ہے۔

جیسے ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] ۵۸ مجادلۃ: ۱۲ [2] طبری، تفسیر ۲۸ : ۱۵ و فتح القدیر ۵ :۱۸۶ [3] ۵۸ مجادلۃ: ۱۳ [4] ۳۰ روم: ۹

وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ۝[1]

اور تم ناپتے وقت پیمانے کو پورا کر کے دو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھو، بھلائی اسی میں ہے اور انجام بھی اسی کا زیادہ بہتر ہے۔

ایک اور مقام پر کچھ اس سے زیادہ واضح طور پر تاویل کا معنی سامنے آتا ہے:

بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِہٖ وَ لَمَّا یَاۡتِہِمۡ تَاۡوِیۡلُہٗ ؕ[2]

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علم میں نہیں آئی اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں کھلا۔

تاویل کی مزید وضاحت حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے سے ہو جاتی ہے کہ جب حضرت خضر (ع) نے کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک بچے کو قتل کیا اور ایک افتادہ دیوار کو درست کرنا شروع کیا تو حضرت موسیٰ (ع) سے ضبط نہ ہو سکا کیونکہ حضرت موسیٰ (ع) ان اقدامات کے مرکزی نکتے اور ان میں پوشیدہ اسرار وحکمت سے آگاہ نہ تھے۔ چنانچہ ان اقدامات میں پوشیدہ اسرار اور حکمتوں کے بیان کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِکَ تَاۡوِیۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعۡ عَّلَیۡہِ صَبۡرًا ۝ؕ[3]

یہ ہے ان باتوں کی تاویل جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

مندرجہ بالا اور دیگر قرآنی استعمالات کے مطابق تاویل کا مطلب نہ ظاہری معنی ہے اور نہ باطنی معنی، بلکہ تاویل کا مطلب اللہ کے احکام کے اندر پوشیدہ وہ حکمتیں اور اسرار ہیں جن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے یا ان بندگانِ خاص کے پاس ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خزانۂ غیب کے علوم سے نوازا ہے:

وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ ...[4]

اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی قدس سرہ فرماتے ہیں:

و قد یستعمل التاویل و یراد منه العاقبة وما یؤول الیه الامر و علی ذلك جرت الآیة الکریمة۔[5]

تاویل سے کبھی انجام اور کسی امر کی بازگشت مراد لی جاتی ہے اور آیۂ شریفہ بھی اس معنی کے مطابق ہے۔

تفسیر اور تاویل میں فرق: کسی آیت میں مقصود الٰہی کی وضاحت کو تفسیر کہتے ہیں[6] اور کسی حکم یا عمل کے مرکزی نکتے اور حکمت کو تاویل کہتے ہیں

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] ۱۷ اسراء: ۳۵ [2] ۱۰ یونس: ۳۹ [3] ۱۸ کہف: ۸۲ [4] ۳ آل عمران: ۷
[5] البیان، امام الخوئی ص ۲۲۳ [6] البیان فی تفسیر القرآن ۔ الامام الخوئی ۔ اردو ترجمہ ص ۳۹۵

ظهره تنزيله و بطنه تاويله ۔[1] قرآن کا ظاہری معنی تنزیل اور باطنی معنی تاویل ہے.

کیا تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے ؟: اہل سنت کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے۔ جب کہ شیعہ امامیہ اور بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ ان کے نزدیک قرآن یا اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے لیے قابل استفادہ نہ ہو۔ قرآن تو انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تدبر اور غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ اگر قرآن کا کچھ حصہ نا قابل فہم ہے تو نہ تو یہ ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے اور نہ ہی اس میں غور وفکر کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔ کوئی کبھی بھی ایسا کلام نہیں کرتا جس کا مطلب خود اس کے علاوہ دوسرا کوئی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تو مقصد کلام ہی ختم ہو جاتا ہے۔

آیہ کریمہ:

وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ[2]	اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں جو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

میں وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ کوئی نیا جملہ نہیں ہے بلکہ سابقہ جملے پر عطف ہوا ہے اور آیت کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اس کی تاویل اللّٰہ اور راسخون فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جملہ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا جملہ مستانفہ حالیہ ہے۔

اس مفہوم کو تفسیر و ادب عربی کے بہت سے ماہرین نے ادبی شواہد اور قرآنی سیاق وسباق کی روشنی میں اخذ کیا ہے۔[3]

کیونکہ راسخون فی العلم علم تاویل کے ساتھ ہی مربوط ہوسکتا ہے۔ آمنا کے لیے رسوخ فی العلم کی ضرورت نہیں ہے۔ مزید برآں ایمان والوں سے تو یہ بھی کہا گیا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا ...[4] اے ایمان والو! سچا ایمان لے آؤ۔

یعنی ایمان میں پختگی نہیں ہے اس لیے نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

اللہ کی ذات وہ ہے جس نے بہترین کلام کو کتاب متشابہ کی صورت میں نازل فرمایا۔

لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے شیریں اسلوب اور اس کے اعجاز الٰہی ہونے میں ساری آیات باہم مشابہت ومماثلت رکھتی ہیں۔ غیر خدا کا کلام یعنی ادیبوں کے اشعار اور مقالات وخطبات جہاں

۱۔ وسائل الشیعة ۲۷: ۱۹۶ ۲۔ ۳ آل عمران: ۷

۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر المنار ۳: ۱۶۷۔ تاویل مشکل القرآن وغیرہ ۴۔ ۴ نساء: ۱۳۶

فصاحت و بلاغت کے شاہکار ہوتے ہیں وہاں ان میں کمزور پہلو اور سرقت شعری وفکری کا عنصر ضرور دکھائی دیتا ہے، مگر قرآن میں اس قسم کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ یہ اول سے لے کر آخر تک معجزہ ہے اور اس کے اعجاز میں کہیں فرق نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ یہ ایک ہی مطلب متعدد مقامات پر پیش کرتے وقت مختلف اسلوبِ کلام اختیار کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرا اسلوب پہلے سے یا پہلا دوسرے سے کمتر ہے۔ دونوں اسلوب معجزہ اور دونوں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس اعتبار سے پورا قرآن باہم متشابہ ہے۔

دوسری طرف کچھ آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن محکم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ...[1] یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں۔

لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ آیات کا مجموعہ یعنی قرآن ایک ناقابل خلل دستور ہے اور اس کے قوانین محکم اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں۔ اس کے افکار کی پختگی، قوانین کے باہمی ارتباط اور نظام کی ہم آہنگی میں کوئی خلل نہیں ہے۔

بعض آیات قرآنی یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں۔ کچھ محکم اور کچھ متشابہ۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ[2] وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں، وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔

اس بات میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں چند متشابہ آیات موجود ہیں اور ایسی آیات بہت کم ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن میں متشابہ آیات نہیں ہیں کیونکہ اگر اس میں متشابہ آیات ہوتیں تو لوگ انہیں نہ سمجھ سکتے۔ اس طرح قرآن سب لوگوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت نہیں بن سکتا تھا، جب کہ خود قرآن کہتا ہے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ○[3] یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

جب کہ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن پورے کا پورا متشابہ ہے اور سب کے لیے قابل فہم نہیں ہے۔

یہ دونوں نظریے ناقابل قبول ہیں۔ کیونکہ قرآن میں متشابہ آیات کا موجود ہونا اس بات کے منافی

---

[1] ۱۱ ھود: ۱ [2] ۳ آل عمران: ۷ [3] ۳ آل عمران: ۱۳۸

نہیں کہ قرآن ہدایت کا سرچشمہ ہے، کیونکہ قرآن میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو کسی طرح بھی قابل فہم نہ ہو۔ متشابہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے ذرائع کی مدد سے بھی ناقابل فہم ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آیت از خود قابل فہم نہیں ہے بلکہ دیگر آیات و احادیث کے ذریعے قابل فہم ہے۔[1]

دوسرا نظریہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں کہ قرآن نے خود فرمایا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ [2] کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔

اگر قرآن ہمارے لیے ناقابل فہم ہے تو پھر ہم تدبر فی القرآن کیسے کر سکتے ہیں۔

نفاذ اور انطباق: چونکہ قرآن مجید بنی نوع انسان کے لیے ایک ابدی دستور ہے۔ لہٰذا جس طرح دور نزول میں جس امر پر منطبق ہوتا تھا، اسی طرح آئندہ آنے والے اس قسم کے تمام امور پر بھی نافذ و منطبق ہو گا۔ بشرطیکہ زمانۂ نزول کے تمام حالات و شرائط اس امر میں موجود ہوں۔

لہٰذا جو فرائض زمانۂ نزول کے لوگوں پر عائد ہوتے تھے، وہی فرائض آنے والے لوگوں پر بھی عائد ہوں گے۔ زمانۂ نزول وحی میں کسی شخص کی مدح ہوتی ہے تو اس قسم کے اوصاف رکھنے والے تمام افراد پر یہ مدح منطبق ہوگی اور اگر زمانۂ نزول میں کسی کی مذمت ہوئی ہے تو آئندہ بھی اس قسم کے اوصاف رذیلہ رکھنے والوں پر اس مذمت کا حکم جاری ہو گا۔

پس شان نزول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آیت صرف شان نزول پر ہی منحصر و منجمد ہو گئی ہے۔ اس بات کو مفسرین یوں بیان کرتے ہیں:

العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ لفظ کی عمومیت دیکھی جاتی ہے خواہ سبب خاص کیوں نہ ہو۔

اسی مفہوم کو احادیث معصومین میں (ع) جَـری (نفاذ) و انطباق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

ولـو ان الآية نزلت فی قوم ثم مات اولـئك مـاتـت الآية لـمـا بقی من الـقرآن شیء، ولکن القرآن یجری اولـه علی آخره ما دامت السمٰوٰت والارض۔ [3]

اور اگر کسی قوم و جماعت کے بارے میں ایک آیت نازل ہوتی اور پھر ان لوگوں کے مر جانے پر آیت کی افادیت بھی ختم ہو جاتی تو اس طرح تو قرآن ختم ہو کر رہ جاتا، حالانکہ جب تک آسمان و زمین باقی ہیں، قرآن بھی اول و آخر جاری و نافذ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے درج ذیل آیت کے بارے میں پوچھا گیا:

---

[1] مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر آیہ ۷ سورہ آل عمران [2] ۴ نساء: ۸۲ و ۴۷ محمد: ۲۴

[3] البیان فی تفسیر القرآن امام الخوئی، ص ۲۳

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ...[1]

اور اللہ نے جن رشتوں کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں قائم رکھتے ہیں۔

تو آپ(ع) نے فرمایا:

هـذه نـزلـت فـي رحـم آل محمد صـلـى الـلـه عليه و آله وسلم وقد تـكـون فـي قرابتك فلا تكونن ممن يقول للشيء انه في شيء واحد۔[2]

یہ آیت آل محمدؐ کے صلۂ رحم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ تیرے اقربا کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے۔ تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو کہتے ہیں کہ یہ ایک ہی شے میں منحصر ہے۔

شان نزول: قرآن مجید کی آیات مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے نازل ہوئی ہیں۔ کچھ آیات کسی سوال کے جواب میں اور کچھ بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ کچھ کسی اہم واقعے کے سلسلے میں اور کچھ کسی شخصیت یا اشخاص کی مدح یا قدح میں نازل ہوئیں۔ لیکن کچھ آیات ایسی بھی ہیں جو صرف بیان احکام کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

قرآن فہمی کے لیے شان نزول کا علم ضروری ہے۔ اگر کسی کلام کے صادر ہونے کے موقع اور مناسبت کا علم ہو تو اس کلام کے حقیقی مفہوم کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور اگر کسی کلام کے محل نزول کا علم نہ ہو تو اس کا رخ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے زیادہ رموز قرآن سے واقف ہیں۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

مـا نـزلـت فـي الـقـران اية الا و قد عـلـمـت اين نزلت و فيمن نزلت و في اى شئ نزلت و في سهل نزلت ام في جبل نزلت ۔[3]

قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہاں نازل ہوئی، کس کے بارے میں نازل ہوئی، کس چیز کے بارے میں نازل ہوئی، میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر نازل ہوئی ۔

روایت ہے کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

سـلـونـي فـو الـلّٰـه لا تسئلوني عن شـيء الا اخبـرتـكم ، وسلوني عن كتاب الله فوالله ما من آية الا و انا اعـلـم ابـلـيـل نـزلـت ام بنهار ام في سهل ام في جبل۔[4]

مجھ سے پوچھ لو۔ قسم بخدا تم جس چیز کے بارے میں بھی پوچھو گے میں تمہیں بتاؤں گا اور مجھ سے قرآن کے بارے میں پوچھو۔ بخدا کوئی ایسی آیت نہیں مگر یہ کہ میں اسے جانتا ہوں کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن میں، میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

حضرت علی علیہ السلام نے علم قرآن کو زمان و مکانِ نزول کے ساتھ مربوط فرمایا۔ اس سے یہ بات

---

[1] ۱۳ رعد : ۲۱ [2] البیان فی تفسیر القرآن۔ امام الخوئی، ص۲۳ [3] بحار الانوار ۸۹ : ۷۹

[4] سعد السعود ص۲۸۴۔ شواهد التنزيل ۱ : ۴۱ ۔ کچھ فرق کے ساتھ ۔ صحيح مسلم

سامنے آتی ہے کہ فہم قرآن اس کے بغیر مشکل ہے۔ کیونکہ جس محل و موقعے پر کلام نازل ہوا ہے، اس کا کلام کے مفہوم کے ساتھ ربط ہوتا ہے۔ مزید برآں کلام فہمی میں مخاطَب یا مخاطَبین کے نظریے اور خیالات کا بھی دخل ہوتا ہے۔مثلاً درج ذیل آیت ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا [۱]

صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں۔

شان نزول سے ہٹ کر آیت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مفہوم یہ معلوم ہوتا کہ صفا اور مروہ کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی ممنوع نہیں، جائز کام ہے۔ اس کلام سے ہرگز یہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا کہ صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنا واجب اور حج و عمرے کا جزو اور حصہ ہے۔ جب کہ اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر زمانۂ جاہلیت میں مشرکوں کے دیوتاؤں کی مورتیاں نصب تھیں اور وہ ان پہاڑیوں میں دوڑ لگاتے اور ان بتوں کو چومتے تھے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو یہ خیال گزرا کہ کہیں صفا و مروہ کے درمیان سعی مشرکین کے شعائر میں سے تو نہیں؟ جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں ۔ پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں۔

لہٰذا شان نزول معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس طرز خطاب سے صحیح مفہوم کا اخذ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ سب قرآنی آیات کے لیے شان نزول کا ہونا ضروری ہو، بلکہ قرآن مجید کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہے جو کسی واقعے یا حادثے کے سلسلے میں نہیں، بلکہ قرآن از خود احکام و قصصِ انبیاء بیان کرتا ہے۔

شان نزول کے سلسلے میں ایک اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ قرآنی آیات کی شان نزول کے بارے میں روایات نہایت متضاد ہیں۔ خاص کر اسرائیلیات پر مبنی روایات کی کثرت کی وجہ سے اکثر روایات ناقابل اعتنا ہیں ۔ مفسر اور محقق کے لیے ایسے مقام پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کہ کون سی روایت سیاق و سباق آیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

نسخہ ہائے قرآن: آسمانی کتب میں سے کسی کتاب کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو قرآن مجید کو حاصل ہوا ہے۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں مسلمانوں نے اپنی تمام تر توجہات قرآن مجید پر مبذول رکھیں۔ چنانچہ اسلامی ممالک کے مختلف شہروں میں ہزاروں مساجد، مکاتب، مدارس، کتب خانے، اور اسلامی مراکز میں

----

[۱] ۲ بقرہ: ۱۵۸

اس مقدس کتاب کے ہزاروں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں اور اب جب کہ طباعت کے آسان طریقے ایجاد ہو گئے ہیں اور اس کے لاکھوں نسخے طبع ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے ابھی تک ہاتھ سے کتابت قرآن کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

قرآن کی طباعت: قرآن کا پہلا ایڈیشن سب سے پہلے ۱۵۳۰ء میں اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں طبع ہوا، لیکن چرچ کی طرف سے تمام قرآنی نسخے ضبط ہوگئے اور اس کی طباعت پر پابندی عائد ہوگئی۔ اس کے باجود اس ایڈیشن کا ایک نسخہ ابھی تک وینس کی ایک لائبریری میں محفوظ ہے۔[۱]

پھر ۱۶۹۴ء میں جرمنی کے شہر ہمبرگ (Humberg) میں قرآن کا ایک ایڈیشن طبع ہوا۔ اس کے کچھ نسخے دار الکتب العربیہ مصر میں اب تک محفوظ ہیں۔

پھر ۱۷۶۸ء میں جرمنی میں اس کی طباعت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۷۹۷ء میں روس کے مسلمانوں نے قرآن کی طباعت کی۔

یورپ میں طبع شدہ قرآنی نسخوں کو مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے قلمی نسخوں ہی سے تلاوت جاری رکھی۔ اس طرح مسلمانوں نے غیروں کی ہر ممکنہ سازش کو ناکام بنا دیا۔

عالم اسلام میں سب سے پہلے ایران میں ۱۲۳۲ھ بمطابق ۱۸۱۷ء میں تبریز میں ایک طبع خانہ قائم کیا گیا جس میں ۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۸۲۸ء میں قرآن طبع کیا گیا۔[۲]

اس کے بعد ۱۲۶۶ھ میں کلکتہ میں اور بعد ازاں ہندوستان کے متعدد دوسرے شہروں میں قرآن مجید طبع ہونا شروع ہوگیا۔

نقطہ نگاری: شروع میں قرآن مجید کی کتابت نقطوں کے بغیر ہوتی تھی۔ باء، تا، ثا اور یا میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ج، ح اور خ میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے صدر اسلام میں قرائت قرآن کے لیے صرف نسخہ ہائے قرآن ہی کافی نہ تھے بلکہ استادوں سے سینہ بہ سینہ حفظ کرنا بھی ضروری تھا۔ مثلاً نبلو کو بے نقطہ ہونے کی وجہ سے چھ طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا:

نَبلو، تَبلو، یَبلو، نَتلو، تَتلو، یَتلو اور اسی طرح کو بے نقطہ ہونے کی وجہ سے یَعلم، تَعلم اور نَعلم تین طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔

اسی وجہ سے قرأتوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ مثلاً بعض نے سورۂ آل عمران کی ۴۸ ویں آیت میں یعلمہ پڑھا اور بعض نے نعلمہ۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی ۲۵۹ ویں آیت میں بعض نے نَنشُزُھا اور بعض نے تَنشُزُھا پڑھا۔

---

[۱] روزنامہ جنگ ۶ مارچ ۱۹۸۹ء
[۲] الخط العربی الاسلامی ص۱۲۳ بحوالہ التمہید ۱: ۳۵۷

بایں ہمہ عرب اپنے عربی سلیقے سے سمجھ سکتے تھے کہ کہاں کیا پڑھنا ہے۔

لیکن جب اسلامی مملکت میں وسعت کے نتیجے میں عرب وعجم میں اختلاط پیدا ہوگیا تو غیر عربوں کے لیے یہ بات ناممکن تھی کہ بغیر نقاط اور علامات کے اجنبی الفاظ کا صحیح تلفظ کرسکیں۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں حروف پر نقطہ نگاری کا عمل شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے یحیی بن یعمر اور نصر بن عاصم نے حروف پر نقطے ڈالے۔[1]

واضح رہے کہ نصر بن عاصم اور یحیٰ بن یعمر دونوں حضرت ابو الاسود دئولی کے شاگرد ہیں جو خود حضرت علی علیہ السلام کے معروف شاگرد تھے۔

اِعراب: عربی زبان میں اِعراب زبر، زیر، پیش بھی کلام فہمی میں بہت مدد دیتے ہیں۔ خود عرب تو اہل زبان ہونے کی بنا پر اپنے فطری سلیقے سے کَتَبَ اور کُتِبَ میں فرق بغیر اِعراب کے بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن غیر عرب کے لیے یہ بات ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرت ابو الاسود دوئلی نے ہی پہلی بار زبر، زیر اور پیش کے لیے علامات وضع کیں۔ چنانچہ: زبر کے لیے حرف کے اوپر دو نقطے، زیر کے لیے حرف کے نیچے دو نقطے اور پیش کے لیے حرف کے سامنے دو نقطوں سے علامات وضع کیں۔

اکثر ان علامتوں کو سرخ رنگ میں لکھا جاتا تھا جب کہ آیات کو اور الفاظ کے نقاط کو سیاہ روشنائی سے تحریر کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے اِعراب والے چند نسخے ابھی تک محفوظ ہیں۔

بعد میں خلیل بن احمد فراہیدی نے اِعراب کی موجودہ شکل وضع کی۔ یعنی زبر کے لیے حرف کے اوپر ایک لکیر، زیر کے لیے حرف کے نیچے ایک لکیر، پیش کے لیے حرف کے اوپر ایک واو، تنوین کے لیے دو لکیریں یا دو واو اور جزم کی علامت کے لیے حرف خ کا سرا علامت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس سے خفیف جزم کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ بعد میں جزم کے لیے حرف میم کا سرا استعمال ہونے لگا۔ اس سے جزم کے سکون ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے اور شد کے لیے شین کا سرا رمز کے طور پر اپنایا گیا۔

----

[1] مناھل العرفان ۱: ۳۹۹

تحریف قرآن

ایک باطل نظریہ

قرآن تحریف ناپذیر معجزہ ہے

قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت پر اللہ کی طرف سے ایک معجزہ ہے:

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

یہ ایک بالادست کتاب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے، نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے لائق ستائش (رَبْ) کی نازل کردہ ہے۔ (۴۱ حمٓ سجدۃ:۴۱-۴۲)

یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو معجزہ عنایت کرے، پھر وہ معجزہ ناتمام رہ جائے یا اس معجزے کی طرف باطل قوتوں کو اپنا ہاتھ دراز کرنے کا موقع مل جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) کے معجزات ان کے بیرونی دشمن فرعون اور داخلی دشمن سامری کی دست درازی کی زد میں آ جائیں؟ حاشا و کلا۔

روایت اور نظریہ۔ نظریہ تجسیم۔ خیانت۔ نظریہ جبر اور تحریف۔ وہ نظریات جن سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔ دو گواہ۔ آیت رجم۔ احادیث سبعة احرف۔ نسخ تلاوت۔

دشمنانِ اسلام نے قدیم زمانے سے اپنی سازشیں اس بات پر مرکوز رکھیں کہ قرآن کو مخدوش اور متنازعہ بنائیں۔ بدقسمتی سے خود امت قرآن کے بعض افراد محض فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اس پروپیگنڈے کو ہوا دینے میں دشمنوں کے ہمدوش ہو گئے کہ فلاں فرقہ تحریف قرآن کا قائل ہے۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ اس الزام سے قرآن کو مشکوک بنا رہے ہیں۔ نظریاتی مخالفین سے عناد اور جاہلانہ تعصب کی وجہ سے ان کے فہم وادراک کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہمارے سارے علماء اپنا اجماعی موقف بیان کریں کہ ہمارے نزدیک تحریف قرآن کا نظریہ سراسر باطل، فرسودہ اور شواذ میں شامل ہے اور ایسے شواذ کسی مسلک و مذہب میں قابل اعتنا نہیں ہوتے، پھر بھی یہ لوگ نہیں مانتے۔ حالانکہ امانت و دیانت کا کوئی شائبہ ہوتا تو اس حد تک بہتان تراشی اور کذب وافترا کا ارتکاب نہ کرتے اور کچھ خوف خدا کرتے۔

ہم ذیل میں اس موضوع سے متعلق کچھ بیان کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ بعض باتوں کا تذکرہ خود ہم پر بھی گراں گزرتا ہے، لیکن ایک موقف کو ذہن نشین کرانے کے لیے کبھی مخاطب کو خود اس کے اپنے حالات کی روشنی میں سمجھانا پڑتا ہے۔ ہم ان حضرات سے معذرت چاہتے ہیں جو اس تنگ نظری اور بد دیانتی و خیانت کے مرتکب نہیں ہیں۔

روایت اور نظریہ: کسی مکتب فکر کی کتب میں روایات کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مکتب فکر ان روایات کے مطابق نظریہ قائم کرتا ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مکتب فکر کے علمائے سلف نے ایک نظریہ قائم کیا ہو، لیکن بعد کے علماء اس نظریے پر قائم نہ رہے ہوں۔ اس صورت میں انصاف و دیانت کا تقاضا، کیا یہ ہے کہ اس مکتب فکر کو ان کے علمائے سلف کے نظریے کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے یا موجودہ موقف کو قبول کیا جائے؟

نظریہ تجسیم: اللہ تعالیٰ کے جسم اور جسمانی ہونے کے سلسلے میں آپ درج ذیل مطالب کا مطالعہ فرمائیں اور فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں:

☆ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ اپنا قدم جہنم میں ڈال دے گا۔[1]

---

[1] صحیح بخاری ۲: ۳۳ طبع مصرح ۴۴۷۲۔ صحیح مسلم ۱: ۱۷۲ طبع لکھنو۔
سعودی عرب کے ایک سکول میں استاد نے شاگرد سے پوچھا: بِمَ تعرف ربك؟ یعنی تم اپنے رب کو کس چیز سے پہچانتے ہو؟ شاگرد بولا: برجلہ المحروق یعنی اس کے جلے ہوئے پاؤں سے۔

☆ امـام الحنابله ابن تیمیة کا کہنا ہے: خدا عرش سے آسمان دنیا پر اسی طرح اترتا ہے جس طرح ہم اترتے ہیں۔ پھر خود زینے سے اتر کر کہا: اس طرح!![1]
☆ خدا کی آنکھیں دکھنے لگیں تو ملائکہ نے اللہ کی عیادت کی۔ طوفان نوح پر خدا اس قدر رویا کہ آنکھیں سوجھ گئیں۔ عرش پر خدا بیٹھتا ہے تو اس کے بوجھ سے عرش چرچرا تا ہے اور عرش کے چاروں طرف سے خدا کا جسم چار انگل باہر لٹکتا رہتا ہے۔[2]
☆ اللہ کی داڑھی اور علامت مرد و زن کے بارے میں نہ پوچھو۔ باقی جس عضو کے بارے میں جو چاہو پوچھو۔[3]
☆ علمائے سلف ان لوگوں کی تکفیر کرتے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اللہ کہاں ہے اور اللہ کے لیے جگہ کا تعین نہیں کرتے۔[4]
☆ جو شخص یہ نہیں کہتا کہ اللہ زمین میں نہیں، آسمان میں ہے، وہ کافر ہے۔[5]
☆ انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول کریم (ص) نے بارش کو اپنے جسم پر لینے کے لیے لباس ہٹا دیا تو سوال ہونے پر فرمایا: لانـه حـديث العهد بربه۔ یہ ابھی اپنے رب کے پاس سے آ رہی ہے۔[6]

مولانا شبلی نعمانی ان نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عقائد میں جس طرح درجہ بدرجہ تغیر ہوتا جاتا ہے، اسے ہم ایک خاص مسئلے کی مثال میں پیش کرتے ہیں:

پہلا درجہ: خدا جسمانی ہے۔ عرش پر متمکن ہے۔ اس کے ہاتھ منہ ہیں۔ خدا نے آنحضرت (ص) کے دوش پر ہاتھ رکھ دیا تو آنحضرت کو (ص) ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

دوسرا درجہ: خدا جسمانی ہے۔ اس کے ہاتھ، منہ اور پنڈلی ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جیسی ہماری ہیں۔[7]

اللہ کے جسم اور جسمانی ہونے پر علمائے سلف کے دلائل کا مطالعہ کرنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں جن میں اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے پر بہت سے دلائل قائم کیے گئے ہیں۔

۱۔ کتاب السنة۔ تالیف: امام احمد بن حنبل امام الحنابلة۔ طبع دار ابن القيم السعودية۔

۱۔ رحلة ابن بطوطة ۱: ۴۳ باب بعض المشاهد والمزارات (مكتبة الشاملة) ۲۔ منهاج السنة ۱: ۲۳۸ طبع مصر
۳۔ الشهرستانی: الملل و النحل ۱: ۴۸ طبع بمبئی ۴۔ الدارمی الرد على الجهمية ص ۹۶
۵۔ حوالہ سابق ۶۔ حوالہ سابق ص ۲۰ ۷۔ علم الکلام صفحہ ۱۵ طبع اعظم گڑھ

۲۔ کتاب الابانۃ۔۔ تالیف: ابوالحسن اشعری امام الاشاعرہ ۔طبع حیدر آباد دکن۔

۳۔الرد علی الجھمیۃ ۔ تالیف: امام احمد بن حنبل اامام الحنابلۃ۔طبع دار الوعی حلب ۔شام۔

۴۔ خلق افعال العباد۔ تالیف: محمد بن اسماعیل مؤلف صحیح بخاری ۔

۵۔ کتاب العرش والعلو۔ تالیف: الحافظ شمس الدین الذہبی، امام الحدیث۔،مطبع فاروقی دہلی۔ ہندوستان

۶۔ کتاب الرد علی الجھمیۃ ۔ تالیف: الامام عثمان بن سعید الدارمی طبع بریل لیدن۔

۷۔ کتاب التوحید۔ تالیف: الامام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ۔طبع ریاض۔سعودی عرب۔

۸۔ اجتماع الجیوش الاسلامیۃ ۔ تالیف:ابن قیم الجوزیہ۔طبع مکتبہ ابن تیمیہ ۔قاہرہ ۔مصر۔

۹۔ الشریعۃ ۔ تالیف: ابوبکر محمد بن الحسین الاجری الشافعی۔ طبع دار السلام۔ ریاض۔سعودی عرب۔

۱۰۔ السنۃ ۔ تالیف: احمد بن محمد الخلال البغدادی، شیخ الحنابلۃ۔طبع دمشق۔شام

۱۱۔ مناھج الدولۃ ۔ تالیف: الحکیم ابن رشد۔

ان کتابوں میں اللہ کے جسمانی ہونے پر دلائل موجود ہیں اور ان کے مؤلفین میں سے بعض ائمۂ مذاہب ہیں ۔بعض امام الحدیث ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کتب اور بیسیوں روایات موجود ہیں ۔[۱]

ائمۂ مذاہب کے اس نظریے کو بنیاد بنایا جائے اور اللہ کے جسمانی نہ ہونے پر اس مذہب کے دیگر سینکڑوں علماء کے نظریات و دلائل کو نظرانداز کیا جائے اور بقول شبلی نعمانی '' عقائد میں درجہ بدرجہ رونما ہونے والے تغیر'' کو اعتنا میں نہ لایا جائے اور اس مذہب کو '' فرقہ مجسمہ'' قرار دے کر اس کے عقیدہ توحید کو مخدوش قرار دیا جائے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا آپ اس عمل کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خلوص قرار دیں گے یا آپ کہیں گے کہ اس شخص نے ہمارے مذہب کے ساتھ عناد اور دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان اختلافی مسائل کا گہرا مطالعہ رکھنے والے انصاف پسند ہمارے اس موقف کی حمایت کریں گے

۱۔ان کے علاوہ درج ذیل کتب بھی اللہ کے جسمانی ہونے پر دلائل سے پُر ہیں:

۱۔ ابو یعلی۔ نقص التاویلات ۲۔ ابو نصر۔ الابانۃ ۳۔عسال۔ السنۃ ۴۔ ابو بکر عاصم ۔ السنۃ ۵۔ طبرانی السنۃ ۶۔حرب السیرجانی ۔الجامع ۷۔حکم بن معبد خزاعی۔الصفات۔

کہ قرآن کے بارے میں اس سے کہیں کمتر مواد کو بعض مکاتب فکر کے حامیوں نے ہمارے (امامیہ کے) خلاف استعمال کیا اور عدم تحریف کے بارے میں ہمارے علمائے سلف و خلف کے اجماعی موقف کو نظرا نداز کیااور شواذ کو ہمارے خلاف دلیل بنایا۔ اگر بفرض محال امامیہ کے بارے میں یہ موقف صحیح ہے تو اس کی زد میں خود اعتراض کنندہ بھی آ جاتا ہے، کیونکہ شواذ تو ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ امام عبد الوہاب شعرانی کو اگر لوگوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ ان تمام آیات کو بیان کرتے جو مصحف عثمان سے رہ گئی ہیں:

لو لا ما یسبق للقلوب الضعیفة و وضع الحکمة فی غیر اهلها لبینت جمیع ماسقط من مصحف عثمان۔[1]

اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کم فہم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے نیز نااہل لوگوں کے ہاتھوں حکمت آ جائے گی تو میں ان سب آیات کو بیان کر دیتا جو مصحف عثمان سے رہ گئی ہیں۔

دیوبند کے صدر المدرسین شیخ الحدیث سید انور شاہ کشمیری کی تحقیق کے مطابق بھی قرآن میں لفظی تحریف واقع ہوگئی ہے۔ بقول ان کے:

والذی تحقق عندی ان التحریف فیه لفظی اما انه عن عمد منهم او لغفلة۔[2]

میرے نزدیک تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تحریف لفظی واقع ہوئی ہے، خواہ عمداً ہو یا غفلت کی بنا پر۔

چنانچہ فیض الباری کے فاضل محشی شیخ الحدیث مولانا محمد بدر عالم استاد الحدیث دیوبند نے اپنے ذیلی حاشیہ البدر الساری میں مندرجہ بالا عبارت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

سید محمود آلوسی بغدادی تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں اور شیخ الحدیث حبیب الرحمٰن کاندھلوی صدیقی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں:

نعم اسقط زمن الصدیق مالم یتواتر او ما نسخت تلاوته۔

ہاں صدیق (حضرت ابوبکر) کے زمانے میں وہ آیات جو متواتر نہ تھیں یا جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی تھی حذف کی گئیں۔

قرآن کے بارے میں مجموعی طور پر مذہب اشعری کے ایک گروہ کا نظریہ دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اس اسلامی فرقے کا ایسا نظریہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ نظریہ اس طرح ہے:

ان القرآ ن لم ینزل قط علی قلب محمد علیه الصلوة و السلام ۔ و ان مانقرأ فی الصلوة و نحفظ فی

اللہ تعالیٰ کا کلام جبرئیل علیہ السلام نے قلب محمد (ص) پر نازل نہیں کیا اور جو چیز ہم نماز میں پڑھتے اور سینے میں (قرآن کے نام سے) محفوظ رکھتے ہیں، ان

---

[1] کبریت احمر برحاشیة الیواقیت و الجواهر ا: ۱۳۹۔ طبع مصر
[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ۳: ۳۹۵

الصدور لیس هو القران البتة۔[1] — میں سے کوئی چیز کلام اللہ نہیں ہے۔

اسی کتاب میں یہ عبارت بھی آپ پڑھیں گے (جسے ہم بخوشی نقل نہیں کر رہے ہیں):

ولقد اخبرنی علی بن حمزه المرادی الصقلی انه رای بعض الاشعریة یبطح المصحف برجله قال: فاکبرت ذالك وقلت له: ویحك هكذاتصنع بالمصحف و فیه كلام الله تعالیٰ؟ فقال: ویلك والله مافیه الاالسخام والسوادواما كلام اللّٰه فلا۔

علی ابن حمزہ مرادی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے مذہب اشعری کے ایک پیروکار کو دیکھا کہ وہ اپنے پاؤں سے قرآن کو ٹھوکر مار رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی جسارت سمجھ کر اس سے کہا: افسوس ہو تم پر، اس مصحف کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو جب کہ اس میں اللہ کا کلام ہے؟ اس نے کہا: تباہی ہو تم پر، قسم بخدا اس میں کلام خدا نہیں بلکہ صرف سیاہ لکیریں ہیں۔

آگے لکھتے ہیں:

و كتب الی ابو المرحی بن رزوار المصری: ان بعض ثقات اهل مصر من طلاب السنن اخبره: ان رجلا من الاشعرية قال له مشافهة: علی من یقول ان اللّٰه قال: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ الف لعنة.

اور ابو المرحی بن رزوار مصری نے مجھے لکھا کہ مصر کے بعض ثقہ طالب علموں نے اسے بتایا کہ ایک اشعری نے اس سے بالمشافہ کہا: جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ کہا ہے، اس پر ہزار لعنت ہو۔

ہمارا مؤقف یہ ہے کہ اس قسم کے شواذ کی کوئی اہمیت نہیں اور اجماع امت کے خلاف شاذ و نادر اقوال قابل اعتنا نہیں ہیں۔ یعنی جس طرح مذہب اشعری کے ماننے والے ایسے اقوال کو اہمیت نہیں دیتے ہم بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

امانت: جامعۃ الازہر کے جلیل القدر استاد الشیخ محمد غزالی کو ان کی امانت اور دیانتداری نے ان لوگوں کے خلاف قلم اٹھانے پر مجبور کیا جو امامیہ پر تحریف قرآن کے قائل ہونے کی جھوٹی تہمت لگا کر غیر شرعی حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجھے بعض لوگوں پر سخت افسوس ہوتا ہے جو بلا تحقیق بات کر جاتے ہیں اور نتائج کی پرواہ کیے بغیر تہمتیں لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مریض اخلاق کے ساتھ اسلام کے فکری میدان میں قدم رکھتے ہیں اور اسلام و امت مسلمہ کے خلاف گستاخی کرتے ہیں۔ میں نے ایک محفل میں کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

---

[1] ابن حزم۔ الفصل فی الملل و النحل ۴: ۱۵۹۔ طبع مصر

شیعوں کا ایک اور قرآن ہے جو ہمارے معروف قرآن سے مختلف ہے۔ میں نے اس سے کہا: وہ قرآن کہاں ہے؟ عالم اسلام تین براعظموں پر پھیلا ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے لے کر آج تک چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور لوگوں کو صرف ایک ہی قرآن کا علم ہے جس کے آغاز و اختتام اور سورہ و آیت کی تعداد تک معلوم ہے۔ پس یہ دوسرا قرآن کہاں ہے؟ اتنے طویل عرصے سے کسی جن و انس کو اس کے کسی نسخے کا علم کیوں نہ ہو سکا؟ یہ بہتان کیوں لگایا جاتا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کس کے مفاد کے لیے کیا جاتا ہے؟ اس سے اپنے بھائیوں اور کتاب اللہ کے بارے میں بدگمانیاں پھیلتی ہیں۔ قرآن ایک ہی ہے جو اگر قاہرہ میں چھپتا ہے تو اسے نجف اور تہران میں بھی مقدس سمجھا جاتا ہے... پھر بعض لوگوں پر نیز وحی الٰہی پر ایسے بہتان کیوں باندھے جاتے ہیں؟[1]

شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند علامہ شمس الحق اپنی کتاب علوم القرآن میں لکھتے ہیں:

شیعوں کا نظریہ وہی ہے جو سنیوں کا ہے کہ قرآن مکمل طور پر محفوظ ہے جس میں ایک آیت کی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔ اس بات کی دلیل کے لیے شیعوں کی متعدد کتب کا حوالہ پیش کرتا ہوں۔[2]

مشہور مفسر علامہ عبدالحق حقانی اپنی معروف تفسیر فتح المنان فی تفسیر القرآن المعروف تفسیر الحقانی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

آج تک سلف سے لے کر خلف تک کوئی محقق شیعہ بلکہ کوئی اہل اسلام بھی یہ عقیدہ (کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے) نہیں رکھتا۔ چنانچہ شیعہ علماء اس خیال کی برائت اپنی کتب میں بڑی شد و مد سے کرتے ہیں۔[3]

خیانت: حضرت علامہ رحمۃ اللہ کیرانوی اپنی معروف تصنیف اظہار الحق جلد دوم صفحہ ۸۹ تا ۹۰ میں عدم تحریف قرآن کے بارے میں امامیہ کا واضح موقف نقل کرتے ہیں اور امامیہ کے علمائے سلف کے اقوال سے اس موقف کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ کتاب قاہرہ، استنبول، مغرب عربی اور کراچی سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔ ترکی، فرانسیسی، انگریزی، گجراتی اور اردو زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا ہے مگر کسی ایڈیشن میں کوئی کمی و بیشی اور خیانت نہیں ہوئی۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ سعودی عرب کا معروف ادارہ

---

[1] دفاع عن العقیدۃ و الشریعۃ۔ صفحہ ۲۶۶۔ طبع دار الکتب الحدیثۃ۔ مصر ۱۹۷۵ء

[2] علوم القرآن ۱۳۴ [3] تفسیر حقانی ۱: ۶۳ طبع دیوبند

رئاسة الادارات للبحوث العلمية و الافتاء والدعوة والارشاد (ریاض) کی طرف سے شائع شدہ کتاب اظهار الحق میں انتہائی علمی بد دیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈھائی صفحات پر مشتمل وہ متن حذف کر دیا گیا ہے جس میں مؤلف نے ثابت کیا تھا کہ اہل تشیع عدم تحریف قرآن کے قائل ہیں۔

نظریہ جبر اور تحریف: ہمارے شامی دوست سعد رستم ناقل ہیں کہ ایک روز اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے مصری اور مقامی اساتذہ شیعوں کے ایمان بالقرآن پر گفتگو کر رہے تھے اور اس بات کو مسلمہ مان رہے تھے کہ شیعہ اس قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ حال دیکھ کر مجھے بھی شک ہوا اور میں نے گھر جا کر اپنی ایرانی نژاد شیعہ بیوی سے سوال کیا: کیا شیعہ اس قرآن کو نہیں مانتے؟ میری بیوی کے جواب کا لب و لہجہ دیکھ کر مجھے یقین آیا کہ شیعہ اسی قرآن پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے دن میں نے اساتذہ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کی جو توجیہ کی وہ ایک یادگار لطیفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: در اصل شیعہ علماء اپنے عوام پر اس عقیدے کا اظہار نہیں کرتے کہ وہ اس قرآن کو نہیں مانتے، جیسا کہ ہم عقیدۂ جبر کا اپنے عوام کے سامنے اظہار نہیں کرتے۔

اسلامی یونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمت میں مؤدبانہ عرض ہے کہ نظریۂ جبر پر آپ کا جبر نہیں چل سکا اور یہ نظریہ خواص کے ساتھ بہت سے عوام تک پہنچا ہوا ہے، البتہ آپ اس کا پرچار نہیں کرتے۔ شاید اس میں آپ اپنی خفت محسوس کرتے ہوں گے۔ اگر امامیہ اس قسم کا عقیدہ رکھتے تو اس پر ہمارا بھی جبر نہ چلتا اور یہ بات کسی نہ کسی طرح اپنے عوام تک پہنچ جاتی۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شيئا الا ظهر في فلتات لسانه وصفحات وجهه۔[1]

جس کسی نے بھی کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی وہ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلے ہوئے الفاظ اور چہرے کے آثار سے ضرور نمایاں ہو جاتی ہے۔

وہ نظریات جن سے تحریف قرآن لازم آتی ہے: امامیہ ان نظریات کو مسترد کرتے ہیں، جن سے قرآن کا تحفظ مخدوش ہوتا ہے:

۱۔ **دو گواہ:** یہ بات اہل سنت کے مصادر میں مسلم سمجھی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں قرآن زید بن ثابت انصاری کے زیر ادارت صرف دو گواہوں کی شہادت کی بنیاد پر جمع کیا گیا۔ یعنی اگر دو گواہوں نے شہادت دی کہ یہ عبارت قرآن کا حصہ ہے تو اسے قرآن میں شامل کر لیا گیا، بلکہ چند آیات تو صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کی گواہی پر قرآن میں شامل کی گئیں۔

یہاں درج ذیل دلچسپ نکات کا ملاحظہ ضروری ہے:

---

[1] نہج البلاغۃ: کلمات قصار: ۲۵

i۔ ثبوت قرآن کے لیے تواتر کے شرط ہونے پر اجماع قائم ہے۔ تواتر کے بغیر قرآن ثابت نہیں ہوتا۔

ii۔ اگر بفرض محال دو گواہوں کی بنیاد پر ہی قرآن ثابت ہوتا ہے تو پھر قرآن میں تحریف خود بخود لازم آجاتی ہے کیونکہ اہل سنت کے مصادر کے مطابق ایسی بہت سی آیات موجود ہیں جن کے قرآن ہونے پر دو سے زائد شہادتیں موجود ہیں مگر اس کے باوجود یہ آیات موجودہ قرآن میں نہیں ہیں مثلاً:

۱۔ آیت رجم: الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموهما.

درج ذیل جلیل القدر اصحاب اس آیت کو قرآن کا حصہ قرار دیتے ہیں:

۱۔ حضرت عمر	(صحیح بخاری ۳: ۶۸ طبع مصر و صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ)

۲۔ حضرت عائشہ	(سنن ابن ماجہ: ۱۴۱)

۳۔ اُبی بن کعب	(الاتقان ۲: ۲۵)

۴۔ زید بن ثابت	(الاتقان ۲: ۲۵)

۲۔ آیت مال: انا انزلنا المال لاقام الصلوة وایتاء الزکوة۔

گواہان: ۱۔ ابی بن کعب	(الدر المنثور ۶: ۳۷۸)

۲۔ زید بن ارقم	(حوالہ سابق)

۳۔ جابر بن عبد اللہ	(حوالہ سابق)

۴۔ بریدة	(حوالہ سابق)

۵۔ ابو موسی اشعری	(صحیح مسلم)

۶۔ ابو واقد لیثی	(الاتقان)

۷۔ عبد اللہ بن مسعود	(محاضرات راغب)

۳۔ آیت رغبت: لا ترغبوا عن آبائکم فانه کفر ان ترغبوا عن آبائکم

گواہان: ۱۔ حضرت عمر	(صحیح بخاری)

۲۔ عبد اللہ بن عباس	(الاتقان)

۳۔ زید بن ثابت	(الاتقان)

۴۔ آیت جہاد: ان جاهدوا کما جاهدتم اول مرة۔

گواہان: ۱۔ حضرت عمر	(الاتقان ۲: ۲۵)

۲۔ عبد الرحمٰن بن عوف	(الاتقان ۲: ۲۵)

۵۔سورۃ الخلع: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم انا نستعینك و نستغفرك ☆ و نثنی علیك و لا نکفرك ☆ و نخلع و نترك من یفجرك ☆

٦۔سورۃ الحفد: بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ اللھم ایاك نعبد ☆ و لك نصلی و نسجد ☆ و الیك نسعی و نحفد ☆ نرجوا برحمتك ☆ و نخشی عذابك ان عذابك بالکافرین ملحق ☆

ان دوسورتوں کے قرآن کا حصہ ہونے پر درج ذیل اصحاب کی گواہی نقل کی گئی ہے :

گواہان: ۱۔حضرت عمر بن خطاب (الدر المنثور ٦: ۴۲۰)

۲۔حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام (مجمع الزوائد ۷: ۱۵۷)

۳۔حضرت ابی بن کعب (الاتقان ۲: ٦٦)

۴۔حضرت عبد اللہ بن عباس (روح المعانی ۱: ۲۵ طبع مصر)

۵۔حضرت ابو موسیٰ اشعری

۲۔احادیث سبعة احرف : صحاح اور دیگر کتب میں متعدد احادیث میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: قرآن سات حروف میں نازل ہوا۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

اقرأنی جبرئیل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده و یزیدنی حتی انتهی الی سبعة احرف ۔[۱]

مجھے جبرئیل نے قرآن ایک حرف (طریقے) سے پڑھایا، میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اضافے کی درخواست کرتا گیا یہاں تک کہ سات حرفوں (طریقوں) سے پڑھنے کی اجازت مل گئی ۔

احادیث سبعة احرف مختلف عبارات میں، صحاح و غیر صحاح میں عبد اللہ بن عباس، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبد الرحمٰن بن ابی بکر سے مروی ہیں۔ ان روایات کی مختلف تاویلات بھی کی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ معروف و مشہور توجیہ یہ ہے: '' قرآنی الفاظ کو قریب المعنی الفاظ میں بدلا جا سکتا ہے ۔'' حلانکہ اس طرح قرآن کی معجزانہ ہیئت ترکیبی کا حلیہ تبدیل ہوجاتا ہے اور یہی تحریف ہے۔ مثلاً اس بات کی تصریح کی گئی :

۱۔ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا میں صَوْمًا کی جگہ صمتا پڑھنا جائز ہے۔[۲]

۲۔ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ میں مَّشَوْا کی جگہ سعوا یا مروا پڑھا جا سکتا ہے۔[۳]

۳۔ابو ہریرہ کے نزدیک عَلِیْمًا حَکِیْمًا کی جگہ غفوراً رحیما پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔[۴]

۱؎ صحیح بخاری باب: انزل القرآن علی سبعة احرف ۴: ۱۹۰۹۔ صحیح مسلم ۱: ۵٦۱

۲؎ تذکرۃ الحفاظ ۱: ۳۴۰ طبع دکن ۳؎ الاتقان ۱: ۴۷ ۴؎ حوالہ سابق

۴۔ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ میں زُخۡرُفٍ کی جگہ ذھب پڑھنا درست ہے۔[۱]

۵۔ ابن مسعود کے نزدیک العهن کی جگہ الصوف پڑھا جا سکتا ہے۔[۲]

۶۔ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً کی جگہ اِلا ذقية واحدة پڑھا جا سکتا ہے۔[۳]

۷۔ ابو ہریرہ کے نزدیک جَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ کی جگہ جاءت سکرة الحق بالموت پڑھنا بھی درست ہے۔[۴]

۸۔ ابو درداء کی روایت ہے کہ طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ کی جگہ طعام الفاجر پڑھا جا سکتا ہے۔[۵]

اس نظریے کو قبول کرنے کی صورت میں دو باتیں ناگزیر ہوتی ہیں:

۱۔ تحریف کا وقوع۔

۲۔ تحریف کا جواز۔

پہلی بات یہ کہ جب قرآن سات حرفوں (طریقوں) پر نازل ہوا ہے اور اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے وہ ایک حرف پر مشتمل ہے تو باقی چھ حرفوں والا قرآن کہاں ہے؟

دوسری بات یہ کہ اگر ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا جائز ہے تو اس کا لازمہ یہ ہوا کہ تحریف جائز ہے۔ اسی وجہ سے امامیہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، کیونکہ ایسا کرنے کا حق تو خود رسول اللہ(ص) کو بھی نہیں تھا۔

ارشاد ہے:

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ[۶]	کہدیجیے: مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔

تحریف قرآن کے بارے میں اگر امامیہ مصادر میں کوئی روایات موجود ہوں تو بھی امامیہ ان روایات پر مبنی کوئی نظریہ قائم نہیں کرتے بلکہ ان کی توجیہ و تاویل کرتے ہیں۔ اگر تاویل ممکن نہ ہو تو کتاب خدا کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہیں مسترد کرتے ہیں۔

لیکن اہل سنت حضرات اپنے مصادر میں موجود تحریف کی روایات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان روایات پر مبنی نسخ تلاوت کا نظریہ قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح ان روایات کی بنا پر بعض آیات کو قرآن کا حصہ تسلیم کرنے کے بعد ''نسخ تلاوت'' کے نظریہ کے ذریعے اس کی قرآنیت سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، جب کہ ''نسخ

۱۔ حوالہ سابق ۲۔ تفسیر طبری ۱: ۱۸ ۳۔ تاویل مشکلات القرآن ۱۹ طبع مصر

۴۔ تفسیر الطبری ۱: ۱۸ ۵۔ حوالہ سابق ۲۵: ۱۳۱ ۶۔ ۱۰ یونس: ۱۵

تلاوت'' ثابت نہیں ہے۔

۳۔ نسخ تلاوت۔ اہل سنت کے مصادر میں آیا ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات زمان رسول (ص) میں قرآن کا حصہ تھیں۔ انہ کان قرآن علی عھد رسول اللّٰہ۔ مثلاً آیہ رجم، آیہ رضاعت اور آیہ رغبت کے قرآن کا حصہ ہونے کے بارے میں صحیحین میں روایت موجود ہے۔

طبرانی نے موثق سند سے حضرت عمر سے روایت کی ہے: ''قرآن دس لاکھ ستائیس ہزار حروف پر مشتمل ہے''۔ جب کہ موجودہ قرآن اس مقدار کا ایک تہائی بھی نہیں ہے۔

وہ اس قسم کی بہت سی روایات کو مسترد کرنے کی بجائے موجودہ قرآن میں غیر موجود چیزوں کو قرآن کا حصہ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ صحاح ستہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

لیکن صحاح کا بھرم رکھنے کے لیے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ ان آیات کو نسخ تلاوت کے ذریعے قرآن سے حذف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث حبیب الرحمٰن کاندھلوی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں:

> حضرت ابوبکر کے زمانے میں وہ آیات جو متواتر نہ تھیں اور جن کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی حذف کر دی گئیں۔

نسخ تلاوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اپنی صحاح میں موجود روایات کی بنا پر انہوں نے بہت سی عبارات کو قرآن کا حصہ تسلیم کر لیا، پھر ان سے ہاتھ اٹھانے کے لیے نسخ تلاوت کا جواز پیش کیا۔ اس بارے میں دوسروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان سے اس ''نسخ تلاوت'' کا مدرک و مأخذ طلب کریں۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ ان کے پاس اس کا کوئی مدرک اور سند موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ نسخ رسول کریم (ص) کے زمانے میں ہوا ہو تو اسے ثابت کرنے کے لیے تواتر کی ضرورت ہے۔ بلکہ بعض ائمہ فقہ جیسے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک تو خبر متواتر سے بھی نسخ قرآن ثابت نہیں ہو سکتا۔ بعض فقہاء خبر متواتر سے نسخ قرآن کو جائز سمجھتے ہیں لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کے قائل نہیں اور خبر واحد کے ذریعے نسخ قرآن کا تو کوئی قائل نہیں ہے۔ لہٰذا نسخ تلاوت پر صحاح میں موجود روایات کے علاوہ کوئی اور دلیل موجود ہی نہیں ہے۔

نکتہ: نسخ تلاوت کی صحت صحاح کی روایت کی صحت پر موقوف ہے۔ جب کہ صحاح کی روایت کی صحت نسخ تلاوت کی صحت پر موقوف ہے۔ لہٰذا نسخ تلاوت کی صحت خود نسخ تلاوت کی صحت پر موقوف ہے، جسے علمی زبان میں دور مصرّح کہتے ہیں جس کا بطلان بدیہی ہے۔

اگر یہ نسخ رسول کریم (ص) کے بعد ہوا ہے تو یہ صریحاً تحریف ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ نسخ تلاوت کے قائل ہیں وہ تحریف کے بھی قائل ہیں۔ یعنی ان کے اس نظریے سے، خواہ

وہ نہ بھی چاہیں، تحریف لازم آئے گی۔ اسی لیے بعض معاصر غیر امامیہ علماء بھی نسخ تلاوت کو مسترد کرتے ہیں۔[1]

---

[1] صبحی صالح ۔ علوم القرآن

روایات تحریف کے بارے میں
مذہب امامیہ کا مؤقف

متحرک اجتہاد۔ ناقابل اعتبار روایات۔
وحی منزل اور قرآن۔ تفسیر۔ شان نزول۔ تحریف معنوی۔
قرائت۔ تطبیق ۔ مخالف قرآن احادیث مسترد کرتے ہیں۔
تحریف قرآن ناممکن ہے ۔ اصول وکلیات۔ تدریجی
نزول۔ کتاب فصل الخطاب اور کتاب الفرقان

دیگر مکاتب فکر کی معتبر کتب کی طرح شیعہ کتب میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جن میں سے بعض سے بادی النظر میں تحریف کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور کچھ میں صراحت موجود ہے، مگر شیعہ ان روایات کے تحت نسخ کا نظریہ قائم نہیں کرتے بلکہ ان روایات کی یا تو توجیہ کرتے ہیں کہ ان سے مراد تحریف لفظی نہیں اور اگر قابل توجیہ نہیں ہیں تو ایسی روایات کو مخالف قرآن سمجھ کر یکسر مسترد کرتے ہیں۔

۱۔ متحرک اجتہاد: اہل تشیع کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، لہٰذا ان کی نظر میں متحرک و زندہ اجتہاد کی وجہ سے کوئی کتاب حرف آخر نہیں ہے، بلکہ ہر کتاب، ہر روایت قابل بحث وتحقیق ہے اور تمام اسلامی نصوص تحقیق و تدقیق کے قابل ہیں۔

چنانچہ اصول کافی اگرچہ کتب شیعہ میں سے مشہور کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اس میں مختلف احادیث موجود ہیں۔ بعض احادیث اگر کچھ مجتہدین کے نزدیک صحیح السند ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسرے مجتہدین کی نظر میں بھی وہ صحیح السند ہوں۔ جو مسلمان صحاح ستہ کی روایات کا صحیح السند ہونا ضروری اور لازمی تصور کرتے ہیں ان کے لیے ممکن ہے کہ صحاح میں کسی روایت کا موجود ہونا اس روایت کے مضمون کا ضمنی اعتراف بن جائے لیکن شیعہ کتب میں اگر کوئی روایت موجود ہے تو اسے مضمون کا ضمنی اعتراف تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے بحار الانوار میں صریحاً کہا ہے کہ قرآن میں قطعاً کوئی تحریف نہیں ہوئی۔

۲۔ ناقابل اعتبار روایات: تحریف قرآن کے بارے میں اکثر شیعہ روایات ضعیف راویوں سے منقول ہیں۔ چنانچہ ان روایات میں ایک قابل توجہ سلسلہ روایت احمد بن محمد السیاری پر منتہی ہوتا ہے۔ علمائے شیعہ فرماتے ہیں کہ تحریف قرآن سے مربوط تین سو (۳۰۰) روایات احمد بن محمد السیاری سے مربوط ہیں۔

السیاری کون ہے؟ شیعہ کتب رجال میں احمد بن محمد السیاری کے بارے میں درج ذیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

وہ ضعیف الحدیث، فاسد المذہب، غالی اور منحرف ہے۔[1]

ان روایات تحریف میں یونس بن ظبیان کا نام بھی آتا ہے۔ اس شخص کو علمائے رجال نے ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے:

یہ نہایت ضعیف، ناقابل توجہ، غالی، کذاب اور احادیث گھڑنے والا ہے۔[2]

پھر ان میں منخل بن جمیل الاسدی کوفی کا نام بھی آیا ہے جس کے بارے میں علمائے رجال نے لکھا ہے:

وہ فاسد الروایہ، ضعیف، غالی اور منحرف ہے۔[3]

محمد بن حسن بن جمھور بھی ان راویوں میں شامل ہے جس کے بارے میں علمائے رجال فرماتے ہیں:

ضعیف، غالی، فاسد الروایہ، ناقابل توجہ اور فاسد المذہب ہے۔[4]

۳۔ وحی منزل اور قرآن: اکثر روایات میں مضمون حدیث اس طرح ہے: نزلت فی فلان ھکذا نزلت وغیرہ۔ علماء اور محققین سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول خدا (ص) پر جو کچھ بھی بطریق وحی نازل ہوتا ہے، ان سب کا قرآن ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اگر روایت یوں کہے: یہ وحی یوں نازل ہوئی یا فلاں ہستی کے بارے میں نازل ہوئی، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرمان الٰہی ہے اور بطور وحی نازل ہوئی ہے، لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قرآن کا حصہ ہے، کیونکہ ہر وحی قرآن نہیں۔ یاد رہے کہ پورا قرآن وحی ہے، لیکن ہر وحی قرآن نہیں۔

شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

کان ثابتا منزلا و ان لم یکن	اگرچہ نازل ہوا ہے لیکن وہ کلام اللہ
من جملة کلام اللّٰہ تعالیٰ	نہیں ہے جو قرآن اور معجزہ ہے۔
الذی ھو القرآن المعجز۔[5]	

شیخ صدوقؒ اپنے اعتقادیہ صفحہ ۷۵ میں ایک حدیث کا مفہوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

بل نقول انہ قد نزل من الوحی	یہ وحی کے طور پر نازل ہوئی تھی مگر قرآن کا حصہ نہ تھی۔
الذی لیس من قرآن مالو جمع الی	اگر ان کو قرآن کے ساتھ جمع کیا جائے تو (مجموعی طور
القرآن لکان مبلغہ مقدار سبع	پر) ستر ہزار آیات بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی روایات

---

[1] قاموس الرجال ج ۱ ص ۴۰۳۔ طبع تہران۔ رجال نجاشی ص ۵۸۔ طبع بمبئی۔ نقد الرجال ص ۳۲ طبع ایران قدیم۔ معجم رجال الحدیث ج ۲ ص ۲۹۔ طبع نجف

[2] نقد الرجال ص ۳۸۱ [3] دراسات فی الحدیث و المحدثین۔ نقد الرجال ص ۳۵۴

[4] نقد الرجال ص ۲۹۹۔ رجال نجاشی ص ۲۳۸۔ طبع بمبئی [5] اوائل المقالات ص ۵۵

عشرة الف آیة، (الی ان قال) و مثل هذا کثیر کله وحی لیس بقرآن۔ بہت ہیں۔ یہ سب وحی تو ہیں مگر قرآن نہیں ہیں۔

۴۔ **تفسیر:** احادیث کے بعض الفاظ تفسیر قرآن کی غرض سے (جملہ معترضہ کے طور پر) آیت کے وسط میں درج ہوئے ہیں۔

چنانچہ کافی میں حضرت امام جعفر الصادق (ع) سے یہ آیت اس طرح نقل کی گئی ہے:

وَ اِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا (عما امرتم) فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا [1]

اس آیت میں عما امرتم بغرض تفسیر وتوضیح آیت کے وسط میں مذکور ہے، نہ کہ قرآن کے طور پر.

۵۔ **شان نزول:** بعض الفاظ شان نزول کے بیان کے لیے آیت کے وسط میں مذکور ہوئے ہیں جیسے:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ (فی علی) وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَـتَهٗ ۔[2]

چنانچہ حضرت عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے آیہ حافظوا علی الصلوات و الصلوة الوسطی کے ساتھ و صلوة العصر پڑھا ہے۔[3] علمائے اہل سنت تو ایسی روایات سے ان الفاظ کو قرآن کا حصہ تسلیم کر لینے کے بعد توجیہ کرتے ہیں، لیکن علمائے شیعہ انہیں قرآن کا حصہ تسلیم کرنے سے پہلے ہی ان کی توجیہ کرتے ہیں۔

۶۔ **تحریف معنوی:** روایات میں تحریف کا لفظ صریحاً موجود ہے لیکن ان میں تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے۔ تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے کہ مفاد پرستوں نے آیات قرآنی کے مطالب کو ان کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنی رائے اور ذاتی یا گروہی خواہشات کے مطابق معنی پر محمول کیا ہے۔ حضرت علی (ع) نے فرمایا:

لا یعرفون الا خطه [4] وہ لوگ قرآن کے صرف خطوط، نقوش کو پہچانتے ہوں گے۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ لوگ قرآن میں معنوی تحریف تو کریں گے لیکن الفاظ قرآن محفوظ رہیں گے۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

و کان من نبذهم الکتاب ان اقاموا انہوں نے کتاب خدا کو اس طرح پس پشت ڈال

---

[1] ۴ نساء : ۱۳۵ [2] ۵ مائدہ : ۶۷ [3] در منثور ۱: ۳۰۴ [4] نہج البلاغۃ خ ۱۴۵ ص ۳۸۸

حروفه و حرفوا حدوده، فهم یروونه ولا یرعونه و الجهال یعجبهم حفظهم للروایة و العلماء یحزنهم ترکهم للرعایة۔[1]	دیا کہ اس کے حروف کی پاسداری تو کی مگر اس کی حدود میں تحریف کی۔ یہ لوگ روایت تو کرتے ہیں مگر رعایت نہیں کرتے نادان لوگ روایت کے تحفظ کو پسند کرتے ہیں اور علماء رعایت کے متروک ہونے سے غمزدہ ہوتے ہیں۔

حضرت علی(ع) سے روایت ہے:

ولیس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الکتاب اذا تلی حق تلاوته ولا انفق منه اذا حرف عن مواضعه۔[2]	اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جب اسے صحیح طور پڑھا جائے اور قرآن سے زیادہ کوئی چیز مقبول نہ ہوگی جب اسے اپنی جگہ سے ہٹا کر تحریف کی جائے۔

۷۔ قراءت: ان روایات میں بہت سی عبارتوں کا تعلق اختلاف قراءت سے ہے جیسا کہ اصحاب رسولؐ(ص) میں سے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ کی قراءتوں میں اختلاف ہے۔ اس طرح ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بعض قراءتوں میں دوسروں سے اختلاف کیا ہے۔

۸۔ تطبیق: قرآن ایک ابدی دستور حیات ہے۔ بنا بریں قرآن نزول کے وقت جس امر پر منطبق ہوتا تھا، اسی طرح بعد کے ہر اس امر پر بھی جاری و منطبق ہوگا جس میں حال نزول کے حالات و شرائط موجود ہوں۔ اگر زمان نزول میں کسی آیت میں کسی کی مدح ہوئی ہے تو اس قسم کے اوصاف رکھنے والے سب لوگوں پر یہ مدح منطبق ہوگی۔ اگر کسی آیت میں کسی فرد کی مذمت ہوئی ہے تو یہ قدح اس قسم کے تمام اشخاص پر منطبق ہوگی۔ مفسرین یہاں پر ایک قاعدہ کلیہ قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں: العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب یعنی شان نزول وسبب نزول پر انحصار نہیں ہوسکتا بلکہ لفظ کے عموم کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔

اس کے تحت بعض غیر قرآنی الفاظ آیت کی تطبیق کے لحاظ سے قرآنی الفاظ کے ساتھ (توضیح و تبیین کی غرض سے) درج ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض روایات میں ہے:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا (حق آل محمد) اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۔[3]

اس آیت کے وسط میں (حق آل محمد) صرف بیان مصداق اور بیان مورد انطباق کی غرض سے مذکور ہے، جزو قرآن ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔

۹۔ مخالف قرآن احادیث مسترد ہیں: اگر کوئی روایت گزشتہ تمام مطالب میں سے کسی ایک پر بھی محمول نہ ہو سکے تو ایسی روایات کو شیعہ اصول حدیث کے مطابق، منافی قرآن وسنت ہونے کی وجہ سے

---

[1] الوافی کتاب الصلوٰۃ ج ۱ص ۱۸۵۔ طبع قم　[2] نہج البلاغۃ خ ۱۴۵ص ۳۸۷　[3] ۲۶ شعراء: ۲۲۷

رد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی روایت قرآن کی صریح نص اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ [١] کی مخالف ہے تو اس کی کوئی قیمت اور حیثیت نہیں ہے اور وہ درجہ اعتبار سے بالکل ساقط ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

ان علی کل حق حقیقة و علی کل صواب نوراً فما وافق کتاب اللّٰہ فخذوہ و ما خالف کتاب اللّٰہ فدعوہ۔ [٢]

ہر حق پر ایک حقیقت اور ہر صائب بات پر ایک روشنی ہوا کرتی ہے ۔ پس جو کتاب خدا کے مطابق ہو اسے اخذ کرو، جو کتاب خدا کے مخالف ہو اسے مسترد کرو۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

لا تصدق علینا الا ما وافق کتاب اللّٰہ و سنة نبیّه (ص)۔ [٣]

ہماری صرف ان احادیث کی تصدیق کرو جو کتاب اللہ اور سنت رسول (ص) کے مطابق ہوں۔

امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

فما وافق کتاب اللّٰہ فخذوہ و ما خالف کتاب اللّٰہ فدعوہ۔ [٤]

جو کتاب خدا کے مطابق ہو اسے اخذ کرو اور جو اس کے مخالف ہو اسے رد کرو۔

اور مسلک امامت کے آٹھویں تاجدار حضرت امام رضا (ع) نے فرمایا ہے:

اذا کانت الروایات مخالفة للقرآن کذبتها۔ [٥]

جو روایات قرآن کریم کی مخالف ہوں میں ان کی تکذیب کرتا ہوں ۔

تحریف قرآن ناممکن ہے: قرآن میں تحریف اس لیے ناممکن ہے کہ اس کی معجزاتی ترکیب اپنے اندر کسی قسم کی تحریف کو قبول نہیں کرتی ۔ اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ اصول وکلیات: گزشتہ امتوں پر نازل شدہ کتب میں تحریف واقع ہونے کے اہم عوامل میں سے ایک عامل یہ تھا کہ آسمانی کتب میں جو دستور حیات دیا گیا تھا وہ حکمرانوں اور مفاد پرستوں کے مفادات کے خلاف ہوتا تھا، لہٰذا کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ کچھ نے ان حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اور کچھ نے تحریف کر ڈالی ۔

لیکن خاتم الانبیاء (ص) کے ابدی معجزے قرآن کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ نے قرآن میں صرف اصول وکلیات ہی بیان کیے اور تفسیر وتشریح کا کام

١۔ ۱۵ حجر: ۹۔ اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔　٢۔ اصول الکافی ۱: ۶۹
٣۔ وسائل الشیعة ۲۷: ۱۲۳
٤۔ حوالہ سابق ۲۷: ۱۱۹۔ مصنف عبد الرزاق ۶: ۱۱۱ فما وافق کی جگہ ما واطی کے ساتھ۔ تہذیب تاریخ دمشق ۵: ۱۳۷ طبع شام
٥۔ اصول کافی ۱: ۹۵

سنت پر چھوڑ دیا۔ اسی لیے قرآن میں معاصر لوگوں میں سے کسی کا نام مذکور نہیں۔ نہ برگزیدہ ہستیوں کے نام مذکور ہیں نہ قابل مذمت لوگوں کے نام درج ہیں۔ صرف ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت نام لے کر کی گئی ہے، کیونکہ ابولہب کی کھلی عداوت اور خود حضور (ص) کا رشتہ دار ہونا ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اس کا نام صریحاً لیا گیا۔ کیونکہ مستقبل میں رسول (ص) کے خاندان کی طرف سے کسی تحریف کا خطرہ نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اصول وکلیات کی تشریح وتوضیح رسول خدا (ص) کے ذمہ کر دی تھی۔ مثلاً آیہ تطہیر میں اہل بیت (ع) کا نام نہیں لیا گیا۔ سنت رسول (ص) نے ایک ایک فرد کا تعارف کرایا۔

آیہ مباہلہ میں بھی اَبۡنَآءَنَا اور نِسَآءَنَا سے جو لوگ مراد ہیں ان کی وضاحت سنت رسول (ص) نے کی۔

نیز سورۃ کوثر میں اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ میں یوں نہیں فرمایا: عاص بن وائل او امیۃ بن الخلف ھو الابتر بلکہ رسول (ص) نے گستاخان رسول (ص) کی نشاندہی فرمائی۔

اگر قرآن میں یہ بتا دیا جاتا کہ... الشَّجَرَةَ الۡمَلۡعُوۡنَةَ [1] سے کون لوگ مراد ہیں تو بنی امیہ قرآن کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتے۔

اسی طرح اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا [2] میں اس فاسق یعنی ولید بن عتبہ کا ذکر نہیں آیا جو بعد میں [illegible] صبح کی [illegible] چار رکعت پڑھائی اور محراب میں قے کی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ [3]
جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں بلاشبہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

میں بھی ان بیوقوفوں کا نام نہیں لیا گیا۔ ایسے تمام موارد میں قرآن کی مراد اور مقصود کا بیان کرنا سنت رسول اللہ (ص) کی ذمہ داری ہے۔ [4]

ہم اس کی کئی مثالیں سنت رسول (ص) سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

اکثر مفسرین اور صحاح نے قرآن کی متعدد آیات کے بارے میں ان روایات کو نہایت شوق سے ذکر کیا ہے جن کے مطابق یہ آیات حضرت ابوطالب کے خلاف نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ برائت آیت ۱۱۳ اور سورہ قصص کی آیت کے بارے میں صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ القصص میں یہ روایت ملے گی کہ یہ دو آیتیں حضرت ابوطالب کے عدم ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، لیکن المائدہ کی آیت ۵۵ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ

۱؎ ۱۷ اسراء: ۶۰
۲؎ ۴۹ حجرات: ۶ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو۔
۳؎ ۴۹ حجرات: ۴
۴؎ اقتباس از انٹرویو آیۃ اللہ عسکری

اللہُ ... کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی کہ یہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، جب کہ اس حدیث کو بارہ اصحاب رسول(ص) نے روایت کیا ہے۔

اس سلسلے میں تحریف حدیث کی سب سے روشن مثال یہ ہے کہ حدیث غدیر، جسے رسول اللہ (ص) نے ہزاروں کے مجمع میں بیان فرمایا اور نہایت نامساعد حالات کے باوجود یہ حدیث ایک سو دس (۱۱۰) اصحاب رسول (ص) کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے، صحاح میں ایسی احادیث کے لیے کوئی جگہ نہیں مل سکی۔

۲۔ تدریجی نزول: قرآن کو ضیاع اور تحریف سے بچانے کے لیے دوسرا انتظام اس کا تدریجی نزول تھا۔ ایک متوسط حجم کی کتاب ۲۳ سالوں کی مدت میں تدریجاً نازل ہوتی رہی اور کتاب بھی ایسی جس کا انداز کلام دوسرے کلاموں سے مختلف ہے اور جس میں روح اور سماعت دونوں کی تسکین کا سامان ہے۔ آیات مختصر، با قافیہ اور مسجع ہیں۔ مثلاً:

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۙ [۱]

اور

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۭ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ [۲]

یہ مختصر اور مقفی آیات حفظ کرنے کے لیے نہایت آسان ہیں۔ اس طرح قرآن کتابت کے ساتھ سینوں میں بھی محفوظ رہا۔

بعد میں مدنی زندگی میں لکھنے پڑھنے کے وسائل فراہم ہوئے تو آیات اور قرآنی سورتیں طولانی ہونا شروع ہو گئیں۔ تدریجی نزول کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہوا کہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ امت کے حوالے ہو گیا۔ یعنی جس طرح نزول قرآن تدریجی تھا، اس کی تعلیم اور امت کی طرف اس کی منتقلی بھی تدریجی تھی۔ جس روز نزول کا کام مکمل ہوا، اسی روز قرآن کی امت کی طرف منتقلی بھی مکمل ہوئی ۔ چنانچہ جس مرحلے میں امت کی طرف قرآن کی منتقلی مکمل ہوئی اسے عرضہ اخیر (آخری باز خوانی) کہتے ہیں ۔

کتاب فصل الخطاب اور کتاب الفرقان: مکتب امامیہ پر عائد الزام کی ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ان کے ایک جید عالم نے تحریف قرآن کے اثبات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور اس کا نام فصل الخطاب رکھا ہے ۔ حقیقت امر یہ ہے :

اولاً: ایسا واقعہ صرف امامیہ کے ہاں پیش نہیں آیا بلکہ مصر کے ایک جید عالم علامہ ابن الخطیب المصری نے ۱۹۴۷ء میں اسی قسم کی ایک کتاب تالیف کی جس میں ضعیف اور نادر روایات جمع کر کے قرآن کی تحریف و تبدیلی اور عدم صحت الفاظ پر بے شمار دلائل پیش کیے ۔

اس کتاب کے بارے میں جامعۃ الازہر کے کلیۃ الشریعۃ کے استاد علامہ شیخ محمد مدنی لکھتے ہیں:

---

[۱] ۹۳ ضحی: ۱ تا ۳ [۲] ۵۵ رحمٰن: ۱ تا ۴

یہ کہنا کہ امامیہ قرآن میں کمی واقع ہونے کے قائل ہیں، معاذ اللہ درست نہیں ہے، بلکہ ان کے ہاں بھی کچھ روایات ایسی ملتی ہیں جیسے ہمارے ہاں ملتی ہیں۔ دونوں فرقوں کے اہل تحقیق اس قسم کی روایات کو مسترد کرتے ہیں۔ چنانچہ شیعہ امامیہ یا زیدیہ میں کوئی تحریف کا قائل نہیں ہے، جیسا کہ اہل سنت کے ہاں بھی کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔

ایسی روایات کا مشاہدہ کرنے کے لیے جنہیں ہم مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں، علامہ سیوطی کی کتاب الاتقان کا مطالعہ کریں اور ایک مصری صاحب نے تو ۱۹۴۸ء میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام الفرقان رکھا۔ اس مؤلف نے اس کتاب کو غیر معتبر، غیروں کی داخل کردہ اور مردود السند روایات سے پر کیا ہے اور ان روایات کو اہل سنت کے ہی مصادر و مآخذ سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ جامعة الازهر نے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا اور اس کتاب کے فاسد اور باطل ہونے پر دلائل قائم کیے۔ چنانچہ حکومت نے اسے منظور کر لیا اور کتاب ضبط ہو گئی۔ مؤلف نے تاوان کے لیے دعویٰ دائر کیا تو عدالت نے اس کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا۔ تو کیا اس کتاب کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت قرآن کے تقدس کے منکر ہیں؟ اور نقص درقرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں؟ صرف ایک روایت کی بنا پر؟ یا فلاں شخص کی تالیف کردہ کتاب کی بنا پر؟ شیعہ امامیہ کا حال بھی کچھ اسی طرح ہے۔[1]

ثانیاً: فصل الخطاب میں درج ساری روایات، شیعوں کی نہیں ہیں، بلکہ اس میں اہل سنت کی روایات بھی بکثرت درج ہیں، جنہیں علامہ مرتضیٰ عسکری نے ایک مستقل کتاب میں جدا کر کے واضح کیا ہے کہ کون کون سی روایات امامیہ یعنی شیعہ مصادر سے ہیں اور کون سی غیر امامیہ یعنی اہل سنت مصادر سے۔[2]

ثالثاً: یہ کتاب ان روایات پر مشتمل ہے جو اصول حدیث کے اعتبار سے بے بنیاد اور مردود ہیں۔ علماء امامیہ میں سے کوئی ایسا نہیں جو اسے مستند سمجھے۔ علماء نے اس کو کتب ضالہ میں شمار کیا ہے۔ اس کے راویوں میں:

۱۔ احمد بن محمد السیاری ہے جو کذاب، فاسد العقیدہ اور تناسخ ارواح کا قائل ہے۔ اس کی روایات سب سے زیادہ ہیں۔

۲۔ سھل بن زیاد

---

[1] رسالة الاسلام شمارہ ۴، صفحہ ۳۸۲　　[2] العسکری: القرآن الکریم و روایات المدرستین ۔ الکتاب الثالث

۳۔ ابراهیم بن اسحاق نهاوندی

۴۔حسین بن حمدان الحضبی

۵۔ ابو سمینه محمد بن علی الکوفی

اور

۶۔ محمد بن سلیمان الدیلمی

جیسے ضعیف وکذاب راوی شامل ہیں۔ جن کی روایات کا کوئی علمی وزن نہیں ہے۔ اسی لیے فصل الخطاب کے مؤلف کے معاصرین نے اس کتاب کی رد میں کئی ایک کتابیں لکھی ہیں مثلاً :

۱۔ علامہ سید محمد حسین شہرستانی نے حفظ الکتاب الشریف عن شبهة القول بالتحریف لکھی۔

۲۔ علامہ محقق شیخ محمود تہرانی نے کشف الارتیاب فی ردّ فصل الخطاب لکھی۔

علوم القرآن

سبقت ۔ خدمات

غریب القرآن۔قراءۃ القرآن۔ آیات الاحکام۔قرآن کے نقطے۔مجاز القرآن۔تفسیر القرآن۔عصر ائمہ (ع) کی تفاسیر۔پہلی صدی کی تفاسیر۔دوسری صدی کی تفاسیر۔ تیسری صدی کی تفاسیر۔ناسخ اور منسوخ۔

ذیل میں ہم اس بات کو متفق علیہ مصادر سے واضح کریں گے کہ قرآن سے متعلق تقریباً تمام علوم کی تدوین وتصنیف میں فرزندان مکتب اہل بیت(ع) کو سبقت حاصل رہی ہے اور مختلف میدانوں میں آغاز انہی کی طرف سے ہوا ہے۔

باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے علوم قرآن کی طرف امت قرآن کی رہنمائی فرمائی۔ چنانچہ آپ (ع) نے قرآن سے مربوط ساٹھ علوم کی تشریح فرمائی اور ہر علم کو مثال کے ساتھ بیان فرمایا۔ ان معارف کو کتاب کی شکل میں تدوین کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسی نے بحارالانوار کتاب القرآن میں پوری کتاب نقل کی ہے۔ اس کے بعد جتنی کتابیں علوم قرآن پر لکھی گئی ہیں، ان سب کا مأخذ یہی کتاب ہے۔

غریب القرآن: قرآن فہمی کے لیے سب سے پہلے تو مصدر وحی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات خود قرآن سے قرآن فہمی کے لیے مدد مل جاتی ہے۔ یعنی قرآن فہمی کے دو مصادر قرآن وسنت ہیں۔ اس کے بعد کسی لفظ کے لغوی معنی اور کسی محاورے کی تشریح عربوں کے محاورات اور استعمالات سے کی جاتی ہے جب کہ مشکل اور نادر (غریب) الفاظ کے معانی سمجھنے کے لیے عربوں کے اشعار سے مدد لی جاتی ہے۔ اس فن کو غریب القرآن کہا جاتا ہے۔

اس فن کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن کے نادر الفاظ کے معانی کو سمجھنا خود اہل زبان کے لیے بھی مشکل تھا۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے آیت کریمہ: وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا [1] کا مفہوم سمجھنے سے عجز کا اظہار کیا نیز وہ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ [2] میں تَخَوُّفٍ کے معنی دوسروں سے پوچھتے تھے۔[3]

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ دو اعرابی ایک کنویں کے سلسلے میں میرے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتھا یعنی اس کنویں کو پہلی بار میں نے کھودا ہے۔ اس کی یہی بات سن کر فَاطِرِ کے معنی سمجھ میں آئے۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۳۱ [2] ۱۶ النحل: ۴۷ [3] مقدمہ مفردات القرآن (اردو) از مولانا محمد عبدہ فیروزپوری۔

غریب القرآن: تالیف حضرت عبداللہ بن عباس (حبر امت)۔ آپ نے قرآن کے نادر اور مشکل الفاظ کے حل کے لیے ایک کتاب لکھی۔ واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ایک طرف سے تو حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد ہیں اور دوسری طرف حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے جلیل القدر صحابی ابونصر محمد بن سائب کلبی ان سے غریب القرآن کی روایت نقل کرتے ہیں۔

غریب القرآن: تالیف ابان بن تغلب الجریری (متوفی ۱۴۱ھ)۔ ائمہ اہل بیت (ع) کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے۔ آپ نے حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کا زمانہ پایا۔ حضرت ابن عباس کے بعد آپ اس فن کے پہلے مصنف ہیں۔ چنانچہ اس بات کی علامہ سیوطی نے بغیۃ الوعاظ میں تصریح کی ہے۔

شیخ الحدیث محمد عبدہ فیروز پوری مفردات القرآن (اردو) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> غریب القران کے سلسلے میں حضرت ابن عباس کے بعد ابان بن تغلب الجریری متوفی ۱۴۱ھ کا نام لیا جاتا ہے جو قاری وفقیہ ہونے کے علاوہ لغت کے بھی عظیم المرتبت عالم تھے اور علی بن حسین (امام سجاد) اور ابو عبد اللہ (امام صادق علیہم السلام) سے روایت کرتے تھے۔ استاد عطار لکھتے ہیں:... سمع من العرب و الف غریب القرآن و ذکر شوا ھدہ من الشعر۔[1] (یعنی عربوں سے اخذ کیا۔ قرآن کے مشکل الفاظ کے بارے میں کتاب لکھی اور شعر سے شواہد ذکر کیے)
> ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے۔ ابان گو تشیع میں غالی تھے یعنی علی (ع) کی تفضیل کے قائل تھے تاہم رافضی نہیں تھے نیز چونکہ روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔[2]

اس موضوع پر سب سے پہلی کاوش حضرت ابان بن تغلب کی طرف سے عمل میں آئی۔ ابن ندیم اپنی کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:

> و لہ من الکتب، کتاب معانی القرآن لطیف، کتاب القرائات. کتاب من الاصول فی الروایۃ علی مذھب الشیعۃ ۔ [3]

قرائۃ القرآن: علم قراءت پر اسلامی تاریخ میں سب سے پہلی کتاب حضرت ابان بن تغلب کی کتاب القراءات ہے۔ جیسا کہ ابن ندیم نے الفہرست میں ذکر کیا ہے۔

حضرت آیۃ اللہ سید حسن صدرؒ اپنی کتاب تاسیس الشیعۃ لعلوم الاسلام میں لکھتے ہیں:

> حافظ ذہبی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ابوعبید قاسم بن سلام کی ہے، حالانکہ سب کے نزدیک ان کی وفات ۲۲۴ھ میں ہوئی ہے اور

---

[1] مقدمۃ الصحاح [2] مقدمہ مفردات القرآن (اردو) صفحہ ۱۶ معانی القرآن [3] الفہرست ابن الندیم ۔ ص ۲۷۶

ابان بن تغلب کی وفات ان سے ۸۳ سال پہلے یعنی ۱۴۱ ہجری میں ہوئی ہے۔
جیسا کہ علامہ سیوطی نے طبقات النحاۃ میں اس بات کی تصریح کی ہے۔
شاید ذہبی کا مقصد یہ ہو کہ اہل سنت میں سے جس شخص نے سب سے پہلے
اس موضوع پر کچھ لکھا ہے وہ ابو عبید ہے، ورنہ اس موضوع پر سب سے پہلے
لکھنے والا ابان بن تغلب ہے۔ ان کے بعد حمزہ بن حبیب کا نام آتا ہے جو
سات مشہور قاریوں میں سے ایک ہیں اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے
صحابی ہیں۔ حمزہ کی وفات ۱۵۸ ھ میں ہوئی ہے۔ بنا بریں حمزہ ابو عبیدہ سے
۶۶ سال پہلے کے ہیں۔[1]

قرائۃ امیر المؤمنین(ع): تالیف حضرت زید شہید ۱۲۲ ھ۔
کتاب القرائۃ: تالیف ابو جعفر محمد بن سعدان الضریر متوفی ۲۳۱ ھ۔
کتاب القرائۃ: تالیف: ابو عثمان بکر بن محمد بن حبیب المازنی متوفی ۲۴۹ ھ۔

آیات الاحکام: قرآن مجید کی جو آیات حلال وحرام اور شرعی احکام سے مربوط ہیں انہیں آیات الاحکام کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی تاریخ میں احکام سے مربوط آیات (آیات الاحکام) کو سب سے پہلے مرتب کرنے کا شرف بھی مذہب اہل بیت (ع) کے ایک پیرو کار کو حاصل ہے۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے شاگرد جناب ابو نصر محمد بن سائب بن بشر کلبی متوفی ۱۴۶ ہجری کی کتاب احکام القرآن اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر اس زمانے کی سب سے بڑی مفصل تفسیر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

علامہ سیوطی کہتے ہیں: اس موضوع کے سب سے پہلے مصنف امام شافعی ہیں۔ حالانکہ امام شافعی کی ولادت ۱۵۵ ھ میں ابو نصر کلبی کی وفات کے نو سال بعد ہوئی ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ قاسم بن اصبغ بن محمد بن یوسف بیانی قرطبی اندلسی اس موضوع کے سب سے پہلے مصنف ہیں، حالانکہ ان کی ولادت بقول سیوطی ۲۴۷ ھ میں امام شافعی کی وفات کے ۴۳ سال بعد ہوئی ہے۔[2]

تفسیر آیات الاحکام۔ تالیف: ابو الحسن مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ ھ)۔ وہ امام جعفر صادق (ع) کے صحابی ہیں۔ اس کتاب کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست صفحہ ۲۵۴ میں کیا ہے۔ الذریعہ جلد ۴ صفحہ ۲۳۵ میں آقا بزرگ طہرانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] تاسیس الشیعۃ لعلوم الاسلام ص: ۳۱۹ [2] الذریعۃ ۱: ۴۰

ابو نصر کلبی کے بعد ان کی کتاب اس موضوع کی دوسری کتاب ہے۔ کیونکہ ان کی وفات امام شافعی کی ولادت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے۔

متشابه القرآن ۔ تالیف: حمزہ بن حبیب الزیات کوفی متوفی ۱۵۶ھ۔ آپ سات نامور قاریوں میں سے ایک ہیں۔ آپ نے قرائت حضرت امام جعفر صادق (ع) سے سیکھی۔ متشابه القران کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔[1]

تقسیم القرآن ۔ تالیف: محمد بن سائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ۔ آپ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق (ع) کے شاگرد ہیں۔ کتاب کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں قرآنی موضوعات کی تقسیم بندی کی گئی ہوگی۔ اس طرح یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے۔

قرآن کے نقطے: شروع میں کتابت نقطوں کے بغیر ہوتی تھی۔ اس لیے صدر اسلام میں قرآن پڑھنے کے سلسلے میں صرف قرآنی نسخوں پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا بلکہ زیادہ تر استاد کی رہنمائی کا سہارا لیا جاتا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد حضرت ابوالاسود دؤلی نے سب سے پہلے حروف پر نقطے رکھے۔ ان کی اس عظیم خدمت سے قرآن مجید کے تلفظ میں غلطی کی گنجائش باقی نہ رہی۔

سیوطی نے مطالع السعیدة میں اور عبد الواحد ابو الطیب لغوی نے مراتب النحو یین میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ ابو الاسود دؤلی ہی نے سب سے پہلے حروف پر نقطے رکھے۔

بعض حضرات کے نزدیک سب سے پہلے ابو الاسود کے شاگرد یحییٰ بن یعمر نے حروف پر نقطے رکھے۔ اگرچہ یحییٰ بن یعمر بھی مذہب اہل بیت (ع) سے تعلق رکھتے تھے تاہم صحیح قول یہ ہے کہ یہ کام سب سے پہلے خود ابو الاسود نے ہی انجام دیا تھا۔

ابو الاسود کے شیعہ ہونے کی تصریح راغب اصفہانی نے المحاضرات میں، حافظ عسقلانی نے الاصابة میں، ابوالفرج اصفہانی نے الاغانی میں، یافعی نے مرآة الجنان میں، سیوطی نے الطبقات میں، ابن الانباری نے النزهة میں اور جاحظ وغیرہ نے کی ہے۔[2]

آل محمد (ص) کے فضائل میں جناب ابو الاسود کے یہ اشعار مشہور ہیں:

امفندی فی حب آل محمد
حجر بفیك فدع ملامك او زد

من لم یکن بحبالهم متمسکا
فلیعترف بولاء من لم یرشد[3]

---

[1] الذریعة ۴: ۱۷۳۔ [2] تاسیس الشیعة لعلوم الاسلام ص ۴۳ [3] ان اشعار کو زمخشری نے نقل کیا ہے

مجاز القرآن: اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب مذہب اہل بیت(ع) کے پیروکار فراء یحییٰ بن زیاد بن عبد اللّٰہ الدیلمی الکوفی (متوفی ۲۰۷ھ) نے لکھی۔ آپ علم نحو میں ایک نہایت ہی بلند مقام رکھتے ہیں۔

الرغیب فی علوم القرآن۔ تالیف: ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۲۱۷ھ)۔ حضرت علی(ع) کے بعد علوم قرآن پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔[1]

اعراب القرآن۔ تالیف: ابوجعفر محمد بن ابی وسادہ کوفی۔ ان کی وفات حضرت امام جعفر صادق (ع) کی حیات میں ۱۴۸ھ سے قبل ہوئی۔

تفسیر القرآن: کتب آسمانی میں کسی کتاب کو وہ توجہ اور اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو قرآن کو حاصل ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔

مکتب اہل بیت (ع) کے فرزندوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تفسیر قرآن لکھنے میں سب سے پہلا قدم انہوں نے اٹھایا۔

تفسیر میثم تمار: تالیف میثم بن یحییٰ التمار الکوفی الشہید۔ آپ کی تفسیر کا ماخذ حضرت علی(ع) ہیں۔ آپ کو ۶۰ھ میں ابن مرجانہ کے حکم سے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ کر سولی پر چڑھایا گیا۔

حضرت میثم تمارؓ نے اپنی تفسیر حضرت ابن عباس کو املا فرمائی۔ بعد میں جب ابن مرجانہ کے ہاتھوں اپنی شہادت کی پیشینگوئی سنائی تو ابن عباس نے اسے کہاوت سمجھ کر ان سے اخذ کردہ تفسیر کو پھاڑنے کا ارادہ کیا۔ تب حضرت میثم نے کہا: جو کچھ آپ نے مجھ سے سنا ہے، اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ اگر میری باتیں سچ ثابت ہوئیں تو اس تفسیر سے متمسک رہیں وگرنہ بے شک اسے پھاڑ دیں۔ چنانچہ چند دنوں بعد وہی ہوا جس کی جناب میثم تمار نے پیش گوئی کی تھی۔[2]

تفسیر جبیر: تالیف حضرت سعید بن جبیر شہید۔ تاریخ قرآن میں آپ وہ پہلے مفسر ہیں جنہوں نے باقاعدہ قرآن کی تفسیر تالیف و تصنیف فرمائی۔ آپ حضرت امام زین العابدین (ع) کے جلیل القدر صحابی اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ممدوح ہیں۔ چنانچہ علامہ ابوعمرو کشی اپنی کتاب رجال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

سعید بن جبیر کان یأتم بعلی بن الحسین و کان علی بن الحسین	سعید بن جبیر، علی ابن الحسین علیہما السلام کی امامت کے قائل تھے اور علی ابن الحسین علیہ السلام ان کی تعریف

---

[1] الذریعہ ۴: ۲۷۲ [2] الذریعۃ ۴: ۳۱۷

یثنی علیہ ۔ کرتے تھے ۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب میں آپ کی تفسیر کا ذکر کیا ہے ۔

علامہ سیوطی الاتقان میں قتادہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

> تابعین میں سب سے زیادہ عالم چار افراد تھے: عطاابن ابی ریاح مناسک و عبادات میں، سعید بن جبیر تفسیر میں، عکرمہ سیرت میں اور حسن حلال و حرام میں ۔[1]

آپ کو حجاج نے تشیع کے جرم میں شہید کیا ۔

عصر ائمہ (ع) کی تفاسیر: صدر اسلام سے ہی قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں فرزندان مکتب اہل بیت (ع) کی قرآنی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل میں ہم عصر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی چند اہم تفاسیر کا ذکر کرتے ہیں۔ ان تفاسیر کے مطالعے سے جہاں قرآنی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب اہل بیت علیہم السلام کس قدر تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

پہلی صدی کی تفاسیر:

۱۔ تفسیر علی علیہ السلام: شیخ مفید علیہ الرحمہ الارشاد میں فرماتے ہیں:

> ان علیا قدم فی مصحفه المنسوخ علی الناسخ و کتب فیه تاویل بعض الآیات و تفسیر ها بالتفصیل۔
>
> حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا ہے اور اس میں بعض آیات کی تاویل اور ان کی تفسیر تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

لو اصبت ذلك الكتاب لكان فيه العلم ۔[2] کاش اس کتاب تک رسائی ہوتی تو علم کا خزانہ مل جاتا۔

محمد بن سیرین عکرمہ سے نقل کرتے ہیں:

لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفواهذا التالیف ما استطاعوا۔[3] اگر اس قسم کی کتاب لکھنے کے لیے جن و انس جمع ہو جائیں تو بھی وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہوں گے ۔

۲۔ تفسیر ابن عباس: حضرت عبداللہ بن عباس حبر امت یعنی ''امت کے بلند پایہ عالم'' کے لقب سے ملقب ہیں۔

۳۔ تفسیر میثم تمار: تالیف میثم بن یحییٰ بن تمار الکوفی شہید (۶۰ ھ) ۔

۱۔ الاتقان فی علوم القرآن ۲: ۱۹۰ ۲۔ الطبقات الکبری ۲: ۳۸۸ ۳۔ الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۷

۴۔ تفسیر جبیر: تالیف حضرت سعید بن جبیر شہید۔

دوسری صدی کی تفاسیر:

۵۔ تفسیر طاؤوس: تالیف ابوعبداللہ طاؤوس بن کیسان الیمانی (متوفی ۱۰۶ھ)۔ آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ احمد بن تیمیہ نے انہیں علم تفسیر میں سب سے زیادہ عالم قرار دیا ہے۔[1] آپ مستجاب الدعوات تھے۔

۶۔ تفسیر عطیہ: تالیف عطیہ عوفی (متوفی ۱۱۴ھ) آپ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ حضرت ابان بن تغلب ان سے روایت اخذ کرتے ہیں۔

۷ تفسیر جعفی: تالیف جابر جعفی تابعی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت امام محمد باقر (ع) کے خاص اور نہایت قریبی صحابی ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ سید حسن صدر فرماتے ہیں:

و صنف تفسیر القرآن و کتبه عن الامام ابی جعفر الباقر علیه السلام	انہوں نے تفسیر لکھی اور اسے امام محمد باقر علیہ السلام سے اخذ کیا۔

آپ نے لمبی عمر پانے کے بعد ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔

۸۔ تفسیر سدی: تالیف ابومحمد اسماعیل بن عبدالرحمٰن الکوفی القرشی السدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے:

امثل التفاسیر تفسیر اسماعیل السدی۔	تفسیروں میں سب سے عمدہ تفسیر اسماعیل سدی کی ہے۔

آپ کی تفسیر کے راوی ابراہیم بن حکم بن ظہیر انفراری ہیں۔

۹۔ تفسیر عدوی: تالیف زید بن اسلم عدوی (متوفی ۱۳۶ھ)۔ شیخ طوسی نے انہیں اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں شمار کیا ہے۔

اور ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں ان کی متعدد تفاسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ تفسیر ابن ابی ھند: تالیف داؤد بن دینار سرخسی (متوفی ۱۳۹ھ)۔ آپ حضرت امام باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ تفسیر ابی بصیر: تالیف: ابوبصیر یحیٰی بن قاسم اسدی (متوفی قبل ۱۴۸ھ)۔ آپ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے معتمد صحابی تھے۔ آپ علمی و فقہی اعتبار سے بلند مقام

---

[1] الاتقان از تاسیس الشیعة ص ۳۲۵

رکھتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

۱۲۔ تفسیر ثمالی: حضرت ابوحمزہ ثابت بن دینار کوفی ثمالی (متوفی ۱۵۰ھ) آپ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام صادق علیہم السلام کے خاص صحابی تھے۔ اپنے عہد میں ائمہ اطہار علیہم السلام کے بعد رئیس شیعہ تھے۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں، ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نیز نجاشی اور صاحب کشف الظنون نے بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۔ تفسیر مقاتل: تالیف ابوالحسن مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ھ)۔ وہ حضرت امام جعفر صادق (ع) کے صحابی تھے۔

یافعی نے امام شافعی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا:

ان الناس کلھم عیال مقاتل بن سلیمان فی التفسیر۔[1]	تمام لوگ تفسیر کے سلسلے میں مقاتل بن سلیمان کے خوشہ چین ہیں۔

ان کی دیگر تالیفات یہ ہیں: الناسخ و المنسوخ۔ نوا در التفسیر۔ کتاب الجوابات فی القرآن۔ الآیات المتشابھات و متشابہ القرآن۔

۱۴۔ تفسیر ابی الجارود: تالیف ابوالجارود زیاد بن منذر (متوفی ۱۵۰ھ) یہ مادر زاد نابینا تھے اور حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کے صحابی تھے۔[2]

۱۵۔ تفسیر بطاینی: تالیف علی بن ابی حمزہ سالم بطائنی کوفی۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صحابی تھے۔ وہ اپنی تفسیر میں ابوبصیر سے روایت اخذ کرتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور الذریعہ نے کیا ہے۔

۱۶۔ تفسیر هشام کلبی: تالیف ہشام بن محمد بن سائب کلبی۔ ان کے والد متوفی ۱۴۶ھ کی تفسیر کا پہلے ذکر ہو چکا۔ ہشام کی متعدد تفاسیر کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں اور آقا بزرگ نے الذریعہ میں کیا ہے۔

۱۷۔ تفسیر اسماعیل: تالیف اسماعیل بن زیاد شعیری کوفی۔ شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے ان کو اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ذکر کیا ہے۔، ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۔ تفسیر الجرحی: تالیف ابو وہیب بن حفص الجریری۔ وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ثقہ صحابی تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر الذریعہ نے کیا ہے۔

---

[1] الذریعہ ۴: ۳۱۶ [2] حوالہ سابق ۴: ۲۵۱

۱۹۔ تفسیر الجوالیقی: تالیف ہشام بن سالم جوالیقی ۔حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسی کاظم علیہا السلام کے صحابی ہیں۔ نجاشی کے مطابق وہ ثقہ ہیں۔ ان کی تفسیر کا ذکر الذریعۃ میں کیا گیا ہے۔

۲۰۔ تفسیر سلولی: تالیف حصین بن مخارق بن عبد الرحمٰن ورقہ ابو جنادہ سلولی متوفی ۲۰۰ ھ ان کے جد اعلیٰ کا نام حبشی تھا اور وہ صحابی رسول (ص) تھے ۔ وہ خود امام جعفر صادق اور امام موسی کاظم علیہا السلام کے صحابی ہیں۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور ابن ندیم دونوں نے کیا ہے۔

۲۱۔ تفسیر ابی روق: تالیف عطیہ بن حارث ہمدانی کوفی تابعی (متوفی ۲۰۰ ھ) ان کی تفسیر کا ذکر ابن ندیم، نجاشی اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے ۔

۲۲۔ تفسیر واقد: تالیف حسن بن واقد (متوفی ۲۰۰ھ) ان کی تفسیر کا ذکر ابن ندیم اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے ۔

۲۳۔ تفسیر الحسین: تالیف حسین بن سعید بن حماد اہوازی کوفی (متوفی ۲۰۰ھ) ۔آپ امام رضا اور امام محمد تقی علیہا السلام سے روایت نقل کرتے تھے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں ان کی تفسیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک درجن دیگر تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

۲۴۔ التنزیل و کتاب التفسیر: تالیف ابوعبداللہ محمد بن خالد بن عبد الرحمٰن برقی ۔ وہ امام موسیٰ کاظم ، امام رضا اور امام محمد تقی علیہم السلام کے شاگرد تھے ۔شیخ طوسی نے اپنی الفہرست میں اور علامہ حلی نے اپنی کتاب الخلاصہ میں ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے ۔

۲۵۔ تفسیر منخل: تالیف منخل بن جمیل اسدی کوفی (متوفی ۲۰۰ھ) وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی نے کیا ہے ۔ واضح رہے اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۶۶ پر اس کے فاسد الروایۃ ہونے کا ذکر ہو چکا ہے ۔

۱۸۵

۲۶۔ تفسیر الصلت: تالیف عبد اللّٰہ بن صلت تیمی قمی ۔ وہ سنہ ۲۰۰ ھ تک زندہ تھے۔ وہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کرتے تھے اور حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے وکیل تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے ۔

۲۷۔ تفسیر اسباط: تالیف ابو الحسن علی بن اسباط بن سالم کوفی (متوفی ۲۰۰ھ) حضرت امام رضا (ع) کے صحابی تھے اور نجاشی ان کے حق میں لکھتے ہیں: کان اوثق الناس و اصدقهم لهجة۔[1]

۲۸۔ تفسیر اهل البیت: تالیف ابو الفضل سلمة القمی ۔ وہ حضرت امام رضا اور حضرت امام محمد تقی علیہا السلام کے دور کے علماء میں سے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی نے کیا ہے۔

---

[1] حوالہ سابق ۴: ۲۴۰

تیسری صدی کی تفاسیر:

۲۹۔ تفسیر یونس: تالیف یونس بن عبد الرحمٰن (متوفی ۲۰۸ھ) انہوں نے صفا و مروہ کے درمیان امام جعفر صادق علیہ السلام کی زیارت کی۔ وہ حضرت امام موسیٰ کاظم اور حضرت امام رضا علیہما السلام سے روایت کرتے تھے۔ وہ نہایت جلیل القدر عالم تھے۔

۳۰۔ تفسیر ھمام: تالیف عبد الرزاق بن ہمام بن نافع حمیری یمانی صنعانی متوفی ۲۱۱ ھ۔ وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی اور بلند پایہ عالم تھے۔ ان کی یہ تفسیر مصر کے بعض کتب خانوں میں آج تک محفوظ ہے۔[1]

۳۱۔ تفسیر محبوب: تالیف ابوالحسن بن محبوب سراد (متوفی ۲۲۴ھ)۔ وہ حضرت امام رضا اور امام محمد تقی علیہما السلام کے صحابی ہیں اور حضرت امام صادق (ع) کے ساٹھ اصحاب سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ آپ نہایت ہی جلیل القدر عالم تھے۔

۳۲۔ تفسیر مھزیار: تالیف ابو الحسن علی بن مہز یار دورقی (متوفی ۲۲۹ ھ)۔ وہ حضرت امام رضا، حضرت امام محمد تقی اور حضرت علی نقی علیہم السلام کے وکیل رہے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف حروف القرآن بھی ہے۔

۳۳۔ تفسیر دکین: تالیف فضل بن دکین شہید (متوفی ۲۱۹ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر نے اپنی کتاب تاسیس الشیعہ میں کیا ہے۔

۳۴۔ تفسیر فضال: تالیف ابو محمد حسن بن علی بن فضال کوفی (متوفی ۲۲۴ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر اور ابن ندیم نے کیا ہے۔

۳۵۔ تفسیر الفراء: تالیف یحییٰ بن زیاد اقطع بن عبد اللہ دیلمی (متوفی ۲۰۷ھ)۔ ان کے والد کا ہاتھ واقعہ فخ میں کٹ گیا تھا اس لیے ان کو اقطع کہتے تھے۔ ان کی تفسیر اور دیگر متعدد تصانیف کا ذکر ابن ندیم نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

۳۶۔ تفسیر العسکری: تالیف ابوعلی حسن بن خالد بن عبد الرحمٰن برقی۔ ابن شہر آشوب اور صاحب الذریعہ نے اس تفسیر کا ذکر تفسیر العسکری کے نام سے اس لیے کیا ہے کہ یہ پوری تفسیر حضرت امام علی نقی (ع) کی املا کردہ ہے۔ حضرت امام علی نقی (ع) کو بھی صاحب عسکر یا عسکری کہتے ہیں۔ یہ تفسیر ایک سو بیس جلدوں پر مشتمل تھی لیکن اس کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

ناسخ اور منسوخ: اس نہایت اہمیت کے حامل موضوع پر مذہب اہل بیت (ع) کے فرزندوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں ہم بطور نمونہ چند اہم کتابوں کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو اس

---

[1] حوالہ سابق ۴ : ۲۵۰

موضوع پر عصر ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں تالیف ہوئیں۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف حسن بن علی بن فضال فطحی کوفی (متوفی ۲۲۴ھ)۔ نجاشی اور صاحب الذریعہ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف ابوجعفر احمد بن محمد بن عیسی اشعری قمی۔ انہوں نے امام رضا علیہ السلام کی زیارت کی اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ اس کتاب کا نجاشی اور صاحب الذریعہ نے ذکر کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف حسن بن واقد (متوفی ۲۰۰ھ)۔ اس کتاب کا ذکر ابن ندیم اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف دارم بن قبیصه بن نهشل تمیمی دارمی۔ وہ امام رضا علیہ السلام کے صحابی تھے۔ اس کتاب کا ذکر نجاشی اور صاحب الذریعة نے کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف عبد اللّٰه بن عبد الرحمن الاصم السمعی البصری۔ آپ حضرت امام جعفر صادق (ع) کے صحابی مسمع کردیز سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ اس کتاب کا ذکر نجاشی اور صاحب الذریعة نے کیا ہے۔

سورة الفاتحة
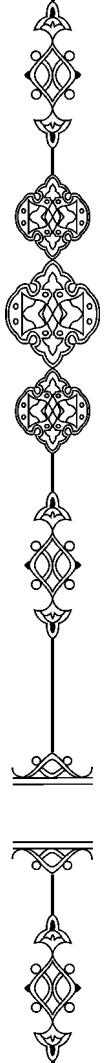
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ سورہ قرآن کریم کا افتتاحیہ اور دیباچہ ہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک قرآنی سورتوں کے نام توقیفی ہیں یعنی خود رسول کریم (ص) نے بحکم خدا ان کے نام متعین فرمائے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن عہد رسالت مآب (ص) میں ہی کتابی شکل میں مدون ہو چکا تھا، جس کا افتتاحیہ سورۂ فاتحہ تھا۔ چنانچہ حدیث کے مطابق اس سورے کو فَاتِحَۃُ الۡکِتَابِ ''کتاب کا افتتاحیہ'' کہا جاتا ہے۔

مقام نزول: سورۂ حجر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ۝[1]

اور بتحقیق ہم نے آپ کو (بار بار) دہرائی جانے والی سات (آیات) اور عظیم قرآن عطا کیا ہے۔

سبع مثانی سے مراد بالاتفاق سورۂ حمد ہے اور اس بات پر بھی تمام مفسرین متفق ہیں کہ سورۂ حجر مکی ہے۔ بنابریں سورۂ حمد بھی مکی ہے۔ البتہ بعض کے نزدیک یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا۔

تعداد آیات: تقریبا تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ سورۂ حمد سات آیات پر مشتمل ہے لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سورہ حمد کا جزو ہے یا نہیں؟ بِسۡمِ اللّٰہِ کو سورے کا جزو سمجھنے والوں کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِیۡنَ سے آخر تک ایک آیت شمار ہوتی ہے اور جو لوگ اسے جزو نہیں سمجھتے وہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کو ایک الگ آیت قرار دیتے ہیں۔

مکتب اہل بیت علیہم السلام میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سورۂ توبہ کے علاوہ تمام سورتوں کا جزو ہے۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۸۷

فضیلت: سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پورے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

مروی ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے آباء طاہرین کے ذریعے سے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا:

> بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فاتحۃ الکتاب کی آیات میں شامل ہے اور یہ سورہ سات آیات پر مشتمل ہے جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے مکمل ہوتا ہے۔ میں نے رسول خدا (ص) کو یہ فرماتے سنا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عز و جل قَالَ لِيْ: يَا مُحَمد! " وَ لَقَد آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَ الْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ" فَأَفْرَدَ الْإِمْتِنَانَ عَلَيَّ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ جَعَلَهَا بِإِزَاءِ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَ إِنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ اَشْرَفُ مَا فِيْ كُنُوْزِ الْعَرْشِ [1]

اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: اے محمد (ص)! بتحقیق ہم نے آپؐ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ پس اللہ نے مجھے فاتحۃ الکتاب عنایت کرنے کے احسان کا علیحدہ ذکر فرمایا اور اسے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا۔ بے شک فاتحۃ الکتاب عرش کے خزانوں کی سب سے انمول چیز ہے۔

آیت: آیت سے مراد ''نشانی'' ہے۔ قرآن مجید کی ہر آیت مضمون اور اسلوب کے لحاظ سے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اسی لیے اسے آیت کہا گیا ہے۔

آیات کی حد بندی توقیفی ہے، یعنی رسول خدا (ص) کے فرمان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک مکمل آیت کتنے الفاظ اور کن عبارات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ حروف مقطعات مثلاً کٓہٰیٰعٓصٓ ایک آیت ہے، جب کہ اس کے برابر حروف پر مشتمل حٰمٓ عٓسٓقٓ دو آیتیں شمار ہوتی ہیں۔

قرآن مجید کی کل آیات چھ ہزار چھ سو (۶۶۰۰) ہیں[2] قرآن مجید کے کل حروف تین لاکھ تیئس ہزار چھ سو اکہتر (۳۲۳۶۷۱) ہیں، جب کہ طبرانی کی روایت کے مطابق حضرت عمر سے مروی ہے: القرآن لف الف حرف یعنی قرآن دس لاکھ (۱۰۰۰۰۰۰) حروف پر مشتمل ہے۔[3] بنا بریں موجودہ قرآن سے چھ لاکھ چھہتر ہزار تین سو انتیس (۶۷۶۳۲۹) حروف غائب ہیں۔

حق تو یہ تھا کہ اس روایت کو خلاف قرآن قرار دے کر رد کر دیا جاتا، مگر علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

وَ قَدْ حُمِلَ ذٰلِكَ عَلَى مَا نُسِخَ رَسْمُهٗ روایت کو اس بات پر محمول کیا گیا ہے کہ یہ حصہ

---

[1] البیان للامام الخوئی اردو ترجمہ ص ۴۱۸۔ امالی للصدوق ص ۱۷۵۔ عیون اخبار الرضا ج ۱ ص ۳۰۲۔

[2] الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۱:۱۳۴ [3] حوالہ سابق

مِنَ الْقُرْآنِ ایضاً اِذِ الْمَوْجُوْدُ اَلْآنَ لَا یَبْلُغُ هٰذَا الْعَدَدَ۔[1]	قرآن سے منسوخ الرسم ہو گیا ہے، کیونکہ موجودہ قرآن میں اس مقدار کے حروف موجود نہیں ہیں۔

کتنا غیر معقول مؤقف ہے کہ قرآن کا دو تہائی منسوخ الرسم ہو جائے اور صرف ایک تہائی باقی رہ جائے؟!

سورہ: قرآن جس طرح اپنے اسلوب بیان میں منفرد ہے، اسی طرح اپنی اصطلاحات میں بھی منفرد ہے۔ قرآن جس ماحول میں نازل ہوا تھا، اس میں دیوان، قصیدہ، بیت اور قافیے جیسی اصطلاحات عام تھیں، لیکن قرآن ایک ہمہ گیر انقلابی دستور ہونے کے ناطے اپنی خصوصی اصطلاحات کا حامل ہے۔ قرآنی ابواب کو ''سورہ'' کا نام دیا گیا، جس کا معنی ہے ''بلند منزلت''، کیونکہ ہر قرآنی باب نہایت بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے۔

سورہ کا ایک اور معنی فصیل شہر ہے۔ گویا قرآنی مضامین، ہر قسم کے تحریفی خطرات سے محفوظ ایک شہر پناہ کے احاطے میں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	۱۔ بنام خدائے رحمٰن رحیم۔

تاریخی حیثیت: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے مبارک نام سے ہر کام کا آغاز و افتتاح الٰہی سنت اور آداب خداوندی میں شامل رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے علم الاسماء سے نوازا گیا۔ حدیث کے مطابق اللہ کی ذات پر دلالت کرنے والے تکوینی اسماء یہی انبیاء و اوصیاء علیہم السلام ہیں۔

حضرت نوح (ع) نے کشتی میں سوار ہوتے وقت فرمایا: بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىہَا وَ مُرۡسٰہَا [2] حضرت سلیمان (ع) نے ملکہ سبا کے نام اپنے خط کی ابتدا بسم اللہ سے کی: اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ [3] حضرت خاتم الانبیاء (ص) پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی تو اسم خدا سے آغاز کرنے کا حکم ہوا: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ۔ [4]

یہ الٰہی اصول ہر قوم اور ہر امت میں رائج ہے:

وَ لِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَکًا لِّیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَہُمۡ مِّنۡۢ بَہِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ ۔۔۔۔ [5]	اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک دستور مقرر کیا ہے تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں عطا کیے ہیں۔

۱۔ حوالہ سابق ۱: ۱۴۱	۲۔ ۱۱ ہود: ۴۱	۳۔ ۲۷ نمل: ۳۰	۴۔ ۹۶ علق: ۱	۵۔ ۲۲ حج: ۳۴

وَ لِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡهُ بِهَا [1] — اور زیبا ترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس تم اسے انہی (اسمائے حسنٰی) سے پکارو۔

وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا [2] — اور صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کریں۔

قرآنی حیثیت: اس بات پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اجماع ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ جزو سورہ ہے۔ مکہ اور کوفہ کے فقہاء اور امام شافعی کا نظریہ بھی یہی ہے۔ عہد رسالت میں بتواتر ہر سورہ کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰہِ کی تلاوت ہوتی رہی اور سب مسلمانوں کی سیرت یہ رہی ہے کہ سورۂ برائت کے علاوہ باقی تمام سورتوں کی ابتدا میں وہ بِسۡمِ اللّٰہِ کی تلاوت کرتے آئے ہیں۔ تمام اصحاب و تابعین کے مصاحف میں بِسۡمِ اللّٰہِ درج تھی، حالانکہ وہ اپنے مصاحف میں غیر قرآنی کلمات درج کرنے میں اتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ قرآنی حروف پر نقطے لگانے سے بھی اجتناب کرتے تھے۔

عصر معاویہ تک یہ سیرت تواتر سے جاری رہی۔ معاویہ نے ایک بار مدینے میں بِسۡمِ اللّٰہِ کے بغیر نماز پڑھائی تو مہاجرین و انصار نے احتجاج کیا:

یا معاویه أسرقت الصلاة أم نسیت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ [3] — اے معاویہ! تو نے نماز چوری کی ہے یا بھول گئے ہو۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہاں گئی؟

معاویہ اور اموی حکام نے قرآن سے بِسۡمِ اللّٰہِ کو حذف کیا، لیکن ان کے مصلحت کوش پیروکاروں نے اسے ترک تو نہیں کیا، مگر آہستہ ضرور پڑھا، حالانکہ قرآن کی تمام سورتوں میں بِسۡمِ اللّٰہِ کے ایک الگ آیت شمار ہونے پر متعدد احادیث موجود ہیں:

۱۔ عن طلحه بن عبید اللّٰه قال: قال رسول اللّٰه (ص): مَنْ تَرَكَ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فَقَدْ تَرَكَ آيَةً مِنْ كتابِ اللّٰه۔ [4] — طلحہ بن عبید اللہ راوی ہیں کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: جس نے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو ترک کیا، اس نے قرآن کی ایک آیت ترک کی۔

۲۔ حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ (ص) ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ (ص) پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی پھر مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ (ص) آپ (ص) کس بات پر مسکرا رہے ہیں؟ فرمایا:

اُنْزِلَتْ عَلَيَّ آنِفاً سُوْرَةٌ فَقَرَأَ — ابھی ابھی مجھ پر ایک سورہ نازل ہوا ہے۔ پھر پڑھا:

---

[1] ۷ اعراف: ۱۸۰ [2] ۷۶ دھر: ۲۵

[3] مصنف عبد الرزاق ۲: ۹۲۔ کتاب الام للشافعی میں مذکورہ عبارت تھوڑے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

[4] الدر المنثور ۱: ۲۷۔ تذکرۃ الحفاظ ۹۰۔ تقریب التہذیب ۱: ۳۷۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ　　بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ [1]

۳۔ ابن عمر راوی ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہر سورہ کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ [2]

۴۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں :

جب رسول اللہ (ص) کے پاس جبرائیل بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لے کر نازل ہوتے تو آپ (ص) کو معلوم ہوجاتا تھا کہ جدید سورہ نازل ہونے والا ہے۔ [3]

لیکن بااین ہمہ امام ابوحنیفہ بسم اللّٰہ کو سورۂ حمد سمیت کسی بھی قرآنی سورے کا جزو نہیں سمجھتے۔ مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو القرآن الکریم و روایات المدرستین از علامہ مرتضیٰ عسکری۔

بسم اللّٰہ سورۂ حمد کی ایک آیت ہے: اس بارے میں متعدد روایات موجود ہیں۔ جن کے راوی درج ذیل جلیل القدر اصحاب ہیں:

۱۔ ابن عباس کہتے ہیں :

رسول اللہ (ص) سورۂ حمد کی ابتدا بِسۡمِ اللّٰہِ سے کرتے تھے۔ [4]

حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی مشہور ہے:

شیطان نے لوگوں سے قرآن کی سب سے بڑی آیت چرا لی ہے۔ [5]

۲۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں :

رسول اللہ (ص) سورۂ حمد میں بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھتے تھے۔ [6]

۳۔ جابر [7]

۴۔ نافع [8]

۵۔ ابوہریرہ [9]

۶۔ انس بن مالک [10]

بسم اللّٰہ کا بالجہر (آواز سے) پڑھنا: اس بات پر بھی کبار اصحاب کی متعدد روایات

۱۔ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ ۱: ۳۰۰۔ سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ ۱: ۲۰۸ حدیث ۷۸۴۔ سنن بیہقی ۱: ۴۳

۲۔ الدر المنثور ۱: ۲۶　۳۔ مستدرک الحاکم ۱: ۲۳۱　۴۔ سنن الترمذی ۲: ۴۴　۵۔ سنن بیہقی ۲: ۵۰

۶۔ مستدرک الحاکم ۲: ۲۳۲۔　۷۔ الدر المنثور ۱: ۸　۸۔ سنن بیہقی ۲: ۴۷

۹۔ حوالہ سابق　۱۰۔ صحیح بخاری باب فضائل القرآن

موجود ہیں کہ رسول اللہ (ص) بسم اللہ کو آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔

۱۔ ابو ہریرہ راوی ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ: ثم عَلَّمَنِی جِبْرائِیْلُ الصَّلٰوۃَ فَقَامَ فَکَبَّرَ لنا ثمَّ قَرَأَ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فِیْمَا یُجْھَرُ بِہِ فِی کُلِّ رَکْعَۃٍ۔[۱]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: جبرئیل نے مجھے نماز سکھائی۔ پس وہ کھڑے ہوئے، تکبیر کہی تا کہ اقتداء کی جائے، بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہر رکعت میں بالجہر پڑھی۔

۲۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

رسول اللہ (ص) بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو بالجہر پڑھتے تھے۔[۲]

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

رسول اللہ (ص) دونوں سورتوں میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو بالجہر پڑھتے تھے۔[۳]

۴۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں:

رسول اللہ (ص) بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو بالجہر پڑھتے تھے مگر لوگوں نے اسے ترک کر دیا۔[۴]

۵۔ ابو طفیل امام علی بن ابی طالب (ع) سے روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ (ص) بِسۡمِ اللّٰہِ کو واجب نمازوں میں بالجہر پڑھتے تھے۔[۵]

۶۔ انس بن مالک کہتے ہیں:

میں نے سنا کہ رسول اللہ بِسۡمِ اللّٰہِ کو بالجہر پڑھتے تھے۔[۶]

۷۔ ابن عمر راوی ہیں:

میں نے نبی (ص)، ابوبکر اور عمر کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ وہ سب بِسۡمِ اللّٰہِ کو بالجہر پڑھتے تھے۔[۷]

۸۔ انس راوی ہیں:

میں نے نبی (ص) ابوبکر، عمر اور علی علیہ السلام کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ سب نے بِسۡمِ اللّٰہِ کو بالجہر پڑھا۔[۸]

اس کے علاوہ بہت سے علماء نے بِسۡمِ اللّٰہِ کو بالجہر پڑھنے اور اس کے ضروری ہونے پر خصوصی

۱۔ سنن الدار قطنی ۱: ۳۰۷۔ اسد الغابہ ۲: ۲۲ تقریب التہذیب ۲: ۳۰۳

۲۔ الدر المنثور ۱: ۲۸۔ سنن الدار قطنی ۱: ۳۱۱ ۳۔ حوالہ سابق ۴۔ حوالہ سابق ۵۔ حوالہ سابق ۱: ۲۸

۶۔ حوالہ سابق۔ مستدرک الحاکم ۱: ۲۳۳ ۷۔ الدر المنثور ۱: ۲۸ ۸۔ مستدرک الحاکم ۱: ۲۳۴

کتب تالیف کی ہیں مثلاً:

۱۔ كتاب البسملة۔ تالیف :ابن خزیمہ متوفی ۳۱۱ ھ

۲۔ كتاب الجهر بالبسملة۔ تالیف : خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ ھ

۳۔ كتاب الجهر بالبسملة۔ تالیف:ابو سعید بوشنجی متوفی ۵۳۶ ھ

۴۔ كتاب الجهر بالبسملة۔ تالیف : جلال الدین محلی شافعی متوفی ۸۶۴ ھ

ملاحظہ ہو: القرآن و روايات المدرستين

تشریح کلمات

سم: (س م و) یہ لفظ اگر سمو سے مشتق ہو تو اس کا معنی ''بلندی'' ہے کیونکہ اسم اپنے معنی کو پردۂ خفا سے منصۂ شہود پر لاتا ہے اور اگر و س م سے مشتق ہو تو ''علامت'' کے معنی میں ہے۔

اللہ: (ا ل ہ) اَلَہَ یعنی عَبَدَ ۔ الٰہ سے مراد ہے معبود۔ حذف ہمزہ کے بعد ال معرفہ داخل کرنے سے اللہ بن گیا۔ یہ اسم ذات ہے جو اللہ کی مقدس ذات سے مخصوص ہے۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا [۱]
''کیا اس کا کوئی ہم نام تیرے علم میں ہے۔''

الرَّحْمٰن: (ر ح م) رحمت سے صیغۂ مبالغہ ہے یعنی نہایت رحم کرنے والا ''مہربان''، جس کی رحمت ہر چیز کو شامل ہو۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا خصوصی لقب ہے۔

الرَّحِيْم: صفت رحم سے متصف ذات جس کی رحمت کثیر ہو۔ یہ ''شریف'' اور ''کریم'' کے وزن پر ہے اور یہ وزن ایسی صفت بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو کسی ذات کے لاینفک لوازم میں سے ہو۔

تفسیر آیات

بِسْمِ اللّٰهِ: بِسْمِ اللّٰهِ میں باء ''استعانت'' کے معنی میں ہے۔ یعنی میں سہارا اور مدد لیتا ہوں اللہ کے نام سے۔

اولاً تو لفظ اللہ ہی اسم اعظم ہونے کے اعتبار سے بہت بڑا سہارا ہے۔ ثانیاً اسم سے مراد مسمی ہوتا ہے۔ جیسے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ ... [۲] میں نام خدا کی نہیں بلکہ ذات خدا کی تسبیح مراد ہے۔

قرآن کا ہر سورہ انسانیت کے لیے صحیفۂ نجات ہے۔ اس لیے ہر سورے کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ سے ہوتی ہے۔ اسم ذات کی ترجمانی کرتا ہے، کیونکہ اسم اگر قراردادی اور اعتباری ہو تو اس کے لیے مخصوص

---

۱ ۱۹ مریم: ۶۵　　۲ ۸۷ اعلیٰ: ۱

الفاظ منتخب کیے جاتے ہیں اور اگر تکوینی ہو تو اس مقصد کے لیے مخصوص ذات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ الفاظ کی شکل میں اسم اعظم بِسۡمِ اللّٰہِ ہے اور ذات کی شکل میں اسم اعظم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی تشریعی و تدوینی کتاب قرآن کو بِسۡمِ اللّٰہِ سے شروع کیا، اسی طرح اپنی تکوینی کتاب کائنات کی ابتدا ذات محمد (ص) سے کی اور تمام مخلوقات سے پہلے نور محمدی (ص) خلق فرمایا:

اِبْتَدَأَ اللّٰهُ كِتَابَهُ التَّدْوِيْنِي بِذِكْرِ اِسْمِهِ كَمَا اِبْتَدَأَ فِي كِتَابِهِ التَّكْوِيْنِي بِاِسْمِهِ الْاَتَمِّ فَخَلَقَ الْحَقِيْقَةَ الْمُحَمَّدِيَّةَ وَ نُوْرَ النَّبِيِّ الْاَكْرَمِ قَبْلَ سَائِرِ الْمَخْلُوْقِيْنَ۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنی تدوینی کتاب کی ابتدا اپنے نام سے کی جیسا کہ اس نے اپنی تکوینی کتاب کی ابتدا اپنے کامل اسم سے کی۔ چنانچہ تمام مخلوقات سے پہلے حقیقت اور نور محمدی (ص) کو خلق کیا۔

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ:

۱۔ قرآن کی ابتدا ذکر رحمت سے ہو رہی ہے۔ خود قرآن بھی اللہ کی عظیم رحمت ہے:

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا ہُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ...[2]

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے۔

خود رسول کریم (ص) بھی اللہ کی عظیم رحمت ہیں:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۝[3]

اور (اے رسول) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے۔رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کی اس غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے رحمت کو اپنی ذات پر لازم قرار دے رکھا ہے:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ[4]

تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے.

۲۔ الرَّحۡمٰنِ ۔ بے پایاں رحم کرنے والا۔ مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کس پر رحم کرنے والا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اگر اس کا ذکر کر دیا جاتا تو خدا کی رحمانیت اسی کے ساتھ مخصوص ہو جاتی، جب کہ ذکر نہ کرنے سے اللہ کی رحمانیت کا دائرہ وسیع رہتا ہے۔ لفظ الرَّحۡمٰنِ ہمیشہ کسی قید و تخصیص کے بغیر استعمال ہوتا ہے یعنی رحمٰن بالمؤمنین نہیں کہا جاتا کیونکہ خدا فقط مؤمنین پر ہی رحم کرنے والا نہیں ہے:

فَاِنَّ كَلِمَةَ الرَّحۡمٰنِ فِي جميع موارد استعمالها مَحْذُوْفَةُ الْمُتَعَلَّقِ فَيُسْتَفَادُ مِنْها الْعُمُوْمُ وَ اَنَّ رَحْمَتَهُ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔[5]

لفظ الرَّحۡمٰنِ جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس کا متعلق محذوف ہے، اسی لیے اس سے عمومیت کا استفادہ ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔

---

[1] البیان اردو ترجمہ ص ۴۳۴　[2] ۱۷ اسراء: ۸۲　[3] ۲۱ انبیاء: ۱۰۷　[4] ۶ انعام: ۵۴　[5] البیان: ۴۳۰

۳۔ الرَّحۡمٰنِ اور الرَّحِیۡمِ کو بِسۡمِ اللّٰہِ جیسی اہم ترین آیت میں باہم ذکر کرنے سے مقام رحمت کی تعبیر میں جامعیت آ جاتی ہے، کیونکہ الرَّحۡمٰنِ سے رحم کی عمومیت و وسعت وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ [1] ''اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے'' اور الرَّحِیۡمِ سے رحم کا لازمۂ ذات ہونا مراد ہے: کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ۔ [2] چنانچہ اس تعبیر میں عموم رحمت اور لزوم رحمت دونوں شامل ہیں۔

۴۔ الرَّحۡمٰنِ اور الرَّحِیۡمِ ، رحم سے مشتق ہیں، جو احتیاج، ضرورتمندی اور محرومی کے موارد میں استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شے کے فقدان کی صورت میں احتیاج، ضرورت اور پھر رحم کا سوال پیدا ہوتا ہے اور رحم کرنے والا اس چیز کا مالک ہوتا ہے جس سے دوسرا شخص (جس پر رحم کیا جاتا ہے) محروم ہوتا ہے.

بعض علماء کے نزدیک الرَّحۡمٰنِ اسم ذات ہے، کیونکہ قرآن میں بہت سے مقامات پر اس لفظ سے ذات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ○ [3]	کہد یجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

اس لیے اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ ہر کمال اور طاقت کا سرچشمہ ہے، جب کہ انسان اور دیگر مخلوقات محتاج اور ضرورتمند ہیں۔ کائنات کا مالک اپنے محتاج بندوں کو یہ باور کرا رہا ہے کہ وہ سب سے پہلے الرَّحۡمٰنِ و الرَّحِیۡمِ ہے، کیونکہ وہی ہر فقدان کا جبران، ہر احتیاج کو پورا اور ہر کمی کو دور کرتا ہے اور اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازتا ہے۔

۵۔ نماز میں بِسۡمِ اللّٰہِ کو بالجہر (آواز کے ساتھ) پڑھنا مستحب ہے۔ حدیث کے مطابق یہ مؤمن کی علامت ہے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے پدر بزرگوار (ع) سے روایت فرماتے ہیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَقۡرَبُ اِلَی اسۡمِ اللّٰہِ الۡاَعۡظَمِ مِن نَاظِرِ الۡعَیۡنِ اِلَی بَیَاضِہَا۔ [4]	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اللہ کے اسم اعظم سے ایسے نزدیک ہے جیسے آنکھ کا قرینہ سفیدی سے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَقۡرَبُ اِلَی اِسۡمِ اللّٰہِ الۡاَعۡظَمِ مِنۡ سَوَادِ الۡعَیۡنِ اِلَی بَیَاضِہَا۔ [5]	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم سے اتنی نزدیک ہے جتنی آنکھ کی سیاہی اس کی سفیدی سے قریب ہے۔

۱۔ ۷ اعراف: ۱۵۶ ۲۔ ۶ انعام: ۵۴ ۳۔ ۴۳ زخرف: ۸۱ ۴۔ التھذیب باب کیفیۃ الصلوۃ ص ۲۸۹
۵۔ بحار الانوار ۷۵: ۳۷۱ باب ۲۹ ح ۶۱۔ کشف الغمہ ۲: ۴۳۰۔ التھذیب باب ۱۵ ص ۲۸۹ سَوَادِ کی بجائے نَاظِرِ ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر کام کی ابتدا میں اپنے مہربان معبود یعنی اللہ کا نام لینا آداب بندگی میں سے ہے۔

۲۔ ہر کام کو نام خدا سے شروع کرنے سے انسان کے کائناتی مؤقف اور تصور حیات کا تعین ہوتا ہے کہ کائنات پر اسی کی حاکمیت ہے۔ لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ ہر کام اور ہر چیز میں صرف اسی کا دخل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبْتَرُ۔[1] یعنی ہر وہ اہم کام جسے اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے اپنے مطلوبہ انجام تک نہیں پہنچتا۔ چونکہ اس کائنات میں اللہ ہی سب کا مطلوب و مقصود ہے اور اس کے بغیر ہر کام ادھورا اور ابتر رہتا ہے۔ لہٰذا حصول مرام کے لیے اس کے نام سے ابتدا کرنا ضروری ہے۔

۳ الرَّحۡمٰنِ سے رحمت کی عمومیت اور الرَّحِیۡمِ سے رحمت کا لازمۂ ذات ہونا، رحمٰن کے صیغۂ مبالغہ ہونے اور رحیم کے صفت مشبہ ہونے سے ظاہر ہے۔

۴۔ اللہ کے اوصاف میں الرَّحۡمٰنِ و الرَّحِیۡمِ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

۵۔ اللہ کی رحمانیت سب کو شامل ہے، جب کہ اس کی رحیمیت صرف مؤمنین کے لیے ہے۔

تحقیق مزید

الوسائل ۶ : ۵۹ باب ان البسملة آية۔ الوسائل ۶: ۱۱۹ ۔ ۷:۱۱۹ ۔ ۷ ۔ ۱۶۹ ۔ مستدرک الوسائل ۴:۱۶۶ ۔۴: ۱۸۷۔۴: ۱۸۹۔ عوالی اللآلی ۴ : ۱۰۲

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۲﴾

۲۔ ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

تشریح کلمات

اَلۡحَمۡدُ: (ح م د) ثنائے کامل۔ اختیاری خوبیوں کی تعریف کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ اَل کلمہ استغراق ہے۔ یعنی ساری حمد، کوئی بھی حمد ہو۔ اس لیے ہم نے اَل کا ترجمہ کامل سے کیا ہے۔

رَب: (ر ب ب) کسی شے کو تدریجاً ارتقائی درجات کی طرف لے جانے والا۔ رب اس مالک کو کہتے ہیں جس کے ہاتھ میں تدبیر امور ہو۔ المالك الذی بيده تدبير الامور۔ العين میں مذکور ہے: و من ملك شيئاً فهو ربه۔ جو کسی چیز کا مالک بنے وہ اس کا رب کہلائے گا۔

---

[1] وسائل الشیعة ۷: ۱۷۰۔ لم یبدأ کی بجائے لم یذکر ہے۔

لسان العرب میں ہے: فَلَان رَبُّ ھَذَا الشیء اَیْ مِلْکُہُ لَہُ۔ فلاں اس چیز کا رب یعنی مالک ہے۔ بادل کو رباب کہتے ہیں، کیونکہ اس سے برسنے والے پانی سے نباتات کی نشو ونما ہوتی ہے۔

جو شخص رب کی طرف منسوب ہوا، اسے ربانی کہتے ہیں۔ ارشاد قدرت ہے:

كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ [1]　　تم سچے ربانی بن جاؤ۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا:

اَنَا رَبَّانِیُّ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔ [2]　　میں اس امت کا ربانی ہوں۔

تفسیر آیات

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ: الْحَمْد دو لفظوں اَل اور حمد سے مرکب ہے۔ اَل عمومیت کا معنی دیتاہ ے اور حمد ثنائے کامل کو کہتے ہیں۔ اردو زبان کی گنجائش کے مطابق اس کا مفہوم یہ بنتا ہے: ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے۔ یعنی اگر غیر خدا کے لیے بظاہر کوئی جزوی ثنا اور حمد دکھائی دیتی بھی ہے تو اس کا حقیقی سرچشمہ بھی ذات خداوندی ہے۔ بالفاظ دیگر مخلوقات کی حمد و ثنا کی بازگشت ان کے خالق کی طرف ہوتی ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی۝ [3]　　ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

تمام موجودات معلول ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے علت العلل ہے۔ لہٰذا معلول کے تمام اوصاف علت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا وجود جو ایک کمال ہے، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی لیے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع) نے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہنے کے بعد فرمایا: فَمَا مِنْ حَمْدٍ اِلَّا وَ ھُوَ دَاخِلٌ فِیْمَا قُلْتُ۔ [4] یعنی ہر قسم کی حمد و ثنا اس جملے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ میں داخل ہے جو میں نے کہا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

شُکْرُ النِّعْمَۃِ اجْتِنَابُ الْمَحَارِمِ وَ تَمَامُ الشُّکْرِ قَوْلُ الرَّجُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ۔ [5]　　حرام سے اجتناب کرنا نعمت کا شکر ہے اور الحمد للہ رب العالمین کہنے سے شکر کی تکمیل ہوتی ہے۔

رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: توحید رب تمام انبیاء (ع) کی تبلیغ کا محور و مرکز رہی ہے، ورنہ توحید خالق کے تو

---

[1] ۳ آل عمران: ۷۹

[2] مفردات راغب مادہ ''رب''۔ قال النبی (ص) علیَ رَبَّانِیَّ ھٰذِہِ الْاُمَّۃ ۔ المناقب ج ۲ ص ۴۵　　[3] ۲۰ طہ: ۵۰

[4] کشف الغمۃ ج ۲ ص ۱۱۸　　[5] الکافی ۲: ۹۵ باب الشکر۔ بحار الانوار ۶۸: ۴۰ باب الشکر

مشرکین بھی قائل تھے۔ ملاحظہ ہو سورۃ عنکبوت: ۶۳ تا ۶۱۔ سورہ زخرف ۹، ۸۷۔ لقمان: ۲۵

تربیت یعنی کسی شے کو بتدریج ارتقائی منازل کی طرف لے جانا۔ جب لفظ رَب کو بلا اضافت استعمال کیا جائے تو اس کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے:

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ ہُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ ... [۱] — کہدیجیے: کیا میں کسی غیر اللہ کو اپنا معبود بناؤں؟ حالانکہ اللہ ہر چیز کا رب ہے۔

البتہ غیر خدا کے لیے اضافت ضروری ہے۔ جیسے رب البیت، رب السفینة وغیرہ۔

لفظ رب اس مالک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس کے ہاتھ میں مملوک کے امور کی تدبیر ہو۔ اسلامی تعلیمات کا مرکزی نکتہ خالق و مدبر کی وحدت ہے کہ جس نے خلق کیا ہے، اسی کے ہاتھ میں تدبیر امور ہے: یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ .... [۲]

انسانی تکامل و ارتقا کا مربی خدا ہے اور حقیقی مالک بھی وہی ہے اس لیے لفظ رب کو مقام دعا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ تمام انبیاء (ع) کی یہ سیرت رہی ہے کہ انہوں نے اپنی دعاؤں کی ابتدا لفظ رَب سے کی اور اللہ کو ہمیشہ اسی لفظ سے پکارا: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ... [۳] رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا .. [۴] رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ .... [۵]

عالمین: اسم جمع ہے۔ موجودات کی ایک صنف پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے عالم الانس، عالم الارواح وغیرہ۔ اللہ کے سوا پوری کائنات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

ممکن ہے عَالَمِین سے یہاں پہلا معنی مراد ہو۔ بنابریں رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کا معنی یہ ہوا کہ تمام عالمین کا مربی اور ان کی ارتقا کا سرچشمہ فقط اللّٰہ ہے۔ اس جامع اور وسیع نظریہ توحید سے وہ فرسودہ توہمات بھی باطل ہوجاتے ہیں، جن کے مطابق مشرکین تربیت و فیض کا سرچشمہ ایک ذات کی بجائے متعدد ذوات کو قرار دیتے اور ایک رب کی بجائے بہت سے ارباب کو پکارتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ہر حمد و ثناء کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ۔

۲۔ تمام کائنات کا مالک اور ہر ارتقا کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے: رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

۳۔ کائنات پر صرف ایک رب کی حاکمیت ہے۔

۴۔ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ مربوب اپنے رب کی تعریف کرے۔

۵۔ مربی کے بغیر ارتقائی مراحل طے نہیں ہو سکتے۔

۱۔ ۶ انعام: ۱۶۴ ۲۔ ۳۲ سجدہ: ۵ ۳۔ ۲ بقرہ: ۲۰۱ ۴۔ ۳ آل عمران: ۸ ۵۔ ۲ بقرہ ۱۲۹

۶۔ تربیت یعنی حقیقی منزل کی طرف رہنمائی سب سے اہم کام ہے۔

۷۔ لفظ عالمین سے ظاہر ہے کہ تربیت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔

۸۔ وحدت مربی نظام کائنات میں ہم آہنگی اور وحدت ہدف کی ضامن ہے۔

تحقیق مزید

مجموعہ ورام ۲ : ۱۰۷۔ الکافی ۶ : ۲۲۳۔ الاستبصار ۱: ۳۱۱

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ۳۔ جو رحمٰن رحیم ہے۔

تشریح کلمات

وہ اللہ جو لائق حمد و ثنا، سرچشمۂ تربیت و ارتقا اور صفت رحمانیت و رحیمیت سے متصف ہے، عالمین کا مالک اور قادر و قہار ہونے کے باوصف رحمن و رحیم بھی ہے۔

مخفی نہ رہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ میں الرَّحۡمٰنِ و الرَّحِیۡمِ کے ذکر کے بعد اس مقام پر دوبارہ تذکرہ بے جا تکرار نہیں بلکہ بِسۡمِ اللّٰہِ میں اس کا ذکر مقام الوہیت میں ہوا تھا، جب کہ یہاں مقام ربوبیت میں لرَّحۡمٰنِ و الرَّحِیۡمِ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

اللہ کی رحمت سے وہ لوگ بہرہ مند ہو سکتے ہیں جو اس کے بندوں پر رحم کرتے ہیں۔ اِرْحَمْ تُرْحَمْ۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ الوہیت کے ساتھ ساتھ ربوبیت میں بھی رَحْمٰن و رَحِیْم ہے۔

۲۔ دوسروں پر رحم کر کے ہی رحمت خداوندی کا اہل بنا جا سکتا ہے۔

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾ ۴۔ روز جزا کا مالک ہے۔

تشریح کلمات

الدِّیۡنِ: (د ی ن) جزا اور اطاعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شریعت کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا حقیقی سرپرست، روز جزا و سزا کا مالک اور صاحب اختیار ہے۔ وہ اپنی

ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ مجرم کو بخش دینا یا اسے سزا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ وہ روز جزا کا قاضی ہی نہیں بلکہ مالک و صاحب اختیار بھی ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مالک ہے تو پھر صرف روز جزا سے اس مالکیت کی تخصیص کیوں کی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے:

اولاً: دنیا میں مجازی مالک بھی ہوتے ہیں، جب کہ بروز قیامت کوئی مجازی مالک نہ ہوگا:

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾[1]	اس دن کسی کو کسی کے لیے کچھ (کرنے کا) اختیار نہیں ہوگا اور اس دن صرف اللہ کا حکم چلے گا۔

ثانیاً: دنیا میں تو اس مالک حقیقی کے منکر بھی موجود ہوتے ہیں، لیکن روز جزا تو کوئی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ...[2] کا جواب دینے والا نہ ہوگا۔

ثالثاً: دنیا میں اللہ کا صرف تکوینی حکم نافذ تھا، جب کہ تشریعی احکام کی نافرمانی بھی ہوتی تھی، لیکن بروز قیامت اس کے تمام احکام نافذ ہوں گے، کوئی نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

رابعاً: دنیا میدان عمل اور دار الامتحان ہے، اس لیے بندے کو کچھ اختیارات دیے گئے ہیں، لیکن قیامت، نتیجے اور جزائے عمل کا دن ہے، لہٰذا اس دن فقط اللہ کی حاکمیت ہوگی، بندوں کو کوئی اختیار نہیں دیا جائے گا۔

روز جزا کا تصور انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ کیونکہ اس عقیدے سے دنیاوی زندگی کو قدر و قیمت ملتی ہے اور اس میں پیش آنے والی سختیوں کی توجیہ میسر آتی ہے۔ زندگی سکون و اطمینان اور صبر و استقامت سے گزرتی ہے اور انسان ناانصافیوں کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے:

لَوْ مَاتَ مَنْ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَمَا اسْتَوْحَشْتُ بَعْدَ أَنْ يَكُونَ الْقُرْآنُ مَعِي وَ كَانَ ع إِذَا قَرَأَ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ يُكَرِّرُهَا حَتَّى كَادَ أَنْ يَمُوتَ۔[3]	اگر مشرق و مغرب کے درمیان سب لوگ مر جائیں تو میں وحشت زدہ نہ ہوں گا اگر قرآن میرے ساتھ ہے۔ جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تلاوت فرماتے تو اس کی اتنی تکرار کرتے کہ لگتا تھا جیسے جان جہاں آفریں کے سپرد ہو رہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن مالکیت و حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی۔

---

[1] ۸۲ انفطار: ۱۹　[2] ۴۰ المؤمن: ۱۶　[3] اصول الکافی ۲: ۶۰۲۔ کتاب فضل القرآن

۲۔　انسانی و اخلاقی اقدار کا تعلق روز جزا سے ہے۔
۳۔　اللہ کے ہاں اخروی احتساب کا عقیدہ انسان کو دنیا میں خود احتسابی پر آمادہ کرتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۵　۵۔ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

تفسیر آیات

اِيَّاكَ نَعْبُدُ: کسی ذات کی تعظیم و تکریم اور اس کی پرستش کے چار عوامل ہو سکتے ہیں۔ کمال، احسان، احتیاج اور خوف۔ اللہ تعالیٰ کی پرستش و عبادت میں یہ چاروں عوامل موجود ہیں۔

کمال: اگر کسی کمال کے سامنے ہی سر تعظیم و تسلیم خم ہونا چاہیے تو اس عالم ہستی میں فقط اللہ تعالیٰ ہی کمال مطلق ہے، جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں۔ تمام کمالات کا منبع اور سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ آسمانوں اور زمین میں بسنے والے اسی کمال مطلق کی عبودیت میں اپنا کمال حاصل کرتے ہیں:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝۹۳ [1]　جوکوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس رحمٰن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا۔

احسان: اگر کسی محسن کی احسان مندی عبادت و تعظیم کا سبب بنتی ہے تو یہاں بھی اللہ کی ذات ہی لائق عبادت ہے، کیونکہ وہی ارحم الراحمین ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر رکھا ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ [2]　تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے.

احتیاج: عبادت کا سبب اگر احتیاج ہے تو یہاں بھی معبود حقیقی اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ ہر لحاظ سے بے نیاز ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ وہ علت العلل ہے اور باقی سب موجودات معلول ہیں اور ظاہر ہے کہ علت کے مقابلے میں معلول مجسم احتیاج ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ [3]　اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز، لائق ستائش ہے۔

خوف: اگر وجہ تعظیم و عبادت خوف ہے تو خداوند عالم کی طرف سے محاسبے اور مؤاخذے کا خوف انسان کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا:

---

[1] ۱۹ مریم: ۹۳　[2] ۶ انعام: ۵۴　[3] ۳۵ فاطر: ۱۵

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ۝ [1]	جو نیکی کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور جو برائی کا ارتکاب کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

رحمن و رحیم، رب العالمین اور روز جزاء کے مالک پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی ہو، کیونکہ سابقہ آیات میں عبادت کے تمام عوامل بیان ہو چکے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے کمال خداوندی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یعنی خداوند عالم کمال کی اس منزل پر ہے کہ تمام حمد و ثنا صرف اسی کے شایان شان ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے عبادت کا دوسرا عامل "احتیاج" سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی خدا ساری کائنات کا مالک، مربی اور پالنہار ہے۔ باقی سب اس کی تربیت کے محتاج ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے تیسرا عامل "احسان" آشکار ہوتا ہے۔ یعنی خدا کا احسان عام ہے اور ہر چیز کو شامل ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ضمن میں چوتھا عامل "خوف" بیان کیا گیا ہے۔ یعنی قیامت کا یقین اللہ کے عدل سے خوف کا باعث بنتا ہے، ورنہ ذات الٰہی سے خوف کا کوئی معنی نہیں۔ وہ تو رحیم و غفور ہے۔ بنابریں ہر اعتبار سے عبادت صرف اسی کی ہو سکتی ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ... [2]	اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

عبادت کی تعریف: عبادت کی تعریف اور مفہوم کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہے اور عبادت کی یہ تعریف کرتے ہیں۔

کسی کے تقرب اور اس کی شفاعت کے حصول کے لیے قلبی تعلق قائم کرنا۔ [3]

اس تعریف میں قلبی تعلق اور تعظیم کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور اس غلط تعریف کی بنیاد پر یہ لوگ اکثر مسلمانوں کو مشرک قرار دیتے ہیں، جب کہ قرآن میں غیر خدا سے قلبی تعلق اور تعظیم کرنے کی ترغیب موجود ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۝ [4]	جو شعائر اللہ کا احترام کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔

والدین کے بارے میں فرمایا:

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ... [5]	اور مہر و محبت کے ساتھ ان (والدین) کے آگے انکساری کا پہلو جھکائے رکھو۔

۱؎ ۴۵ جاثیہ: ۱۵		۲؎ ۱۷ اسراء: ۲۳		۳؎ محمد بن عبد الوهاب ـ كشف الشبهات		۴؎ ۲۲ حج: ۳۲
۵؎ ۱۷ بنی اسرائیل: ۲۴

عبادت کی صحیح تعریف قرآنی شواہد کی روشنی میں اس طرح ہے:

کسی کو خالق یا رَب تسلیم کر کے اس کی تعظیم کرنا۔

خود لفظ ''عبادت'' سے اس کی تعریف نکل آتی ہے۔ چنانچہ عبد مملوک کو کہتے ہیں۔ العین میں آیا ہے: العبد المملوك ۔اور مملوک اسے کہتے ہیں جس کا کوئی مالک ہو۔ چنانچہ رَب مالک کو کہتے ہیں۔ العین میں آیا ہے:

و من ملك شيئا فهو ربّه، لا يقال بغير الاضافة الا للّٰه عز و جل ۔	جو کوئی کسی چیز کا مالک بنتا ہے وہ اس کا رَب کہلائے گا اور بغیر اضافہ کے مطلق رب صرف اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے۔

لہذا عبادت رب کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی رب نہیں ہے تو کوئی اس کا عبد بھی نہیں ہو گا اور جب عبد نہیں ہے تو عبادت بھی نہیں ہو گی۔ اس مطلب کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ۝[1]	بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہٰذا تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ مریم آیت ۶۵، سورۂ حج آیت ۷۷، سورۂ انبیاء آیت ۹۲۔ ان آیات میں فرمایا ہے کہ چونکہ اللّٰہ ہی تمہارا رَب ہے لہذا تم اسی کی عبادت کرو۔ ان سب آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت رَب کی ہوتی ہے۔

چنانچہ بت پرست اپنے بتوں کو رب مانتے تھے پھر ان کی پرستش کرتے تھے، اس لیے مشرک قرار پائے۔ اسی طرح کسی کو اپنا خالق تسلیم کر کے اس کی تعظیم کرنا بھی عبادت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡہُ ۚ ...[2]	یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اس کی عبادت کرو۔

وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ چونکہ کائنات کا مالک وہی ہے اور ہر چیز پر اسی کی حاکمیت ہے:

لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ ...[3]	آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کی ملکیت ہیں۔

لہٰذا جب مومن طاقت کے اصل سرچشمے سے وابستہ ہوتا ہے تو تمام دیگر طاقتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور کسی دوسری طاقت سے مدد لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔

غیر اللہ سے استمداد کا مطلب یہ ہوگا کہ سلسلۂ استمداد اللہ تعالیٰ پر منتہی نہ ہو اور اس غیر اللہ کو اذن خدا بھی حاصل نہ ہو۔ لیکن اگر یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ پر منتہی ہوتا ہو تو یہ اللہ سے براہ راست استمداد کے منافی نہیں۔ کیونکہ مخلوقات جس طرح اپنے وجود میں خالق حقیقی سے مستغنی اور بے نیاز نہیں، اسی طرح اپنے افعال

---

[1] ۳ آل عمران: ۵۱　[2] ۶ انعام: ۱۰۲　[3] ۳۹ زمر: ۶۳

میں بھی مستقل نہیں ہیں۔ ان کا ہر عمل فیض الٰہی کا کرشمہ ہوتا ہے۔ بنا بریں اگر خدا نے اپنے خاص بندوں کو وسیلہ بننے کی اجازت دے رکھی ہے تو ان سے استمداد درحقیقت خدا سے استمداد ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ۝[1]

اور جب یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے تھے تو اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا پاتے۔

یعنی اللہ سے طلب مغفرت کے لیے رسول (ص) کے دربار میں حاضر ہو کر انہیں وسیلہ بنانا جَآءُوۡکَ اور وسیلہ بن کر رسول کا (ص) ان کے لیے استغفار کرنا ہمارے مدعا کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

نیز فرمایا:

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ رَسُوۡلُہٗۤ ...[2]

اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ انہیں دیا ہے وہ اس پر راضی ہو جاتے اور کہتے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، عنقریب اللہ اپنے فضل سے ہمیں بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی۔

نیز فرمایا:

وَ مَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ مِنۡ فَضۡلِہٖ ...[3]

اور انہیں اس بات پر غصہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان (مسلمانوں) کو دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

''بہت کچھ عنایت کرنے'' اور ''دولت سے مالا مال کرنے'' میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے رسول (ص) کا اس طرح ذکر کرنا کہ ''اللہ اور رسول (ص) نے بہت کچھ دیا ہے'' اور ''اللہ اور رسول (ص) نے دولت سے مالا مال کر دیا''، شرک نہیں ہے، کیونکہ یہ عطا و بخشش اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر نہیں ہے کہ شرک کے زمرے میں چلی جائے بلکہ یہ تو مِنۡ فَضۡلِہٖ کے ذیل میں آتی ہے۔

لہٰذا قرآنی تصریحات کے مطابق جب یہ کہنا درست ثابت ہو گیا کہ ''اللہ اور اس کے رسول (ص) نے دولت سے مالا مال کر دیا'' تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ''اے رسول خدا (ص)! ہمیں دولت سے مالا مال فرما دیں۔''

لہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ سے حصول فیض میں وسائل اور وسائط کارفرما ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ

---

[1] ۴ نساء: ۶۴　[2] ۹ توبہ: ۵۹　[3] ۹ توبہ: ۷۴

سے طلب فیض کے لیے بھی اس کے مجاز وسائل اور واسطوں کا ہونا ثابت ہے ۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مخلوق سے مدد طلب کرنا شرعاً جائز ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے: فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّۃٍ ...[1] تم طاقت کے ساتھ میری مدد کرو، نیز فرمایا: وَتَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی ...[2] نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو، تو صرف اللہ سے مدد مانگنے کا مطلب کیا ہوا؟

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ مدد سے مراد توفیق ہے اور توفیق کسی فعل کے انجام دینے کے لیے تمام اسباب کی فراہمی کو کہتے ہیں اور صرف اللہ تمام اسباب فراہم کر سکتا ہے۔ اس لیے ہر مدد کو توفیق نہیں کہتے، بلکہ ہر توفیق مدد ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مدد سے مراد بدنی طاقت ہے جو صرف اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو مدد غیر خدا سے لی جاتی ہے وہ درحقیقت اللہ سے ہے، چونکہ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اس نے جو کچھ مدد دی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ چوتھا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مدد دینے والا خود اپنے ذات، اپنے وجود، اپنے افعال میں اللہ کا محتاج ہے، لَا حَول وَ لَا قُوۃ اِلَّا بِاللّٰہ کا یہی مفہوم ہے، لہٰذا اس سے مدد لینا خود اللہ سے مدد ہے۔

اہم نکات

١۔ جس کی بندگی کی جاتی ہے، مدد بھی اسی سے طلب کی جاتی ہے۔ نَعۡبُدُ ۔ نَسۡتَعِیۡنُ۔

٢۔ استعانت الٰہی کے بغیر عبادت بھی ممکن نہیں ہے۔

٣۔ عبادت اور استعانت کا حقیقی محور صرف ایک ہی کامل ذات ہے۔

٤۔ حرف خطاب "ك" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت و استعانت کے وقت بندہ خود کو بارگاہ خدا میں حاضر دیکھے۔

٥۔ نَعۡبُدُ سے اجتماعی عبادت کا تصور ملتا ہے۔

٦۔ نَسۡتَعِیۡنُ سے پہلے نَعۡبُدُ کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندے کو استعانت سے پہلے عبودیت کی منزل پر فائز ہونا چاہیے۔

٦۔ استعانت دلیل احتیاج ہے۔

اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ٦۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

تشریح کلمات

هدایت: (ہ د ی) مہر و محبت سے رہنمائی کرنا۔ اسی لیے بلامعاوضہ اور خلوص و محبت سے دیا جانے والا

---

[1] ١٨ کہف: ٩٥ [2] ٥ مائدہ: ٢

تحفہ ھدیہ کہلاتا ہے۔

صراط: (ص ر ط)اس کا لغوی معنی ''نگلنا'' ہے۔ صحیح راہ پر چلنے والا منزل مقصود تک پہنچنے کے بعد اس کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ راستہ قوت جاذبہ و ہاضمہ کی طرح سالکین کو اپنی طرف جذب کر کے انہیں اپنا جزو بنا لیتا ہے۔ اسی لیے صحیح راستے کو صراط کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کی ربوبیت اور روز جزا کے اعتراف اور عبادت و استعانت کا صحیح تصور قائم کرنے کے بعد انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ ہدایت و رہنمائی ہے۔ کیونکہ انسان عبث نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ و ارفع ہدف کے لیے خلق ہوا ہے۔ اب خالق پر لازم ہے کہ اس اعلیٰ ہدف کی طرف اس کی رہنمائی بھی کرے۔ بنا برایں خالق کائنات نے خلقت سے پہلے ہدایت کا انتظام فرمایا:

لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔[1] اے محمد(ص)! اے پیکر ہدایت! اگر میں نے انسانوں کی رہنمائی و ہدایت کے لیے تجھے نہ چنا ہوتا تو میں افلاک کو پیدا ہی نہ کرتا۔

صراط سے حرکت اور روانی کا تصور بھی قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی مومن قدم بہ قدم منزل کی طرف بڑھ رہا ہے:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ○[2] اے انسان! تو مشقت اٹھا کر یقیناً اپنے رب کی طرف جانے والا ہے پھر اس سے ملنے والا ہے۔

مستقیم سے اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے کہ راستہ کٹھن اور دشوار گزار ہے، کیونکہ ''صراط مستقیم'' کے مقابلے میں ''صراط منحرف'' ہے جس سے بچنے کے لیے ہدایت، راہنمائی اور جہد مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت سے یہ بات واضح ہو گی کہ مغضوب علیھم اور ضالین کے راستوں سے بچ کر صراط مستقیم کی تلاش اور پھر اس کی حفاظت اور اس پر پابند رہنا کوئی آسان کام نہیں۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورِي۔[3] اس کائنات میں اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی (ص) کو خلق فرمایا تاکہ راہ ارتقا کے متلاشی اس نور کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر سکیں۔

اعتراض: ہدایت کی طلب اور خواہش سے تو گمان ہوتا ہے کہ بندہ ابھی ہدایت یافتہ نہیں ہوا۔

جواب: اللہ تعالیٰ کی ذات سرچشمۂ فیض ہے۔ اس کی عنایات غیر منقطع ہوتی ہیں:

---

[1] تاویل الآیات الظاهرہ ص ۴۳۰ [2] ۸۴ انشقاق: ۶ [3] بحار الانوار ۱: ۹۷ و ۱۵: ۲۴۔ عوالی اللآلی ۴: ۹۹

عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ [1] — وہاں منقطع نہ ہونے والی بخشش ہو گی

اور اللہ کی جانب سے فیض کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا: لَا اِنْقِطَاعَ فِی الفَیْضِ۔ دوسری طرف سے بندہ سراپا محتاج ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سرچشمۂ فیض سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہدایت، رہنمائی اور توفیق اس کے فیوضات ہیں، جو ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں اور بندہ ہر آن جن کا محتاج ہے۔ ہدایت ایسی چیز نہیں جو خدا کی طرف سے اگر ایک بار مل جائے تو پھر بندہ بے نیاز ہو جاتا ہے، بلکہ وہ ہر آن، ہر لحہ ہدایت الٰہی کا محتاج رہتا ہے۔

بندے کا ہر آن ہر لحہ اللہ کی رحمت و ہدایت کا محتاج ہونا اس دعائیہ جملے سے واضح ہو جاتا ہے، جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام اپنی دعاؤں میں نہایت اہتمام کے ساتھ کیا کرتے تھے:

رَبِّ لَا تَكِلْنِيْ اِلىٰ نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ اَبَدًا۔ [2] — میرے مالک! مجھے کبھی بھی چشم زدن کے لیے اپنے حال پر نہ چھوڑ۔

بھلا جس سے اللہ نے ہاتھ اٹھایا ہوا سے کون ہدایت دے سکتا ہے:

فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ○ [3] — پس اللہ کے بعد اب اسے کون ہدایت دے گا؟ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اسی آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَدِمْ لَنَا تَوفِيقَكَ الَّذِى بِهِ اَطَعْنَاكَ فِى مَاضِىِّ اَيَامِنَا حَتّٰى نُطِيْعَكَ كَذٰلِكَ فِى مُسْتَقْبِلِ اَعْمَارِنَا۔ [4] — خداوندا! اپنی عطا کردہ توفیق کو برقرار رکھ، جس کی بدولت ہم نے ماضی میں تیری اطاعت کی ہے، تاکہ ہم آئندہ بھی تیری اطاعت کرتے رہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہدایت کے درجات ہوتے ہیں اور ہر درجے پر فائز مسلمان بالاتر درجۂ ہدایت کے لیے دعا کر سکتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمۡ تَقۡوٰىهُمۡ ○ [5] — جن لوگوں نے ہدایت حاصل کی اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور انہیں ان کا تقویٰ عطا کیا۔

اہم نکات

۱۔ بندے کو اللہ تعالیٰ کی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت، ہدایت کے مسئلے میں ہوتی ہے۔

۲۔ مومن کا تصور حیات، راہ مستقیم کی رہنمائی کے لیے دعا کرنے سے ہی متعین ہوتا ہے۔

---

[1] ہود ۱۱: ۱۰۸ [2] اصول الکافی ج ۲ ص ۵۸۱ [3] ۴۵ جاثیہ: ۲۳

[4] بحار الانوار ۲۴: ۹۔ أیْ أَدِمْ لنا توفيقك الذى به اطعناك ... تفسیر امام حسن عسکریؑ ص ۴۴ [5] ۴۷ محمد: ۱۷

۳۔ مومن انسان اپنی زندگی کی ایک منزل مقصود رکھتا ہے جس تک پہنچنے کے لیے ہدایت اور رہنمائی ضروری ہے۔

۴۔ انسان مومن، متحرک اور رواں دواں ہوتا ہے، اس لیے اسے ہر آن رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر انسان جمود وسکوت کی حالت میں ہو تو اس کے لیے کسی رہنمائی کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪﴿۷﴾	۷۔ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا،جن پر نہ تیرا غضب ہوا نہ ہی (وہ) گمراہ ہونے والے ہیں۔

تشریح کلمات

مغضوب: (غ ض ب) خون قلب کا جوش مارنا۔ ارادۂ انتقام۔غضب الٰہی سے مرادصرف انتقام ہے۔

ضالین: (ض ل ل) ضلال، ہدایت کی ضد ہے۔یعنی سیدھے راستے سے ہٹنا۔ ضال اسم فاعل ہے جس کی جمع ضالین ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں اسوہ کا ذکر ہے، جسے نمونہ عمل بنانا ہے اور دو انحرافی راستوں کا ذکر بھی ہے، جن سے برائت اختیار کرنا ہے۔

گویا تولیٰ اور تبریٰ کے بغیر کوئی نظریہ قائم نہیں ہوسکتا اور نہ ہی جاذبہ و دافعہ کے بغیر کوئی نظام برقرار رہ سکتا ہے۔ لہٰذا ہدایت ونجات کے لیے منعم علیھم ”جن پر خدا کی نعمتیں نازل ہوئیں“ سے محبت اور مغضوب علیھم اور ضالین سے نفرت ضروری ہے۔ جن سے محبت کرنا اور اسوہ بنانا مقصود ہے، وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہی معیار اطاعت ہیں۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿ؕ۶۹﴾[1]	اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ ان انبیاء، صدیقین، گواہوں اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۶۹

مغضوب علیھم سے نفرت اور برائت اختیار کرنے کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

یَاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ...[1]	اے ایمان والو! اس قوم سے دوستی نہ رکھو جس پر اللہ غضبناک ہوا ہے۔

اور ضالین کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ مَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ○[2]	اپنے رب کی رحمت سے تو صرف گمراہ لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ غَیۡر کے مجرور ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ھم کا بدل ہے جو عَلَیۡھِمۡ میں ہے۔ یعنی غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ وہی لوگ ہیں جو اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غَیۡر، اَلَّذِیۡن کا بدل ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ غَیۡر، اَلَّذِیۡن کی صفت ہے۔[3] تینوں صورتوں میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے وہی صحیح ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ۔

۲۔ اللہ کی نعمت سے محروم لوگ مغضوب یا ضالین (موردِ غضب خداوندی یا گمراہ) ہوتے ہیں.

۳۔ تولّا و تبرّیٰ ایمان کا اہم حصہ ہیں۔

۴۔ تولّا و تبرّیٰ سے مراد نیکوں کی روش اپنانا اور برے لوگوں کی پیروی سے اجتناب برتنا ہے۔

۱۔ ۶۰ ممتحنہ: ۱۳　۲۔ ۱۵ حجر: ۵۶　۳۔ مجمع البیان، ذیل آیہ۔
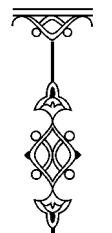
سُورَةُ البَقَرَةِ
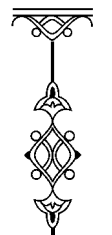
یہ قرآن مجید کا سب سے بڑا سورہ ہے، جس میں اسلامی تعلیمات کا معتدبہ حصہ موجود ہے۔ مثلاً تحویل قبلہ، حج، صوم اور جہاد جیسی اہم تعلیمات کے علاوہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل آیۃ الکرسی بھی اس میں شامل ہے۔

عربی میں بقرۃ گائے کو کہتے ہیں۔ اس سورہ میں گائے سے مربوط ایک اہم واقعہ بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اسے سورۂ بقرہ کہا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾	۱۔ الف لام میم۔
ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾	۲۔ یہ کتاب، جس میں کوئی شبہ نہیں، ہدایت ہے تقویٰ والوں کے لیے۔

تشریح کلمات

ذٰلِکَ: اشارۂ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ چیز بلحاظ مکان بعید ہو یا بلحاظ مرتبہ و مقام بلند و بالا ہو۔

الۡکِتٰبُ: (ک ت ب) سے قِتَال کے وزن پر مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کتاب سے مکتوب مراد ہے۔ نیز یہ مادہ جمع کے معنی میں بھی ہے۔ چنانچہ ایسے اوراق کا مجموعہ کتاب کہلاتا ہے، جن پر کچھ لکھا ہوا ہو۔

کبھی یہ دستور اور حکم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے:

وَ کَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ...[1]　　اور ہم نے توریت میں ان پر (یہ قانون) لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان ہے۔

چنانچہ قرآن، صحیفوں اور نوشتہ جات کا مجموعہ ہونے کے اعتبار سے بھی اور دستور و احکام کے اعتبار سے بھی کتاب ہے۔

فرض اور واجب قرار دینے کے لیے بھی کتب استعمال ہوتا ہے:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ...[2]　　تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ...[3]　　تم پر روزے کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

رَیۡبَ: (ر ی ب) شبہ، بدگمانی اور عدم اعتماد۔ یہ لفظ شک کا مترادف نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

ھُدًی: (ہ د ی) ہدایت یعنی مہر و محبت کے ساتھ رہنمائی کرنا۔ اسی لیے بلامعاوضہ دی جانے والی چیز ھدیہ کہلاتی ہے۔

متقین: (و ق ی) صاحبان تقویٰ، متقی کی جمع ہے۔ تقویٰ، وقایۃ سے ماخوذ ہے، جس کا لفظی معنی ہے، ہر اس چیز سے نفس کو بچانا جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ انسان خود کو خطرات سے اس وقت بچاتا ہے جب اسے ان سے خوف لاحق ہوتا ہے۔ اسی لیے تقویٰ کا معنی ڈر اور خوف بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ تقویٰ کا سبب خوف ہوتا ہے اور مسبب کا نام لے کر سبب کو مراد لینا عام طور پر رائج ہے۔ یعنی تقویٰ سے خوف مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ...[4] اللہ کا خوف کرو جیسا کہ اس کا خوف کرنے کا حق ہے۔

تفسیر آیات

الٓمّٓ: انہیں "مقطعات قرآنیہ" کہتے ہیں، جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ درست رائے یہ ہے کہ یہ صرف افتتاحیہ حروف ہی نہیں بلکہ ان میں وہ اسرار و رموز پنہاں ہیں جو خدا اور اس کے حبیب (ص) کے درمیان مخصوص ہیں اور خداوند عالم نے کسی مصلحت کے پیش نظر انہیں صرف اپنے رسول (ص) تک محدود رکھا ہے۔

زان گونه پیامها که او پنهان داد
یك ذره بصد هزار جان نتوان داد

---

[1] ۵ مائدہ: ۴۵　[2] ۶ انعام: ۵۴　[3] ۲ بقرہ: ۱۸۳　[4] ۳ آل عمران: ۱۰۲

مذکورہ نظریے کی دلیل یہ ہے کہ ان مقطعات میں سے بعض مستقل آیت ہیں، جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ، الٓمّٓ، الٓمّٓصٓ وغیرہ اور بعض مستقل آیت نہیں ہیں، جیسے الٓرٰ اور الٓمّٓرٰ وغیرہ اور مستقل آیت ہونا یا نہ ہونا آیت کے مضمون سے مربوط ہوتا ہے۔ لہٰذا حروف مقطعات اپنی جگہ مضمون ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی دعاؤں میں فرماتے تھے: یا کٓھٰیٰعٓصٓ۔[1] ظاہر ہے ان حروف مقطعات کو ندا کا متعلق بنانے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ یہ حروف اپنی جگہ ایک مضمون ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں: یَا اَرۡحَمَ الرَّاحِمِیۡنَ۔ یَا غِیَاثَ الۡمُسۡتَغِیۡثِیۡنَ وغیرہ۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

الم رَمۡزٌ و اشارۃ بینہ و بین حبیبہ محمد (ص) اراد ان لا یطلع علیہ سواھما۔[2]	الف لام میم اللہ اور اس کے حبیب (ص) کے درمیان ایک ایسا رمز اور اشارہ ہے جس پر صرف اللہ اور رسول (ص) آگاہ ہو سکتے ہیں۔

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ: لفظ کتاب کے اطلاق اور دیگر قرآنی آیات و تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صرف زبانی یادداشتوں اور روایت شدہ باتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ کتابی شکل میں مرتب شدہ ایک آسمانی صحیفہ ہے جو ابتدائے نزول سے ہی بطور کتاب نازل ہوا اور رسول خدا (ص) اس بات پر مامور تھے کہ وحی قرآنی کے نازل ہوتے ہی کسی کاتب وحی کے ذریعے اسے ضبط تحریر میں لائیں۔

وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ۝[3]	اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ: اس کتاب میں شبہ اور بدگمانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس جملے سے شبہ اور بدگمانی کے وجود کی نفی نہیں ہوئی، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن ایسے حقائق کا مجموعہ ہے، جنہیں مکمل طور پر سمجھنے کی صورت میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی شبہات سے دوچار ہوتا ہے تو اس کا سبب شک و شبہ کرنے والے کی نادانی، کج فہمی اور کوتاہ بینی کے علاوہ کچھ نہیں۔ چنانچہ جونہی یہ نقائص دور ہوں گے، شبہات بھی یکسر ختم ہو جائیں گے۔

قرآنی تعلیمات میں شبہات پیدا ہونے کے ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ مثلاً بطلیموسی فلکیات پر خط بطلان کھینچنے اور زمین کی جگہ سورج کو مرکز نظام ثابت کرنے پر قرآن کے خلاف بدگمانی کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا کہ قرآن سورج کو متحرک کہتا ہے: وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ...[4] جب کہ جدید انکشافات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سورج اس نظام کا مرکز اور ساکن ہے۔ بعد میں جب یہ ثابت ہو گیا کہ سورج بھی اپنے

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۰۵　[2] سعد السعود ص ۲۱۷　[3] ۲۵ فرقان: ۵

[4] ۳۶ یس: ۳۸ "اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے..."

سیاروں سمیت ہمیشہ حرکت میں ہے تو وہ بدگمانی اس غلط فہمی کے ازالے سے ختم ہوگئی۔

بنا برایں اگر کسی کے ذہن میں کوئی بدگمانی پیدا ہوتی ہے تو یہ قرآن کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ قرآن سے ہٹ کر دوسرے خارجی عوامل کی وجہ سے ہوگی۔ خود قرآن میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ: یہ قرآن صاحبان تقویٰ کے لیے ہدایت ہے۔ اَلتَّقْوٰی جَعْلُ النَّفْسِ فِیْ وِقَايَةٍ مِمَّا يُخَافُ۔[1] یعنی تقویٰ اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کا نام ہے۔ جو شخص بیماری کے ممکنہ خطرات سے محفوظ رہنا چاہے، وہی دوا اور علاج سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ چنانچہ متقی وہی ہو گا جو ہلاکت ابدی سے بچنے کی کوشش کرے۔ ایسا شخص ہی قرآن سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ رہنمائی صرف اسے فائدہ دے سکتی ہے، جو عازم راہ ہو۔ جو شخص کہیں جانا ہی نہیں چاہتا، اسے رہنمائی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ لہٰذا عازم راہ کو متقی کہتے ہیں۔ یعنی راہ نجات کا راہرو اور اسی قسم کے افراد قرآن سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے متقین کی پانچ صفات بیان کی ہیں جو بعد کی آیات میں مذکور ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اشارہ بعید ذٰلِكَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اس بلند مقام پر ہے جہاں شبہے کی رسائی ممکن نہیں۔

۲۔ قرآنی ہدایت اہل تقویٰ اور سالکان راہ نجات کے پاک دلوں میں ہی اتر سکتی ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

۳۔ ہادی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو۔

۴۔ تقویٰ جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر بہتر ہدایت حاصل ہو سکے گی۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۲: ۱۶۔ ۱۷: ۲۱۸۔ ۸۸: ۹۔ کمال الدین ۲: ۶۴۰۔ معانی الاخبار ص ۲۲ مناقب شہر آشوب ۶: ۱۳۷

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

۳۔ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں نیز جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

---

[1] مفردات راغب اصفہانی ۔ مادہ وقی

تشریح کلمات

یُقِیۡمُوۡنَ: (ق و م) اقامۃ سے ہے۔ یہ لفظ کسی ذمہ داری کی ادائیگی اور اس پر کاربند رہنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ ...[1]

الصَّلٰوۃَ: (ص ل و) اکثر ماہرین لغت کے نزدیک صلوٰۃ کا لغوی معنی ''دعا'' ہے اور شرعی اصطلاح میں صلوٰۃ رکوع و سجود پر مشتمل عبادت یعنی ''نماز'' سے عبارت ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ لفظ صلوٰۃ عربی ہے یا عبرانی۔ میرے نزدیک یہ عبرانی لفظ ہے اور قدیم بابلی عہد میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے رکوع و سجود پر مشتمل عبادت کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ عبرانی میں عبادت گاہ کو صلوتا کہا جاتا ہے اور یہودی بھی اپنی عبادت گاہ کو صلوتا کہتے ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک بعید نہیں کہ انگریزی کا لفظ salute اسی سے ماخوذ ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا:

وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّہُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡہَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ...[2]	اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے روکے نہ رکھتا تو راہبوں کی کوٹھڑیوں اور گرجوں اور عبادت گاہوں اور مساجد کو جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دیا جاتا۔

بعد میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعے یہ لفظ عربی میں داخل ہوا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جو عبادت بجا لاتے تھے، وہ رکوع و سجود پر مشتمل تھی:

وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ○[3]	اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل پر یہ ذمے داری عائد کی کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

سابقہ بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ لفظ صلوٰۃ اصل میں حضرت اسماعیل (ع) کی رکوع و سجود والی عبادت کا نام تھا، جو بعد میں دعا کے معنی میں استعمال ہونے لگا، لیکن اسلام نے اسے دوبارہ رکوع و سجود والی عبادت ابراہیمی کے لیے مخصوص کر دیا۔

الرزق: (ر ز ق) رزق عطائے جاری کو کہتے ہیں: اَلرِّزۡقُ یُقَالُ لِلۡعَطَاءِ الۡجَارِیۡ [5]۔

ینفقون: (ن ف ق) انفاق، نفق سے ہے، جس کے معنی دونوں طرف سے کھلی سرنگ یا گلی ہے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۸۔ ''اللہ کے لیے بھرپور قیام کرنے والے بن جاؤ۔''

[2] ۲۲ حج: ۴۰ [3] ۲ بقرہ: ۱۲۵۔ [5] مفردات راغب اصفہانی

مال ہاتھ میں آ کر خرچ ہو جائے تو یہ انفاق کہلاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں دو رخی اختیار کرنے کو نفاق کہا جاتا ہے۔ کیونکہ منافق دین میں ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے یا جس طرح سرنگ کے دو دہانے ہوتے ہیں، اسی طرح منافق کے بھی دو چہرے ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ: ایمان "امن" (سلامتی) سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ ابدی ہلاکت سے سلامتی اور بچاؤ کا موجب ہے یا ایمان باللہ سے قلب و ضمیر کو امن و سکون ملتا ہے۔ پھر چونکہ ایمان کے بھی درجات ہیں، یعنی قلب کا ایمان (تصدیق)، زبان کا ایمان (اقرار) اور اعضائے بدن کا ایمان (عمل)، لہٰذا کامل ایمان وہ ہو گا جو ان سب کا مجموعہ ہو۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

الْایمَانُ هُوَ الْإِقْرَارُ بِالْلِسَانِ وَ عَقْدٌ فِی الْقَلْبِ وَ عَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔[1] ایمان زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور اعضاء و جوارح سے عمل کرنے سے عبارت ہے۔

غیب مشہود و محسوس کی ضد ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ، وحی، فرشتوں اور دینی عقائد و اصول وغیرہ کا تعلق ماورائے محسوسات سے ہے۔ ان پر ایمان لانا اور انہیں تسلیم کرنا ہی "ایمان بالغیب" ہے۔

الحادی نظریات رکھنے والوں کے نزدیک صرف ان امور پر ایمان لانا درست ہے جو محسوس، مادی اور قابل تجربہ ہوں۔ ماورائے محسوسات چونکہ تجربے کے دائرے سے باہر ہیں اس لیے ان پر ایمان لانا درست نہیں، حالانکہ:

اولاً: ان کا یہ استدلال خود غیر حسی اور غیر تجرباتی ہے اگر غیر محسوس امور کی کوئی حقیقت نہیں تو خود یہ دلیل بھی فاسد ہے۔

ثانیاً: غیر محسوس اور غیر تجرباتی اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سے حقائق سربستہ رہیں گے کیونکہ حس و تجربہ ہر جگہ کلی طور پر دلیل نہیں بن سکتے، بلکہ صرف ان محدود امور کے لیے دلیل بن سکتے ہیں جن پر تجربہ ہوا ہو۔

ثالثاً: اگر معلول سے علت اور آثار سے مؤثر کا وجود ثابت نہیں ہوتا تو کوئی شے ثابت نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ آثار مشہود ہوتے ہیں اور مؤثر غیبت میں۔ عمارت مشہود ہوتی ہے، مگر معمار غائب۔ نقوش قدم مشاہدے میں آتے ہیں، جب کہ راہرو نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتے ہیں۔

رابعاً: اگر صرف حس و تجربہ ہی دلیل وجود ہے تو ملحدین کو ماورائے حس پر نفیاً و اثباتاً کوئی نظریہ قائم ہی نہیں کرنا چاہیے۔ چونکہ اگر صرف تجربہ دلیل ہو تو غیر تجربی بات نہ تو ماورائے

---

[1] اصول الکافی ۲: ۲۷

حس کے اثبات کے لیے دلیل ہے اور نہ نفی کے لیے، لہٰذا وہ ماورائے حس کی نفی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ لوگ ماورائے حس کی نفی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ لاشعوری طور پر ماورائے حس میں قدم رکھتے ہیں (اگرچہ اس کی نفی کے لیے ہی سہی) اور حس و تجربے کی حدود سے نکل جاتے ہیں اور یہ ان کی طرف سے ماورائے حس کا عملی اعتراف ہے۔ مختصر یہ کہ مادہ پرست کا مضطرب اور غیر مطمئن ذہن ماورائے حس کو سمجھنے سے قاصر ہے، کیونکہ پرسکون جھیل ہی ابر وکوہ کے صحیح خد و خال کو منعکس کرتی ہے، جب کہ ایک مضطرب و متلاطم جھیل اپنے اردگرد کے دلکش مناظر کی عکاسی کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کے فطری ہونے پر انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ: نماز دین کا ستون اور معراج مومن ہے جو لا تترك بحال کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑی جا سکتی۔

فَاِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَیٰھَا وَ اِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَا سِوَیٰھَا۔[1]　　اگر نماز قبول ہوئی تو دیگر عبادات بھی قبول اور اگر یہ رد ہو گئی تو دیگر عبادات بھی مسترد ہو جائیں گی۔

یہاں قرآن مجید نے لفظ اقامہ استعمال کیا ہے۔ یعنی مؤمنین و متقین نماز "قائم" کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا: نماز "ادا" کرتے ہیں۔

لفظ اقامہ اجتماعی ذمہ داریوں کے لیے استعمال ہوا ہے:

اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ...[2]　　اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

وَ اَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ۝[3]　　اور انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو اور تول میں کمی نہ کرو۔

۲۲۳

لہٰذا اقامۃ الصلوٰۃ انفرادی سے زیادہ اجتماعی فریضہ ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ایک نمازی معاشرہ قائم کریں، جو فحشاء اور منکر سے پاک ہو۔ چنانچہ ایک اور آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکومت اسلامی کے قیام کا ایک اہم مقصد اقامۂ صلوٰۃ ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ...[4]　　یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے....

ظاہر ہے کہ انفرادی نماز کا قیام اقتدار کے بغیر بھی ہو سکتا ہے نیز مذکورہ آیت باجماعت نماز پڑھنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ: مومن، عابد اور متقی انسان اجتماعی زندگی اور اقتصادی جدوجہد سے الگ

---

[1] فلاح السائل ص ۱۲۷　[2] ۴۲ شوریٰ: ۱۳　[3] ۵۵ رحمٰن: ۹　[4] ۲۲ حج: ۴۱

تھلگ نہیں رہ سکتا۔ دشمنان اسلام کے نظریات کے برعکس، مذہب افیون نہیں بلکہ مذہبی انسان معاشرے کا فعال رکن ہوتا ہے۔

انفاق و فیاضی ایک کائناتی نظام ہے۔ سورج اپنی شعاعوں سے، ہوا اپنی لطافت سے اور پانی اپنی تازگی سے جو فیاضی کرتا ہے، اسی سے کائنات میں زندگی اور شادابی کا دور دورہ ہے۔ متقی میں اس فیاضی کی موجودگی ضروری ہے تاکہ معاشرہ اس کے مادی رزق کی طرح معنوی رزق سے بھی فیضیاب ہوتا رہے۔ چنانچہ علم، ایک معنوی رزق ہے، لہٰذا اس کی زکوٰۃ تعلیم و تدریس ہے۔ اس آیت کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

مِمَّا عَلَّمۡنَاھُمۡ یَبُثُّوۡنَ۔[1]　　ہم نے انہیں جو تعلیم دی ہے، وہ اس کی اشاعت کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اہل تقویٰ محسوس پرست نہیں ہوتے: یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ۔

۲۔ غیب پر ایمان نماز اور انفاق پر عمل کے ساتھ مربوط ہے۔

۳۔ نماز اور انفاق ایمان کا لازمہ ہیں۔

۴۔ اہل تقویٰ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک نمازی معاشرے کے قیام کی کوشش کرتے ہیں۔

۵۔ انفاق ایک کائناتی عمل ہے، جس سے ایک مومن انسان لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

۶۔ تمام عبادات کا اصل محور نماز ہے۔

۷۔ ایمان کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک، عمل ہے۔

تحقیق مزید

الوسائل ۲۱ : ۵۲۷۔ مستدرک الوسائل ۳ : ۸۴

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؃

۴۔ اور جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا نیز جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے ان پر ایمان اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

تشریح کلمات

اُنۡزِلَ: (ن ز ل) نزول یعنی بلند جگہ سے نیچے اترنا۔ خواہ یہ بلندی محسوسات میں سے ہو جیسے:

---

[1] بحار الانوار ۲ : ۱۶

وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوۡرًا ... [1]　　　اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی برسایا ہے.

یا معنوی بلندی ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر حکم کو "نازل شدہ حکم" کہا جاتا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡمِيۡزَانَ . [2]　　　اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے.

اکثر اوقات نزول سے عطاو عنایت مراد لی جاتی ہے خواہ یہ عنایت براہ راست ہو جیسے نزول قرآن یا بذریعہ اسباب جیسے:

قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِيۡ سَوۡاٰتِكُمۡ ... [3]　　　ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے شرم کے مقامات کو چھپائے...

یعنی تمہیں عقل و حواس عطا کیے، جن کے ذریعے تم ستر پوشی کا سامان مہیا کرتے ہو۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر وحی ، قرآن نہیں ہوتی۔ کچھ ایسے احکام بھی نازل ہوئے ہیں، جو قرآن کا حصہ نہیں ہیں، جنہیں سنت کہا جاتا ہے.

تفسیر قرآن کے ضمن میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی بعض روایات میں ھَكَذا اُنْزِلَتْ کے الفاظ ملتے ہیں جن سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اُنْزِلَت سے مراد نزول قرآن ہے، جو درست نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس طرح نازل ہوئی ہے، مگر قرآن کا حصہ نہیں ہے، تاکہ تحریف قرآن کا شائبہ نہ رہے۔

آخرة:　　(ا خ ر) آخر اول کی ضد ہے۔ الدار الآخرة سے نشأة ثانیہ مراد لی جاتی ہے اور کبھی الدار حذف کر کے صرف الآخرة استعمال ہوتا ہے جیسے: وَ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ۔

تفسیر آیات

وَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ : صاحبان تقویٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ رسول (ص) کے لائے ہوئے ہر حکم اور ہر پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے مطلب کی باتوں پر تو ایمان لے آئیں، مگر اپنے مفادات سے متصادم باتوں کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھیں۔ ایسے کردار کے حامل افراد کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

اَ فَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ... [4]　　　کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے سے کفر اختیار کرتے ہو؟

وَ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ : یقین ایمان کے بعد آتا ہے۔ یعنی ایمان کی پختگی کا نام یقین ہے۔ یقین کا اعلیٰ ترین مرتبہ و مقام عصمت ہے۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] ۲۵ فرقان : ۴۸　　[2] ۵۷ حدید : ۲۵　　[3] ۷ اعراف : ۲۶　　[4] ۲ بقرہ : ۸۵

لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيْنًا۔[1] اگر پردہ ہٹا بھی دیا جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہو گا۔

آخرت پر یقین سے انسان میں بقاء کا تصور قائم ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنّما خُلِقْتُمْ لِلْبَقَاءِ لَا لِلْفَنَاء۔[2] تم بقا کے لیے پیدا کیے گئے ہو، فنا کے لیے نہیں۔

تصور بقا سے ہی زندگی بامقصد اور بامعنی بنتی ہے۔ تصور معاد کے بغیر انسان ایک بے مقصد وجود اور لایعنی و فالتو چیز قرار پاتا ہے جس کا انجام بلاوجہ دکھ درد سہتے ہوئے نیست و نابود ہونا ہے۔ وہ طبیعت کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے، جب کہ اسے طبیعت سے بہلنے کے لیے نہیں، بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس مقصد اور مقام تک رسائی، تصور معاد کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قرآنی تعلیمات کا ایک تہائی حصہ اخروی زندگی سے متعلق ہے۔

تصور معاد سے انسان ایک بامقصد وجود بن جاتا ہے، جو اپنے ہر عمل کا ذمے دار اور حیات ابدی کا مالک قرار پاتا ہے۔ تصور آخرت کے بعد وہ تقویٰ کی اعلیٰ ترین منازل پر فائز ہو کر کمال حاصل کرتا ہے۔ اس کی دنیاوی زندگی کو قیمت و وقعت مل جاتی ہے۔ اس زندگی میں اس کا ایک مختصر سا عمل اس کی اخروی زندگی کو آباد و شاد کر دیتا ہے۔

بر گردد آنکه باهوس کشور آمده — کاین عرصه نیست درخور فرهمائے ما
یزدان ذوالجلال بخلوت سرائے قدس — آراسته است بزم ضیافت برای ما

اہم نکات

۱۔ تمام ادیان سماوی باہم مربوط ہیں، لہٰذا ایمان سب پر ہونا چاہیے۔

۲۔ آخرت پر یقین سے انسان میں بقا و دوام کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔

۳۔ حیات ابدی کا تصور انسان کو ذمہ دار اور اس کی زندگی کو بامقصد بناتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۵۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر (قائم) ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

الْمُفْلِحُوْنَ: (ف ل ح) فلاح پانے والے۔ فلاح یعنی پھاڑنا۔ کسان زمین کو پھاڑتا ہے، اس لیے اسے

[1] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ج ۷ باب ۱۱۳ ص ۲۵۳۔ [2] غرر الحکم و درر الکلم ص ۱۳۳

فلّاح کہتے ہیں۔ کامیابی و کامرانی کو شاید اس لیے فلاح کہتے ہیں کہ مشکلات کو چیر پھاڑ کر (انہیں دور کر کے) ہی مقاصد میں کامیابی حاصل کی جاتی ہے۔ حی علی الفلاح کا مطلب یہ ہے کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔

تفسیر آیات

مذکورہ صفات کے حامل مؤمنین ہی متقی کہلانے کے حقدار ہیں اور وہی اپنے رب کی طرف سے حاصل شدہ ہدایت پر قائم رہ کر فلاح و کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

گزشتہ آیات میں مجموعی طور پر پانچ صفات ذکر کی گئی ہیں:

۱۔ ایمان بالغیب کے ذریعے اس کائنات کے سرچشمۂ طاقت سے متصل ہونا۔

۲۔ اقامہ نماز کے ذریعے اس طاقت سے اجتماعی روابط کا قیام۔

۳۔ انفاق کے ذریعے کائنات کی موجودات سے مربوط و منظّم ہونا۔ یعنی جہاں دوسری چیزوں سے فیض حاصل کیا جاتا ہے، وہاں دوسروں کو فیضیاب کرنا۔

۴۔ مَاۤ اُنۡزِلَ پر ایمان کے ذریعے اس ارتباط و تنظیم کی خاطر خالق کے دیے ہوئے دستور اور قانون پر عمل کرنا۔

۵۔ آخرت پر یقین کے ذریعے اس زندگی کو بامقصد بنانا اور پوری کائنات کے وجود کو اہمیت دیتے ہوئے یہاں رونما ہونے والے ہر واقعے کی تفسیر و توضیح کا صحیح تصور قائم کرنا۔

اہم نکات

۱۔ اہل تقویٰ ہی ہدایت پر ہیں۔

۲۔ ایمان بالغیب رکھنے، نماز قائم کرنے، انفاق کرنے اور وحی و قیامت پر ایمان رکھنے والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

تحقیق مزید

شواھد التنزیل ۱ : ۵۷۰

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے یکساں ہے کہ آپ انہیں متنبہ کریں یا نہ کریں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تشریح کلمات

کفر: (ك ف ر) چھپنے یا چھپانے والے کو کافر کہتے ہیں۔ کاشتکار اور رات کو بھی اسی لیے کافر کہا جاتا ہے، کیونکہ کاشتکار زمین میں بیج کو چھپاتا ہے اور رات اپنے دامن میں ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ ترک شکر کے ذریعے نعمت کو چھپانا ''کفران نعمت'' کہلاتا ہے۔ توحید و رسالت کے منکر کو اس لیے کافر کہتے ہیں کہ وہ حق کو چھپاتا ہے۔

نذار: (ن ذ ر) توجہ دلانا، تنبیہ کرنا، برے انجام سے خبردار کرنا۔ انذار کا ترجمہ ''ڈرانا'' درست نہیں۔ کیونکہ ہر ڈرانا انذار نہیں ہوتا بلکہ بقول ''راغب'' کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنا الانذار کہلاتا ہے، بشرطیکہ جس چیز سے آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں خوف کا پہلو موجود ہو۔ بنابراین خوف لازمۂ انذار ہے۔ چنانچہ جوہری کہتے ہیں:

اَلۡاِنۡذَارُ، اَلۡاِبۡلَاغُ وَ لَا یَکُوۡنُ اِلَّا فِی التَّخۡوِیۡفِ۔[1] انذار سے مراد پہنچانا ہے اور یہ صرف ڈرانے کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اسلامی حقائق کو درک نہ کر سکنے یا ان سے غافل ہونے کی وجہ سے اگر کوئی شخص کفر اختیار کرے تو وہ قابل ہدایت ہے، لیکن اگر حقائق کے علم و ادراک کے بعد عناد اور ضد کی بنا پر کفر اختیار کرے تو ایسا کافر قابل ہدایت نہیں ہوتا:

وَ جَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ...[2] وہ ان نشانیوں کے منکر ہوئے حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا۔

یہ آیت ایسے کفار کے بارے میں ہے جو معرفت حق کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ بات تمام کفار کے بارے میں ہوتی تو دعوت انبیاء عبث اور بے معنی ہو جاتی۔ البتہ یہاں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ کفار ایمان نہیں لائیں گے تو انہیں دعوت ایمان دینا کیسے درست ہے؟ بلکہ یہ عبث اور لاحاصل کام شمار ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، کفار کا ایمان لانا محال ہے، ورنہ اللہ کے اعلان کا کذب لازم آئے گا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف علم خدا کی وجہ سے کفار عذاب کے مستحق نہیں بن سکتے، جب تک انہیں دعوت حق نہ دی جائے اور یہ اس سے انکار نہ کر دیں، کیونکہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے۔

---

[1] الصحاح ۲: ۸۲۵ [2] ۲۷ نمل: ۱۴

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ کفار کا ایمان لانا امر محال نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ ایمان لے آئیں، مگر اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائیں گے۔ لیکن اس علم کی وجہ سے ان کا ایمان لانا محال نہیں ہو جاتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے ایک استاد کو اپنے تساہل پسند شاگرد کے مستقبل کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ تساہل پسندی اس طالب علم کی سرشت میں شامل ہو چکی ہے، لہٰذا اب کبھی یہ ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ یہاں استاد کے اس علم کی وجہ سے شاگرد تساہل پسندی اور ناکامی پر مجبور نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ عناد اور ضد کی بنا پر کفر اختیار کرتے ہیں وہ ناقابل ہدایت ہیں۔

۲۔ تنبیہ کرنا اور دعوت دینا اتمام حجت کے لیے ضروری ہے۔

۳۔ علم خدا موجب جبر نہیں۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ٪

۷۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کی سماعت پر مہر لگا دی ہے نیز ان کی نگاہوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تشریح کلمات

ختم: (خ ت م) مہر لگا دی۔

قلب: (ق ل ب) لغت میں دل اور محاورے میں وجدان، عقل اور ضمیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

غشاوۃ: (غ ش و) پردہ۔

عذاب: (ع ذ ب) روکنا۔ نعمت ابدی تک پہنچنے سے روکنے والی ہر شے عذاب ہے۔ اسی طرح حیات کی شیرینی سے محروم ہونا بھی عذاب ہے۔

تفسیر آیات

یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے کفار کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور وہ ایمان لانے سے قاصر ہیں، تو ان کے کفر کا سبب خدا کا عمل (مہر لگانا) ہے، گویا انہوں نے مجبوری کے عالم میں کفر اختیار کیا ہے، اب ان کی مذمت کیونکر درست ہو سکتی ہے؟

جواب: اعمال و افعال عباد کے بارے میں مسلمانوں میں متعدد مؤقف موجود ہیں۔ پہلا مؤقف

"نظریہ جبر" کہلاتا ہے اور مسلمانوں کا ایک کلامی فرقہ اشاعرہ اس کا قائل ہے، جب کہ مذہب امامیہ انسان کو خود مختار سمجھتا ہے۔

اس آیت کی طرح دیگر متعدد آیات سے نظریہ جبر کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے،لیکن ان آیات سے نظریہ جبر ثابت نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ تو ایمان لانے کے سلسلے میں کوئی جبر ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [1] اور نہ کفر اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی جبر ہے، بلکہ خدا تو اپنے رسولوں اور اپنی نشانیوں کے ذریعے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا دیتا ہے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا [2]۔ اتمام حجت کے بعد جب کفار پر حق واضح ہو جاتا ہے اور ان کا دل اس دعوت کی حقانیت کا ادراک بھی کر لیتا ہے تو اگر وہ حق کے خلاف عمداً دشمنی نہ رکھیں تو رحمت الٰہی اور توفیق خداوندی ان کے شامل حال ہوتی ہے اور انہیں ہدایت کے مزید عوامل و اسباب فراہم کیے جاتے ہیں، انہیں ہرگز ان کے حال پر چھوڑا نہیں جاتا۔ لیکن اگر وہ حق کے واضح اور آشکار ہو جانے کے بعد بھی عناد و دشمنی کی بنا پر ایمان نہیں لاتے تو ایسے کفار کو خدا ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے: فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ [3]۔ اب ظاہر ہے کہ اس صورت میں انہیں ہدایت کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، درنتیجہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ حق سے ان کی دشمنی کی وجہ سے ہوتا ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ [4]۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا [5]۔ پہلے یہ لوگ کفر اختیار کرتے ہیں پھر اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ۔۔ [6]

جس طرح ایک سرکش اور نافرمان بیٹے کو اس کا باپ آخر کار اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے: "جہنم میں جاؤ۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سرکشوں کو انتقام و سزا کے طور پر گمراہی کے منہ میں جانے دیتا ہے۔

مؤمنین کو اس آیہ وافی ہدایہ کے ذریعے اس بات سے باخبر کیا جا رہا ہے کہ وہ ہر لحہ توفیق و رحمتِ الٰہی کے محتاج ہیں۔ انہیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کہیں ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے توفیق الٰہی سلب نہ ہو جائے، دلوں پر مہر نہ لگ جائے اور اللہ انہیں ان کے حال پر نہ چھوڑ دے۔ اسی لیے ائمہ علیہم السلام سے مروی دعاؤں میں یہ جملہ بکثرت ملتا ہے: رَبِّ لَا تَكِلْنِي اِلَى نَفْسِي [7] "میرے مالک! مجھے میرے حال پر نہ چھوڑ۔"

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۵۶۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔
[2] ۷۶ دھر: ۳۔ ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی، خواہ شکرگزار بنے اور خواہ ناشکرا۔
[3] ۱۰ یونس: ۱۱۔ لیکن جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں مہلت دیے رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔
[4] ۶۱ صف: ۵۔ پس جب وہ ٹیڑھے رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔
[5] ۲ بقرۃ: ۱۰۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی۔
[6] ۴ نساء: ۱۵۵۔ بلکہ ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے۔
[7] اصول الکافی ۲: ۵۸۱۔ امام صادق (ع) سے روایت منقول ہے۔

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلْخَتْمُ هُوَ الطَّبْعُ عَلَى قُلُوبِ الْكُفَّارِ عُقُوبَةً عَلَى كُفْرِهِمْ ۔[1]	مہر لگ جانے کا مطلب کفار کے دلوں کو بند کرنا ہے اور یہ کفر اختیار کرنے کی سزا کے طور پر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کسی کو بلاوجہ گمراہ نہیں کرتا بلکہ ہر شخص اپنے برے اعمال کے نتیجے میں ہدایت پانے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور اسی کا نام گمراہی ہے۔

۲۔ اللہ کی طرف سے گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفار کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ حق کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سلب ہدایت کا موجب ہے۔

تحقیق مزید

عیون اخبار ۱: ۱۳۳۔ بحار الانوار ۹: ۱۷۴۔ الاحتجاج ۲: ۴۵۵

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ⑧	۸۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لے آئے حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

ان آیات میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ پہلا گروہ متقین کا ہے، دوسرا ناقابل ہدایت کفار کا اور تیسرا گروہ منافقین کا ہے۔ متقین کے لیے حق واضح ہوا اور انہوں نے اسے دل و جان سے قبول کیا اور کفار پر بھی حق واضح ہوا، لیکن انہوں نے از روئے عناد اسے رد کر دیا۔ منافقین وہ ہیں جنہیں نہ تو حق پر ایمان لانے کی توفیق حاصل ہوئی اور نہ ہی اعلانیہ اس کے انکار اور اسے رد کرنے کی جرأت ہوئی۔ وہ دل میں کفر رکھتے ہیں اور زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کفار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں، کیونکہ یہ اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ فکری اضطراب اور ذہنی ناہم آہنگی کا شکار ہوتے ہیں۔ منافقین کے بارے میں تفصیلی بحث سورۂ منافقین میں آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اور یوم آخرت پر پختہ یقین ہی ایمان و نفاق کے درمیان حد فاصل ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۵: ۱۱

۲۔ ایمان دل میں ہو تو ایمان ہے لیکن اگر صرف زبان پر ہو تو نفاق کہلاتا ہے۔

۳۔ اسلام کے لیے کفر سے زیادہ نقصان دہ نفاق ہے۔

يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝۹

۹۔ وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، جب کہ (حقیقت میں) وہ صرف اپنی ذات کو ہی دھوکا دے رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اس بات کا شعور نہیں رکھتے۔

تشریح کلمات

يُخٰدِعُوۡنَ: (خ د ع) الخدع دھوکا دینا۔ جو کچھ دل میں ہو، اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس کام کے ترک کرنے پر آمادہ کرنا جسے وہ انجام دینا چاہتا ہو۔

تفسیر آیات

غیر شعوری ناکامی: وہ اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہوئے بزعم خود اللہ اور مؤمنین کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم اس سازش میں کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں، جب کہ درحقیقت غیر شعوری طور پر وہ خود دھوکا کھا رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ منافقین اس بات کا شعور نہیں رکھتے کہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

۲۔ اللہ سے اپنے دل کا حال چھپانا خود فریبی ہے۔

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۱ : ۱۰۷

فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۝۱۰

۱۰۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی اور ان کے لیے دردناک عذاب اس وجہ سے ہے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

مَرَض: (م ر ض) اعتدال و توازن کا مفقود ہونا۔ مزاج میں اعتدال و توازن ختم ہونے سے انسان جسمانی طور پر ارتقا و تکامل کے قابل نہیں رہتا۔اسی طرح اخلاقی و معنوی اعتدال کے فقدان سے انسان روحانی ارتقا اور انسانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلَا وَ اِنَّ مِنَ الْبَلَاءِ اَلْفَاقَةُ وَ اَشَدُّ مِنَ الْفَاقَةِ مَرَضُ الْبَدَنِ وَ اَشَدُّ مِنْ مَرَضِ الْبَدَنِ مَرَضُ الْقَلْبِ۔[1]

آ گاہ رہو! فقر و احتیاج ایک المیہ ہے، فقر سے بدتر جسمانی بیماری ہے اور جسمانی بیماری سے بھی بدتر دل کی بیماری ہے۔

تفسیر آیات

قلب کی بیماری: یہ منافقین کی دوسری علامت ہے۔ قلب سے مراد روح و عقل ہے۔ یعنی منافقین کی روح اور عقل بیمار ہیں۔ جس طرح جسمانی مرض کی صورت میں پورا جسمانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ، بدن سست ہو جاتا ہے اور اعضائے بدن اپنے فرائض کی بجا آوری کے قابل نہیں رہتے اور ایک موزوں غذا بھی ناموزوں اور ایک لذیذ طعام بھی ناگوار گزرتا ہے، بالکل اسی طرح منافق کی عقل بھی معقول باتوں کا ادراک نہیں کر سکتی اور مفید باتوں اور واضح دلائل و براہین کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ یہ مرض منافقین کے اپنے عمل سے پیدا ہوتا ہے اور جب یہ قابل علاج نہ رہے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ مرض کے مضر اثرات اور مہلک جراثیم مکمل طور پر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور ایسا ہونا قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا خدا کی طرف اس کی نسبت دینا درست ہے، البتہ اس کے ذمہ دار خود منافقین ہیں۔

اہم نکات

۱۔ منافقت وہ مہلک مرض ہے، جو قانون طبیعت کے تحت پھیلتا ہے۔

۲۔ منافقین کی دروغ گوئی گناہوں میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے: زمین میں فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں: ہم تو بس اصلاح کرنے والے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغۃ ۔حکم امیر المؤمنین (ع): ۳۸۸، ص ۹۳۲

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ یاد رہے! فسادی تو یہی لوگ ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

تشریح کلمات

فساد: (ف س د) حد اعتدال سے تجاوز کرنا۔ توازن بگڑ جانا۔ ''فساد'' اصلاح کی ضد ہے:

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ...[1]

اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں (کے نظام) درہم برہم ہو جاتے۔

مُصۡلِحُوۡنَ: (ص ل ح) اصلاح یعنی خرابی دور کرنا، ٹھیک کرنا، صلح کرانا۔

تفسیر آیات

فساد فی الارض: منافقین کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ معاشرے کا امن وسکون برباد کرتے، لوگوں کے درمیان نفرت کا بیج بوتے اور ان میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔ پھر وہ اس تخریب کاری کو اصلاح کا نام دے کر یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم تو اجتماعی مفادات کے تحفظ کی خاطر یہ کام کر رہے ہیں۔ ہم تو عوام کی فلاح و بہبود میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس قسم کے دلفریب نعروں کی آڑ میں یہ لوگ اقوام و مذاہب کا استحصال کرتے ہیں اور ان میں خانہ جنگی کراتے ہیں اور اس طرح ان پر حکومت کرتے ہیں۔ منافقین کا یہ رویہ جس طرح عصر رسالت (ص) کے معاشرے میں رہا ہے، آج بھی جاری ہے۔ البتہ اب ان کا دائرۂ عمل وسیع ہو گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اصلاح کے روپ میں تخریب کاری منافقین کا شیوہ ہے: اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔

۲۔ منافقین ہمیشہ دلفریب نعروں کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں: اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔

۳۔ حق کی جماعت منافقین کی سازشوں پر نظر رکھتی ہے۔ لَا تُفۡسِدُوۡا...۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دیگر لوگوں کی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم (بھی ان) بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ یاد رہے! بیوقوف تو خود یہی لوگ ہیں لیکن یہ اس کا (بھی) علم نہیں رکھتے.

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۲۲

تشریح کلمات

السُّفَهَآءُ: (س ف ہ) خفت اور ہلکا پن۔ رومی کپڑے کو اس کی نزاکت کی وجہ سے ثوب سفیہ کہتے ہیں۔ احمق اور بیوقوف آدمی کو عقل کی خفت اور ہلکے پن کی وجہ سے سفیہ کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

منافقین کی چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ مؤمنین کو معاشرے کا ادنیٰ طبقہ سمجھتے اور یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ صرف بیوقوف لوگ ہی انبیاءؑ پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ نظریہ سابقہ انبیاءؑ کی امتوں کے بارے میں بھی قائم کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت نوح (ع) کی امت کے بارے میں کافر کہتے تھے:

قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَکَ وَ اتَّبَعَکَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ[1] انہوں نے کہا: ہم تم پر کیسے ایمان لے آئیں جب کہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے پیروکار ہیں۔

اور آج کل بھی اہل دین کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے انہیں ارذل یا سفہاء کہا جاتا تھا اور آج کل رجعت پسند، جمود پسند یا قدامت پرست وغیرہ کہا جاتا ہے۔

خالق فرماتا ہے کہ چند روز کے دنیاوی مفاد کی خاطر ابدی زندگی تباہ کرنے والے لوگ ہی درحقیقت احمق ہیں۔

اہم نکات

۱۔ منافق لوگ دینداروں کو احمق و حقیر جب کہ اپنے آپ کو عاقل اور ان سے برتر سمجھتے ہیں۔

۲۔ دیرپا اور حقیقی فائدے کو چھوڑ کر وقتی اور عارضی مفادات کے پیچھے جانا ہی اصل حماقت ہے۔

۳۔ منافقین اہل ایمان کی تحقیر کے لیے ہر دور میں نت نئے حربے استعمال کرتے آئے ہیں۔

۴۔ حبّ دنیا عقل و دل اور نظریات پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیے میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، (ان مسلمانوں کا تو) ہم صرف مذاق اڑاتے ہیں۔

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۱۱

اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَ یَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اللہ بھی ان کے ساتھ تمسخر کرتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ یہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔

تشریح کلمات

شیاطین : شیطان کی جمع۔ یہ شطن سے ماخوذ ہے، جو حق سے دوری اختیار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ابلیس کو بھی شیطان کہتے ہیں۔لیکن ہر شیطان ابلیس نہیں ہوتا۔ اس آیت میں انسانی شیاطین کا ذکر ہے۔

مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ: (ہ ز ء) استہزاء ۔ مذاق اڑانا ،تمسخر کرنا ۔مُسْتَهْزِءُ وْن استہزاء سے اسم فاعل ہے۔ یعنی مذاق اڑانے والے ۔

طغیان : سرکشی کرنا۔حد سے تجاوز کرنا۔ اس لیے اخلاقی و انسانی حدود سے تجاوز کرنے والے کو طاغوت کہتے ہیں ۔

یَعۡمَہُوۡنَ: (ع م ہ) عمہ یعنی سرگرداں۔

تفسیر آیات

سازش اور تمسخر: منافقین کی پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ داخلی طور پر کچھ ہوتے ہیں اور خارجی طرزعمل کچھ اور رکھتے ہیں۔ درون خانہ یہ لوگ دشمنوں سے وابستہ ہوتے ہیں: اِنَّا مَعَکُمۡ اور مسلمانوں سے ملاقات کے وقت اٰمَنَّا کہہکر ان کے ہم خیال بنتے ہیں اوراپنے حقیقی ہم خیال ساتھیوں کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خالق فرماتا ہے : اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ ۔ البتہ اللہ تعالیٰ کا تمسخر یہ ہے کہ تمسخر کرنے والے جس سزا کے مستحق ہیں، وہ سزا انہیں دیتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ جب منافقین نے مؤمنین سے تمسخر کیا تو اللہ نے مؤمنین سے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی منافقین کے تمسخر کا جواب تمسخر سے دو، جیسا کہ حضرت نوح (ع) نے فرمایا:

اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ﴿ؕ۳۸﴾[1]

اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو کل ہم اسی طرح تمہارا مذاق اڑائیں گے، جیسے تم مذاق اڑاتے ہو۔

بلکہ امت محمدی (ص) سے تمسخر کرنے پر ذات احدیت کو منافقین پر جلال آیا اور فرمایا کہ اس تمسخر کا جواب میں خود دوں گا: وَیَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ اور خدائی تمسخر کا طریقہ یہ ہے کہ ان منافقین کو سرکشی میں ڈھیل دے کر مزید تباہی سے دوچار کر دیا جائے، جیسا کہ ایک جگہ ارشاد قدرت ہے:

----

[1] ۱۱ ہود : ۳۸

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○[1]	اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں اور آخرکار ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔
فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○[2]	لیکن جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں مہلت دیے رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

اہم نکات

۱۔ سازش اور دو روئی منافقت ہے۔

۲۔ خدا نے منافقین کے تمسخر کا جواب ان کی سرگردانی کی شکل میں دیا ہے۔

۳۔ اہل حق کے ساتھ ظاہرداری اور باطل طاقتوں کے ساتھ خفیہ اور صمیمانہ تعلقات رکھنا نفاق کی علامت ہے۔

۴۔ شیاطین ہی منافق کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۶ : ۵۱

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯	۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خرید لی ہے چنانچہ نہ تو ان کی تجارت سودمند رہی اور نہ ہی انہیں ہدایت حاصل ہوئی۔
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰	۱۷۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے (تلاش راہ کے لیے) آگ جلائی، پھر جب اس آگ نے گرد و پیش کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور انہیں اندھیروں میں (سرگرداں) چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

[1] ۳ آل عمران: ۱۷۸ [2] ۱۰ یونس: ۱۱

صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں پس وہ (اس ضلالت سے) باز نہیں آئیں گے۔

تشریح کلمات

مَثَلٌ : عبرت انگیز داستان اور مشابہت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ المثل ایسی بات جو کسی اور بات سے ملتی جلتی ہوتا کہ ایک کے ذریعے دوسری کا مطلب واضح ہوجائے۔

اِسۡتَوۡقَدَ: (و ق د وَقَدَ یَقِدُ) آگ کے شعلے۔ استوقد جلنا یا جلانا۔ الوقود ایندھن۔

تفسیر آیات

منافقین کے سیاہ اعمال کے تذکرے کے بعد اب ان کے نتائج بیان ہو رہے ہیں کہ ان لوگوں نے احمقانہ سودا کیا۔ ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی اور سو فیصد گھاٹے میں رہے۔ اسی لیے وہ نفسیاتی طور پر پریشان رہتے ہیں۔ خداوند کریم نے منافقین کے اس اندرونی انتشار اور نفسیاتی الجھن کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی حالت اس شخص کی سی ہے، جسے روشنی حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوئے اور اس نے اردگرد دیکھا اور اشیاء کے نفع وضرر سے آگاہی حاصل کی ہی تھی کہ یکا یک یہ روشنی چھن گئی اور چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا شخص احساس محرومی سے بہت زیادہ دوچار ہوتا ہے، بہ نسبت اس شخص کے جس نے روشنی دیکھی ہی نہیں اور پہلے سے اندھیرے میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ منافق اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے کبھی کبھار حق کا سہارا لیتا ہے، لیکن اکثر باطل کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

۲۔ منافق اپنی منافقانہ روش کے نتیجے میں اندرونی انتشار اور نفسیاتی اضطراب میں مبتلا رہتا ہے۔

۳۔ منافق کے سامنے کوئی مستقل لائحہ عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ ابن الوقت ہوتا ہے۔

۴۔ منافق کے سامنے کوئی روشن مستقبل نہیں ہوتا۔

۵۔ منافقین کا سرمایۂ حیات خسارے میں ہے: فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ ....

۶۔ منافقین کے حواس حقائق کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ ....

اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ یا جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو جس میں تاریکیاں اور گرج و چمک ہو، بجلی کی کڑک کی وجہ سے موت سے خائف ہو کر وہ اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیتے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۙ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں سلب کر لے جب وہ ان کے لیے چمک دکھاتی ہے تو وہ اس (روشنی) میں چل پڑتے ہیں اور جب تاریکی ان پر چھا جاتی ہے تو وہ رک جاتے ہیں اور اللہ اگر چاہتا تو ان کی سماعت اور بینائی (کی طاقت) سلب کر لیتا، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

صیب: (ص و ب) برسنے والا بادل۔ بار بار برسنے والی بارش۔

الصَّوَاعِقِ: (ص ع ق) صاعقه کی جمع۔ خوفناک آواز۔ آسمان سے گرنے والی بجلی، آتش اور موت کو بھی صعق کہتے ہیں۔

يَخۡطَفُ: (خ ط ف) اچک لینا۔ تَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ پرندہ اسے اچک کر لے جائے۔

تفسیر آیات

دوسری مثال میں منافقین کی حالت کو اور زیادہ وحشت ناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سابقہ آیت میں منافق کی انفرادی حالت کی تصویرکشی ہوئی تھی، لیکن اب منافقین کے اجتماعی ماحول کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ گویا وہ ایسے ماحول میں رہتے ہیں جس میں چہار سو تاریکیاں ہیں اور بجلی کی گرج و چمک ہے۔ جہاں ہر وقت موت سروں پر منڈلاتی نظر آتی ہے۔ یعنی منافقین کی نفسیاتی حالت مضطرب اور تشویش ناک ہے، انہیں

ہرگز امن وسکون نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اس کے حصول کے لیے وقتی اور ظاہری کاوش کرتے ہیں اور اسی عارضی سکون پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وہ ذہنی اضطراب سے بچنے کے لیے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور آج کل کے ترقی یافتہ معاشرے میں نشہ آور اور خواب آور گولیوں کا سہارا لیتے ہیں اور وقتی سکون پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن ایک حیات آفرین اور حیات ساز دستور ہونے کے لحاظ سے مؤمنین کی فکری اور شعوری تربیت کر رہا ہے تاکہ مؤمنین اپنے اردگرد کے مختلف افراد کے ساتھ مناسب روش اختیار کریں۔ منافقین کی نفسیاتی پریشانی، ذہنی اضطراب، اخلاقی پستی اور برے عزائم کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور مؤمنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے دل مریض ہیں، یہ معاشرتی اصلاح کی آڑ میں اجتماعی فساد پھیلاتے ہیں، تکبر اور احساس برتری جیسے موذی نفسیاتی امراض میں مبتلا ہیں اور اہل ایمان کو حقیر سمجھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نزول وحی کو منافقین اپنی موت تصور کرتے تھے: حَذَرَ الۡمَوۡتِ...۔

۲۔ اندرونی کیفیت کے باوصف منافق کی زندگی میں نظر آنے والی ظاہری خوشی اورسکون عارضی ہے۔

۳۔ مومن کو ہمیشہ اپنے اس ازلی اور خفیہ دشمن (منافق) سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾	۲۱۔ اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم (خطرات سے) بچاؤ کرو۔

تشریح کلمات

خلق: (خ ل ق) پیدا کرنا۔ اصل میں درست اندازہ گیری کو خلق کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں خلق ''ایجاد'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے خلق ابداعی کہتے ہیں اور یہ صرف خداوند تعالیٰ سے مخصوص ہے۔ البتہ یہ لفظ دیگر معانی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً کسی موجود چیز کو ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل کرنا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا:

وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ ...[1]	اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا پتلا بناتے تھے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۱۱۰

تفسیر آیات

گزشتہ آیات میں مختلف اور متعدد انسانی گروہوں (متقین، کفار اور منافقین) کا ذکر گزرا اور اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو فکر و استدلال اور عقل و تدبر کے ذریعے دعوت دیتا ہے کہ وہ متقین سے پیوست ہو جائیں۔ مذکورہ تین گروہوں میں سے متقین کے گروہ کو اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے خالق نے منطقی بنیادوں کا ذکر فرمایا، جو ربوبیت، خالقیت اور رزاقیت سے عبارت ہیں۔

ربوبیت کے ادراک کے بعد عبودیت ہے۔ یعنی اپنے مربی اور تربیت کنندہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ایک ضروری اور فطری امر ہے۔

جب انسان اپنے آپ کو مخلوق سمجھتا ہے تو اپنے خالق کی طرف متوجہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ کتاب خلقت (کائنات) کے مطالعے کے ذریعے توحید تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قاری صرف خلقت کے موجودہ صفحات پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ سے پتہ چلتا ہے کہ اس خلقت کے گزشتہ ادوار پر مشتمل صفحات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ میں موجودہ نسل سے قبل یا موجودہ انسانی نوع سے پہلے، یعنی انسانی خلقت سے پہلے کی مخلوقات غرضیکہ تمام ممکنہ مخلوقات اس میں شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مختلف نظریاتی گروہوں کے تقابلی مطالعے کے بعد انسان کو متقین (صاحبان عقل و منطق) کے ساتھ رہنے کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۔ انسان کو خلقت کے حوالے سے آفاقی مطالعے کی دعوت دی گئی ہے۔

۳۔ انسانی خلقت کا مقصد خالق کی پرستش ہے: اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ۔

۴۔ عابد کے پیش نظر صرف اللہ کی ربوبیت اور خالقیت ہونی چاہیے: الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے تمہاری غذا کے لیے پھل پیدا کیے، پس تم جانتے بوجھتے ہوئے کسی کو اللہ کا مدمقابل نہ بناؤ۔

تشریح کلمات

فراش: (ف ر ش) بستر جس پر انسان آرام کرتا ہے۔
اَنۡدَادًا: (ن د د) نِدّ کی جمع یعنی ایسا مدمقابل اور ہمسر جو کسی کی ذات میں شریک ہو۔

تفسیر آیات

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا: جَعَلَ یعنی عدم سے وجود میں لانا۔ بنا بر ایں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین پہلے قابل سکونت نہ تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی کے قابل بنایا۔ اللہ نے ایک طویل مدت تک زمین کے اندر ذخائر پنہاں کیے، پھر سطح زمین کو پانی کے ذریعے قابل استفادہ بنایا۔ بچھونے کی تعبیر اختیار کرنے سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس میں آرام و آسائش کے تمام وسائل فراہم ہیں۔ نہ تو اسے زیادہ سخت بنایا کہ دانہ اگ نہ سکے اور نہ ہی اسے اتنا نرم بنایا کہ چیزیں اس میں دھنس جائیں۔ نہ اتنی چھوٹی بنائی کہ آکسیجن کے ذرات فضا میں زمین سے منسلک نہ رہ سکیں اور نہ اتنی بڑی کہ ہوائی ذرات فضا میں معلق نہ رہ سکیں۔ زمین کی محوری حرکت اگر موجودہ رفتار سے کئی گنا سست ہوتی تو دن اور رات بھی کئی گنا بڑے ہوتے۔ دن کو گرمی اور رات کو سردی کی شدت سے جاندار مر جاتے ۔خلاصہ یہ کہ اس قسم کے ہزاروں ایسے اسرار و رموز ہیں، جن کی وجہ سے یہ زمین آرام دہ بستر قرار پائی ہے۔

اہم نکات

۱۔ چونکہ اللہ نے عبودیت کے لیے تمام ضروری چیزیں عطا کی ہیں، لہٰذا صرف اور صرف اسی کی بندگی ہونی چاہیے۔
۲۔ علم و آگہی سے انسان موحد بنتا ہے مشرک نہیں۔ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۳: ۳۵۔ ۵۴: ۸۷۔ ۵۷: ۸۲

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور اگر تم لوگوں کو اس (کتاب) کے بارے میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسا کوئی سورہ بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے حامیوں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

تشریح کلمات

سورہ: (س و ر) بلند مقام۔ بلند عمارت۔ بلند دیوار۔ قرآنی سورتوں میں ایسے بلند پایہ مطالب ہیں جو عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہیں، اس لیے انہیں سورہ کہا گیا ہے۔

شہداء: (ش ہ د) ''شاہد'' کی جمع۔ حاضر و ناظر۔ گواہ کو اس لیے ''شاہد'' کہتے ہیں کہ وہ واقعے کا مشاہدہ کرتا ہے اور ''شہید'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ فرشتے فوراً اس کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن کا ابدی دعویٰ: اس دعوے کے مخاطب الناس یعنی سب لوگ ہیں۔ اس لیے یہ کسی خاص گروہ یا زمانے سے مخصوص نہیں۔ چونکہ قرآن ایک ابدی اور دائمی معجزہ ہے، لہٰذا اس کا دعویٰ بھی ابدی اور دائمی ہے۔ بنا برایں اس دعوے کے مخاطبین میں ہر دور اور ہر عصر کے انسان شامل ہیں۔

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر ایسے دعوے کیے گئے ہیں:

قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ وَ لَوۡ کَانَ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ ظَہِیۡرًا ۝[۱]

کہدیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

اس آیت میں انسانوں کے ساتھ جنات بھی دعوے میں مدمقابل ہیں۔

مِّنۡ مِّثۡلِہٖ کی ضمیر مِّمَّا نَزَّلۡنَا کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی اس قرآن کی سورتوں میں سے ایک سورت کی مثل ہی بنالاؤ اور اگر ایک فرد سے یہ کام نہ ہو سکے تو اپنے حمائتیوں کو بھی بلا لاؤ۔ یعنی ساری دنیا کے کفار کو بلا لو اور سب مل کر ایک سورت کی مثل بنانے کی کوشش کرو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ میں مِّثۡلِہٖ کی ضمیر عَبۡدِنَا کی طرف جاتی ہے۔ یعنی محمد (ص) جیسے آدمی سے ایک سورہ بنوا لاؤ۔ '' محمد (ص) جیسے '' کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے انسان سے جو کسی انسانی مکتب میں پڑھا ہوا نہ ہو اور جس نے تمہارے ماحول میں پرورش پائی ہو۔ یعنی قرآن اگر انسانی دماغ کی پیداوار ہے اور خود محمد (ص) نے اسے بنایا ہے تو محمد (ص) جیسے کسی اور آدمی سے بھی یہ کام صادر ہونا ممکن ہو گا۔ پس اگر ممکن ہے تو بنا لو اور اگر ممکن نہیں تو ثابت ہو گا کہ یہ قرآن بشری ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔

یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے ماحول میں نہ ہو

---

[۱] ۱۷ اسراء: ۸۸

اور کسی مکتب کا پڑھا ہوا ہے تو اس کے لیے اس جیسا قرآن لانا ممکن ہے۔ جب کہ قرآن کا دعویٰ ابدی ہے کہ ہر زمانے کے جن وانس کے لیے اس جیسا قرآن لانا ممکن نہیں ہے۔

دعوے کی عمومیت: قرآن کا یہ دعویٰ کسی خاص زاویے یا عنوان سے مخصوص نہیں۔ مثلاً یہ کہ صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن کی مثل لانے کا دعویٰ نہیں، بلکہ اس میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ یعنی ایک بلیغ کے لیے بلاغت کا، حکیم کے لیے حکمت کا، قانون دان کے لیے تقنین کا، ماہر نفسیات کے لیے نفسیات کا اور ادیب کے لیے ادبیات کا دعویٰ ہے۔

کیا معجزہ فطری قوانین کے دائرے میں ہوتا ہے؟: اس بات میں شک وتردید کی گنجائش نہیں کہ اس کائنات کا نظام قانونِ علل و اسباب پر مبنی ہے۔ یعنی جب تک کوئی علت کارفرما نہ ہو، تب تک نہ کوئی معلول وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ علت کے بغیر کسی چیز کا معرض وجود میں آنا ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا معجزہ بھی اس قانون کے تابع ہے؟ اگر جواب مثبت ہے تو ہر معجزے کے مخصوص علل و اسباب تلاش کرنا پڑیں گے۔ مثلاً عصائے موسیٰ (ع) کا اژدھا بننا یا حضرت عیسیٰ (ع) کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ایسے معجزات ہیں جن کے مادی و سائنسی اسباب کا ہونا ضروری ہے، جو بظاہر دکھائی نہیں دیتے۔

اس مقام پر سائنس سے مرعوب اور مغرب زدہ ذہنوں نے ان آیات کی تاویلیں شروع کر دیں، جو ان کے لیے ظاہری اور سطحی طور پر ناقابل فہم تھیں۔

ہم اس اہم اور دقیق مسئلے پر قدرے تفصیل سے بحث کریں گے، تاکہ قارئین محترم اس مسئلے کے اہم نکات سے واقف ہو جائیں:

۱۔ عقل و تجربے کی طرح قرآن بھی یہ اصول تسلیم کرتا ہے کہ ہر واقعے کے پیچھے ایک علت وسبب کارفرما ہوتا ہے۔ مثلا اگر کسی جسم کا حجم پھیلتا ہے تو اس کے پس پردہ اس کی علت یعنی حرارت کارفرما ہوتی ہے۔

۲۔ اس کے ساتھ قرآن کچھ غیر معمولی واقعات کو بھی بطور معجزہ پیش کرتا ہے۔

۳۔ معجزات معمول کے مطابق نہیں ہوتے، لیکن محالات اور ناممکنات سے بھی نہیں ہوتے۔ یعنی معجزہ ناممکن یا محال کو ممکن بنانے کا نام نہیں۔ مثلاً پانچ کو پانچ سے ضرب دی جائے تو معجزے کے ذریعے حاصل ضرب پچیس کی بجائے پندرہ نہیں بن سکتا، بلکہ عقل کے نزدیک معجزات کا تعلق ممکنات سے ہوتا ہے۔

۴۔ معجزات قانون فطرت کی عام دفعات کے بالکل مطابق بھی نہیں ہوتے۔ مثلا ایک چٹان سے

بارہ چشموں کا پھوٹنا عقلاً ایک ممکنہ امر ہے، لیکن دو گز کا عصا مارنے سے نہیں، بلکہ طبیعی اور فزیکلی علل و اسباب کے تحت۔ چنانچہ اسی لیے تو معجزات سائنسی تجربات اور معمولات پر پورے نہیں اترتے اور نہ ہی سائنسی علوم اور تجربات ان معجزات اور غیر معمولی طور پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے انکار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آج بھی دنیا کے گوشہ و کنار میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کی توجیہ تجربات اور سائنسی اصولوں کے مطابق نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً ہپناٹزم وغیرہ۔ ان غیر معمولی واقعات کی توجیہ میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کے پیچھے نامعلوم برقی لہریں کارفرما ہوتی ہیں۔

معجزات بھی چونکہ مادی امور سے ہیں، اس لیے ان کے پیچھے بھی کچھ عوامل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں، لیکن یہ عوامل عام مادی و طبیعی قوانین کی سطحی دفعات کے مطابق نہیں ہوتے۔ اسی لیے طبیعی و مادی قوانین تمام معجزات کی مادی توجیہ نہیں کر سکتے۔

۵۔ طبیعیات یا مادی قوانین کی عام سطحی دفعات اور ان کے اصول بھی دائمی حیثیت نہیں رکھتے۔

ان تمام باتوں سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ تمام مادی حوادث کے پیچھے سطحی علل و اسباب اور عوامل ضرور کارفرما ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے حقیقی علل و اسباب اور پھر ان سب کے پس پردہ ارادۂ خداوندی کارفرما ہوتا ہے۔

چنانچہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات تین امور میں تقسیم ہوتے ہیں:

الف: عام طور پر رونما ہونے والے واقعات جن کے ساتھ ظاہری اور سطحی اسباب و عوامل موجود ہوتے ہیں، جو تجربات اور سائنسی اصولوں کے اعتبار سے قابل فہم ہوتے ہیں۔ پھر ان کے ماوراء حقیقی علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں، جن کی طرف انسان متوجہ نہیں ہوتا۔ سطحی علل و اسباب کے اصول بظاہر ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن ان حقیقی اور غیر مرئی علل و اسباب کے اصول دائمی ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں طرح کے علل و اسباب کے پیچھے ارادۂ خداوندی حکم فرما ہوتا ہے۔

ب: غیر معمولی اور عام حالات و عادات سے ہٹ کر رونما ہونے والے بعض واقعات میں صرف حقیقی علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں، جیسے دعا وغیرہ کے اثرات۔

ج: غیر معمولی اور عام حالات و عادات سے ہٹ کر رونما ہونے والے ایسے واقعات جن میں اگرچہ حقیقی علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں، لیکن یہ اسباب عام لوگوں کے لیے ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ معجزہ اسی قسم میں شامل ہے۔ لیکن معجزے اور دعا میں فرق یہ ہے کہ اگر بیماری سے شفا دست مسیحا کے ذریعے ہو تو اس شفایابی کے علل و اسباب ناقابل تسخیر ہیں، جب کہ دعا کے

ذریعے حاصل ہونے والی شفا کے علل و اسباب قابل تسخیر ہیں۔ یعنی دوسرے لوگ بھی انہیں اپنا سکتے ہیں یا ان سے بہتر علل و اسباب مہیا کر سکتے ہیں۔

لہٰذا معجزات قانون علیت سے مستثنیٰ نہیں ہیں، بلکہ تابع علل و اسباب ہیں۔ البتہ معجزات کے علل و اسباب کے بارے میں دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔ معجزات کے پیچھے جو علل و اسباب کارفرما ہیں، وہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔

۲۔ ان کے پیچھے غیر مادی علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک مادی واقعے کے پیچھے غیر مادی عوامل کا کارفرما ہونا کوئی محال بات نہیں۔ ریاضت اور عملیات کے ذریعے انسان ایک غیر مادی طاقت کا مالک بن جاتا ہے اور بہت سے ایسے امور انجام دیتا ہے جن کی توجیہ مادی علل و اسباب کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ بنا بر ایں ممکن ہے کہ خدا کے حکم سے، رسول (ص) اور ولی خدا کا ارادہ اظہار معجزہ میں دخیل ہو۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کا دعویٰ ہمہ گیر اور عالمگیر ہے۔

۲۔ قرآن کے دعوے کا جواب دینے سے بشر کی عاجزی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن ایک ابدی معجزہ ہے۔

۳۔ معجزات قانون علیت سے مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن طبیعی قوانین کی عام دفعات اور ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر حقیقی اور غیر مرئی علل و اسباب اور ارادۂ خداوندی کے تابع ہیں، جو عام مادی علل و اسباب سے ماوراء ہیں۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز تم ایسا نہ کر سکو گے تو اس آتش سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں (یہ آگ) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

تفسیر آیات

ایک اور قرآنی دعویٰ کہ تم سب مل کر اجتماعی کوشش کرو تو بھی ایک سورہ کی مثل ہرگز نہیں لا سکو

گے۔ وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا میں دعویٰ بھی ہے اور قاطعانہ پیشگوئی بھی کہ تم مستقبل میں بھی ہرگز یہ کام نہ کر سکو گے۔ اس پیشگوئی اور دعوے کو چودہ صدیاں گزر گئیں اور انسان علوم و فنون کے بے شمار ارتقائی مراحل طے کر چکا، لیکن قرآن کے دعوے کا مقابلہ آج تک کسی سے نہ ہو سکا اور آئندہ بھی ایک طرف انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا اور دوسری طرف قرآنی دعوے وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا کی گونج بھی کائنات کی فضاؤں میں گونجتی رہے گی، مگر قرآن کا مقابلہ کرنے کی جرأت، استطاعت اور قوت کسی میں بھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ چونکہ تم اس قرآن کی مثل لانے کی جرأت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر خود اپنے جسم کے ایندھن سے بھڑکی ہوئی آگ میں جلایا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ یہ دعویٰ صرف وہ علیم و خبیر ہستی ہی کر سکتی ہے جو جانتی ہو کہ کبھی بھی قرآن کی مثل نہیں لائی جا سکتی۔

۲۔ اتمام حجت و نعمت کے بعد ہٹ دھرمی کرنے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡہَا مِنۡ ثَمَرَۃٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا ہٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِہًا ؕ وَ لَہُمۡ فِیۡہَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ ٭ۙ وَّ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجیے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے کہ ان کے لیے (بہشت کے) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اس میں سے جب بھی کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے بھی مل چکا ہے حالانکہ انہیں ملتا جلتا دیا گیا ہے اور ان کے لیے جنت میں پاک بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

بَشِّر: (ب ش ر) بشارت۔ وہ خبر جو سننے والے کے لیے خوشی کی باعث ہو۔ اصل میں بشر جلد کو کہتے ہیں۔ چونکہ خوشی کے عالم میں انسانی چہرے کی جلد میں انبساط آ جاتا ہے، اس لیے خوشی کی خبر کو ''بشارت'' کہا جاتا ہے۔

جَنّٰتٍ: (ج ن ن) جنت کی جمع ہے۔ وہ جگہ جو درختوں سے ڈھکی ہوئی ہو۔ چنانچہ انسانی نظروں سے پوشیدہ رہنے والی مخلوق کو جن کہتے ہیں۔ ڈھال کو جنۃ کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

اَلصَّومُ جُنَّۃٌ مِنَ النَّارِ[1] روزہ آتش جہنم (سے بچنے) کی ڈھال ہے۔

کیونکہ ڈھال اپنے مالک کو نقصان دہ چیزوں سے محفوظ اور پوشیدہ رکھتی ہے۔

تفسیر آیات

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ہے۔ نجات و فلاح کے لیے اگر ایمان ضروری ہے تو عمل صالح بھی شرط ہے۔ ایمان و عمل کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ ایمان بلا عمل۔ ۲۔ عمل بلا ایمان۔ ۳۔ ایمان با عمل۔

۱۔ پہلی صورت یعنی ایمان بلا عمل، قرآن مجید کی رو سے نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ قرآن نے جہاں بھی نعیم جنت اور فلاح آخرت کی نوید سنائی ہے، وہاں ایمان کو عمل صالح سے مشروط کر دیا ہے۔ کیونکہ ایمان و ایقان انسان کے ضمیر اور شعور پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر مریض کا ایمان ہو کہ فلاں دوا میرے لیے بہتر ہے تو اس ایمان و یقین کا اثر اس کے شعور پر مرتب ہوگا، جس کے نتیجے میں وہ عمل کرے گا (یعنی دوا استعمال کرے گا)۔ کوئی عاقل ایسا نہیں جو اپنے اس ایمان کا اثر مرتب نہ ہونے دے۔

۲۔ دوسری صورت (عمل بلا ایمان) معقول ہی نہیں کہ کسی چیز پر ایمان نہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ انسان کے ضمیر اور شعور پر اثر انداز ہو اور پھر اس کا نتیجہ عمل کی صورت میں ظاہر ہو۔ جس مریض کا علاج پر ایمان ہی نہیں، اس کے ضمیر و شعور پر وہ علاج کبھی اثر انداز نہیں ہو گا کہ اسے عملی صورت انجام دینے کی ضرورت پڑے۔ بنابریں جن لوگوں کا اللہ پر ایمان نہ ہو وہ اس کی اطاعت نہیں کریں گے اور اس صورت میں عمل صالح بجا لانا ممکن ہی نہ ہو گا۔ واضح رہے کہ جو لوگ رفاہی کام تو سرانجام دیتے ہیں لیکن اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں، ان کے اعمال کسی اور ایمان وعقیدے کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا ثواب اللہ کے ذمے نہیں بلکہ اسی کے ذمے ہے، جس کے لیے انہوں نے یہ اعمال انجام دیے ہیں۔

۳۔ تیسری صورت (ایمان با عمل) ذریعہ نجات ہے اور اسی کے لیے قرآن نے بھی جنت کی ابدی نعمتوں کی بشارت دی ہے: وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لانے والوں کے لیے بہشت کے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ کُلَّمَا رُزِقُوۡا انہیں جب بھی کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے بھی ہمیں مل چکا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: وَ اُتُوۡا بِہٖ

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ ۲: ۷۴ باب فضل الصیام

مُتَشَابِهًا۔ ''حالانکہ انہیں ملتا جلتا دیا گیا ہوگا'' بعض محقق مفسرین فرماتے ہیں کہ جنت کی نعمتوں میں تکرار یعنی یکسانیت نہیں۔ دنیا میں اگر ہم ایک چیز کئی بار کھائیں تو ہر مرتبہ وہی لذت ملے گی جو پہلی بار کھانے سے ملی تھی۔ لیکن جنت میں ہر مرتبہ ایک نئی لذت ملے گی اور نیا ذائقہ محسوس ہوگا۔ ہر چند کہ پھل ملتے جلتے دیے جائیں گے۔

عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے:

ما فی القرآن ایة " الذین امنوا و عملوا الصالحت" الا و علی امیرها و شریفها۔[1]

قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس کا عنوان الذین امنوا و عملوا الصالحت ہو مگر یہ کہ علی (ع) اس کے سب سے اولی و شریف ترین مصداق نہ ہوں۔

اہم نکات

۱۔ ایمان اور عمل صالح دونوں کا مجموعی نتیجہ نجات ہے۔

۲۔ غیر اسلامی نظریات کی حامل رفاہی سرگرمیوں کا صلہ اللہ کے ذمے نہیں۔

۳۔ ایمان کی صداقت کو پرکھنے کی واحد کسوٹی عمل صالح ہے۔

تحقیق مزید

الفقیہ ۱: ۸۹۔ الوسائل ۱۶: ۲۲۱

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَهۡدِیۡ بِهٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اللہ کسی مثال کے پیش کرنے سے نہیں شرماتا خواہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (چھوٹی چیز کی)، پس جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ (مثال) ان کے پروردگار کی جانب سے برحق ہے، لیکن کفر اختیار کرنے والے کہتے رہیں گے کہ اس مثال سے اللہ کا کیا مقصد ہے، اللہ اس سے بہت سوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے اور وہ اس کے ذریعے صرف بداعمال لوگوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۳۶: ۱۰۷، باب ۳۹۔ شواهد التنزیل ۱: ۳۰

تشریح کلمات

یَسۡتَحۡیٖۤ: (ح ی ی) حیا، شرم۔ وہ اثر جو کسی نامناسب عمل کے سرزد ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا شرم نہیں کر سکتا، لہٰذا خدا کی شرم سے مراد شرم کا لازمہ ہے۔ یعنی اگر کوئی کسی عمل پر شرم کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عمل کو ترک کر دیتا ہے۔ لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اس عمل کو ترک نہیں کر سکتا۔ یہی بات غضب و رضا اور محبت و کراہت میں بھی متصور ہوگی۔ یعنی اللہ کی رضا ''ثواب دینا'' اور اس کا غضب ''عذاب دینا'' ہے۔

ضرب المثل: ضرب کا ایک معنی زمین پر چلنا ہے۔ چونکہ '' ضرب المثل'' شہرت حاصل کرنے کے بعد ایک مسافر کی طرح لوگوں کی زبان پر ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے، اس لیے اسے'' ضرب المثل'' کہا جاتا ہے۔

بَعُوۡضَۃً: چھوٹا مچھر۔

الحَقُّ: (ح ق ق) ثابت۔ واقعیت، حقیقت۔ اگر ایک کلام واقع کے مطابق ہو تو کلام کو صدق اور واقعیت کو حق کہتے ہیں۔

فسق: (ف س ق) نکل آنا۔ فسقت الرطبة عن قشرها کھجور اپنے چھلکے یا خول سے نکل آئی۔ اسی لیے شریعت کی چار دیواری سے خارج ہونے والے کو فاسق کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

شرم و حیا انسانی مزاج سے مربوط ہے اور خدا اس سے منزہ ہے، کیونکہ یہ ایک کیفیت ہے اور اللہ کیفیات سے ماوراء ہے۔ اس لیے یہاں خدا کی شرم و حیا کا مطلب اس کا لازمہ ہے۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قرآن نے سورۂ عنکبوت میں مکڑی کے جالے کی مثال دی:

وَ اِنَّ اَوۡهَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ [1] اور گھروں میں سب سے کمزور یقیناً مکڑی کا گھر ہے۔

اور سورۂ حج میں مکھی کو بعنوان مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ... [2] اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں۔

چنانچہ بعض یہودیوں نے طنزاً کہا کہ قرآن مثال کے لیے حقیر سی چیزوں کو منتخب کرتا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ مچھر یا اس سے بھی کمتر چیز کی مثال پیش کرنے سے نہیں شرماتا۔ فَمَا فَوۡقَهَا (فی الصِّغَر) یعنی اس سے بھی کمتر چیز کو مثال کے طور پر پیش کرے گا۔

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۴۱ [2] ۲۲ حج: ۷۳

یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا: اس مثال کے ذریعے خدا گمراہ ہونے والوں کو گمراہ کرتا اور ہدایت پانے والوں کی ہدایت کرتا ہے۔ یعنی ہر شخص کو اس کی لیاقت کی بنیاد پر استحقاق ملے گا۔ گویا ایسی مثالیں ایک کسوٹی کی طرح ہیں، جن سے گمراہ ہونے والے اور ہدایت پانے والے جدا ہو جاتے ہیں۔

وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ: یعنی ان مثالوں سے خدا صرف فاسقوں کو ہی گمراہی میں ڈالتا ہے۔

قرآن مجید میں اس مفہوم کی بہت سی آیات ہیں۔ سورۂ نحل میں فرمایا:

یُّضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ... [1]　　وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

سورۂ دہر میں فرمایا:

وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ [2]　　اور تم نہیں چاہتے ہو مگر وہ جو اللہ چاہتا ہے....

ان آیات سے بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مجبور و بے بس ہے اور سب کچھ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

۱۔ نظریۂ جبر: مذکورہ آیات کو دیکھ کر مسلمانوں کے ایک فرقے نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں بے بس ہے۔ آگے چل کر اس ضمن میں تین نظریات سامنے آئے۔

الف۔ اشاعرہ کا نظریۂ جبر: ان کا نظریہ ہے کہ بندہ کسی بھی قسم کے قصد و ارادے کا مالک نہیں۔ اس کائنات میں صرف ارادۂ خدا نافذ ہے اور ارادۂ خدا کے سامنے بندے کی حیثیت کاتب کے ہاتھ میں پکڑے قلم کی سی ہے۔ لہٰذا بندوں سے صادر ہونے والے افعال درحقیقت اللہ کے افعال ہیں اور ظاہراً بندے کے۔

ب۔ نظریۂ وحدۃ الوجود: اس نظریے کے مطابق خالق اور مخلوق میں دوئی کا تصور ہی نہیں کہ بندے میں کسی قصد و ارادے کا تصور قائم ہو۔ جب کائنات میں صرف ایک ہی وجود ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ کا وجود اور باقی موجودات اس حقیقی وجود کی تجلیات ہیں تو اس کائنات میں جو کچھ رونما ہوگا، اسی وجود واحد کا کرشمہ اور اسی یکتا کارساز کا کارنامہ ہوگا۔

ج۔ نظریۂ علم خدا: اللہ تعالیٰ کو کائنات میں ہونے والے تمام واقعات کا ازل سے علم ہے۔ اگر کسی نے گناہ کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم پہلے سے حاصل ہے۔ اس علم خدا کے مطابق عمل کا سرزد ہونا ضروری ہے، ورنہ علم خدا جہل میں بدل جائے گا۔ بنا بریں اس جہان میں رونما ہونے والے اعمال کے بارے میں علم خدا علت تامہ ہے۔ تمام اعمال علم خدا کے مطابق رونما ہوتے ہیں، ان میں انسانی قصد و ارادے کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

---

[1] ۱۶ نحل: ۹۳　　[2] ۷۶ دہر: ۳۰

نظریۂ جبر پر آیات کے علاوہ یہ دلیل بھی قائم کی جاتی ہے کہ اگر اللہ کے قصد و ارادے کے ساتھ عبد اور مخلوق کا ارادہ بھی نافذ ہو تو شرک لازم آئے گا اور خدا کا چونکہ کوئی شریک نہیں ہے، اس لیے اس کے ارادے کے ساتھ کوئی اور ارادہ بھی نفاذ عمل میں شریک نہیں ہو سکتا۔

۲۔ نظریۂ تفویض: اس نظریے کے مطابق بندے کے افعال و اعمال خود اسی کے قصد و ارادے سے صادر ہوتے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کے قصد و ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ معتزلہ نے اختیار کیا ہے۔ اس پر متعدد قرآنی آیات سے استدلال کیا جاتا ہے مثلاً:

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ...[1]　　　ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ[2]　　　پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

آیات کے علاوہ ان کا استدلال یہ بھی ہے: اگر صرف ارادۂ خدا ہی سے یہ افعال صادر ہوں اور ان میں بندے کا ارادہ شامل نہ ہو تو بندہ ثواب و عذاب کا مستحق نہیں بن سکتا اور یہ بات عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک شخص کو گناہ پر مجبور بھی کرے اور پھر اسے سزا بھی دے۔

۳۔ نظریۂ امرین بین امرین: یہ شیعہ امامیہ کا نظریہ ہے۔ یعنی نہ جبر ہے اور نہ تفویض، بلکہ ایک تیسری صورت ہے، جس میں کسی حد تک ارادہ خدا بھی دخیل ہے اور ارادۂ عبد بھی۔

اس نظریے کے مطابق خدا عمل کی طاقت عطا کرتا ہے اور بندہ عمل کو ارادے و اختیار سے انجام دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل کی طاقت و صلاحیت خدا کی طرف سے ہے اور طاقت کا استعمال بندے کی طرف سے ہے۔ تیسرے الفاظ میں طاقت اللہ کی طرف سے ہے مگر غیر مشروط اور انتخاب بندے کی طرف سے ہے۔ یعنی انتخاب کرنے میں بندہ آزاد ہے۔

توضیح مزید: اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خلق فرمایا اور انہیں غیر مشروط طور پر نیک و بد اعمال انجام دینے کی قوت دی۔ یعنی اس طاقت کے ساتھ یہ شرط نہیں رکھی کہ اس خداداد قوت سے وہ صرف نیک اعمال بجا لائے گا اور نہ یہ کہ اس قوت سے برے اعمال انجام دے گا، بلکہ خدا نے تو ایک ایسی ذات خلق فرمائی ہے جو نیکیوں پر بھی قادر ہے اور گناہوں پر بھی اور اسی طرح مباحات بجا لانے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔ البتہ نیکی اور گناہ میں فرق یہ ہے کہ ''نیکی'' کو بجا لانے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اس کی ترغیب دلائی ہے، وہ اس پر راضی ہے اور اسی نے ہی نیکی کرنے کی قوت بھی دی ہے۔ جب کہ ''گناہ'' سے روکا ہے، اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور اسے انجام دینے والے کے لیے عذاب مقرر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان سے گناہ کرنے کی قوت سلب نہیں کی نیز ''مباح'' کے بجا لانے کی اجازت دی اور انجام دہی کی طاقت بھی عنایت فرمائی کہ چاہے تو انجام دے اور چاہے تو انجام نہ دے۔

---

[1] ۵۲ طور: ۲۱　　[2] ۱۸ کہف: ۲۹

احادیث

اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا فرمان کس قدر جامع ،دلکش اور حکمت آمیز ہے:

اَلتَّوْحِیدُ اَنْ لَا تَتَوَھَّمَهُ وَ الْعَدْلُ اَنْ لَا تَتَّهِمَهُ فَالْقَائِلُ بِاَنَّهُ خَالِقٌ لِلْاَفْعَالِ فَقَد اِتَّهَمَهُ بِالظُّلْمِ وَ الْقَائِلُ بِاَنَّهُ یُكَلِّفُ الْعَبَادَ مَا لَا یُطِیْقُوْنَ فَقَدْ نَسَبَ اِلَیْهِ الْقَبِیْحَ ، وَ الْقَائِلُ بِاَنَّهُ لَا یَقْدِرُ عَلَی اَعْمَالِ عِبَادِهِ وَ ان كل اَعْمَالَهُمْ بِاِرَادَتِهِمْ وَ لَا شَأنَ لَهُ فِیْهَا قَد اِتَهَمَهُ بِالْعَجْزِ۔ [1]

توحید یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنے وہم و گمان کے دائرے میں نہ لائے۔ عدل یہ ہے کہ اللہ کو مورد الزام نہ ٹھہرائے۔ جو یہ کہے کہ اعمال کو اللہ خلق کرتا ہے تو اس نے خدا پر ظلم کا الزام لگایا اور جو یہ کہے کہ خدا غیر مقدور چیزوں کا حکم دیتا ہے تو اس نے خدا کی طرف قبیح کی نسبت دی اور جو یہ کہے کہ اللہ بندوں کے اعمال پر قدرت نہیں رکھتا، یعنی بندے سب اعمال خود اپنے ارادے سے بجا لاتے ہیں، ان میں اللہ کا کوئی عمل دخل نہیں تو اس نے اللہ کو عاجز ٹھہرایا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لَا جَبْرَ وَ لَا تَفْوِیْضَ بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ اَمرین۔ [2]

نہ تو جبر کا نظریہ صحیح ہے اور نہ ہی تفویض کا، بلکہ ان دونوں کے مابین ایک امر ہے۔

فقلت له یا ابن رسول الله (ص) فما امر بین امرین فقال‌وجود السبیل الی اتیان ما امروا به و ترك ما نهوا عنه ۔ [3]

میں نے عرض کیا: فرزند رسول (ص) امر بین امرین کیا ہے؟ فرمایا: جن چیزوں کا حکم ہوا ہے ان کے بجا لانے کا اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان کے ترک کرنے کا امکان موجود ہونا۔

امام علی علیہ السلام سے مروی ہے:

اذا کانت الخطیئة علی الخاطی حتماً کان القصاص فی القضیة ظلماً۔ [4]

اگر خطا کار سے خطا سرزد ہونا قہری ہے تو پھر اس سے قصاص لینا ظلم ہے۔

أ تظن ان الذی نهاك دهاك۔ [5]

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ جس نے تجھے روکا ہے اس نے تجھے دھوکہ دیا ہے۔ (مجبور ہونے کے باوجود روکا ہے۔)

---

[1] مواہب الرحمن ۱: ۱۵۷ [2] بحار الانوار ۴: ۱۹۷

[3] بحار الانوار ۵: ۱۱ [4] متشابہ القرآن ۱: ۲۰۱ [5] الطرائف ۲: ۳۲۹

لو كان الزور فی الاصل محتوما
كان المزور فی القصاص مظلوما[1]

اگر جھوٹی گواہی دینا جبری طور پر سرزد ہوا ہے تو جھوٹی گواہی دینے والے سے قصاص لینا ظلم ہو گا۔

أ يد لك على الطريق و يأخذ عليك المضيق۔[2]

کیا ممکن ہے کہ تجھے راستہ دکھایا جائے پھر تجھ پر راستہ بند کر دیا جائے۔

كل ما استغفرت اللّٰه منه فهو منك و كل ما حمدت اللّٰه عليه فهو منه.[3]

جس پر تو استغفار کرتا ہے وہ تیری طرف سے ہے اور جس پر تو اللہ کی حمد کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

ما استطعت ان تلوم العبد فهو منه و ما لم تستطع ان تلوم العبد عليه فهو من فعل اللّٰه۔[4]

جس کام پر تو بندے کی مذمت کر سکتا ہے وہ اس بندے کی طرف سے ہے اور جس کام پر تو بندے کی مذمت نہیں کر سکتا وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

ما كان من خير فبأمر اللّٰه و ما كان من شر فبعلم اللّٰه لا بأمره۔[5]

جو کار خیر ہے وہ امر خدا سے ہے اور جو شر ہے وہ علم خدا سے ہے، امر خدا سے نہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی مثالیں حق و باطل کی کسوٹی ہیں۔

۲۔ تخلیقی شاہکار جتنا چھوٹا ہوگا اہل بصیرت کی نگاہ میں وہ خالق کی قدرت و عظمت پر اسی قدر زیادہ دلالت کرے گا۔

۳۔ مسئلہ جبر و اختیار میں قرآنی نقطہ نظر یہ ہے کہ عمل کی طاقت اللہ کی طرف سے اور اس طاقت کا استعمال بندے کی طرف سے ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۱: ۱۵۵ ۔ تصحیح الاعتقاد ص ۴۳ ۔ قرب الاسناد ۳ : ۱۵۵ ۔ الکافی ۱ : ۱۵۹۔ الوسائل : ۴۳۔ الطرائف ۲ : ۳۲۹

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ جو (فاسقین) اللہ کے ساتھ محکم عہد باندھنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس (رشتے) کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے اسے قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

---

[1] و [2] بحار الانوار ۵ : ۵۸ [3] بحار الانوار ۵ : ۵۸ [4] الطرائف ۲ : ۳۳۰ [5] متشابہ القرآن ۱ : ۲۰۱

نقض: (ن ق ض) عمارت کا گرانا۔ ہڈی توڑنا۔ رسی توڑنا۔ نیز عہد توڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

میثاق: (و ث ق) وثاقت سے ماخوذ ہے۔ وثاق: وہ رسی جس سے کسی بوجھ کو آسانی اٹھانے کے لیے گٹھا باندھا جاتا ہے۔ بنا برایں یہ لفظ اس عہد کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو آپس میں باندھا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں فاسقین کی تین علامات بتائی گئی ہیں۔

۱۔ عہد شکنی: اس عہد سے مراد فطرت کا عہد بھی ہوسکتا ہے، جس کی توثیق انبیاء علیہم السلام کی طرف سے اتمام حجت کے طور پر ہوئی۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علی، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بارے میں فرماتے ہیں:

لِيَسْتَأْدُوْهُمْ مِيْثَاقَ فِطْرَتِهِ ۔[۱] وہ اللہ کے ساتھ کیے گئے فطری عہد و میثاق کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے۔

۲۔ قطع صلہ: جن سے تعلق اور رشتہ قائم رکھنے کا حکم ہے، فاسقین ان سے تعلق توڑتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور جگہ ارشاد قدرت ہے:

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...[۲] ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا آقا بنا لیا ہے۔

۳۔ فساد فی الارض: زمین پر بسنے والوں کا امن وسکون برباد کرنا ان کا شیوہ رہا ہے اور آج بھی کرۂ ارض پر جہاں کہیں فتنہ وفساد برپا ہے اس میں درپردہ یا ظاہری طور پر فاسقین ہی کا عمل دخل ہے۔

اہم نکات

۱۔ فاسق عہد خدا کو توڑنے اور فساد فی الارض کے نتیجے میں گمراہ ہو کر خسارے میں پڑ جاتا ہے۔

تحقیق مزید: الکافی ۲ : ۶۴۱

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ

۲۸۔ اللہ کے بارے میں تم کس طرح کفر اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے تو اللہ نے

---

[۱] نہج البلاغۃ ۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ ص ۷۶
[۲] ۷ اعراف: ۳۰

يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

نے تمہیں حیات دی، پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر (آخر کار) وہی تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

مسئلہ حیات: زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے اور کیونکر ہوئی؟ یہ ایک سربستہ راز اور پراسرار حقیقت ہے۔ اگرچہ انسان یہ جان چکا ہے کہ غیر نامیاتی عناصر سے نامیاتی مرکب کیسے تیار کیے جاتے ہیں، لیکن یہ راز ابھی تک سینۂ قدرت میں پنہاں ہے کہ یہ نامیاتی مرکبات کس طرح زندہ خلیے بن جاتے ہیں۔

زندگی ایک سربستہ راز ہونے کے علاوہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی ہے۔ توحید پر قائم ہونے والے دلائل میں سے ایک اہم ترین اور وزنی دلیل ہے۔ یہ دلیل چند مقدمات پر مشتمل ہے:

۱۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ مادہ ذاتی طور پر فاقد حیات ہے۔ یعنی خود مادہ ایک مردہ چیز ہے۔

۲۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حیات کا منبع حیات ہی ہے۔ یعنی کسی زندگی کی پیدائش زندہ چیز سے ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر گوشت کو بیرونی حیاتیاتی دنیا سے منقطع اور الگ رکھا جائے تو اس میں کوئی زندگی (کیڑوں وغیرہ کی شکل میں) پیدا نہیں ہو گی۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بے جان چیز کسی اور بے جان کو زندگی نہیں دے سکتی۔

۳۔ ایک اور طے شدہ حقیقت یہ بھی ہے کہ زمین اپنے ابتدائی دور میں قابل حیات نہ تھی۔ اس کا درجہ حرارت اتنا زیادہ تھا کہ کسی حیات کے لیے اس پر زندگی ممکن ہی نہ تھی۔ چنانچہ سائنسی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ابتدا میں روئے زمین پر حیات نہ تھی، بلکہ بعد میں پیدا ہوئی۔

۴۔ دوسرے کرات سے زمین کی طرف زندگی کا منتقل ہونا بھی ممکن نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ شاید بعض شہاب ثاقب دوسرے کرات سے زمین کی طرف زندگی منتقل کرنے کا سبب بنے ہوں۔ لیکن جدید سائنسی پیشرفت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ تاہم جدید تحقیقات کے ذریعے اگر ثابت ہو جائے کہ زمین پر زندگی دوسرے کرات سے آ سکتی ہے تو یہی سوال دوسرے کرات کے لیے بھی پیدا ہو گا اور وہاں بھی زندگی کا منبع لامحالہ زندگی ہی کو فرض کرنا پڑے گا۔

ان چار باتوں کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوئی؟ اور روئے زمین پر زندگی کو کس نے پیدا کیا؟

کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس راز سے اب تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ زندگی کی کوئی توجیہ

اب تک سامنے نہیں آئی، سوائے اس کے کہ ”زندگی کو اللہ نے پیدا کیا“۔

بعض اہل تحقیق کو اس قسم کا استدلال پسند نہیں ہے جو مجہولات پر مبنی ہو۔ چونکہ حیات ایک سربستہ راز ہے، اس کے وجود میں آنے کی فزیکل توجیہ معلوم نہیں ہو سکی تو اس مجہول کی جگہ اللہ کو رکھا جاتا ہے۔

چنانچہ قدیم انسانوں کو بہت سے مظاہر قدرت کا راز معلوم نہ تھا۔ مثلاً بارش، زلزلہ وغیرہ تو وہ اس مجہول راز کی جگہ اللہ کو رکھتے اور اس سے خدا کے وجود پر استدلال کرتے۔ آج راز منکشف ہونے کی صورت میں کیا یہ وجود خالق سے بے نیاز ہوتے؟ اگر کل راز حیات انسان پر منکشف ہو جائے تو کیا حیات، وجود خدا پر دلیل نہیں رہے گی۔

ہماری نظر میں راز حیات منکشف ہونے کی صورت میں یہ راز اس بات پر بہتر اور زیادہ واضح دلیل بنے گا کہ اس تخلیق کے پیچھے ایک ذی شعور ارادہ کارفرما ہے۔

چنانچہ ۲۶ جون ۲۰۰۰ ء کو انکشافات کی تاریخ کا اہم ترین دن قرار دیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ اس روز سینۂ کائنات میں پوشیدہ ایک راز ”راز حیات“ سے پردہ اٹھ گیا اور انسانی D . N . A[1] میں تین ارب سالموں کی منظّم ترتیب کے ذریعے جینیاتی کوڈ کا معمہ حل ہو گیا۔

تمام زندہ موجودات کے لیے جبلی ہدایات اللہ تعالیٰ نے خلیات (cells) کے مرکزی حصے D.N.A میں ودیعت فرمائی ہیں جو تین ارب نہایت چھوٹے سالموں پر مشتمل ہے اور حیات کا راز انہیں سالموں میں پوشیدہ ہے۔

واضح رہے کہ انسانی جسم کے اندر ۱۰۰ کھرب خلیات ہیں اور ہر خلیے میں ایک مرکزہ اور ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں۔ ہر کروموسوم ایک لمبے دھاگے کی طرح ہے، جس کی لمبائی چھ قدم ہے اور اسے خیط الحیات (زندگی کی تار) کہ سکتے ہیں۔ یہ دھاگہ ان جزئیات سے بنتا ہے جنہیں D.N.A یا زندگی کی بنیادی اینٹ کہتے ہیں۔ انسانی جسم کے ۱۰۰ کھرب خلیات میں موجود ان دھاگوں کو جوڑ دیا جائے تو آٹھ ہزار مرتبہ چاند سے ہو کر واپس آ سکتے ہیں۔ ہر D.N.A میں تین ارب سالمے موجود ہیں جن کی ترتیب و تنظیم سے حیات وجود میں آتی ہے۔

D.N.A کے کئی سیکشن ہوتے ہیں جنہیں جین (gene) کہتے ہیں اور جین ہی میں وہ بنیادی نقشہ ہوتا ہے، جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

انسان کو آگے جو کچھ بننا ہے یا جس بیماری میں اسے مبتلا ہونا ہے، وہ اس جین میں کمپیوٹر کے ایک کوڈ کی طرح ملفوف ہوتا ہے۔

ڈی۔ این۔ اے میں موجود تین ارب سالموں کی ”منظّم ترتیب“ سے وجود خالق پر ایک یقینی برہان وجود میں آتی ہے۔

---

[1] Deoxyribo Nucleic Acid کا مخفف۔

چنانچہ ایک مغربی مفکر اسے یوں بیان کرتا ہے:

دس ٹوکنوں پر ایک سے دس تک نمبر لگائیں۔ پھر انہیں اپنی جیب میں ڈال کر خوب ہلائیں۔ اس کے بعد ترتیب کے ساتھ جیب سے نکالیں۔ جس ٹوکن کو جیب سے نکالا گیا ہے، اسے دوبارہ جیب میں ڈال کر ہلائیں پھر دوسری بار دوسرا ٹوکن نکالیں۔ اس طرح نمبر ایک ٹوکن اتفاقیہ طور پر نکلنے کا امکان دس میں سے ایک ہے اور ایک اور دو نمبر ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک سو میں سے ایک ہے۔ ایک، دو اور تین ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک، دو، تین اور چار کا ترتیب سے نکل آنے کا احتمال دس ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک، دو، تین، چار اور پانچ کا ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا امکان ایک لاکھ میں سے ایک ہے۔ اس طرح ایک سے لے کر دس تک ترتیب کے ساتھ اتفاقیہ طور پر نکل آنے کا احتمال دس ارب میں سے ایک ہے۔

چنانچہ تین نمبروں کا اتفاقاً ترتیب سے آنے کا امکان کم ہونے کی وجہ سے یہی ترتیب آپ کے بریف کیس کا تالہ بھی بن جاتی ہے۔

اس سادہ مثال کے بعد انسانی خلقت پر ایک نظر ڈالیں کہ انسان کئی ملین cells کی ترتیب و ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ یعنی اربوں ٹوکنوں کو ترتیب کے ساتھ رکھنے سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اب سوچئے کہ دس ٹوکن اتفاقیہ طور پر ترتیب کے ساتھ نکل آنے کے لیے اتفاقیہ کو دس ارب میں سے ایک حصہ ملتا ہے۔ اگر یہ ٹوکن کئی میلین ہوں تو ان میں اتفاقیہ کا حصہ کیا ہوگا؟ جواب صفر ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ اگر ان اربوں ٹوکنوں میں سے ہر ایک ٹوکن کے اندر موجود ٹوکنوں کی تعداد تین ارب ہو تو ان کا اتفاقاً ایک ''منظّم ترتیب'' میں آنے کا امکان صفر سے کئی بار نیچے رہ جائے گا۔ اس سے یقین آجاتا ہے کہ ان سالموں کے منظّم ترتیب سے آنے کے لیے اتفاق کا کوئی امکان نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک قصد و ارادہ کارفرما ہے۔

یہاں ان جدید انکشافات پر قدیم سوال پھر لوٹ آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کی تمام صلاحیتیں اس کے cells میں ودیعت فرمائی ہیں تو نیک و بد ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے، بلکہ انسان اپنے خلیوں میں اللہ کی طرف سے ودیعت شدہ خصوصیات کے تابع ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہے اور اپنے ارادے کے تابع نہیں ہے کہ خودمختار ہو جائے۔ یعنی اس سے خیرہ و شرہ من اللّٰہ یعنی نظریہ جبر ثابت ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ خاصیتیں تقاضے کی حد تک ضرور مؤثر ہیں، جبر کی حد تک نہیں۔ دوسرے لفظوں

میں یہ خاصیتیں مقتضی ہیں، علت تامہ نہیں۔چنانچہ جدید تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جمالیاتی ذوق، احسان دوستی، آ گاہ طلبی اور خدا پرستی کے رجحانات انسانی فطرت میں ودیعت فرمائے گئے ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان اپنے فطری تقاضوں اور جبلی رجحانات پر عمل کرنے پر مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اس سے انحراف کر جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب فطری تقاضوں پر ان کے منافی خصائل غالب آ جائیں۔ مثلاً ناداروں پر احسان کی جگہ یہ منفی رجحان غالب آ جائے کہ غریبوں کا خون چوس کر بھی اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس قسم کے جبلی خصائل کی وجہ سے انسان کا عزم و ارادہ اور نیک و بد کی تمیز اس سے سلب نہیں ہوتی، بلکہ انسان کے اندر موجود منفی رجحانات کے مقابلے میں ایک مثبت رجحان فطرت کی طرف سے اس پر حجت پوری کر رہا ہوتا ہے۔ یہی مثال دوبارہ سامنے رکھیے کہ غریبوں کا خون چوسنے والے کے ضمیر اور وجدان میں موجود ایک مخالف رجحان اس کی مذمت کرتا ہے اور اپنے ضمیر کی عدالت میں اسے سزا ملتی ہے، جسے ہم ضمیر کی ملامت کہتے ہیں۔

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ میں طنزیہ استفہام ہے کہ یہ بات کس قدر نامعقول ہے کہ تم اللہ سے کفر اختیار کرتے ہو، جس نے تمہیں مردہ سے زندہ بنایا۔

اہم نکات

۱۔ زندگی (حیات) ایک سربستہ راز ہے اور اللہ کے وجود اور توحید کے محکم دلائل میں سے ایک اہم اور وزنی دلیل ہے۔

۲۔ حیات کی تخلیق صرف حیات ہی سے ممکن ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ٭ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾

۲۹۔وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کا رخ کیا تو انہیں سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

اسۡتَوٰی: (س و ی) ہر طرف سے احاطہ کرنا اور کسی عمل پر استقرار۔ جب اس لفظ کے ساتھ اِلَی آئے

تو اس کا معنی ہے ''خود کسی چیز تک پہنچ جانا'' یا ''اس کا قصد و ارادہ اور تدبیر کرنا''۔ اسی لیے ہم نے اسْتَوٰٓی کا ترجمہ ''قصد'' کیا ہے۔

سوّٰی: (س و ی) حکمت و تدبیر سے کسی چیز کو درست کرنا: الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ ...[1]

عَلِیۡمٌ: (ع ل م) عالم کا صیغہ مبالغہ۔ کسی عالم کے بارے میں جب یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ زیادہ اور خوب جاننے والا ہے تو اسے علیم کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

الٰہی تصور کائنات کے مطابق انسان مخدوم کائنات ہے۔ وہ صرف بندۂ زر نہیں اور نہ ہی اقتصادی عوامل اور پیداواری وسائل کا غلام ہے۔ الٰہی انسان سے تو یہ خطاب ہوتا ہے: هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ...۔

وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ...[2] — جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔

وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ ...[3] — اور اسی نے ہمیشہ چلتے رہنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔

الٰہی انسان کی عزت و تکریم کے بارے میں فرمایا:

وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ ...[4] — اور بتحقیق ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم سے نوازا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

خُلِقَ لَکُمْ لِتَعْتَبِرُوْا بِهِ وَ تَتَوَصَّلُوْا بِهِ اِلٰی رِضْوَانِهِ وَ تَتَوَقَّوا مِنْ عَذَابِ نِیْرَانِه۔[5] — یہ سب کچھ تمہارے لیے خلق ہوا ہے تاکہ تم اس سے عبرت حاصل کرو اور اسے اللہ کی خوشنودی کا وسیلہ بناؤ اور اس کے ذریعے آتش جہنم سے بچنے کا سامان مہیا کرو۔

اس آیت سے منابع ارضی کی حلیت کا قانون بنتا ہے، جس کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں خلق فرمایا: خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ ..[6]۔ اس کے بعد زمین کو اس پر بسنے والوں کے لیے مسخر کیا اور چار دن میں اسے قابل استفادہ بنا دیا: وَ قَدَّرَ فِیۡہَاۤ اَقۡوَاتَہَا فِیۡۤ اَرۡبَعَۃِ اَیَّامٍ ...[7]

اس کے بعد آسمانوں کی خلقت کا مرحلہ آتا ہے: ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ ...[8] ''پھر آسمان کا قصد کیا۔'' البتہ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰىہَا ۔[9] سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو آسمان کے بعد بنایا۔

---

[1] ۸۲ انفطار: ۷ [2] ۴۵ جاثیہ: ۱۳ [3] ۱۴ ابراہیم: ۳۳ [4] ۱۷ اسراء: ۷۰ [5] تفسیر امام حسن عسکریؑ ص ۲۱۵
[6] ۴۱ حم سجدہ: ۹۔ زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ [7] ۴۱ حم سجدہ: ۱۰۔ اور اس میں چار دنوں میں سامان خوراک مقرر کیا۔
[8] ۴۱ حم سجدہ: ۱۱ [9] ۷۹ نازعات: ۳۰۔ اور اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا۔

دونوں آیات سے مجموعی طور پر جو مطلب سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو خلق فرمایا، پھر آسمانوں کا قصد کیا اور انہیں سات آسمانوں کی شکل میں مرتب کیا۔اس کے بعد زمین کو دحو کیا۔

عام طور پر دحو کا ترجمہ ''بچھانا'' کیا جاتا ہے۔اس صورت میں ترتیب کار یہ ہے:

۱۔زمین کی خلقت۔

۲۔آسمانوں کی خلقت۔

۳۔زمین کا بچھانا۔

راغب نے مفردات میں دحو کا یہ معنی بیان کیا ہے: ازالها عن مقرها۔ زمین کو اس کے ٹھکانے سے ہٹا دیا۔اس صورت میں ترتیب عمل اس طرح ہو گی:

۱۔زمین کی خلقت۔

۲۔آسمانوں کی خلقت۔

۳۔زمین کو مدار میں چھوڑنا، اسے حرکت دینا۔ یعنی زمین کی خلقت آسمانوں سے پہلے ہوئی مگر اسے اصل جگہ سے ہٹا کر حرکت دینے کا عمل بعد میں انجام پایا۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ان آیات میں آسمانوں کے لیے جمع کا صیغہ سَمٰوٰت ذکر کیا گیا ہے جب کہ زمین کے لیے مفرد کا صیغہ الۡاَرۡض ذکر ہوا ہے۔صرف ایک جگہ آسمانوں کے ذکر کے بعد زمین کا ذکر وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ ...[1] کی تعبیر کے ساتھ آیا ہے، جس میں اس بات کی صراحت موجود نہیں ہے کہ زمینیں بھی سات ہیں، کیونکہ مِثۡلَہُنَّ میں تعداد کے لحاظ سے مِثلیّت ضروری نہیں بلکہ ممکن ہے کہ عناصر تخلیق یا دیگر جہات میں مِثلیّت مراد ہو۔

سات آسمانوں کے بارے میں ہماری معلومات نہایت محدود ہیں۔ قدیم زمانے میں کچھ حضرات نے بطلیموسی تصور افلاک کی روشنی میں سات آسمانوں کی توجیہ سات سیاروں کے ساتھ کی ہے۔

واضح رہے کہ اولاً تو بطلیموسی تصور افلاک صد درصد باطل ثابت ہوا ہے۔ ثانیاً ہمارے پورے نظام شمسی کو کائنات کے اس حصے میں بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں جو ہمارے مشاہدے میں آ چکا ہے اور کائنات کا وہ حصہ جو ہمارے مشاہدے میں نہیں آیا اس کا اندازہ کرنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کائنات میں اگر ہمارا پورا نظام شمسی تباہ ہوجاتا ہے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے ایک چیونٹی کسی کے پاؤں تلے آ کر ہلاک ہوجائے۔ لہٰذا یہ تصور مضحکہ خیز ہے کہ سات آسمانوں سے مراد سات سیارے ہیں۔

سات آسمانوں میں سے کسی ایک آسمان کے بارے میں بھی اگر کچھ تفصیل ہمیں معلوم ہوجاتی تو باقی آسمانوں کے بارے میں ایک اجمالی تصور قائم کرنا ممکن ہوتا۔ روایات میں بھی آسمان اول، دوم، سوم تا

---

[1] ۶۵ طلاق: ۱۲

آخر کا ذکر آتا ہے، لیکن کسی آسمان کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔

البتہ قرآن میں تین آیات ایسی ہیں جن سے آسمان اول کی تشخیص میں کچھ مدد ملتی ہے:

پہلی آیت: اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِۣ الۡکَوَاکِبِ ۙ[1] ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا،

دوسری آیت: وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ...[2] اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا۔

تیسری آیت: وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ...[3] اور بے شک ہم نے قریب ترین آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے آراستہ کیا۔

ان آیات سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جو ستارے اور کہکشائیں انسان کے مشاہدے میں آئی ہیں، وہ سب سات آسمانوں میں سے صرف آسمان اول السَّمَآءَ الدُّنۡیَا سے متعلق ہیں۔ اس مؤقف کے مطابق آسمان اول کی وسعت کا اندازہ کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ بعض کہکشاؤں سے روشنی چلے ہوئے اربوں سال گزر چکے ہیں، لیکن ہنوز ہم تک نہیں پہنچی۔ یاد رہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکینڈ ہے۔ لہٰذا دیگر آسمانوں کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

اہم نکات

۱۔ انسان مخدوم کائنات ہے۔

۲۔ نظام کائنات توحید کی مستحکم ترین دلیل ہے۔

تحقیق مزید: تفسیر الامام ص ۲۱۵۔ عیون اخبار الرضا ۲: ۱۲

وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزی کرے گا؟ جبکہ ہم تیری ثنا کی تسبیح اور تیری پاکیزگی کا ورد کرتے رہتے ہیں، (اللہ نے) فرمایا: (اسرار خلقت بشر کے بارے میں) میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

۱۔ ۳۷ صافات: ۶　　۲۔ ۴۱ حم سجدہ: ۱۲　　۳۔ ۶۷ ملک: ۵

تشریح کلمات

ملائکۃ: ملك کی جمع ہے اور الوك سے ماخوذ ہے۔ اَلَكَ لِیْ وَ اَلَكَنِیْ اَیْ اَرْسَلَنِیْ یعنی پیغام رسانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر فرشتے اللہ کے پیغامات دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لیے انہیں ملك کہا جاتا ہے۔ وجود ملائکہ پر قدیم فلاسفہ نے بھی ''امکان اشرف'' کے عنوان سے استدلال کیا ہے۔ فرشتے چونکہ غیر مادی مخلوق ہیں، اس لیے ان میں کسی قسم کی نامطلوب خواہشات نہیں ہوتیں اور نہ یہ قابل امتحان و آزمائش ہوتے ہیں۔ مزید برآں یہ ارتقا و تکامل کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔ فرشتے معصوم ہوتے ہیں۔ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ ...[1] کیونکہ عصیان کا مادہ (تضاد، خواہشات) ان میں نہیں ہوتا۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے نیک اعمال کے نتیجے میں فرشتوں کی اس نوری جماعت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یعنی یہ وقتاً فوقتاً خلق ہوتے رہتے ہیں۔

خلیفۃ: (خ ل ف) جانشین، نائب، کسی کی طرف سے اس کے امور کو انجام دینے والا۔ خَلَفَ فَلَانٌ فَلَانًا اَیْ قَامَ بِالْاَمْرِ عَنْہُ۔

سفك: (س ف ك) ناحق خون بہانا۔

تسبیح: (س ب ح) ہر قسم کی آلودگی سے پاک و منزہ قرار دینا۔ اصل میں تسبیح تیزی سے گزرنے کو کہتے ہیں اور کسی سے برائی کو دور قرار دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عبادت سریع بھی مراد لی جاتی ہے: اَلسَّرِیْعُ فِی عِبَادَۃِ اللّٰہِ۔ (راغب)

تقدیس: (ق د س) پاکیزگی کی گواہی دینا۔

تفسیر آیات

خلافت الٰہیہ: اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ روئے زمین پر ایک مکلّف مخلوق امتحان و آزمائش کے لیے بھیجی جائے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ احسن عمل کا امتیازی نشان کون حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ حکمت و رحمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اس مخلوق کے بسنے سے پہلے اس کی ہدایت و راہنمائی کا انتظام کیا جائے تاکہ یہ لوگ زمین میں اپنی نیابت و خلافت کی ذمہ داری کے اہل ثابت ہو جائیں۔ لہٰذا اس مخلوق کی خاطر مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ...[2] خلق فرمایا اور وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا ... [3] نیز عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ... [4] کے ذریعے مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ .... [5] اور وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ... [6] کو اس کے لیے مسخر کر کے اس کے اندر مختلف اور متضاد خواہشات ودیعت فرمائیں۔

---

[1] ۶۶ تحریم: ۶ ''اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔''　[2] ۲ بقرۃ: ۲۹　[3] ۲ بقرۃ: ۳۱۔ اللہ نے آدمؑ کو تمام نام سکھا دیے۔

[4] ۹۶ علق: ۵۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔　[5] ۳۱ لقمان: ۲۰۔　[6] ۶ انعام: ۹۶

پھر اس مخلوق کو ارتقا و تکامل کے قابل بھی بنا دیا۔ اس کے بعد کسی مصلحت و حکمت کے تحت فرشتوں کو آگاہ فرمایا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ ملکوت اعلیٰ میں اعلان ہو گیا کہ اس نائب کی خلقت ہونے والی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلْحُجَّۃُ قَبْلَ الْخَلْقِ وَ مَعَ الْخَلْقِ وَ بَعْدَ الْخَلْقِ۔[1]

حجت خدا خلقت سے پہلے، خلقت کے ساتھ اور خلقت کے بعد بھی ہے۔

خلیفہ کے بارے میں مفسرین کے چند اقوال ہیں:

۱۔ زمین پر پہلے کچھ فرشتے یا جن بستے تھے۔ جب اللہ نے ان کی جگہ آدم (ع) کو خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بولے: ہم آپ کی تقدیس و تسبیح کرتے ہیں تو اس نئی مخلوق کو آپ کس حکمت کے تحت خلیفہ بنا رہے ہیں۔

۲۔ اولاد آدم نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے کی جانشین ہو گی، اس لیے آدم (ع) کو خلیفہ کہا گیا۔

۳۔ حضرت آدم (ع) زمین پر اللہ کی طرف سے خلیفہ اور اللہ کے نمائندہ ہیں۔

ان تین اقوال میں سے آخری قول درست ہے اور اس کی تائید میں متعدد آیات بھی پیش کی جاتی ہیں:

وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَ رَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰکُمۡ ۔۔۔[2]

اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض پر بعض کے درجات بلند کیے تاکہ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں وہ تمہیں آزمائے.

انسان کے خلیفۃ اللّٰہ ہونے کی دو صورتیں ممکن ہیں:

پہلی صورت: انسان عالم شہود و عیاں اور محسوس دنیا میں اللہ کا جانشین ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود عالم ناسوت یعنی محسوس میں نہیں آ سکتا، لہٰذا انسان کی شکل میں اللہ نے تجلی فرمائی، اس لیے انسان کو خلیفہ فرمایا۔

دوسری صورت: یہ ہو سکتی ہے کہ زمین کو نور خدا سے روشن کرنے اور اہل ارض کو اپنی طرف دعوت دینے کے لیے اللہ نے انسان کو اپنا جانشین بنایا۔ اس صورت میں ہادیان برحق ہی خلیفۃ اللّٰہ ہو سکتے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تسبیح و تقدیس کے استدلال کے جواب میں عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا کہ کر آدم (ع) کے علم کو پیش کیا۔ یہ بات دوسرے دو نظریات سے مناسبت نہیں رکھتی۔ لہٰذا حضرت آدم (ع) رسول اور نبی ہونے کے لحاظ سے ذاتی طور پر اللہ کے نمائندہ اور حجت خدا ہیں اور ابو البشر ہونے کے ناطے من حیث النوع بھی خلیفۃ اللّٰہ فی الارض ہیں۔

---

[1] اصول الکافی ۱: ۱۷۷	[2] ۶ انعام: ۱۶۵

عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام علم ودانش میں برتری کی وجہ سے خلافت الٰہیہ کے مقام پر فائز ہوئے۔ بنابریں وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تسبیح وتقدیس پر علم کو فضیلت حاصل ہے: مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ سے معلوم ہوتا ہے کہ متضاد صفات والی اس متحول مخلوق کو علم و قابلیت دینے کی راہ میں فساد وخون خرابہ حائل ہو تو بھی علم کی فضیلت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

علم ملائکہ: فرشتوں کو کیسے علم ہوا کہ بنی نوع انسان کی خلافت سے روئے زمین پر فساد وخون خرابہ ہوگا؟ یہاں عموماً چند جوابات دیے جاتے ہیں:

۱۔ فرشتے زمین پر چلنے والی سابقہ مخلوقات میں اس بات کو دیکھ چکے تھے۔

۲۔ خدا نے انہیں پہلے بتا دیا تھا۔

۳۔ ملائکہ خود سمجھ گئے تھے کہ مادی مخلوق متضاد اور مختلف قوتوں کی مالک ہوتی ہے۔ اس میں اگر جذبہ ایثار ہے تو جذبہ انتقام بھی موجود ہے۔ رحم کا مادہ پایا جاتا ہے تو غضب کی خصلت بھی پنہاں ہے۔ لہٰذا روئے زمین پر مختلف خواہشات کی جنگ رہے گی اور یہ مخلوق مفادات کے ٹکراؤ کی صورت میں ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہے گی، کیونکہ زندگی تو اجتماعی ہی ہوسکتی ہے، انفرادی زندگی ممکن نہیں ہے۔

ملائکہ کا یہ خیال تھا کہ خلقت کا واحد مقصد تسبیح و تقدیس ہے، جسے وہ بطریق احسن انجام دے رہے ہیں ۔ ارشاد قدرت ہوا: اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ فرشتوں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مقصد خلقت ان کے اس عمل تک محدود نہیں، بلکہ مطلوب خالق کچھ اور ہے۔

اہم نکات

۱۔ تسبیح و تقدیس پر علم کو برتری حاصل ہے۔

۲۔ انسان کو اللہ نے ابتدا ہی سے انسان خلق کیا ہے۔ وہ ارتقائے انواع کے تسلسل کی ایک کڑی نہیں ہے، جیسا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا ہے۔

۳۔ روئے زمین پر انسان کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا اور اسے ایک دیرینہ اور ازلی دشمن اور اس کے ناپاک عزائم سے آگاہ کر دیا گیا۔

۴۔ شجرۂ ممنوعہ سے لغزش اور ابلیس کے دھوکے سے آزمائشوں کا آغاز ہوا۔

۵۔ آزمائش میں کامیابی کا معیار علم اور حسن عمل ہے۔

۶۔ خلیفہ کے انتخاب کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

تحقیق مزید: بحار الانوار ۲ : ۲۱۰۔ ۴ : ۱۹۹۔ شواہد التنزیل ۱ : ۹۷ الاحتجاج ۲۱۴۔ کمال الدین ۱ : ۴۔ ۱۱ نہج الحق ص ۲۱۱۔ تفسیر العیاشی ۱ : ۳۳۔ الخصال ۲ : ۲۶۳۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور (اللہ نے) آدم کو تمام نام سکھا دیے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔

تشریح کلمات

اٰدَمَ: (ا د م) ابو البشر کا نام ہے۔ اس کا معنی ہے "گندم گوں"۔ آدم کا رنگ یہی تھا۔ شاید اسی لیے انہیں اس نام سے پکارا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد وہ دجلہ و فرات کے درمیان آباد ہوئے۔

عرض: (ع ر ض) باز خوانی۔ الاظہار علی الغیر۔ دوسرے کے سامنے پیش کرنا۔

تفسیر آیات

فرشتوں کی حیرت و استعجاب پر اللہ کے اجمالی جواب: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے بعد اب تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے۔ اس جواب میں آدم (ع) کو خلافت الٰہیہ کے عظیم منصب پر فائز کرنے کا راز بھی مذکور ہے۔

تعلیم اسماء: مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو چیزوں کے نام اور زبان سکھائی وغیرہ۔ لیکن اگر اسم کے معنی پر غور کیا جائے تو مطلب حل ہو جاتا ہے۔ اسم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی ذات پر دلالت کرے۔ یعنی اسم وہ ہوتا ہے جو مسمی بتائے۔ اَلْاِسْمُ مَا یُعْرَفُ بِهٖ ذَاتُ الشَّیْءِ (راغب)۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو کسی موجود کی نشاندہی کرے، وہ اسم ہے۔ اس لحاظ سے اسم کی دو قسمیں بنتی ہیں:

۱۔ تکوینی اسم: اس میں وہ تمام موجودات شامل ہیں جو کسی اور ذات پر دلالت کریں۔ کیونکہ بعض موجودات کسی اور ذات پر اجمالاً دلالت کرتی ہیں، یہ بھی اسماء ہیں اور بعض واضح طور پر دلالت کرتی ہیں، یہ بھی اسماء ہیں۔ جو اسماء ذات الٰہی پر واضح دلالت کریں انہیں اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے محمد و آل محمد علیہم السلام اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے کامل ترین مصادیق ہیں۔ چنانچہ بعض روایات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ ذوات مقدسہ اسمائے

حسنیٰ میں شامل ہیں۔

۲۔ لفظی اسم: اس میں الفاظ، اشارات اور کنایات وغیرہ شامل ہیں جو قراردادی، اعتباری اور وضعی لحاظ سے کسی چیز پر دلالت کرتے ہیں۔

لفظ الاسماء مطلق ہے۔ لہٰذا اس میں ہر قسم کا اسم شامل ہے۔

فَالْمُرَادُ بِهَا كُلُّ اِسْمٍ يَقَعُ لِمُسَمًّى وَ لَا تَقْيِيْدَ وَ لَا عَهْدَ۔[1]

پس ان اسماء سے مراد ہر وہ اسم ہے جو کسی مسمی کو بتائے۔ چونکہ یہاں نہ کوئی قید ہے، نہ کسی خاص اسم کی طرف اشارہ ہے۔

نیز ثُمَّ عَرَضَهُمْ میں هُمْ کی ضمیر موجود ہے، جو عقل و ادراک رکھنے والوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر مفسرین یہ استنباط کرتے ہیں کہ یہ اسماء ایسی زندہ موجودات ہیں جو صاحبان عقل و ادراک ہیں:

اِنَّ هَذِهَ الْاَسْمَاءَ اَو اَنَّ مُسَمَّيَاتِهَا كانوا مَوْجُوْدَاتٍ اَحيَاءً عُقَلَاءَ مَحْجُوبِيْنَ تَحْتَ حَجَابِ الْغَيْبِ.[2]

یہ اسماء یا مسمیات ایسی موجودات تھیں جو زندہ اور عاقل تھیں اور حجاب غیبی کے تحت مستور تھیں۔

ہوسکتا ہے کہ ان اسماء سے مراد زمین پر اللہ کے خلفاء ہوں:

لِيَكُوْنَ آدَمُ عَلٰى بَصِيْرَةٍ مِنْ اَمْرِهِ مِنْ اَنَّ الْاَرْضَ اَرْضُهُ و الْبَشَرَ نَسْلُهُ وَ الْخُلَفَاءَ مِنْ ذُرِّيَتِهِ لَا سِيِّمَا سَيِّدُهُمْ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ[3]

تاکہ آدم (ع) کو اچھی طرح علم ہو جائے کہ یہ زمین اس کی ہے اور بشر اس کی نسل سے ہے اور خلافت اس کی ذریت میں سے ہے، خاص طور پر سید البشر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔

اس نظریے کی تائید میں وہ مشہور حدیث پیش کی جاتی ہے جو فریقین سے مروی ہے:

كُنْتُ نَبِيّاً وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَ الطِّيْنِ۔[4]

میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔

چنانچہ خود قرآن بھی گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسل آدم سے، عالم ناسوت میں آنے سے پہلے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ[5]

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

---

[1] المیزان ۱: ۱۱۷　[2] حوالہ سابق ۱: ۱۱۶　[3] مواہب الرحمن　[4] بحار الانوار ۱۶: ۴۰۲ باب ۱۲۔　[5] ۷ اعراف: ۱۷۲

ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ ''پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔'' پیش کرنے کا مطلب شاید یہ ہو کہ پردہ غیب کو ہٹا کر ان حقائق کے بارے میں سوال کیا ہو جن کی تعلیم حضرت آدم (ع) کو دی تھی۔

اہم نکات

۱۔ انسان تمام حقائق کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا۔

۲۔ محمد و آل محمد علیہم السلام اسمائے حسنیٰ کے کامل ترین مصادیق ہیں۔

تحقیق مزید: تفسیر العیاشی ۱: ۳۳۔ کمال الدین ۱: ۱۳۔ المستدرک ۹: ۳۲۴۔ الدر المنثور ۱: ۱۰۱۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ فرشتوں نے کہا: تو پاک و منزہ ہے، جو کچھ تو نے ہمیں بتا دیا ہے ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، یقیناً تو ہی بہتر جاننے والا، حکمت والا ہے۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ (اللہ نے) فرمایا: اے آدم! ان (فرشتوں) کو ان کے نام بتلا دو، پس جب آدم نے انہیں ان کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں خوب جانتا ہوں نیز جس چیز کا تم اظہار کرتے ہو اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو وہ سب جانتا ہوں۔

تفسیر آیات

فرشتوں نے اپنی عاجزی اور لاعلمی کا اظہار کیا اور ضمناً آدمؑ کی فضیلت کا اقرار بھی۔ چنانچہ جواب میں بولے: سُبۡحٰنَکَ ۔ یہ توبہ و استغفار کا مقام ہے۔ تو ہر اس چیز سے پاک و منزہ ہے جو قبیح، نامناسب اور خلاف عدل ہو۔ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا یوں اپنی کم مائیگی کا اعتراف بھی کیا۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۔ چنانچہ حضرت آدمؑ نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیے اور استاد ملائکہ ثابت ہوئے۔ کیونکہ فرشتوں کو یہ نام یا یہ پوشیدہ راز خداوند عالم نے خود نہیں سکھائے، بلکہ حضرت آدم (ع) نے بحکم خدا یہ نام انہیں سکھا دیے۔

یہاں سے خلافت الٰہیہ کے فرائض کا آغاز ہوا اور یہ رسالت، تعلیم ملائکہ سے شروع ہوئی۔ اس

طرح یہ بات بھی سامنے آئی کہ خلافت الٰہیہ کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ تعلیم و تربیت ہے نیز یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ خلافت الٰہیہ کے شعبۂ تعلیم و تربیت کا دائرہ انسان، جنات اور ملائکہ تک کو شامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے خلیفہ کا علم فرشتوں کے علم سے زیادہ ہوتا ہے، بلکہ وہ فرشتوں کا معلم ہوتا ہے۔

۲۔ تسبیح و تقدیس توبہ و استغفار کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ تعلیم و تربیت خلافت الٰہیہ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

۴۔ خلافت الٰہیہ کے شعبۂ تعلیم و تربیت کا دائرہ انسان، جنات اور ملائکہ سب کو شامل ہے۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی وَ اسۡتَکۡبَرَ ٭۫ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

تشریح کلمات

سجدہ: (س ج د) اپنے آپ کو پست کرنا۔ خضوع کرنا۔ خاک پر پیشانی رکھنا۔

بلیس: (ب ل س) ابلیس یعنی شیطان ایک غیر مرئی مخلوق ہے۔ یہ لفظ عربی نہیں۔ بہرکیف اگر عربی ہے تو اس کی اصل ابلس ہے۔ یعنی غمگین، انکار اور مایوسی۔

تفسیر آیات

خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز ہونے کے بعد سب سے پہلے آدم (ع) نے بحکم خدا فرشتوں کو علم الاسماء کی تعلیم دی۔ پھر فرشتوں کو حکم ملا کہ وہ آدم (ع) کو سجدہ کریں۔ سجدہ اگر بقصد ربوبیت ہو تو یہ عبادت ہوگی۔ اگر قصد ربوبیت نہ ہو، لیکن بقصد تعظیم و تکریم سجدہ کیا جائے تو یہ تحیہ و تسلیم ہے اور اگر قصد استہزاء یہ عمل انجام دیا جائے تو تمسخر ہے۔

اسلامی تعلیمات میں توحیدی ذوق غالب ہونے کی وجہ سے غیر اللہ کے لیے یہ عمل سجدہ درست نہیں سمجھا جاتا۔

سجدہ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے ایک تذلل و تواضع ہے: وَّ النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ ۔[1] ظاہر ہے کہ نجم اور شجر کا سجدہ خاک پر پیشانی رکھنے والا سجدہ تو نہیں ہو سکتا۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ

---

[1] ۵۵ رحمٰن: ۶۔ اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔

يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ ... ۔[1]

اس ضمن میں تحقیق یہ ہے کہ بقول راغب : اَلسُّجُوْدُ اَصْلُهٗ اَلتَّطَامُنُ وَ التَّذَلُّل اصل میں سجدہ فروتنی و عاجزی کا عملی اظہار ہے۔ تذلل وخضوع ایک جامع معنی ہے، جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے انسان کی طرف سے تذلل وخضوع کے اظہار کا سب سے واضح اور کامل نمونہ خاک پر پیشانی رکھنا ہے۔ دوسری مخلوقات کے سجدے اپنی اپنی ہیئت وضع کے مطابق ہوں گے۔

فرشتوں نے حضرت آدم (ع) کو جو سجدہ کیا وہ اولاً تو بقصد ربوبیت نہیں تھا جو عبادت شمار ہوتا اور اس سجدے کی وجہ سے شرک لازم آتا۔ ثانیاً یہ حکم خدا وندکریم کی طرف سے ہوا، لہٰذا اس کی تعمیل میں کیا جانے والا سجدہ شرک نہیں ہوسکتا، چاہے اس سجدے کا رخ حضرت آدمؑ کی طرف ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن عبادت میں خانہ کعبہ مقصود نہیں ہوتا۔

بعض معاصر مفسرین کا نظریہ ہے کہ حضرت آدم (ع) کے لیے سجدہ ان کی علمی فضیلت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ فرشتوں کا امتحان مقصود تھا۔

یہ نظریہ اس لیے درست نہیں کہ فرشتوں کا امتحان لینا معقول نہیں۔ امتحان تو اس کا لیا جاتا ہے جو مختلف متضاد خواہشات کا مالک اور تکامل و ارتقا کی استعداد رکھتا ہو اور نافرمانی پر قادر ہو۔ جب کہ فرشتے نہ تو مختلف خواہشات رکھتے ہیں، نہ ارتقا کی استعداد اور نہ ہی نافرمانی پر قادر ہیں۔ چنانچہ خود معاصر آگے لکھتے ہیں: امتحان ہمیشہ اس چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر شاق ہو۔[2]

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو صلے کے طور پر اسے ارتقائی منازل پر فائز کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد قدرت ہے:

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ[3]	اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا، ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ: ابلیس نے سجدہ نہ کیا تکبر کیا۔ تکبر عبادت کے مقابلے میں آتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۰﴾[4]	جو لوگ از راہ تکبر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں یقیناً وہ ذلیل ہو کر عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے۔

ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنات میں سے تھا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

---

[1] ۲۲ حج: ۱۸۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے ... اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے۔
[2] تدبر قرآن ۱: ۱۶۴　[3] ۲ بقرہ: ۱۲۴　[4] ۴۰ غافر: ۶۰

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ ؕ[1]

اور (یہ بات بھی) یاد کریں: جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا، پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا۔

نیز سورۂ اعراف میں ہے:

قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ۚ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ ○[2]

بولا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ابلیس چونکہ ملائکہ کی صفوں میں شامل تھا، اس لیے اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ کے خطاب میں بھی شامل تھا اور اس بات کو وہ خود درک کر چکا تھا، اس لیے اس نے سجدہ نہ کرنے پر نسلی امتیاز سے استدلال کیا: اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ. میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے اسے سجدہ نہیں کرتا۔

اہم نکات

۱۔ اعتقادی انحراف، عملی انحراف سے زیادہ خطرناک ہے۔
۲۔ تکبر، بندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔
۳۔ حکم خدا کی تعمیل میں غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا شرک نہیں ہے۔
۴۔ نسلی تعصب مخلوق کو سرکش اور گمراہ بنا دیتا ہے۔

تحقیق مزید

الاحتجاج ۱ : ۲۱۰۔ تفسیر القمی ۱ : ۴۱۔ قصص الانبیاء ص ۴۳۔ بحار الانوار ۷۰ : ۱۹

وَ قُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَ زَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ وَ کُلَا مِنۡہَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۪ وَ لَا تَقۡرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں قیام کرو اور اس میں جہاں سے چاہو فراوانی سے کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم دونوں زیادتی کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

تشریح کلمات

رَغَدًا: (ر غ د) عیش رغد۔ آرام و سکون کی زندگی۔

---

[1] ۱۸ کہف : ۵۰ [2] ۷ اعراف : ۱۴

ظالم : (ظ ل م) ظلم ۔ مقررہ حد سے تجاوز کرنا۔ زیادتی کرنا۔ وضع الشییء فی غیر محلہ۔ کسی شے کو اس کا جائز مقام نہ دینا۔

تفسیر آیات

جنت آدم: حضرت آدم (ع) کی جنت کے بارے میں تین اقوال ہیں:

۱۔ یہ وہی جنت خلد ہے جس کا مؤمنین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ اس لیے درست نہیں ہے :

اولاً: جنت، خلد، ابدی جگہ ہے۔ وہاں داخل ہونے کے بعد نکالے جانے کا کوئی تصور نہیں۔

ثانیاً : جنت خلد اعمال کی جزاء کے نتیجے میں ملتی ہے۔ جب کہ حضرت آدم(ع) کو کسی عمل کی جزاء میں جنت نہیں ملی تھی ۔

ثالثاً: احادیث سے بھی ثابت ہے کہ وہ جنت خلد نہ تھی۔

رابعاً: اگر جنت خلد ہوتی تو ابلیس شجرۃ الخلد کا بہانہ نہ بنا سکتا۔

۲۔ دنیا کے باغات میں سے ایک سرسبز باغ تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (ع) کے لیے خلق فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

جَنَّۃٌ مِنْ جَنَّاتِ الدُّنْیَا تَطْلَعُ فِیْھَا الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ لَوْ کَانَتْ مِنْ جَنَّاتِ الْخُلْدِ مَا خَرَجَ مِنْھَا اَبَداً[1]

یہ دنیا کے باغات میں سے ایک باغ تھا جس میں آفتاب اور ماہتاب طلوع ہوا کرتا تھا۔ اگر آخرت کی جنت ہوتی تو وہاں سے نکالے نہ جاتے۔

۳۔ وَ ھٰذَا لَا یَسْتَلْزِمُ کَوْنَھَا فِی الْاَرْضِ[2] دنیا کی جنت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ جنت زمین پر ہی تھی۔ ہوسکتا ہے کسی اور کرہ پر ہو۔ کیونکہ اگر کرہ ارض پر ہوتی تو اگلی آیت میں اھۡبِطُوۡا کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ چنانچہ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جنت کسی اور کرہ پر تھی۔

وَلَا تَقۡرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ: اس درخت کے نزدیک نہ جانا۔ یہ نہی ارشادی اور تاکید کے لیے ہے۔ کیونکہ جب نزدیک جانا ممنوع ہے تو اسے کھانا بطریق اولیٰ ممنوع ہوگا۔ جس طرح یتیم کے مال کے بارے میں حکم ہے: وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ ....[3] اور یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جانا۔

اس بات کی بحث کوئی خاص نتیجہ خیز نہیں کہ یہ درخت کس چیز کا تھا۔ البتہ اس درخت سے کھانے کے اثرات کے بارے میں چند اقوال ہیں:

شجرۃ المونۃ : توریت نے اس درخت کو شجرہ مونہ سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس کا پھل تناول کرنے کے بعد آدم (ع) میں نیک و بد کی تمیز آ گئی اور وہ اپنی عریانی سے آگاہ ہوئے۔

---

[1] علل الشرایع ۲ : ۶۰۰
[2] تفسیر آلاء الرحمن ، ذیل آیہ۔
[3] ۶ انعام : ۱۵۲

یہ بات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ امر غیر ممکن ہے کہ فرشتوں کے معلم واستاد کو اپنی عریانی کا علم وشعور بھی نہ ہو۔

شجرۃ الخلد: ابلیس نے حضرت آدم (ع) کو یہ کہ کر وسوسے میں ڈالا کہ یہ شجرۃ الخلد ہیشگی کا درخت ہے:

فَوَسۡوَسَ اِلَیۡہِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡکٍ لَّا یَبۡلٰی ۝[1]

پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا: اے آدم! کیا میں تمہیں ہیشگی کے درخت اور لازوال سلطنت کے بارے میں بتاؤں؟

اس آیہ شریفہ میں تین احکام ہیں: اسۡکُنۡ، وَکُلَا، وَلَا تَقۡرَبَا، قیام کرو، کھاؤ، درخت کے نزدیک مت جاؤ۔ پہلے دو حکم ارشادی ہیں، لہٰذا تیسرا حکم بھی ارشادی ہی ہے۔ حکم ارشادی کی وضاحت عنقریب آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ جنت مقام عمل نہیں، بلکہ جزائے عمل ہے۔ پس آدمؑ کی جنت جنۃ الخلد نہ تھی۔

۲۔ صحیح راستوں کی نشاندہی کے بعد ہی ممنوعہ امور پر پابندی لگائی جاتی ہے۔

۳۔ حیات جاوید کی خواہش فطری ہے۔ شیطان نے اسی فطری خواہش سے غلط فائدہ اٹھا کر وسوسہ پیدا کیا۔

تحقیق مزید

تفسیر القمی ۱: ۴۳۔ العیون ۱: ۱۹۵۔ الکافی ۳: ۲۴۷

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا فِیۡهِ ۪ وَ قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پس شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا، پھر جس (نعمت) میں وہ دونوں قیام پذیر تھے اس سے ان دونوں کو نکلوا دیا اور ہم نے کہا: (اب) تم ایک دوسرے کے دشمن بن کر نیچے اتر جاؤ اور ایک مدت تک زمین میں تمہارا قیام اور سامان زیست ہوگا۔

تشریح کلمات

ازل: (ز ل ل) یعنی لغزش، پھسلنا، راہ حق سے منحرف ہونا۔

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۱۲۰

اھۡبِطُوۡا: (ہ ب ط) ہبوط نیچے اترنا، پست ہونا، پہلے سے بدتر حالت میں آنا۔
مُسۡتَقَرٌّ: (ق ر ر) ٹھکانا، استقرار کی جگہ۔
مَتَاعٌ: (م ت ع) فائدہ اٹھانا۔

تفسیر آیات

حضرت آدم (ع) کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر بسانے کے لیے ہی خلق فرمایا تھا۔ چنانچہ شروع میں ہی فرمایا: اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ۔ پھر اس خلیفہ ارضی کو زمین پر بسانے سے پہلے درج ذیل مختلف مراحل سے گزارا:

۱۔ آدم (ع) کو ملائکہ پر فضیلت بخشی اور اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ کے ذریعے انہیں معلم ملائکہ بنایا.
۲۔ ان کے مقام و مرتبے کا اعتراف لینے کے لیے فرشتوں کو ان کے سامنے جھکایا۔
۳۔ چونکہ یہ نئی ارضی مخلوق ارتقا و تکامل کی استعداد رکھتی تھی اس لیے اسے ایک پر نعمت باغ میں آزمائش کے لیے بھیج دیا اور وہاں شجرۂ ممنوعہ کے ذریعے اسے آزمایا گیا۔

۴۔ میدان امتحان میں ایک عیار دشمن سے اس کا سامنا کرایا۔ اپنے ازلی دشمن سے ناواقف اس نئی مخلوق کے لیے یہ مرحلہ قانونِ ارتقا کی ایک لازمی شق کے طور پر ضروری تھا، کیونکہ چالاک دشمن یہ جانتا تھا کہ اس نئی مخلوق کی سرشت اور فطرت میں حصول کمال اور بقا کی خواہش موجود ہے۔ چنانچہ اس نے آدم کو ان کی فطری خواہشات کے مطابق درج ذیل چیزوں کے لالچ میں مبتلا کیا:

الف: خلود یعنی حیات ابدی: مَا نَھٰىکُمَا رَبُّکُمَا عَنۡ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَا مَلَکَیۡنِ اَوۡ تَکُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِیۡنَ ۔[۱] ”تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ مبادا تم فرشتے بن جاؤ یا زندہ جاوید بن جاؤ۔“

ب: حکومت و سلطنت: ابلیس نے کہا: ہَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡکٍ لَّا یَبۡلٰی ۔[۲] کیا میں تمہیں ہمیشگی کے درخت اور لازوال سلطنت کے بارے میں بتاؤں؟

۵۔ ستر پوشی کا فقدان: بظاہر شجر ممنوعہ سے کھانے کا طبعی نتیجہ تھا کہ حضرت آدم (ع) اور حضرت حوا کو ستر پوشی کی ضرورت پیش آئی۔ ہوسکتا ہے کہ ستر پوشی حیوانی خواہشات سے عبارت ہو۔ فَھُوَ التَّمَایُلُ الْحَیَوَانِیْ و یَسْتَلْزِمُ التَّغَذِّیَ وَ النُّمُوَّ ۔[۳] اور آدم (ع) کو حیوانی خواہشات میں مبتلا دیکھنے کے لیے ہی شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

۱۔ اعراف: ۲۰ ۲۔ طٰہ: ۱۲۰ ۳۔ المیزان ۱: ۱۲۷

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا [1]	پھر شیطان نے انہیں بہکایا تاکہ اس طرح ان دونوں کے شرم کے مقامات جو ان سے چھپائے رکھے گئے تھے ان کے لیے نمایاں ہو جائیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان کا مقصد آدم (ع) کو ستر پوشی کے فقدان کا احساس دلانا یعنی خواہشات میں مبتلا کرنا تھا۔

شجر ممنوعہ کا نتیجہ: حضرت آدم (ع) کو نافرمانی کی سزا کے طور پر زمین کی طرف روانہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ زمین پر بسنا اس پھل کے کھانے کا لازمی اور طبعی نتیجہ تھا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ○ [2]	اے آدم! یہ آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے، کہیں یہ آپ دونوں کو جنت سے نکال نہ دے، پھر آپ مشقت میں پڑ جائیں گے۔

ممنوعہ درخت سے پھل کھا کر آدم (ع) نے اپنے آپ کو دنیا کی پرمشقت زندگی میں ڈال دیا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ [3]	اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم دونوں زیادتی کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر حضرت آدم (ع) کو نافرمانی کی سزا کے طور پر زمین کی طرف بھیجا گیا ہوتا تو ضروری تھا کہ توبہ قبول ہونے کے بعد انہیں واپس جنت میں بھیج دیا جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ توبہ قبول ہونے کے بعد بھی آدم (ع) زمین پر ہی رہے۔ اس سے پتہ چلا کہ پھل کھانے کا ذاتی اثر ارضی زندگی گزارنا تھا۔

بنا بریں واضح ہوا کہ حضرت آدم (ع) سے جو خطا سرزد ہوئی وہ اللہ کے تشریعی حکم کی نافرمانی نہ تھی، بلکہ انہوں نے اللہ کے ارشادی اور تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی تھی، جس کا نتیجہ ظلم بنفس تھا۔

وضاحت: حکم دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ شرعی یا تشریعی

۲۔ ارشادی یا تکوینی

حکم شرعی: قانونی حاکم اور مولا کی طرف سے جو حکم دیا جائے، وہ شرعی حکم کہلاتا ہے۔ جیسے نماز، روزے وغیرہ کا حکم۔ ایسے حکم کی خلاف ورزی مولا کی نافرمانی تصور ہوگی اور اس پر عذاب ہوگا۔ کیونکہ یہ نافرمانی گناہ محسوب ہوتی ہے اور پیغمبروں کے لیے خلاف عصمت ہے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۲۰ [2] ۲۰ طٰہٰ: ۱۱۷ [3] ۲ بقرہ: ۳۵

حکم ارشادی : اس کی قانونی حیثیت نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک نصیحت کے طور پر ہوتا ہے اور امر واقع کی نشاندہی کے لیے دیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک طبیب مضر صحت چیزوں کی نشاندہی کر کے ان سے پرہیز کا ناصحانہ حکم دیتا ہے۔ ایسے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ طبعی طور پر خود بخود سامنے آ جاتا ہے، جسے شرعی سزا نہیں بلکہ فطری ردعمل کہتے ہیں۔

حضرت آدم (ع) کو اللہ نے نصیحت فرمائی تھی کہ شجرۂ ممنوعہ سے تناول کرنے کے نتیجے میں پرمشقت زمینی زندگی گزارنا ہوگی۔ چنانچہ فوسوس اور لیبدی میں عمل اور ردعمل کا ربط معلوم ہوتا ہے۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

اس وضاحت سے ایک سوال کا جواب خود بخود واضح ہوجاتا ہے کہ آدم (ع) نے نبی اور معصوم ہونے کے باوجود گناہ کا ارتکاب کیوں کیا؟

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ زیر بحث واقعہ جنت میں پیش آیا تھا جو دارالتکلیف نہیں ہے۔ یعنی تشریعی تکلیف۔ چنانچہ جب حضرت آدم (ع) کو خداوند عالم نے زمین پر بسایا اور انہیں رسول اور حجت بنایا تو اس کے بعد ان سے کبھی گناہ سرزد نہیں ہوا: اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا ...[1]

قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا: ھبوط کا ظاہری معنی ''اونچی جگہ سے نیچے کی طرف آنا'' ہے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ آدم (ع) کی جنت اگرچہ جنت الخلد نہ تھی، لیکن زمین پر بھی نہ تھی۔ ممکن ہے یہ جنت کسی اور کرّے پر ہو اور وہاں سے حضرت آدم (ع) کو زمین پر اتارا گیا ہو۔

اہۡبِطُوۡا میں آدم (ع) و حوا کے ساتھ ابلیس بھی شامل ہے۔ یعنی مجموعی طور پر ایک دوسرے سے دشمنی، نزاع اور خصومت ہوگی۔ اختلاف و خصومت اس ارضی زندگی کا لازمہ ہے۔ کیونکہ یہاں اجتماعی زندگی گزارنا ہوگی اور اجتماعیت کا نتیجہ خصومت ہے۔ لہٰذا ہبوط، اجتماعیت اور دشمنی باہم مربوط ہیں۔

مُسۡتَقَرٌّ، مَتَاعٌ اور حِیۡنٍ کو اضافت کے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔ شاید مفہوم یہ بنتا ہو کہ ارضی زندگی یعنی مستقر بیقرار، متاع ناپائیدار اور مدت نامعلوم۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بسانے سے پہلے دو دشمنوں سے آگاہ کیا گیا۔ ایک داخلی دشمن جو نفسانی خواہشات ہے اور ایک بیرونی دشمن ابلیس۔ ساتھ ہی یہ درس بھی یاد کرایا کہ بیرونی دشمن داخلی دشمن (خواہشات) کے ذریعے حملہ آور ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ روئے زمین پر انسانی زندگی چند روزہ اور عارضی ہے۔

۲۔ انسان کا مقام جتنا بلند ہوگا، شیطانی وسوسوں کا خطرہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

---

[1] ۳ آل عمران : ۳۳

۳۔ حکم شرعی (تشریعی) کی مخالفت، گناہ اور عصمت کے منافی ہے۔ لیکن امر تکوینی (ارشادی) کی مخالفت گناہ نہیں۔ لہٰذا عصمت کے منافی نہیں ہو گی۔

۴۔ انسان اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر بہشتی ہے۔ البتہ خلاف ورزیاں اس کے سقوط کا سبب بنتی ہیں۔

۵۔ بے حجابی شیطانی حربہ ہے، جس سے وہ انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔

۶۔ پر مشقت ارضی زندگی گزارنا حضرت آدمؑ کی سزا نہ تھی بلکہ پھل کھانے کا طبعی اور ذاتی اثر تھا۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے تو اللہ نے آدم کی توبہ قبول کر لی، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

تلقی: (ل ق ی) پانا۔ دریافت کرنا۔ سیکھنا اَخۡذُ الۡکَلَامِ مَعَ فَہۡمٍ وَ فِقۡہٍ۔[1]

کلمات: (ك ل م) کلمہ کی جمع ہے۔ کلمہ وہ لفظ ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے۔ یہ کلم سے ماخوذ ہے۔ یعنی زخم لگانا۔ جس طرح ہاتھ سے برائے اثر زخم لگایا جاتا ہے، بالکل اسی طرح زبان سے بھی برائے اثر لفظ ادا کیا جاتا ہے۔

لکلم: اَلتَّاۡثِیۡرُ الۡمُدۡرَكُ بِاِحۡدَی الۡحَاسَّتَیۡنِ (راغب) کلم اس اثر کو کہتے ہیں جو سمعی و بصری حواس کے ذریعے سمجھا جائے۔ کلام کو سمعی اور کلم کو بصری حواس کے ذریعے سمجھا جاتا ہے۔

تاب: (ت و ب) اس لفظ کے ساتھ الیہ اور علیہ لگانے سے مختلف معانی حاصل ہوتے ہیں۔ تاب الیہ یعنی اس نے فلاں کے حضور توبہ کی یا توجہ کی۔ تاب علیہ اس نے فلاں کی توبہ قبول کی یا اس پر رحم کیا۔

تفسیر آیات

حضرت آدم (ع) کو جن کلمات کی تعلیم دی گئی ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

۱۔ یہ وہ کلمات ہیں جن کا خود خداوند عالم نے سورۂ اعراف میں ذکر فرمایا ہے: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۔[2]

---

[1] المیزان ۱:۱۳۳

[2] اعراف ۷: ۲۳۔ پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

۲۔ سیوطی نے درمنثور میں ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق کلمات سے مراد ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

۳۔ نیز درمنثور میں ہی دیلمی سے ایک طویل روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: حضرت آدم (ع) نے یہ کلمات سیکھے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مَحَمَّدٍ سُبْحَانَکَ لَا اِلَہَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءِ اً وَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ. سُبْحَانَکَ لَا اِلَہَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءِ اً وَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم۔[۱]

اے اللہ میں محمد و آل محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ پاک و منزہ ہے تیری ذات۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ۔ میں نے برا کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا پس مجھے بخش دے بے شک تو غفور و رحیم ہے ۔ اے اللہ میں محمد و آل محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے التجا کرتا ہوں۔ پاک و منزہ ہے تیری ذات۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے برا کیا اور اپنے آپ پر ظلم کیا۔ پس میری توبہ قبول فرما۔ بیشک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

۴۔ نیز درمنثور میں ابن نجار نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول خدا (ص) سے ان کلمات کے بارے میں سوال کیا جن کی وجہ سے آدم (ع) کی توبہ قبول ہوئی تو آپ (ص) نے فرمایا:

سَأَلَ بِحَقِّ محمد و علی و فاطمة و الحسن و الحسین اِلَّا تُبْتَ عَلَیَّ فَتَابَ عَلَیْہِ۔[۲]

آدم نے محمد علی فاطمہ حسن اور حسین علیہم السلام کا واسطہ دے کر سوال کیا کہ میری توبہ قبول کی جائے۔ چنانچہ ان کی توبہ قبول ہوئی ۔

۵۔ شیخ صدوق کی روایت کے مطابق کلمات سے مراد محمد (ص)، علی ، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام ہیں۔

یہ اقوال قابل جمع ہیں۔ کیونکہ کلمات کا اطلاق الفاظ پر بھی ہوتا ہے اور ذوات پر بھی۔ ممکن ہے کہ حضرت آدم (ع) نے دعائیہ کلمات کے ساتھ ذوات مقدسہ کو بھی شفیع بنایا ہو۔ چنانچہ ذوات مقدسہ کو بھی اسی بنا پر کلمۃ کہا گیا ہے، جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم (ع) کو کلمۃ کہا گیا۔ وَکَلِمَتُہٗ ۚ اَلْقٰھَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ [۳] دوسری جگہ فرمایا: بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ ۤ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ...۔[۴]

---

۱ و ۲ الدر المنثور ۱: ۱۱۹ ۔ ۳ ۴ نساء: ۱۷۱۔ ۴ ۳ آل عمران: ۴۵

کلمات سیکھنے کی نسبت حضرت آدم(ع) کی طرف دی گئی ہے۔کیونکہ توبہ و انابت کی اولین شرط یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں رجوع کرے۔ سعی و کوشش بندے کی طرف سے ہوتو اللہ کی طرف سے توفیق ملتی ہے اور توفیق کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے ممکنہ وسائل میسر آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (ع) کو توفیق دی کہ وہ توبہ کرنے کے لیے ممکنہ وسیلہ و ذریعہ تلاش کریں۔ چنانچہ وسیلہ ملنے کے بعد انہوں نے توبہ کی: فَتَابَ عَلَيۡهِ ۔ پھر ان کی توبہ قبول ہوئی۔

اہم نکات

۱۔ توفیق خداوندی کے بغیر توبہ نہیں ہوسکتی۔

۲۔ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ سے یہ ثابت ہے کہ ما ذون من اللہ ہستیوں کو وسیلہ بنانا درست ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۸ : ۳۰۴ ۔ الوسائل ۷ : ۹۸۔ الدر المنثور ۱ : ۱۱۶۔ معانی الاخبار ص ۱۲۵۔ المستدرک ۵ : ۲۲۸۔ تفسیر فرات ص ۵۷

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا‌ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ ہم نے کہا: تم سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تم تک پہنچے تو جس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، پھر انہیں نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور جو لوگ کفر کریں اور ہماری آیات کو جھٹلائیں وہی دوزخ والے ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

حزن : (ح ز ن) کسی قابل قدر چیز کے ہاتھ سے نکل جانے پر فکرمند ہونا۔ ..لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا

فَاتَکُمۡ ...[1]

اصل میں "حزن" کا معنی "خشونت" ہے۔ یُقَالُ: حَزَنَتِ الۡاَرۡضُ اِذَا خَشَنَت۔ چونکہ غم و اندوہ کی وجہ سے نفس انسانی میں خشونت آ جاتی ہے، اس لیے اسے حزن کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ھبوط اِلَی الۡاَرض کا حکم حضرت آدمؑ کو دو مرتبہ ملا۔ ایک حکم توبہ سے پہلے اور دوسرا حکم توبہ کے بعد۔

توبہ سے پہلے: اس میں کہا گیا: "تم ایک دوسرے کے دشمن بن کر نیچے اتر جاؤ۔" یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش سرزد ہونے کے طبعی اثر کے طور پر صادر فرمایا کہ اب تمہیں زمین پر باہمی عناد و دشمنی پر مشتمل پرمشقت زندگی گزارنا ہو گی۔

توبہ کے بعد: اس حکم میں فرمایا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے.

اس حکم میں زمین پر اترنے کے بعد زندگی کے لیے ہدایت و شریعت کا ذکر ہے، جب کہ سابقہ حکم میں باہمی عداوت و دشمنی کا ذکر تھا:

فَتَاَلَّفَتِ الۡحَیَاۃُ مِنۡ حَیَاۃٍ اَرۡضِیَّۃٍ وَ حَیَاۃٍ سَمَاوِیَّۃٍ۔[2]	پس ارضی زندگی اور سماوی زندگی میں امتزاج پیدا ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم (ع) کو کسی اور کرہ سے زمین کی طرف روانہ فرمایا گیا تھا۔

زمین: زمین پر اترنے کا حکم ملنے کے بعد روئے زمین پر بسنے والوں کے لیے پہلی مرتبہ شریعت اور دستور حیات کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان دو مختصر آیتوں میں آنے والی تمام شریعتوں کا ایک نہایت ہی جامع خلاصہ ذکر فرمایا۔ یہ خلاصہ تین ایسے نکات پر مشتمل ہے جو بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ ہدایت: اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا ذکر ہے۔ مِّنِّیۡ ھُدًی۔

۲۔ اتباع: اس میں ہدایت خداوندی کی اتباع کرنے والوں کے اچھے انجام اور ان کی حیات ابدی کا ذکر ہے: فَمَنۡ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔ جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا اسے نہ آئندہ کے بارے میں کسی نقصان کا خوف ہو گا اور نہ کسی گزشتہ خسارے پر حزن و ملال۔

اس آیت میں ہدایت کی اتباع کرنے والوں کی حیات کی جامع تعریف فرمائی گئی کہ ان کی زندگی سکون و اطمینان سے گزرے گی اور زندگی کا سکون غارت کرنے والے دو عوامل

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۵۳ [2] المیزان ۱: ۱۳۵

خوف اور حزن ان کے قریب نہیں پھٹکیں گے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۔[1]

۳۔ کفر: آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس ہدایت کی پیروی سے انکار کریں گے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے: اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

سابقہ بیان سے یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ حضرت آدم (ع) کے زمین پر آنے سے پہلے یہاں کوئی شریعت نہ تھی۔ لہٰذا نہ کوئی معصیت قابل تصور تھی، نہ اطاعت۔

احادیث

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

وَ اللّٰهِ لَقَدْ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ لِلدُّنْیَا وَ اَسْکَنَهُ الْجَنَّةَ لِیَعْصِیَهُ فَیُرَدَّهُ اِلَی مَا خَلَقَهُ له۔[2]

خدا کی قسم اللہ نے آدم (ع) کو دنیا کے لیے خلق فرمایا اور انہیں جنت میں ٹھہرایا تاکہ وہ اللہ کی نافرمانی کریں اور انہیں واپس کیا جائے، اس طرف جس کے لیے خلق فرمایا ہے۔

امام رضا علیہ السلام نے مامون کے سوالات کے جواب میں فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ عزّ و جلّ خَلَقَ آدَمَ حُجَّةً فِیْ اَرْضِهٖ وَخَلِیْفَتَهٗ فِیْ بِلَادِهٖ لَمْ یَخْلُقْهُ لِلْجَنَّةِ وَ کَانَتِ الْمَعْصِیَّةُ من آدَمَ فِی الْجَنَّةِ لَا فِی الْاَرْضِ لِتُتِمَّ مَقَادِیْرُ اَمْرِ اللّٰهِ عِزَّ وَ جَلَّ. فَلَمَّا اُهْبِطَ اِلَی الْاَرْضِ وَ جُعِلَ حُجَّةً وَ خَلِیْفَةً عُصِمَ بِقَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔[3]

اللہ تعالیٰ نے آدم (ع) کو زمین پر حجت اور خلیفہ بنایا تھا جنت کے لیے نہیں اور آدمؑ سے جنت میں لغزش سرزد ہوئی زمین پر نہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے امور کی تقدیر مکمل ہو۔ جب آپ کو زمین پر اتارا گیا اور حجت و خلیفہ بنایا گیا تو اس کے بعد ان سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو اس کی خلقت اور اس میں پوشیدہ الٰہی اسرار و رموز سے ابتدا ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔

۲۔ اسے ایک دیرینہ دشمن (ابلیس) اور اس کے عزائم سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔

۳۔ فرشتوں پر انسان کی برتری اور اس کا راز بیان ہوا۔

---

[1] ۱۳ رعد: ۲۸۔ یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔　[2] بحار الانوار ۵: ۸۹　[3] مواهب الرحمٰن ۱: ۲۱۴

۴۔ علم کو تسبیح و تقدیس سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

۵۔ انسان کو علم کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

۶۔ انسان کو زندگی میں کڑی آزمائش سے گزرنا ہو گا، لہٰذا شجر ممنوعہ سے متعلق لغزش اور ابلیس کے دھوکے سے ان آزمائشوں کا آغاز ہوا۔

۷۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے انسان خلق کیا ہے اور وہ تحول انواع کے تسلسل کی ایک کڑی نہیں ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا ہے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور تم لوگ صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

تشریح کلمات

بن: یہ لفظ بناء سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ بیٹا باپ کی زندگی پر مبنی ہوتا ہے۔

اِسۡرَآءِیۡلَ: یہ عبری لفظ ہے۔ اسر یعنی بندہ اور ایل سے مراد اللہ ہے۔ لہٰذا اسرائیل کا مطلب 'بندۂ خدا' ہوا۔ یہ حضرت یعقوب اور اسحاق علیہما السلام کا لقب تھا۔
ایک امریکی دانشور مسٹر ہیکس اپنی کتاب قاموس کتاب مقدس میں لکھتا ہے:
اسرائیل کا مطلب 'خدا پر جیت حاصل کرنے والا' ہے۔ حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام فرشتہ خدا کے ساتھ کشتی لڑنے کے بعد اس نام سے ملقب ہوئے۔[1]
یہودیوں کے نزدیک اسرائیل کا معنیٰ 'بطل اللہ' ہے اور یہ اس روایت پر مبنی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب (ع) نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑی تھی۔

اذۡکُرُوۡا: (ذ ک ر) ذکر۔ یاد کرنا، توجہ دینا، زبان پر کسی چیز کا لانا۔

اَوۡفُوۡا: (و ف ی) وفاء ۔ وفا کرنا، عہد پورا کرنا، عہد و پیان کا تحفظ کرنا۔ اس کی ضد غدر یعنی غداری ہے۔

فَارۡهَبُوۡنِ: (ر ہ ب) رھب۔ کسی کی عظمت کے سامنے خشوع کے ساتھ خوف لاحق ہونا۔ اس کی ضد

---

[1] پرتوی از قرآن ۱: ۱۳۸

رغبت ہے۔

تفسیر آیات

یہودیوں سے یہ خطاب بطور ملامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مختلف نعمتوں سے نوازا، آل فرعون سے انہیں نجات دی، ان کے لیے دریا کو شق کیا، ان کے دشمن مبین فرعون اور اس کے لشکر کو غرق آب کیا، انبیاءؑ وملوک ان میں بھیجے، پوری دنیا کے باسیوں پر انہیں فضیلت دی، وعدہ گاہِ طور کے بعد گوسالہ پرستی سے بھی انہیں نجات دی اور اس قبیل کی بے شمار نعمتیں انہیں عطا کیں۔ لیکن اولاد اسرائیل نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھنے کی بجائے ایک نسلی حق تصور کیا اور یہ عقیدہ اختیار کیا: نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ ..[1] ہم اللہ کے فرزند ہیں...۔'' چنانچہ موجودہ تحریف شدہ بائبل میں بھی یہ بات موجود ہے: ''خدا نے یوں فرمایا ہے: اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پہلوٹا ہے۔''[2]

اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ: یہ خطاب بھی بنی اسرائیل سے ہے کہ پہلے تم میرا عہد پورا کرو تو میں بھی تمہارا عہد پورا کروں گا۔

تمام امم میں یہ سنت کارفرما رہی ہے کہ جب تک انہوں نے اللہ کے عہد کی پاسداری نہیں کی تو اللہ نے بھی بلا استحقاق انہیں کچھ نہیں دیا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۔[3] لہٰذا اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اور اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ کے درمیان عوض و معوض کا نہیں بلکہ علت و معلول کا ربط ہے۔

بنی اسرائیل سے یہ خطاب بھی بعنوان ملامت و تعریض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد و پیمان لیے مگر بنی اسرائیل نے ان میں سے کسی ایک عہد کی بھی پاسداری نہیں کی۔

وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ: خوف اگر کسی ذات کی عظمت و جلالت کے تصور سے لاحق ہو تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت لامتناہی ہے اور اگر خوف کسی طاقت سے ہو تو اللہ تعالیٰ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ہے اور اگر کسی سے اس لیے خوف آتا ہے کہ وہ رازہائے درونی سے آگاہ ہے تو بھی اللہ تعالیٰ ہی تمام پوشیدہ رازوں سے آگاہ ہے۔

صرف خدا ہی سے خوف رکھنا، یعنی تمام مصلحتوں اور مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف اللہ کی ذات کو سامنے رکھا جائے۔ اگر خوف خدا دل میں ہو تو کوئی دوسرا خوف دل میں جاگزیں نہیں ہو سکے گا، کیونکہ یہ ایسا خوف ہے جو انسان کو ہزار قسم کے خوف سے نجات دیتا ہے۔

وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا　۴۱۔ اور میری نازل کردہ (اس کتاب) پر ایمان

---

[1] ۵ مائدہ: ۱۸　[2] خروج ۴: ۲۲
[3] ۱۳ رعد: ۱۱ - اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

لاؤ جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر مت بنو اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو اور صرف میرے (غضب) سے بچنے کی فکر کرو۔

تشریح کلمات

ثمن: معاملے کا عوض، قیمت، قدر۔

تفسیر آیات

''میری آیات کو حقیر اور ناپائیدار چیزوں کے عوض نہ بیچو''۔ یہ ایک عمومی دعوت فکر ہے کہ آیات الٰہی کے مقابلے میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مفادات بھی حقیر ہیں۔

اگرچہ اس آیت میں یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ'' اپنے دنیاوی مفادات کی خاطر توریت کی آیات اور اس کے احکام میں تحریف نہ کرو''، لیکن درحقیقت یہ تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی حکم ہے۔ کیونکہ مجموعی طور پر قرآنی آیات و احکام اپنے مخاطبین سے ہی مخصوص نہیں، بلکہ ان میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ شان نزول کے خاص ہونے سے کلام کی عمومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بنابرایں اشتراء سے مراد ہر قسم کا معاوضہ و معاملہ ہے اور ثمن قلیل سے مراد دنیاوی مفادات ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس شخص نے اپنی خواہشات کو اللہ کی خوشنودی پر مقدم رکھا، گویا اس نے اللہ کی آیات کو حقیر قیمت پر بیچ ڈالا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

مَنْ اَصْغَىٰ اِلَى نَاطِقٍ فَقَدْ عَبَدَهٗ فَاِنْ كَانَ النَّاطِقُ عَنِ اللّٰهِ فَقَدْ عَبَدَ اللّٰهَ وَ اِنْ كَانَ النَّاطِقُ عَنْ اِبْلِيْسَ فَقَدْ عَبَدَ اِبْلِيْسَ۔[1]

جس شخص نے کسی کی آواز پر کان دھرا گویا اس نے اس کی عبادت کی۔ پس اگر بولنے والا اللہ کی طرف سے (بول رہا) ہو تو عبادت بھی اللہ کی ہو گی اور اگر یہ آواز شیطان کی طرف سے ہو تو عبادت بھی شیطان کی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ دنیاوی مفادات کی خاطر دینی مفاہیم میں تبدیلی ہلاکت خیز سودا ہے۔

۲۔ حقائق کو مسخ کرنے والوں کی بات ماننا شیطان کی بندگی ہے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۷: ۱۵۳

وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط نہ کرو اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

تشریح کلمات

تَلۡبِسُوا: (ل ب س) خلط ملط کرنا۔ ملا دینا۔

تَكۡتُمُوا: (ك ت م) کتمان اس چیز کو چھپانا جس کا اظہار مناسب یا ضروری ہو۔ اس کی ضد اظہار ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کی طرف سے نازل شدہ برحق باتوں کو باطل اور جعلی نظریات سے مخلوط کرنے کی مذمت ہو رہی ہے۔ باطل کو حق کی شکل میں پیش کرنے کا یہ عمل نہایت خطرناک ہے۔ روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اس ضمن میں فرماتے ہیں:

فَلَوْ اَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِزَاجِ الْحَقِّ لَمْ یَخْفَ عَلَی الْمُرْتَادِیْنَ وَ لَوْ اَنَّ الْحَقَّ خَلَصَ مِنْ لَّبْسِ الْبَاطِلِ لَانْقَطَعَتْ عَنْهُ اَلْسُنُ الْمُعَانِدِیْنَ وَ لٰكِنْ یُؤْخَذُ مِنْ هٰذا ضِغْثٌ وَّ مِنْ هٰذا ضِغْثٌ فَیُمْزَجَان فَهُنَالِكَ یَسْتَوْلِی الشَّیْطَانُ عَلٰی اَوْلِیَائِهٖ۔[1]

اگر باطل حق کی آمیزش سے خالی ہوتا تو وہ حق کے متلاشیوں سے پوشیدہ نہ رہتا اور اگر حق باطل کے شائبے سے پاک ہو کر سامنے آتا تو عناد رکھنے والی زبانیں بند ہو جاتیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ ادھر سے لیا جاتا ہے اور کچھ ادھر سے اور دونوں کو مخلوط کر دیا جاتا ہے۔ پس اس موقع پر شیطان اپنے دوستوں پر چھا جاتا ہے۔

وَ لَا تَلۡبِسُوا: حق و باطل کو مخلوط اور حق میں تحریف کی ممنوعیت پر مشتمل یہ حکم لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات کو شامل ہے اور یہودی دونوں قسم کی تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔

شان نزول

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حی بن اخطب، کعب بن اشرف اور یہودیوں کے ایک گروہ کے لیے دوسرے یہودیوں کے ذمے ایک کھانے کا اہتمام کرنا تھا۔ انہیں خوف لاحق ہوا کہ رسول خدا (ص) کے حکم پر کہیں یہ لوگ اس کھانا دینے

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ: ۵۰

کو ترک نہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے توریت کی ان آیات میں تحریف کر دی جن میں رسول اکرم (ص) کا ذکر اور آپ (ص) کے اوصاف بیان ہوئے تھے۔ آیت میں حقیر قیمت سے مراد یہی چیز ہے۔

اس حقیقت کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ شان نزول اگرچہ خاص ہو، مگر حکم عام ہوا کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق و باطل کی آمیزش مؤثر شیطانی چال ہے۔

وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور (اللہ کے سامنے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔

تشریح کلمات

رکوع : (ر ک ع) تواضع۔ فروتنی۔ سرخم کرنا۔

تفسیر آیات

سلسلۂ خطاب ہنوز یہودیوں کے لیے جاری ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز قائم کرنا یہودیوں پر بھی واجب تھا، البتہ ان کے موجودہ صحیفوں میں نماز کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ قرآن میں اس حکم کے ذکر کا مطلب یہ ہو کہ آنے والی امتوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہودیوں نے اللہ کے احکام اور عہد و میثاق کی کس قدر خلاف ورزی کی ہے اور انہیں کس بری طرح پامال کیا ہے۔

زکوٰۃ کو یہودی علماء نے فقراء و مساکین کی بجائے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا:

اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ۱

(اہل کتاب کے) بہت سے علماء اور راہب ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں....

بنا برایں یہودیوں نے اللہ کے احکام کو یکسر مسخ کر دیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کو درج ذیل امور پر سرزنش کی گئی ہے:

i۔ احسان فراموشی: اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ۔

ii۔ بے وفائی: اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ۔

----

۱ ۹ توبۃ: ۳۴

iii۔ بیباکی: وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ۔
iv۔ سرکشی: وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ ۔
v۔ کفر: وَلَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِهٖ ۔
vi۔ دین فروشی: وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۔
vii۔ معصیت: وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ۔
viii۔ حق و باطل کی آمیزش: وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ ۔
ix۔ کتمان حق: وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ ۔
x۔ ناشکری: وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ۔
xi۔ حرص مال: وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۔
xii۔ تکبر: وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ۔

۲۔ الٰہی اقدار اور مکافات عمل کا قانون تمام ادیان میں نیز تمام انسانوں اور تمام نسلوں کے لیے یکساں ہے۔

۳۔ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اور اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ کے درمیان عوض و معوض کا نہیں بلکہ علت و معلول کا ربط ہے۔

۴۔ اپنی خواہشات کو اللہ کی خوشنودی پر مقدم رکھنا، اللہ کی آیات کو حقیر قیمت پر بیچنے کے مترادف ہے۔

۵۔ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے حق و باطل کو ملا کر پیش کرنا فکری و اعتقادی خیانت ہے۔

تحقیق مزید: الفقیہ ۶ : ۳۷۵۔ ۲ : ۱۰۔ التہذیب ۴ : ۸۹۔ الوسائل ۹ : ۲۲۵

اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ کیا تم (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب (اللہ) کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تشریح کلمات

البر: (ب ر ر) نیکی، نیک اندیشی۔ التوسع فی فعل الخیر۔ (راغب) اصل میں یہ لفظ بَرّ سے ماخوذ ہے جو بحر کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں اس لفظ میں وسعت کا تصور مضمر ہے۔

تَنۡسَوۡنَ: (ن س ی) النسیان۔ فراموشی۔کسی چیز کا پہلے علم ہو پھر وہ یاد نہ رہے۔

تَعۡقِلُوۡنَ: (ع ق ل) روکنا، محفوظ رکھنا۔ یہ لفظ عقال سے ماخوذ ہے۔یعنی وہ رسی جس سے اونٹ کے پیر باندھتے ہیں۔عقل بھی اپنے صاحب کو ہلاکت و خسارے کی طرف جانے سے روکتی ہے اور اسے پابند کر دیتی ہے۔اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی قوت بھی عقل کہلاتی ہے۔

تفسیر آیات

یہاں بھی بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔لیکن حکم میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کو سرزنش کی گئی ہے جو دوسروں کو اچھے کاموں کی دعوت دیتے ہیں، لیکن خود ان پر عمل نہیں کرتے۔ دوسروں کو برائی سے روکتے ہیں، لیکن خود ان کے دامن آلودہ رہتے ہیں۔ یہ روش، عقل و دانش کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر قول و عمل یا بالفاظ دیگر قانون اور نفاذ میں مطابقت نہ ہو تو اس کا حتمی نتیجہ فساد اور بدنظمی ہے۔ اگر کسی معاشرے میں قانون اور عمل میں ہم آہنگی نہ ہو تو معاشرہ فساد اور افراتفری سے دوچار ہو جائے گا۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

کُوۡنوۡا دُعَاۃً لِلناس بِغَیۡرِ اَلۡسِنَتِکُمۡ[1]　　تم لوگوں کو دعوت دینے والے بن جاؤ مگر صرف زبان سے نہیں۔

شان نزول

یہ آیت ان یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی جو رسول اسلام کی حقانیت کو واضح طور پر سمجھ چکے تھے اور اپنی کتاب میں آنحضرت (ص) کے اوصاف پڑھ کر آنحضور (ص) پر ان کی تطبیق بھی کر چکے تھے۔ وہ مؤمنین کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے اور اپنے ہم کیشوں کو ایمان لانے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن خود اپنے دنیاوی مفادات کی خاطر ایمان نہیں لاتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ قول و فعل نیز قانون اور اس کی تطبیق میں تضاد پایا جانا فکری اور عملی سطح پر معاشرتی بگاڑ کا سبب ہے۔

۲۔ عمل سے عاری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خلاف عقل و شرع ہے۔

تحقیق مزید

المستدرک ۱۲: ۲۰۲۔تفسیر العیاشی ۱: ۴۳

---

[1] اصول الکافی ۲: ۷۸ باب الورع

وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور صبر اور نماز کا سہارا لو اور یہ (نماز) بارگراں ہے مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں۔

الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ وَ اَنَّہُمۡ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ جنہیں اس بات کا خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تشریح کلمات

اسۡتَعِیۡنُوۡا: (ع و ن) استعانت۔ مدد لینا۔

لصبر: (ص ب ر) مشقت کے باوجود باز رہنا۔ شرعی اصطلاح میں اپنے نفس کو عقل اور شریعت کے تقاضوں کے مطابق قابو میں رکھنا۔

خشوع: (خ ش ع) فروتنی، عاجزی۔ اکثر کے نزدیک بیرونی اعضاو جوارح کی فروتنی خشوع کہلاتی ہے۔ یاد رہے کہ خشوع جب دل میں ہوگا تو اعضائے ظاہری میں ضرور نمایاں ہوگا۔

یَظُنُّوۡنَ: (ظ ن ن) ظن، گمان یعنی کسی خبر کے مثبت اور منفی پہلوؤں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا جب کہ دوسری طرف کا احتمال باقی ہو۔ اگر دوسری طرف کا احتمال باقی نہ رہے تو اسے علم اور یقین کہتے ہیں۔ یہ لفظ کبھی یقین کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے: وَّ ظَنَّ اَنَّہُ الۡفِرَاقُ ۔[1]

رجوع: (ر ج ع) اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹنا۔

تفسیر آیات

استعانت کے حکم سے دو تصور سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان ہمیشہ دشمن کے حملے کی زد میں ہے۔

۲۔ انسان بذات خود کمزور اور ناتواں ہے۔

صبر، عاجزی اور بےبسی نہیں بلکہ مشکلات اور شدائد کا مقابلہ کرنے کی ایک معنوی اور روحانی طاقت کا نام ہے۔ اسلام روزے اور دوسرے احکام کے ذریعے صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے صبر سے مراد روزہ لیا ہے۔ لیکن صبر صرف روزے میں منحصر نہیں، بلکہ روزہ تو صبر کے مصادیق میں سے ایک مصداق اور اس کے تربیتی مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔

علل و اسباب کی دنیا میں انسان کو گونا گوں حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی اسے کامیابی حاصل

---

[1] ۷۵ قیامۃ: ۲۸۔ اور وہ سمجھ جائے گا کہ اس کی جدائی کا لمحہ آ گیا ہے۔

ہوتی ہے اور کبھی ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ فطری طور پر کامیابی کے وقت خوش اور ناکامی کی صورت میں غمگین ہوتا ہے۔

لیکن اگر انسان مضبوط شخصیت کا مالک ہو تو وہ خوشی کی حالت میں آپے سے باہر نہیں ہوتا اور ناکامی کی حالت میں بدحواس نہیں ہوتا۔ قرآن اس قسم کی مضبوط اور آہنی شخصیت کی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے:

لِّكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىكُمۡ [1]

تاکہ جو چیز تم لوگوں کے ہاتھ سے چلی جائے اس پر تم رنجیدہ نہ ہو اور جو چیز تم لوگوں کو عطا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

شخصیات کو فقیری و امیری، تنگدستی و خوشحالی، مرض و صحت اور محبت و عداوت کے متضاد آئینوں میں ہی پہچانا جاتا ہے۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب سے وصال ہوتا ہے تو زندگی جنت نعیم بن جاتی ہے اور فراق کی صورت میں عذاب جحیم:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ۙ﴿۲۱﴾ اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ ۙ﴿۲۲﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾ [2]

انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے، جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گردش روزگار نمازی کی مضبوط اور آہنی شخصیت پر اثرانداز نہیں ہو سکتی۔ نماز انسان کو اس لامحدود طاقت سے وابستہ کر دیتی ہے جو تمام طاقتوں کی سرچشمہ ہے۔ انسان نمازی بن جانے کے بعد چٹان کی طرح مضبوط اور سمندر کی طرح بیکراں ہو جاتا ہے۔

خدا اپنے حبیب کو نماز ہی کے ذریعے آنے والے مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۙ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ﴿۵﴾ [3]

اے کپڑوں میں لپٹنے والے۔ رات کو اٹھا کیجیے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجیے۔ عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں

رات کی نمازوں اور تلاوت قرآن کے ذریعے رسالت کے بار گراں کو اٹھانے کی تیاری کا حکم ہے۔

اِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ: خشوع نہ رکھنے والوں، ذوق عبادت نہ رکھنے والوں اور دل سے

---

[1] ۵۷ حدید: ۲۳ [2] ۷۰ معارج: ۱۹ تا ۲۳ [3] ۷۳ مزمل: ۱ تا ۵

عبادت بجا نہ لانے والوں پر یہ نماز بارگراں ہے۔ جب کہ خشوع رکھنے والے نماز سے جو لذت اور سکون قلب حاصل کرتے ہیں وہ کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض روایات کے مطابق خاشعین سے مراد رسول خدا(ص) اور حضرت علی (ع) ہیں۔[1] لفظ عمومیت رکھتا ہے اور اگرچہ تمام خاشعین کو اصولاً شامل ہے۔ تاہم اس کے مصداق کے اولین افراد محمد(ص) وعلی (ع) ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ لفظ اگرچہ عمومیت رکھتا ہے، لیکن اس لفظ کو محمد (ص) وعلی(ع) کی طرح کوئی حقیقی مصداق میسر نہیں ہوا۔

الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ :[2] مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں ظن سے مراد یقین ہے۔ اگرچہ رب کی ملاقات کا گمان بھی باعث خشوع ہوتا ہے، لیکن اگر یقین حاصل ہو تو یہ خشوع بطریق اولی دو چند ہو گا۔

احادیث

الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ میں موجود یَظُنُّوۡنَ کی وضاحت میں امام علی علیہ السلام سے مروی ہے:

یُوقِنُونَ اَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ وَ الظَّنُّ مِنْهُمْ یَقِیْنٌ ۔[3]

انہیں اپنے رب سے ملاقات کا یقین ہوتا ہے۔

کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

کَانَ عَلِیٌّ اِذَا هَالَهُ شیء فَزِعَ اِلَی الصَّلٰوۃِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآیَةَ: وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ۔[4]

حضرت علی علیہ السلام کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو اٹھ کر نماز پڑھ لیتے اور اس آیت: وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ کی تلاوت کرتے تھے۔

من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا:

الصَّبْرُ الصِّیَامُ وَ قال اِذَا نَزَلَتْ بِالرَّجُلِ النَّازِلَةُ و الشَّدِیْدَةُ فَلْیَصُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ عز و جل یَقُوْلُ: وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ یعنی الصیام ۔[5]

صبر سے مراد روزہ ہے۔ جب کسی آدمی پر برا وقت آجائے تو وہ روزہ رکھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ ۔

اہم نکات

۱۔ عاجزی کا نام صبر نہیں، بلکہ مشکلات و شدائد کا مقابلہ کرنے کی معنوی اور روحانی طاقت کا نام

---

[1] المیزان ۱:۱۵۳ [2] ۲ بقرہ: ۴۶
[3] المیزان ۱: ۱۵۳۔ تفسیر العیاشی ۱: ۴۴۔ بحار الانوار ۷: ۴۲ باب ۳ از باب اثبات الحشر و کیفیته و کفرہ۔
[4] اصول الکافی ۳: ۴۸۰ [5] حوالہ سابق ۴: ۶۳

صبر ہے۔

۲۔ مشکلات کے موقع پر صبر اور نماز سے مدد لینی چاہیے۔

۳۔ نماز انسان کو اللہ کی لامحدود طاقت سے وابستہ کر دیتی ہے۔

۴۔ استعانت کے حکم سے انسان کی ناتوانی کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ مشکلات اور شدائد میں انسانی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

تحقیق مزید: الکافی ۳ : ۴۸۰ ـ ۴ : ۶۳ ـ الفقیہ ۳ : ۶۷ ـ الوسائل ۸ : ۱۳۸۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور تمہیں عالمین پر فضیلت دی۔

وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور اس دن سے بچنے کی فکر کرو جس دن نہ کوئی کسی کا بدلہ بن سکے گا اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

تشریح کلمات

شَفَاعَۃٌ: (ش ف ع) سفارش۔ یہ کلمہ شفع سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے، جفت، ضمیمہ، جوڑنا۔ جب کوئی شخص کسی کی سفارش کرتا ہے تو اپنی آبرو اور وقار کو اس کے ساتھ ضمیمہ کرتا ہے۔ اسی لیے سفارش کو شفاعت کہا جاتا ہے۔

عَدۡلٌ: (ع د ل) برابری۔ انصاف کے لیے بھی عدل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ انصاف تب متحقق ہو سکتا ہے جب سب کو برابر حق مل جائے: اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِکَ صِیَامًا ..[1] نیز یہ لفظ معاوضے اور فدیے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے، کیونکہ معاوضہ یا فدیہ بھی اس چیز کے برابر سمجھا جاتا ہے جس کے لیے وہ دیا جا رہا ہو۔

---

[1] ۵ مائدہ : ۹۵

رسول خدا (ص) سے روایت ہے: بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوَاتُ وَ الْاَرْض [1] یعنی تکوینی اور فطری توازن سے آسمانوں اور زمین کا نظام قائم ہے۔

تفسیر آیات

یوماً سے مراد روز قیامت ہے، جس دن تمام وسائل منقطع ہو جائیں گے اور کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ وَ اخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ ۫ وَ لَا مَوۡلُوۡدٌ هُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِہٖ شَیۡـًٔا [2]	لوگو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے بچو اور اس دن کا خوف کرو جس دن نہ باپ بیٹے کے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آئے گا۔

آیت کے اس حصے میں یہودیوں کے ایک نظریے کی تردید کی گئی ہے جس کے مطابق وہ دوسروں کے "اعمال حسنہ" کی وجہ سے اپنی بخشش کی امید رکھتے ہیں۔

مولانا دریابادی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> لَا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ سے اس اسرائیلی عقیدے کی تردید مقصود ہے، جو آج تک "جیوش انسائیکلو پیڈیا" میں ان الفاظ میں لکھا چلا آیا ہے کہ "بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اعمال حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے۔

وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَۃٌ: اس جملے میں یہودیوں کے ایک اور عقیدے کی تردید ہے، جس کے مطابق وہ اپنے اسلاف کی شفاعت پر یقین رکھتے ہیں، البتہ عمل و ایمان کی بنا پر نہیں، بلکہ نسب و نسل کی بنیاد پر!!۔ چنانچہ خداوند عالم نے فرمایا: "ان کی شفاعت قبول نہ ہوگی"۔

ایک اور جگہ کفار کے بارے میں ارشاد قدرت ہے:

فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیۡنَ ؕ [3]	اب سفارش کرنے والوں کی سفارش انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

ان آیات سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ شفاعت کے وجود کا عندیہ ملتا ہے۔ البتہ یہودیوں اور کافروں کے لیے کسی قسم کی شفاعت قابل قبول نہ ہوگی۔

وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ: آیت کے اس حصے میں بھی یہودیوں کے ایک عقیدے کو رد کیا گیا ہے جو "عقیدۂ کفارہ" کہلاتا ہے۔ یہ نظریہ مسیحیوں کے ہاں کچھ زیادہ ہی رائج ہو گیا کہ گناہ کیے جاؤ اور کفارہ دے کر انہیں بخشواؤ۔ خدا فرماتا ہے: کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا نیز یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ۔[4] اس روز نہ مال کچھ فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔

---

[1] عوالی اللآلی ۴: ۱۰۲ [2] ۳۱ لقمان: ۳۳ [3] ۷۴ مدثر: ۴۸ [4] ۲۶ شعراء: ۸۸

بنی اسرائیل کو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی اولاد ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی نجات یقینی ہے اور ان بزرگوں کی سفارش سے ان کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

مسئلہ شفاعت: متعدد قرآنی آیات میں مسئلہ شفاعت کو بیان کیا گیا ہے جنہیں باہم مربوط کرنے سے ایک جامع دستور اور واضح روش سامنے آتی ہے۔

شفاعت صرف اللہ سے مخصوص ہے: بعض آیات سے یہ بات واضح ہے کہ شفاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے اور شفاعت کرنا بنیادی طور پر اسی کا کام ہے: قُلۡ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیۡعًا [1] کہد یجیے: ساری شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔

مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیۡعٍ [2] — اس کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ شفاعت کرنے والا۔

غیر اللہ کی شفاعت: متعدد آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر اللہ کو بھی شفاعت کا خدا داد حق حاصل ہے۔ البتہ یہ حق ذاتی اور استقلالی نہیں بلکہ اذن خدا سے استعمال کیا جا سکتا ہے:

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا [3] — اس روز شفاعت کسی کو فائدہ نہ دے گی سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے۔

لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا [4] — کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہو گا سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے عہد لیا ہو۔

شفاعت کی حقیقت: شفاعت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ انسان مادی یا غیر مادی کمال پر فائز ہونے کا خواہاں ہو، لیکن اس کے پاس کافی وسائل یا لیاقت و صلاحیت موجود نہ ہو۔ مثلاً اس نے اپنے آقا کے احکام کی کماحقہ تعمیل تو نہیں کی، جس کی وجہ سے وہ کمال حاصل کر سکتا، البتہ وہ شفاعت کا سہارا لے کر اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔

۲۔ آقا کے احکام کی نافرمانی کی صورت میں اگر کوئی شخص عذاب کا مستحق قرار پائے تو وہ کسی شخصیت کی سفارش یا شفاعت کا سہارا لے گا تاکہ اس سے یہ عذاب ٹل جائے۔

البتہ دونوں صورتوں میں شفاعت اس وقت مؤثر ہو گی جب مذکورہ شخص شفاعت کی اہلیت رکھتا ہو، کیونکہ شفاعت ہر جگہ مؤثر نہیں ہوا کرتی:

فَاِنَّمَا الشَّفَاعَۃُ مُتَمِّمَۃٌ لِلسَّبَبِ لَا مُسْتَقِلَّۃٌ فِی التَّاْثِیْرِ۔ [5] — شفاعت مستقل سبب نہیں ہے، بلکہ تکمیل سبب کے لیے ہوتی ہے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۴۴ [2] ۳۲ سجدہ: ۴ [3] ۲۰ طہ: ۱۰۹ [4] ۱۹ مریم: ۸۷ [5] المیزان ۱: ۱۵۸

بنا بریں کسی اہم علمی عہدے کے لیے ایک جاہل ان پڑھ کی سفارش کسی طرح بھی معقول نہیں، ایک سرکش کافر کے بارے میں مولا کے سامنے شفاعت اور سفارش کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

قابل شفاعت کون؟: سابقہ بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر شخص کی سفارش اور شفاعت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے قرآن نے ایک معیار مقرر کیا ہے، جس کے بغیر کوئی بھی شفاعت سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ قرآنی آیات کی رو سے شفاعت کے لیے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ شفاعت کے قابل وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پسندیدہ دین پر قائم ہوں، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَ لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی ...[1]

اور وہ فقط ان لوگوں کی شفاعت کر سکتے ہیں جن سے اللہ راضی ہے۔

نیز فرمایا:

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ﴿﴾[2]

اس روز شفاعت کسی کو فائدہ نہ دے گی سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے۔

۲۔ دین خدا پر قائم لوگ اپنے گناہان کبیرہ کے ساتھ وارد حشر ہوئے ہوں۔ کیونکہ گناہان صغیرہ تو اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی بخش دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡہَوۡنَ عَنۡہُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ...[3]

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔

رسول اکرم (ص) نے فرمایا:

اِنَّمَا شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِی۔[4]

میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کو حاصل ہو گی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔

لہٰذا شفاعت ان لوگوں کی ہو گی جو دین حق پر قائم ہوں اور گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں اور توبہ وغیرہ کے ذریعے بخشے نہ گئے ہوں۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کے لیے مزید شرائط بیان کی ہیں جنہیں شفاعت مل سکتی ہے۔

۱۔ عہد: شفاعت قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عہد لیا ہو: لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا ۔[5]

۲۔ پسند: دوسری شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے بارے میں شفاعت کو پسند کرے: یَوۡمَئِذٍ

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۲۸ [2] ۲۰ طٰہ: ۱۰۹ [3] ۴ نساء: ۳۱ [4] من لا یحضرہ الفقیہ ۳: ۵۷۴ حدیث: ۴۹۶۳ [5] ۱۹ مریم: ۸۷۔

لَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ۔[1]

۳۔ خوف خدا: تیسری شرط خوف خدا ہے:

وَ لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی وَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَتِہٖ مُشۡفِقُوۡنَ ۝[2]

اور وہ فقط ان لوگوں کی شفاعت کر سکتے ہیں جن سے اللہ راضی ہے اور وہ اللہ کی ہیبت سے ہراساں رہتے ہیں۔

شفیع کون؟

ا۔ دنیا میں:

الف۔ توبہ: دنیا میں گناہوں سے پاک ہونے کے لیے توبہ ایک وسیلہ اور شفیع ہے۔ توبہ کے ذریعے کبیرہ ہوں یا صغیرہ، تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝ وَ اَنِیۡبُوۡۤا اِلٰی رَبِّکُمۡ ...[3]

کہدیجیے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے، وہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ۔

وَ اِذَا جَآءَکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ۙ اَنَّہٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡکُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَ اَصۡلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝[4]

اور جب آپ کے پاس ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ آ جائیں تو ان سے کہیے: سلام علیکم تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے کہ تم میں سے جو نادانی سے کوئی گناہ کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَ اِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اہۡتَدٰی ۝[5]

جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے پھر راہ راست پر چلے تو میں اسے خوب بخشنے والا ہوں.

وَ الَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝[6]

اور جنہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تو اس (توبہ) کے بعد آپ کا رب یقیناً بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۱۰۹ [2] ۲۱ الانبیاء: ۲۸ [3] ۳۹ زمر: ۵۳۔۵۴
[4] ۶ انعام: ۵۴ [5] ۲۰ طٰہ: ۸۲ [6] ۷ اعراف: ۱۵۳

ب۔ نیکی: نیکیاں بجا لانے سے گناہ خود بخود معاف ہو جاتے ہیں:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ۔۔[1] نیکیاں بے شک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

ج۔ ایمان: ایمان بھی دنیا میں وسیلۂ شفاعت ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝[2]

اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل بجا لانے والوں سے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

د۔ رسول کریم (ص): رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقینی طور پر شفاعت دارین کے لیے وسیلہ ہیں۔ دنیا میں رسول کریم (ص) کی شفاعت کے لیے "استغفار" کا لفظ استعمال ہوا ہے:

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ۝[3]

اور جب یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے تھے تو اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا پاتے۔

ھ۔ ملائکہ: ملائکہ بھی ایمان والوں کی مغفرت کے لیے بطور شفیع دعا کرتے ہیں:

اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَ مَنۡ حَوۡلَہٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ[4]

جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو (فرشتے) اس کے اردگرد ہیں، سب اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں اور ایمان والوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ[5]

اور فرشتے اپنے پروردگار کی ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے استغفار چاہتے ہیں۔

و۔ مؤمنین: مؤمنین کی دعا سے بھی گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ ...[6]

ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

۲۔ آخرت میں: لفظ شفاعت بروز محشر ہونے والی سفارش کے لیے استعمال ہوا ہے۔ متعدد قرآنی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حشر کے دن درج ذیل ہستیوں کی شفاعت قبول ہوگی:

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۴　[2] ۵ مائدہ: ۹　[3] ۴ نساء: ۶۴　[4] ۴۰ مومن: ۷　[5] ۴۲ شوریٰ: ۵　[6] ۵۹ حشر: ۱۰

۱۔ انبیاء علیہم السلام

۲۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام

۳۔ ملائکہ

۴۔ شہداء

عقیدہ شفاعت پر اعتراض: شفاعت کا عقیدہ ارتکاب گناہ کا باعث بنتا ہے اور احساس ذمہ داری کو ختم کرتا ہے۔

جواب: اولاً: یہ اعتراض اللہ تعالیٰ کی مغفرت، بخشش اور رحیمیت پر بھی کیا جا سکتا ہے، جب کہ ارشاد قدرت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ [1]	اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا، اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے۔

ثانیاً: عقیدۂ شفاعت صرف اس صورت میں گناہ اور لاپرواہی کا سبب بن سکتا ہے، جب گناہ اور گناہ گار کے بارے میں کوئی شرط نہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں قوم کی سفارش بلا شرط ہو گی یا فلاں گناہ کے بارے میں بلا شرط سفارش ہوگی تو اس صورت میں وہ قوم ارتکاب گناہ کی جسارت کرے گی۔ لیکن اگر گناہ اور گناہ گار کا تعین بھی نہ ہو اور شفاعت کا مستحق بننے کی شرائط بھی مقرر ہوں تو انسان کو یہ علم نہیں ہو گا کہ وہ شفاعت کا مستحق بنے گا یا نہیں یا شفاعت کی شرائط اس میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

اس کا مثبت نتیجہ یہ ہے کہ انسان یاس وقنوطیت میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ خوف و رجاء کے درمیان محتاط رہتا ہے اور ناامیدی کا شکار نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ضمیر بیدار اور متحرک رہتا ہے۔

احادیث شفاعت

درج ذیل احادیث شفاعت پر دلالت کرتی ہیں:

☆ وَ فِیْ تَفْسِیرِ الْفُرَاتِ عَنْ مُحمد بن قَاسِمِ بن عُبَیْد مُعَنْعَنًا عَنْ حرب بن شُرَیْحِ الْبَصرِی قَالَ : قُلْتُ لِمُحَمَّد بْنِ عَلِیٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ آیَۃُ آیَۃٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اَرْجَیٰ؟ قَالَ: فَمَا یَقُوْلُ فِیْھَا قَوْمُکَ؟ قَالَ قُلْتُ :	تفسیر فرات میں ہے: محمد بن قاسم بن عبید نے حرب بن شریح بصری سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت محمد بن علی علیہا السلام سے عرض کیا: کتاب خدا میں کون سی آیت سب سے زیادہ امید بخش ہے؟ فرمایا: تمہارے لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کی: ہمارے ہاں لوگ آیہ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ

---

[1] ۴ نساء: ۱۱۶

یَقُوْلُوْنَ: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ قَالَ: لَكِنَّا اَهْلُ الْبَيْتِ لَا نَقُوْلُ ذٰلِكَ۔ قَالَ: قُلْتُ: فَاَيُّ شَيْءٍ تَقُوْلُوْنَ فِيْهَا؟ قَالَ: نَقُوْلُ: وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى، اَلشَّفَاعَةَ وَ اللّٰهِ الشَّفَاعَةِ وَ اللّٰهِ الشَّفَاعَةَ۔ [1]

اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کو سب سے زیادہ امید بخش سمجھتے ہیں۔ فرمایا: لیکن ہم اہل بیتؑ یہ نہیں کہتے۔ میں نے عرض کی: پس آپؑ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: ہمارے نزدیک یہ آیت ہے: وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ”عنقریب آپ کا رب آپ کو اس قدر عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے“، قسم بخدا یہ شفاعت ہے، قسم بخدا یہ شفاعت ہے، قسم بخدا یہ شفاعت ہے۔

☆ وَ فِيْ تَفْسِيْرِ الْقُمِّي : قَالَ عَلِيُّ ابْنُ الْحُسَيْنِؑ : لَا يَشْفَعُ اَحَدٌ مِنْ اَنْبِيَاءِ اللّٰهِ وَ رُسُلِهِ يومَ القيامة حَتّٰى يَاْذَنَ اللّٰهُ لَهُ اِلَّا رَسُولُ اللّٰهِ، فَاِنَّ اللّٰهَ قد اَذِنَ لَهُ فِي الشَّفَاعَةِ من قَبْلِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَ الشَّفَاعَةُ لَهُ وَ لِلْاَئِمَّةِ مِنْ وُلْدِهِ ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ لِلْاَنْبِيَاءِ۔ [2]

تفسیر قمی میں ہے: حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: انبیاء و مرسلین میں سے کوئی بھی قیامت کے دن اذن خدا سے پہلے شفاعت نہیں کر سکتا سوائے رسول خدا (ص) کے، کیونکہ آپ (ص) کو قیامت کے دن سے پہلے اجازت دے دی گئی ہے۔ شفاعت کا حق آپ (ص) کو، پھر آپ کی اولاد میں سے ائمہ (ع) کو، اس کے بعد انبیاء (ع) کو حاصل ہے۔

☆ عَنْ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) : ثَلَاثَةٌ يَشْفَعُوْنَ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فَيُشَفَّعُوْنَ: اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ۔ [3]

حضرت علی (ع) سے روایت ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا: رسول خدا (ص) نے فرمایا: تین قسم کے افراد اللہ سے سفارش کرتے ہیں اور ان کی سفارش قبول ہو جاتی ہے۔ انبیاء، پھر علماء، پھر شہداء۔

☆ عَنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمْ: مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِحَوْضِيْ فَلَا اَوْرَدَهُ اللّٰهُ حَوْضِيْ وَ مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِشَفَاعَتِيْ فَلَا اَنَا لَهُ اللّٰهُ شَفَاعَتِيْ،

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا: رسول خدا (ص) نے فرمایا: جو میرے حوض پر ایمان نہیں رکھے گا، اللہ اسے میرے حوض تک نہیں پہنچنے دے گا اور جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھے گا، اسے میری شفاعت نصیب نہ ہو گی۔ پھر

---

[1] المیزان ۱: ۱۷۶۔ تفسیر فرات الکوفی ص ۵۷۱۔ بحار الانوار ج ۸ ص ۵۷ باب ۲۱ حدیث ۷۲۔
[2] تفسیر القمی ج ۲ ص ۲۰۱۔ المیزان ۱: ۱۷۹۔ یومَ القیامة کے بغیر۔
[3] المیزان ۱: ۱۷۹۔ بحار الانوار ج ۸ ص ۳۴ باب ۲۱ الشفاعة حدیث ۲

ثُمَّ قَالَ: اِنَّمَا شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ۔[1]	فرمایا (ص): میری شفاعت تو امت کے گناہان کبیرہ کے مرتکب افراد کے لیے ہے۔
☆ قال الْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَیْہِ السَّلَامُ: وَ اعلَمُوْا اَنَّہٗ لَیْسَ یُغْنِیْ عَنْکُمْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ مِنْ خَلْقِہٖ شَیْءًا لَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَ لَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ وَ لَا مَنْ دُوْنَ ذَلِکَ فَمَنْ سَرَّہٗ اَنْ تَنْفَعَہٗ شَفَاعَۃُ الشَّافِعِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ فَلْیَطْلُبْ اِلَی اللّٰہِ اَنْ یَرْضَیٰ عَنہ۔[2]	امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: یاد رکھو اللہ کی مخلوق میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ سے بے نیاز ہو، خواہ وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل یا کوئی اس سے کمتر۔ اگر کوئی شخص شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے فائدہ حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی خوشنودی طلب کرے۔

ان کے علاوہ ائمہ طاہرین علیہم السلام اور حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی شفاعت کے بارے میں کثیر احادیث موجود ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شفاعت کی نعمت سے فقط مسلمان ہی بہرہ مند ہوسکتا ہے۔

۲۔ دنیا میں بخشش کے ذرائع توبہ، نیکی، ایمان نیز رسول خدا (ص)، ملائکہ اور مؤمنین کی استغفار ہے۔ جب کہ آخرت میں بخشش کا ذریعہ فقط رسول(ص)، آئمہ(ع)، ملائکہ اور شہداء کی شفاعت ہے۔

۳۔ شفاعت کائناتی نظام کا ایک اہم حصہ ہے، نہ کہ جانبداری اور نسلی امتیاز۔

۴۔ حصول شفاعت کے لیے مخصوص شرائط اور اہلیت کی موجودگی ضروری ہے۔

۵۔ نظریۂ شفاعت انسان کو ناامیدی اور یاس سے نجات دلاتا ہے اور اس میں قوت عمل پیدا کرتا ہے۔

۶۔ بعض مقررہ شرائط کے تحت شفاعت کرنے والی ہستی کی سفارش کے نتیجے میں گناہوں کی بخشش اور کامل ترین مقام پر رسائی کا نام شفاعت ہے۔

تحقیق مزید

الامالی للصدوق مجلس ۱۲ ص ۵۰۔ بحار الانوار ۸: ۵۸۔ تفسیر العیاشی ۲ : ۳۱۴۔ الخصال ۱ : ۶۳ و ۶۲۴:۲ ۔ متشابہ القرآن ۲: ۱۱۹۔ الکافی ۸ : ۱۱۔

---

[1] المیزان ۱ :۱۷۴
[2] اصول الکافی ج ۸ ص ۱۱۔ کتاب الروضۃ ۔

وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بری طرح اذیت دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا۔

تشریح کلمات

اٰلِ: لغت میں اھل کے مترادف ہے۔ آل اور اھل میں فرق یہ ہے:

۱۔ آل کی اضافت نام و لقب کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسے: آل محمد (ص) و آل مصطفیٰ (ص)۔ نکرہ کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ لہٰذا آلُ رَجُلٍ نہیں کہا جاتا، جب کہ اَھۡلُ رَجُلٍ کہا جاتا ہے۔

۲۔ زمان و مکان کی طرف آل کی اضافت نہیں ہوتی۔ چنانچہ آلُ زَمَانٍ، آلُ مَدِیۡنَۃٍ کہنا غلط ہے، جب کہ اَھۡلُ زَمَان، اَھۡلُ مَدِیۡنَۃٍ کہنا درست ہے۔

قریبی اور سگے رشتہ داروں کو آل کہتے ہیں جیسے قول خداوندی ہے:

فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ...[1]　　ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی۔

نیز فرمایا:

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ٭ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ ...[2]　　اور آل فرعون میں سے ایک مومن جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، کہنے لگا۔

ظاہر ہے کہ ایک مومن مرد کو فرعون کا سگا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے آل کہا گیا ہے، جب کہ وہ فرعون کا ہم عقیدہ نہ تھا۔

وَ یُسۡتَعۡمَلُ فِیۡمَنۡ یَخۡتَصُّ بِالۡاِنۡسَان اِخۡتِصَاصًا ذَاتِیًا اِمَّا بِقَرَابَۃٍ قَرِیۡبَۃٍ اَوۡ بِمَوَالَاۃٍ۔[3]　　یہ اس (انسان) کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ذاتی طور پر یعنی قرابت یا دوستی کی وجہ سے اس کے ساتھ مخصوص ہو۔

---

[1] ۴ نساء: ۵۴　[2] ۴۰ غافر: ۲۸　[3] مفردات راغب ص ۳۰ مطبوعہ ایران دفتر نشر الکتاب ۱۴۰۴ھ

البتہ اگر قرینہ موجود ہو تو لفظ آل دینی اور فکری قرابت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اِذۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ [1] میں آل فرعون سے اس کے ہم نوا مراد ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ (ع) نے بنی اسرائیل کو صرف فرعون کے رشتہ داروں سے نہیں، بلکہ فرعونی نظام سلطنت سے نجات دلائی تھی۔

فِرۡعَوۡنَ: شاہان مصر کو فرعون کہا جاتا تھا، جس کی جمع فراعنہ ہے۔ اس طرح شاہان روم کو قَیۡصَر، شاہان ایران کو کِسۡریٰ اور مشرک بادشاہوں کو خَاقَان کہا جاتا تھا۔ ایک قول کی بنا پر فِرْعَوْن دو مصری الفاظ پَر اور عَوْن کا مرکب ہے۔ پس یہ ایک غیر عربی لفظ ہے جس کا معنی ''بڑا ایوان'' ہے۔ جس طرح سلاطین آل عثمان کے لیے الباب العالی کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ: (س و م) سوم یعنی کسی پر تشدد کرنا۔ مشقت اور ناقابل تحمل بوجھ ڈالنا۔ اس کا اصلی معنی کسی چیز کی تلاش میں نکلنا ہے۔

بَلَآءٌ: آزمائش۔ (ب ل ی) اس کا مادہ ہے، جس کا معنی ''پرانا ہونا'' ہے۔ آزمائش کو اس لیے بلاء کہتے ہیں کہ امتحان میں ڈالنے سے انسان کو تکلیف اور اذیت پہنچتی ہے، جس سے پرانی آلودگی ختم ہو جاتی ہے اور امتحان سے فراغت کے بعد تازگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ دکھ درد کو بھی بلاء کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو پرانا کر دیتا ہے، جس سے وہ نقاہت محسوس کرتا ہے۔

تفسیر آیات

مصر میں بنی اسرائیل کی آبادی کا سہرا حضرت یوسف (ع) کے سر ہے، جو فلسطین سے وہاں پہنچے۔ قرآن مجید نے یہ واقعہ سورۂ یوسف میں بیان کیا ہے۔ بعد میں آپ (ع) کے والد اور بھائی بھی مصر آ گئے۔ فرزندان یعقوب کو مصر کی آسائشیں راس آئیں اور ان میں نسلی افزائش بڑی تیزی سے ہونے لگی۔ یوں چار سو سال کے عرصے میں بنی اسرائیل کی آبادی چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس منظم اور متحد اقلیت کی روز افزوں آبادی سے فرعون خوفزدہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کی نسلی افزائش کی روک تھام اور موجودہ نسل کے قلع قمع کے لیے انہیں سخت ترین اور پر مشقت کاموں میں لگا دیا۔ مثلاً بڑے بڑے پتھر اٹھانا نیز دیو قامت ہیکلوں اور محلات کی تعمیر وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود بنی اسرائیل نے اپنے رسوم و اخلاق و عادات کو ترک نہ کیا اور فرعون کا یہ دباؤ ان کی روحانی اور امید فردا کی طاقت کو ختم نہ کر سکا۔ چنانچہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ہر دائی کو یہ حکم تھا کہ بنی اسرائیل میں سے جس کے ہاں لڑکا پیدا ہو، اس کا گلا گھونٹ دیا جائے یا اسے جلادوں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اس کا سر تن

---

[1] ۷ اعراف: ۱۴۱

سے جدا کر دیں۔[1]

اہم نکات

۱۔ محکوم اقوام سے بیگار لینا اور ان کی نسل کشی طاغوتی طاقتوں کا وتیرہ رہا ہے۔

وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو شق کیا پھر تمہیں نجات دی اور تمہاری نگاہوں کے سامنے فرعونیوں کو غرق کر دیا۔

تشریح کلمات

فَرَقۡنَا: فرق اور فلق، شگاف کو کہتے ہیں۔ سورۂ شعراء آیہ ۶۳ میں ارشاد ہے: فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ۔ ”چنانچہ دریا شق ہو گیا اور ہر حصہ اتنا بڑا تھا جیسے بڑا پہاڑ“۔ بِکُمۡ میں باء، سببیہ ہے۔ یعنی تمہارے لیے۔

الۡبَحۡرَ: بحیرہ احمر کی خلیج مراد ہے، جسے آج کل ”نہر سویز“ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل نے فرعونی مظالم سے تنگ آ کر حضرت موسیٰ (ع) کی قیادت میں مصر سے نکل کر اپنے آبائی وطن فلسطین جانے کا فیصلہ کیا اور فرعونی حکومت کے خوف کی وجہ سے رات کو سفر اختیار کیا۔ لیکن رات کی تاریکی میں راستہ بھول گئے۔ ادھر فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ اپنے لشکر سمیت بنی اسرائیل کے تعاقب میں آ پہنچا۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔ بنی اسرائیل کے سامنے سمندر، اطراف میں پہاڑیاں اور پشت پر فرعونی لشکر۔ وہ بہت پریشان ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور حکم دیا کہ دریا میں چل پڑو۔ چنانچہ پانی نے دونوں اطراف سے سمٹ کر پہاڑ کی شکل اختیار کر لی اور درمیان میں خشک راستہ پیدا ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے گزر نےکے بعد فرعونی لشکر بھی اسی راستے پر چل پڑا۔ لیکن جب وہ وسط میں پہنچا تو پانی کے دونوں ایستادہ حصے باہم مل گئے اور یوں فرعون کا سارا لشکر فرعون سمیت غرق آب ہو گیا۔

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ انبیاء (ع) کے معجزات معمول کے مادی علل و اسباب اور مادی قوانین کے دائرے میں محدود نہیں ہوتے بلکہ ماورائے مادہ ان کے اپنے علل و اسباب ہوتے ہیں اور کم از کم ارادۂ الٰہی ان کی بنیادی علت اور سبب ہوتا ہے۔

---

[1] پرتوی از قرآن ۱: ۱۵۳

اس مقام پر مادی علل و اسباب کے ساتھ معجزات انبیاء کی توجیہ کرنے والے یہ کہتے ہیں : بحیرہ احمر اس زمانے میں کم گہرا تھا اور حضرت موسیٰ (ع) نے بنی اسرائیل کے ساتھ اسے عبور کیا تو وہ ''جزر'' کی حالت میں تھا لیکن جب فرعون اپنے لشکر کے ہمراہ وہاں سے گزرا تو سمندر ''مد'' کی حالت میں آ گیا اور وہ سب غرق ہو گئے۔

قرآنی سیاق و سباق مد و جزر کی اس توجیہ کو یکسر مسترد کرتا ہے کیونکہ:

۱۔ قرآن فرماتا ہے: '' ہم نے دریا میں شگاف پیدا کر دیا'' جب کہ مد و جزر میں شگاف نہیں ہوا کرتا بلکہ پانی کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔

۲۔ ایک اور جگہ پر قرآن اس واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡبَحۡرَ ؕ فَانۡفَلَقَ ...[1] — پھر ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی: اپنا عصا دریا پر ماریں، چنانچہ دریا پھٹ گیا۔

اس آیت میں انفلاق یعنی شگاف پڑنے کو ضرب عصا کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ عصائے موسیٰ (ع) سے مد و جزر کا بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

۳۔ دریا کے شگاف کی نقشہ کشی کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ دریا اس طرح پھٹا کہ اطراف میں موجیں عظیم پہاڑوں کی مانند کھڑی تھیں: فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ اور ظاہر ہے کہ مد و جزر میں یہ کیفیت نہیں ہوتی، ورنہ اب بھی مد و جزر کے وقت یہی منظر دیکھنے میں آتا۔

۴۔ قرآنی تفسیر کے مطابق حضرت موسیٰ (ع) نے بحکم خدا پانی کے وسط میں راستہ بنایا تھا: فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ...[2] پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا دیں۔ اگر حضرت موسیٰ (ع) نے حالت جزر میں سمندر عبور کیا ہوتا تو فِی الۡبَحۡرِ کی بجائے سَاحِلُ الۡبَحۡر کہنا درست ہوتا۔

۵۔ سمندر اتنا کم گہرا نہیں ہوتا کہ اسے پیدل یا سوار ہو کر عبور کیا جا سکے۔

۶۔ مد و جزر میں اتنا وقفہ نہیں ہوتا کہ ایک بڑا گروہ اتنے عریض سمندر کو عبور کرے تو پھر مد آئے۔

۷۔ کچھ لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ جس جگہ سے صحرائے سینا کو عبور کیا گیا، وہ ایک دلدلی پٹی تھی جس کے دونوں جانب سمندر تھا۔ اگر یہ نظریہ درست مان لیا جائے تو فرعونیوں کو بھی اس دلدلی پٹی سے گزر جانا چاہیے تھا۔

---

[1] شعراء: ۶۳   [2] طٰہ: ۷۷

اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل کا بچنا اور فرعونی لشکر کا غرق ہونا ایک معجزہ تھا۔ مادی علل و اسباب سے اس کی توجیہ کرنا درست نہیں ہے۔

وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا، پھر اس کے بعد تم نے گوسالہ کو (بغرض پرستش) اختیار کیا اور تم ظالم بن گئے۔

ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید تم شکرگزار بن جاؤ۔

وَ اِذۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو (توریت) کتاب اور فرقان (حق و باطل میں امتیاز کرنے والا قانون) عطا کیا تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

تشریح کلمات

مُوۡسٰی: موسیٰ بن عمران (ع)۔ سلسلۂ بنی اسرائیل کے سب سے بڑے، مشہور اور جلیل القدر پیغمبر کا نام ہے۔ توریت میں ہے کہ آپ (ع) نے ایک سو بیس سال عمر پائی۔[1]

مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کا اندازہ ہے کہ آپؑ کا زمانہ پندرھویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ سال ولادت غالباً ۱۵۲۰ سال قبل از میلاد اور سال وفات غالباً چودہ سو سال قبل از میلاد تھا۔[2]

موسیٰ دو قبطی لفظوں سے مرکب ہے۔ مو پانی اور شے درخت۔ عبرانی شین کو عربی سین سے بدل کر لفظ موسیٰ بنا دیا گیا۔

الۡعِجۡلَ: گوسالہ، بچھڑا۔

عفو: (ع ف و) درگزر کرنا۔ اس کا اصل معنی ''مٹانا'' ہے۔ عَفَی الرِّیۡحُ الۡاَثَرَ۔ ہوا نے علامت

۱؎ استثناء: ۳۴: ۷　　۲؎ دریابادی ص ۲۲

مٹا دی۔ چنانچہ گناہ کے آثار و نتائج کو مٹانے کے لیے عفو کا لفظ استعمال ہوا۔

فرقان: حق و باطل میں فرق نمایاں کرنے والا۔ یہ لفظ قرآن اور توریت، دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

لَعَلَّ: لفظی ترجمہ ''شاید'' ہے۔ جب یہ لفظ انسان سے صادر ہو تو ''شاید'' اور ''امید'' کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یہ اللہ تعالیٰ سے صادر ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس جملے پر لَعَلَّ داخل ہے، وہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ چنانچہ ہدایت حاصل کرنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ امر ہے۔

تفسیر آیات

یہ واقعہ سورۂ اعراف میں بھی مذکور ہے، جہاں فرمایا:

وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ۚ [1]

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس (دیگر) راتوں سے اسے پورا کیا، اس طرح ان کے رب کی مقررہ میعاد چالیس راتیں پوری ہو گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کے عدد میں کوئی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسے اہمیت حاصل ہے۔

چنانچہ رسول اکرم (ص) نے فرمایا:

مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحاً ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ۔ [2]

جو شخص اللہ کے لیے خلوص کے ساتھ چالیس صبح گزارے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہوں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بار شریعت ڈالنے اور انہیں اس منصب جلیلہ کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے چالیس دن تک انہیں کوہ طور پر ٹھہرایا۔

یہ وعدہ پہلے تیس دن کا تھا بعد میں بڑھا کر چالیس دن کر دیے گئے۔ اس بارے میں امین احسن اصلاحی صاحب کی عبارت یہ ہے:

> ابتداً یہ وعدہ تیس دن کا تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ مدت سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کی اس جلدی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حکمت تربیت متقضی ہوئی کہ یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے۔

حالات اور تقاضوں کے بدلنے سے جب اللہ تعالیٰ کا تکوینی فیصلہ بدلتا ہے تو اسے بدَاء کہتے ہیں اور

---

[1] ۷ اعراف: ۱۴۲ [2] جامع الاخبار ص ۹۴۔ الفصل الثانی و الخمسون فی للسان

جب اللہ کا شرعی حکم بدلتا ہے تو اسے نسخ کہا جاتا ہے۔ البداء منزلته فی التکوین منزلة النسخ فی التشریع ۔[1]

وعدہ گاہ: کوہ طور کی داہنی جانب تھی: وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ ....۔[2]

وقت وعدہ: یکم ذی القعدہ تا دس ذی الحجة الحرام۔ یہ وہ ایام ہیں جن میں حضرت آدم (ع) کی توبہ قبول ہوئی اور یہی حج کے ایام ہیں۔ یہ دو مہینے حرمت والے مہینوں میں سے ہیں۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۔ بعض اقوال کی بنا پر بنی اسرائیل نے مصریوں کی گائے پرستی سے متاثر ہو کر یہ گمراہی اختیار کی تھی۔ بہر کیف اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ(ع) کی غیبت کے چند روز بعد ہی ان کی تعلیمات سے انحراف کر کے دین موسیٰ(ع) کے ایک بنیادی اصول کو ترک کر دیا تھا اور سب کے سب مشرک ہوگئے تھے۔ جب کہ حضرت موسیٰ (ع) کے نمائندے اور حجت خدا حضرت ہارون (ع) کے درمیان موجود تھے، لیکن انہوں نے نہ صرف ان کی نافرمانی کی بلکہ انہیں جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی۔

اہم نکات

۱۔ کسی اہم ذمہ داری کو سنبھالنے سے قبل حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مناسب تربیت ضروری ہے۔

۲۔ معنوی کمال اور روحانی فیوض و برکات سے بہرہ مند ہونے کے لیے چالیس کے عدد کو ایک خاص تاثیر حاصل ہے۔

۳۔ حالات اور واقعات کی مناسبت سے اگر اللہ تعالیٰ کے تکوینی فیصلے میں تبدیلی آئے تو اسے بداء اور اگر تشریعی فیصلہ بدل جائے تو اسے نسخ کہتے ہیں۔

۴۔ اندھی تقلید گمراہی کا سبب بنتی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ

۵۴۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم نے گوسالہ اختیار کر کے یقیناً اپنے آپ پر ظلم کیا ہے پس اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اپنے لوگوں کو قتل کرو، تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، پھر اس

---

[1] بحار الانوار ۴: ۱۲۵۔ باب ۲ البداء۔　[2] ۱۹ مریم: ۵۲۔ ترجمہ: اور ہم نے انہیں طور کی داہنی جانب سے پکارا۔

فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۴﴾

اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہ خوب توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

بَارِیٔ: (ب ر ا) خالق۔ برء بیماری سے صحت مند ہونا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ لفظ باری کے ساتھ دو اور وصف ذکر ہوئے ہیں: ہُوَ اللّٰہُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ؕ ..[1]

خالق اور باری میں فرق یہ ہے:

الف: باری صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ب: یہ لفظ ہر چیز کے لیے نہیں بلکہ جاندار چیزوں کی خلقت کے لیے استعمال ہوتا ہے خَالِقُ الْخَلْقِ وَ بَارِئُ النَسَمَاتِ .

ج: یہ اس مقام پر بولا جاتا ہے جہاں ان دقیق رموز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو جن کا احاطہ صرف عالم الغیب ہی کر سکتا ہے۔

یہاں پر باری کے استعمال سے یہ لطیف اشارہ ملتا ہے کہ جانور کو خدا بنانے والے کس قدر احمق ہیں۔ انہیں اپنے اس خالق کے حضور توبہ کرنی چاہیے جس نے انہیں اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ پر خلق فرمایا ہے۔

تفسیر آیات

گوسالہ پرستی دین خدا سے ارتداد اور شرک باللہ ہے: اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ....[2]

اور چونکہ شرک توحید کی اہانت اور عہد شکنی ہے۔ اس لیے اس کی سزا بھی جرم کی شدت کے مطابق ہے۔ یعنی بت پرستوں کو اپنے ہی رشتے داروں کے ہاتھوں قتل کرا دیا جائے۔

مفسرین لکھتے ہیں: ان لوگوں کو حکم ملا کہ فتنۂ گوسالہ سے بری الذمہ افراد گوسالہ پرستوں کو قتل کر دیں۔

توریت میں ہے: قبیلہ بنی لاوی چونکہ اس بت کے سامنے نہیں جھکا تھا، اس لیے اسے حکم ملا کہ وہ بت پرستوں کو قتل کر دے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہی بت پرست رشتہ داروں کو قتل کر دیا۔

ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۔ ''اس میں تمہاری بھلائی ہے''۔ کیونکہ ایک جسم یا امت سے کسی ناسور کو کاٹ

---

[1] ۵۹ حشر: ۲۴. ترجمہ: وہی اللہ ہی خالق، موجد اور صورت گر ہے جس کے لیے حسین ترین نام ہیں۔

[2] ۳۱ لقمان: ۱۳. یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

کر جدا کرنے میں ہی اس جسم یا امت کی بھلائی مضمر ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حکم خداوندی کی تعمیل میں رشتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ حدود الٰہی کے اجرا اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے میں انسانیت کی بھلائی مضمر ہے۔

تحقیق مزید: الدر المنثور ۱: ۱۳۵۔ تفسیر القمی ۱: ۴۷۔ القصص ص ۲۶۷۔

وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم آپ پر ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں، اس پر بجلی نے تمہیں گرفت میں لے لیا اور تم دیکھتے رہ گئے۔

تشریح کلمات

نری: (ر أ ی) رویت۔ دکھائی دینا، نظر آنا۔ یہاں رؤیت حسی مراد ہے۔ یعنی طبیعی آنکھوں میں کسی شے کا عکس سما جانا۔

جھرۃ: (ج ہ ر) آشکار۔ علانیہ۔

الصّٰعِقَۃُ: (ص ع ق) وہ کڑک جس سے بجلی گرے۔ موت واقع ہو یا عذاب نازل ہو۔

تفسیر آیات

دریا کے شق اور فرعون کے غرق ہونے جیسی واضح نشانیوں کے ظہور کے باوجود بنی اسرائیل ثابت قدم نہ رہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ کے عبرت انگیز واقعات میں سے ایک صَاعِقَۃ کا واقعہ ہے۔

قوم موسیٰ (ع) نے کہا: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ آپ (ع) سے ہمکلام ہوتا ہے اور آپ (ع) اس کے نبی ہیں، کیونکہ وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہم اس وقت تک آپ (ع) کی باتوں پر یقین نہیں کریں گے جب تک خدا کو ظاہری آنکھوں سے علانیہ دیکھ نہ لیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) اپنی قوم کے ستر معتبر افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے اور خدا سے آشکار ہونے کا مطالبہ کیا جس پر وہ سب صَاعِقَۃ کی نذر ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ جہالت پر مبنی ہونے کے علاوہ شان خداوندی کے منافی تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑی سرعت سے بلا فاصلہ نازل ہوا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے ''بیٹا ہونے'' کا الزام شانِ خداوندی میں گستاخی تھا:

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمۡ شَیۡئًا اِدًّا ۙ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡہُ وَ تَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَ تَخِرُّ الۡجِبَالُ ہَدًّا ۙ اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ۚ [1]

اور وہ کہتے ہیں: رحمٰن نے کسی کو فرزند بنا لیا ہے۔ بتحقیق تم بہت سخت بیہودہ بات (زبان پر) لائے ہو۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں۔ اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے فرزند (کی موجودگی) کا الزام لگایا ہے۔

بالکل اسی طرح رویئت خدا کا جاہلانہ مطالبہ بھی ایک بہت بڑی گستاخی تھا، جس کا فطری نتیجہ صَاعِقَة کا عذاب تھا۔

صَاعِقَة عذاب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار غضب کے لیے استعمال ہوتا ہے:

اَنۡذَرۡتُکُمۡ صٰعِقَۃً مِّثۡلَ صٰعِقَۃِ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ؕ [2]

میں نے تمہیں ایسی بجلی سے ڈرایا ہے جیسی بجلی قوم عاد و ثمود پر آئی تھی۔

گوسالہ پرستی اور اللہ تعالیٰ کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ، دونوں ایک ہی نظریے کی عملی شکلیں ہیں۔ یعنی محسوسات کو خدا سمجھنا اور اللہ کو جسم تصور کرنا۔ ان دونوں میں سے گوسالہ پرستی زیادہ بڑا جرم اور ظلم تھا: اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ، لہٰذا اس کی سزا قتل قرار پائی۔ جب کہ اللہ کے دیدار کا مطالبہ نسبتاً کم جرم تھا، لیکن پھر بھی ظلم تھا، اس لیے انہیں صَاعِقَة کے ذریعے قتل کیا گیا اور پھر دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔

چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔

یَسۡـَٔلُکَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَیۡہِمۡ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ۚ [3]

اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لائیں جب کہ یہ لوگ اس سے بڑا مطالبہ موسیٰ سے کر چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا: ہمیں علانیہ طور پر اللہ دکھا دو، ان کی اسی زیادتی کی وجہ سے انہیں بجلی نے آ لیا۔

ان محسوس پرستوں نے رسول کریم (ص) سے بھی مطالبہ کیا تھا: اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا [4] یا خود اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔

رویئت خدا کے سلسلے میں اہل بیت رسول (ص) کے پیروکاروں کا نقطۂ نظر اس طرح ہے: دنیا یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کا نظر آنا کسی طور ممکن نہیں، خواہ انبیاء علیہم السلام ہوں یا دوسرے صالح افراد۔ فرقہ امامیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو کسی رویئت یا نظر کے احاطے یا کسی نگاہ کی حدود میں محدود ٹھہرانا، اس ذات لامتناہی کی شان میں گستاخی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

---

[1] ۱۹ مریم: ۸۸ تا ۹۱　[2] ۴۱ فصلت: ۱۳　[3] ۴ النساء: ۱۵۳　[4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹۲

اہم نکات

۱۔ رویئت خداوندی کا عقیدہ بہت بڑا ظلم اور قابل عذاب گستاخی ہے۔

۲۔ رویئت کا مطالبہ مادہ پرستی کی دلیل اور ایمان بالغیب کے منافی ہے۔

تحقیق مزید: بحار الانوار ۴ : ۴۷۔ حضرت امام رضا علیہ السلام اور مامون کا مناظرہ عیون الاخبار الرضا ۱: ۲۰۰۔ الکافی ۱ : ۹۵ تا ۹۷۔ الاحتجاج ۲ : ۴۴۹۔ اوائل المقالات ص ۵۷۔ تنزیہ الانبیاء ص ۷۶۔ التوحید ص ۳۸ ۔ ۱۰۷ ۔ ۱۲۲۔ متشابہ القرآن ۱ : ۹۶ ۔ ۱۰۱۔ نہج الحق ص ۴۰ ۔ ۴۱۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں اٹھایا کہ شاید تم شکرگزار بن جاؤ۔

تشریح کلمات

بَعَث: (ب ع ث) مرنے کے بعد اٹھانا: قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ...[1] نیند، بیہوشی جمود، سکوت یا غفلت سے اٹھانا: وَ کَذٰلِکَ بَعَثۡنٰہُمۡ لِیَتَسَآءَلُوۡا بَیۡنَہُمۡ ...[2] عدم سے وجود میں لانا: فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا ...[3] کسی مقصد کی طرف روانہ کرنا: وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا ...[4]

آیہ شریفہ میں بعث سے مراد مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا ہے اور موت سے مراد نیند یا بے ہوشی نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے۔

آیہ مجیدہ میں بَعَثَ اور مَوت دونوں الفاظ ایک دوسرے کے معنی کے تعین کے لیے قرینہ ہیں۔ چنانچہ موت قرینہ ہے کہ بَعَث سے مراد احیاء ہے اور بَعَثَ قرینہ ہے کہ مَوت سے مراد ''بے ہوشی'' وغیرہ نہیں ہے نیز لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ کے ذریعے خدائی احسانات جتائے جا رہے ہیں۔ واضح ہے کہ بے ہوشی سے ہوش میں لانا ایسی بات نہیں جس پر احسان جتایا جائے۔ احسان تو یہ ہے کہ مردے کو زندہ کردیا جائے۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کے مطالبے پر جب حضرت موسیٰ (ع) ستر افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے اور بارگاہ خداوندی

۱۔ ۳۶ یس: ۵۲۔ کہیں گے: ہائے ہماری شامت! ہماری خوابگاہوں سے ہمیں کس نے اٹھایا۔
۲۔ ۱۸ کہف : ۱۹۔ ترجمہ: اسی انداز سے ہم نے انہیں بیدار کیا تا کہ یہ آپس میں پوچھ گچھ کر لیں۔
۳۔ ۵ مائدہ: ۳۱۔ ترجمہ: پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا۔
۴۔ ۱۶ نحل: ۳۶۔ ترجمہ: اور بتحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے

میں ان کا مطالبہ پیش کیا تو آسمان سے رعب دار اور ہیبت ناک بجلی ان پر گری، جس کی وجہ سے وحشت زدہ ہو کر سب بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے۔

یہ ماجرا دیکھ کر حضرت موسیٰ (ع) نہایت پریشان ہوئے کہ قوم کو کیا جواب دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ میں خدا سے دعا کی:

رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَ اِيَّایَ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَ تَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَ ارۡحَمۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡغٰفِرِیۡنَ ۝ [1]

پروردگارا! اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر دیتا، کیا تو ہمارے کم عقل لوگوں کے اعمال کی سزا میں ہمیں ہلاک کر دے گا؟ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی جس سے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو ہی ہمارا آقا ہے، پس ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم فرما اور تو معاف کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ "صاعقہ" کی وہ تفسیر مبنی بر حقیقت نہیں جس کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) ان افراد کو ایک آتش فشاں پہاڑ کے پاس لے گئے تھے تاکہ یہ لوگ خوف زدہ ہو جائیں۔

اہم نکات

۱۔ ابتدائی زندگی سے موت واقع ہونے کے بعد کی دوسری زندگی زیادہ قابل شکر ہے۔

۲۔ موت کے بعد دنیا میں دوسری زندگی اتمام حجت کا آخری مرحلہ ہے۔

وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ۝۵۷

۵۷۔ اور ہم نے تمہارے اوپر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا، ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عنایت کی ہیں اور وہ ہم پر نہیں بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۵۵

تشریح کلمات

الۡغَمَامَ: (غ م م) بادل، جو آسمان کو ڈھانپ دے۔ ابر کا ٹکڑا ہو تو اسے غَمامه کہتے ہیں اور اگر بارش برسائے تو اسے سَحاب کہتے ہیں۔ غَم اس اندوہ کو کہتے ہیں جو قلب انسان کو ڈھانپ لیتا ہے۔

الۡمَنَّ: (م ن ن) وہ احسان جو کسی ایسے پر کیا جائے جس کا وہ سزاوار نہ ہو: اِذَا کُفِرَتِ النِّعۡمَةُ حَسُنَتِ الۡمَنَّةُ۔ ''جب نعمت کی ناشکری ہو تو احسان جتانا درست ہوتا ہے۔''

یہاں پر مَن سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل پر نازل فرمائی۔ مَن کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً میٹھا گوند، شہد، شربت، ترنجبین (شہد کی طرح گاڑھی، لذیذ اور شبنم کی طرح صاف)۔

بقول توریت مَن اوس کی شکل میں گرتی تھی۔

السَّلۡوٰی: (س ل و) لفظی معنی تسلی اور آسائش کے ہیں: فلان فی سلوة من العیش ''فلان شخص آرام کی زندگی گزار رہا ہے''۔

یہاں پر یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے تھے۔ یہ پرندے بٹیروں سے ملتے جلتے تھے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ان انعامات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا کی دھوپ اور فاقوں سے نجات ملی۔

ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو صحرائے سینا کی دھوپ کی تپش سے محفوظ رکھنے کے لیے عطا ہونے والا ابر کا سایہ کوئی معجزانہ سایہ نہ ہو، بلکہ اللہ کی عام نعمتوں کی طرح ہو۔ لیکن آیات کے لب و لہجے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ابر کا سایہ بھی معمول سے ہٹ کر ایک خصوصی انعام تھا، جو بنی اسرائیل سے مختص تھا۔ ورنہ عمومی لحاظ سے صحرائے سینا میں کوئی ایسا بلند پہاڑ نہیں جس سے سمندر کے آبی بخارات ٹکرا کر بادل کی صورت میں بنی اسرائیل پر چھائے رہتے۔ اس کے علاوہ چونکہ بنی اسرائیل چالیس سال تک اس صحرا میں بھٹکتے رہے: قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ...[1] لہٰذا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں نے چالیس سال تک ان پر سایہ کیے رکھا۔

تفسیر البرہان ج ا صفحہ ۲۲۲ میں حضرت امام حسن العسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ المَن سے مراد ترنجبین ہے جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۲۶۔ ترجمہ: اللہ نے فرمایا: وہ ملک ان پر چالیس سال تک حرام رہے گا، وہ زمین میں سرگرداں رہیں گے....

تفسیر قمی میں ہے:

وَ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ بِاللَّيْلِ اَلْمَنُّ فَيَقَعُ عَلَى النَّبَاتِ وَ الشَّجَرِ وَ الْحَجَرِ فَيَاكُلُوْنَهٗ۔[1]

مَن رات کو نازل ہوتی تھی اور نباتات، درختوں اور پتھروں پر گرتی تھی، جسے وہ کھاتے تھے۔

السَّلْوٰی: قتادہ اس پرندے کی توضیح میں کہتے ہیں: تَحْشُرُهَا عَلَيْهِمْ رِيْحُ الْجُنُوْبِ ” ان پرندوں کو جنوب کی ہوا بنی اسرائیل تک لے آتی تھی۔

ڈکشنری آف دی بائبل ۱: ۱۷۹ میں مذکور ہے: سمندری ہوا ان کی بے شمار تعداد با آسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی۔[2]

مَن اور سَلْوٰی بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتوں میں سے ضرور ہیں، لیکن یہ بات ہنوز تشنۂ تحقیق ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نے یہ دو نعمتیں طبیعی علل و اسباب سے ہٹ کر بطور معجزہ فراہم فرمائی تھیں یا طبیعی قانون کے تحت ظاہری علل و اسباب کے ذریعے؟

البتہ آیت کا لب و لہجہ دونوں سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی پاکیزہ نعمتوں کو ترک کرنا ظلم اور کفران نعمت ہے۔

۲۔ اللہ کی نافرمانی کا نقصان اللہ کو نہیں بلکہ خود بندے کو پہنچتا ہے۔

تحقیق مزید

الفقیہ ۱: ۵۰۳۔ مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۳۳

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا: اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور فراوانی کے ساتھ جہاں سے چاہو کھاؤ اور (شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو: گناہوں کو بخش دے تو ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ہم نیکوکاروں کو زیادہ ہی عطا کریں گے۔

---

[1] المیزان ۱: ۱۹۱

[2] دریا بادی ص ۲۳

فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾	۵۹۔ مگر ظالموں نے اس قول کو جس کا انہیں کہا گیا تھا، دوسرے قول سے بدل دیا تو ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔

تشریح کلمات

الۡقَرۡیَۃَ: (ق ر ی) بستی، قصبہ۔ شہر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ قَرَی سے ماخوذ ہے، جس سے مراد ہے جمع ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنا۔

اس آیت میں بستی سے مراد ''بیت المقدس'' یا اس کے نزدیک کوئی بستی یا شہر ہے، جس پر حضرت موسیٰ (ع) یا ان کے بعد بنی اسرائیل نے قبضہ کیا تھا۔

حِطَّۃٌ: (ح ط ط) گناہوں کا جھاڑنا، اترنا، بوجھ کو زمین پر رکھنا۔

غَفَر: (غ ف ر) بخش دینا، چھپانا، پر کرنا۔

خَطَایا: (خ ط ی) خطیئۃ کی جمع۔ گناہ، لغزش۔

مقصد اور ارادے سے گناہ کیا جائے تو اسے خطیئۃ اور اگر بلا ارادہ گناہ سرزد ہو تو خطا کہتے ہیں۔

رِجۡزًا: (ر ج ز) عذاب، پلیدی، کڑک کی آواز۔

تفسیر آیات

چالیس سال کی سزا کاٹنے کے بعد جب انہیں اس ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم ملا تو ان سے صرف یہ کہا گیا کہ داخل ہوتے وقت اپنے گناہوں سے توبہ کرنا: وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ، لیکن انہوں نے حِطَّۃٌ 'گناہ بخش دے' کی بجائے حِنۡطَۃٌ 'گیہوں' کہ کر حکم خدا کا مذاق اڑایا۔

بنی اسرائیل کی زبان عبرانی تھی اور حِطَّۃٌ کا لفظ عربی ہے۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ اظہار توبہ کے لیے حِطَّۃٌ کا ہم معنی لفظ کہنے کا حکم دیا گیا ہو۔

الۡبَابَ سے مراد شاید بیت المقدس کا دروازہ ہو جسے آج بھی باب حطۃ کہا جاتا ہے۔

اس واقعے کی تفصیل سورۂ مائدہ آیہ ۲۰ تا ۲۶ میں آئے گی۔

اہل البیت (ع) سے مروی حدیث نبوی (ص) میں مذکور ہے:

اِنَّ عَلِیًّا سَفِیْنَۃُ نَجَاتِھَا وَ بَابُ حِطَّتِھَا۔[1]		بے شک علی (ع) اس امت کے لیے کشتی نجات اور باب حطہ ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

نَحْنُ بَابُ حِطَّتِکُمْ۔[2]		ہم تمہارے لیے باب حطہ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کرنا منشائے خداوندی ہے۔

۲۔ مخصوص الفاظ، اجابت دعا میں مؤثر ہیں: قُوْلُوْا حِطَّۃٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ ...۔

تحقیق مزید: امام علی علیہ السلام باب حطہ ہیں۔ الکافی ۸ : ۲۹۔ الدر المنثور ۱ : ۱۳۹۔ امالی الصدوق ص ۴۷۔ امالی الطوسی ص ۶۰۔ امالی مفید ص ۱۴۵۔ التوحید ص ۱۶۴

وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰہِ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا: اپنا عصا پتھر پر ماریں، پس (پتھر پر عصا مارنے کے نتیجے میں) اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر گروہ کو اپنے گھاٹ کا علم ہو گیا، اللہ کے رزق سے کھاؤ اور پیو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

تشریح کلمات

اِسۡتَسۡقٰی: (س ق ی) استسقاء سے مراد ہے پانی طلب کرنا۔

اِنۡفَجَرَتۡ: (ف ج ر) فعل ماضی۔ انفجار پھوٹ نکلنا۔

مَشۡرَبَ: (ش ر ب) گھاٹ۔

لَا تَعۡثَوۡا: (ع ث ی) صیغہ نہی۔ شدت سے فساد پھیلانا۔

تفسیر آیات

آیات کی ترتیب کا واقعات کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ یہاں بستی میں داخل ہونے کا ذکر

---

[1] تفسیر نور الثقلین ۱ : ۸۲۔ بحار الانوار ۳۸ : ۱۱۲

[2] نور الثقلین ۱ : ۸۳۔ بحار الانوار ۱۳ : ۱۶۸

پہلے گزر چکا ہے، لیکن پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک صحرائے سینا کا واقعہ جاری ہے۔

توریت میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

اور جماعت کے لوگوں کو وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ(ع)اور ہارون(ع) خلاف اکٹھے ہوئے اور موسیٰ(ع) سے جھگڑنے اور کہنے لگے: کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے، جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے تھے۔تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی مریں۔ خدا وند کریم نے موسیٰ (ع) سے کہا: اس لاٹھی کو لو پھر تم اور تمہارا بھائی ہارون (ع) دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے۔ موسیٰ (ع) نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہ نکلا۔[1]

قرآن مجید میں ایک اور جگہ یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَۃَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ[2]

اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کر کے جدا جدا جماعتیں بنائیں اور جب ان کی قوم نے ان سے پانی طلب کیا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے....

ہوسکتا ہے کہ واقعے کی ترتیب آیات کے مطابق ہی ہو۔ یعنی پانی کی طلب قریہ میں داخل ہونے کے بعد ہوئی ہو، تاکہ وہ قریہ میں زراعت اور دیگر ذرائع سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔

بنی اسرائیل کے مختلف قبائل کے اخلاقی انحطاط کا یہ عالم تھا کہ وہ سب مل کر ایک ہی گھاٹ سے پانی نہیں لے سکتے تھے۔اس لیے ہر قبیلے کو پانی کا الگ چشمہ فراہم کیا گیا۔یعنی بارہ قبیلوں کے لیے بارہ چشمے۔

کچھ روشن خیال افراد نے ضَرۡب عَصَا کا معنی یہ لیا ہے: ضَرَبَ فِی الۡاَرۡضِ ''پہاڑی اور پتھریلے راستوں پر چلنا'' جب کہ یہ ظاہر قرآن کے سراسر خلاف ہے کیونکہ:

اولاً: ضرب چلنے کے معنوں میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ فی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہو۔

ثانیاً: ضَرَبَ سے اگر ''چلنا'' مراد لیا جائے تو عَصَا اس وقت مربوط ہوسکتا ہے جب محل کلام ''مسافت طے کرنا'' یا ''معذوری بتانا'' ہو، جب کہ یہاں محل کلام ''طلب آب'' ہے۔

ثالثاً: علاقہ بے شک کوہستانی اور پتھریلا ہو، اس پر چلنا ضرب فی الارض ہی کہلائے گا۔ یہاں ضَرَبَ فِی الۡحَجَر کہنا عربی محاورے کی رو سے درست نہیں۔

---

[1] گنتی باب ۲۰۔ ۱۔ ۱۲　　[2] ۷ اعراف: ۱۶۰

اہم نکات

۱۔ رزق خدا سے لطف اندوز ہونا حکم خدا کے مطابق ہے: کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا۔ شرط یہ ہے کہ رزق خدا کھا اور پی کر اس کی زمین میں فساد نہ پھیلایا جائے۔ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ۔

۲۔ معجزات بھی علل واسباب کے تابع ہیں (عصا کا مارنا)۔

تحقیق مزید: الیقین ص ۲۴۴۔ مستدرک الوسائل ۱۵: ۶۲۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْکَنَةُ ٭ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے طعام پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے، پس آپ اپنے رب سے کہد یجیے کہ ہمارے لیے زمین سے اگنے والی چیزیں فراہم کرے، جیسے ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز، (موسیٰ نے) کہا: کیا تم اعلیٰ کی جگہ ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ ایسا ہے تو کسی شہر میں اتر جاؤ، جو کچھ تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا اور ان پر ذلت و محتاجی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں مبتلا ہو گئے، ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی اور حد سے تجاوز کیا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

طَعَامٍ: (ط ع م) سازگار کھانا، طعم سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ 'چکھنا' ہے۔

بَقل: (ب ق ل) ساگ، سبزی، جو دانے سے اگتی ہو: اَلْبَقْلُ مَا یَنْبُتُ اَصْلُهُ وَ فَرْعُهُ فِی الشِّتَاءِ ۔ (راغب). ”بقل وہ ہے جس کی جڑ اور شاخ سردیوں میں اگتی ہو۔“

ککڑی۔ کھیرا۔

فُوم: گیہوں۔ لہسن۔ ہر وہ دانہ جو روٹی بن سکے۔ معصوم (ع) کی روایت میں فوم سے مراد گیہوں ہے۔

بَصل: پیاز۔

بَاء : (ب و ء) پلٹ آنا، ٹھکانا بنانا، جگہ ہموار کرنا۔ چنانچہ حدیث نبوی (ص) ہے:

مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّار۔[1] جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی نسبت دے تو وہ آتش جہنم کو اپنا ٹھکانا بنا لے۔

مصر: شہر۔ حدود۔

مسکنة : (س ك ن) بدحالی، بے بسی، محتاجی۔

تفسیر آیات

اس آیت میں بنی اسرائیل کی سرکش ذہنیت کے دو نمونے پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہ کر سکنا۔

۲۔ گستاخانہ لب و لہجے میں حضرت موسیٰ (ع) سے یہ کہنا: ”تم اپنے رب سے کہدو۔“ گویا وہ ان کا رب نہ ہو۔

عام حالات میں تو شاید ایک ہی قسم کے کھانے سے اکتا جانے کا کوئی جواز بن سکتا ہو، لیکن بنی اسرائیل تو اپنی آزادی اور خودمختاری کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ایک ظالم و جابر اور خونخوار حکمران سے چھٹکارا حاصل کیا تھا اور اب انہیں ایک جابر قوم سے نبرد آزما ہونا تھا۔ آزادی کے اس کٹھن سفر میں تو عزت سے جو بھی میسر ہو، اسے غنیمت سمجھنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ رنگین مزاج لوگ مَن و سَلوی جیسی غذائی ضیافت پر صبر نہ کر سکے اور بے صبری و بے قراری میں مَن و سَلوی کی جگہ پیاز، سبزی وغیرہ مانگنے لگے ۔ نہ تو یہ عزت کی قدر جانتے تھے اور نہ ہی ذلت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی قیمت دینے پر آمادہ تھے چنانچہ کفران نعمت کا طبعی نتیجہ یہی تھا کہ وہ دوبارہ ذلت اور حقارت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گریں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا : اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ کسی شہر میں بس جاؤ، یہ چیزیں تمہیں مل جائیں گی ۔

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ ۴ : ۲۶۲

مصر سے مراد کوئی بھی شہر ہے، کیونکہ یہ چیزیں شہری اور متمدن ماحول میں میسر آتی ہیں۔ اس سے مراد معروف شہر مصر لینا درست نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات بنی اسرائیل کے صرف انہی افراد تک محدود نہ ہو، بلکہ پوری قوم سے مربوط ہو کہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی اگر شہری ماحول میں آ جائیں اور انہیں مطلوبہ چیزیں مل جائیں تو بھی ذلت و حقارت بہرحال ان کا مقدر رہے گی۔

وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ: بنی اسرائیل کی بے صبری اور عدم استقامت کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ پھر ذلت و رسوائی میں مبتلا ہو جاتے اور یہ مسئلہ صرف انہی سے مخصوص نہیں، بلکہ جو قوم بھی ان کی طرح بے صبری اور عدم استقامت کا مظاہرہ کرے گی، وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہو گی۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل اگر ذلیل و محتاج بن گئے تو یہ ان کے کردار کا طبعی نتیجہ تھا، جو صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا۔

ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ: یہاں بنی اسرائیل کی ذلت و بے بسی کی علت بیان ہو رہی ہے۔ اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار اور قتل انبیاء جیسے جرائم کا ارتکاب نہ کرتے تو ذلت و رسوائی میں ہرگز مبتلا نہ ہوتے۔ چنانچہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ[1]	اور اگر یہ اہل کتاب توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے۔

اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ دستور الٰہی پر عمل کرنے کی صورت میں کوئی قوم ذلت و غربت میں مبتلا نہیں ہو گی۔

ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا: یعنی یہ لوگ کفر اور قتل انبیاء کے مرتکب اس لیے ہوئے کہ وہ عصیان کے عادی ہو گئے تھے اور جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی گناہ کا احساس نہیں کرتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ گناہ کا احساس نہ ہونا گناہ سے زیادہ بڑا جرم ہے۔ کیونکہ اس صورت میں گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے: ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا ....

۲۔ ناشکری اور عدم استقامت، ذلت اور رسوائی کا سبب ہیں: ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّۃُ ....

۳۔ انسان تنوع پسند ہے۔

تحقیق مزید: الکافی ۲: ۳۷۱۔ العدد القویۃ ص ۳۳۔ القصص ص ۲۶۱۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۶۶

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین میں سے جو کوئی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے تو ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تشریح کلمات

یہودی: حضرت یعقوب (ع) کے بڑے یا چوتھے بیٹے کا نام یہوذا بتایا جاتا ہے۔ اس سے بارہ خاندان ظہور پذیر ہوئے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں متحد رہے، لیکن حضرت سلیمان (ع) کے بعد ان میں اختلاف پیدا ہوا اور وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک یہودا اور دوسرا بنی اسرائیل کے نام سے موسوم ہوا۔

بعد میں جب دوسری اقوام ان پر غالب آگئیں اور یہ لوگ محکوم اور اسیر بن گئے تو ان کا مشترکہ نام یہود استعمال ہونے لگا۔ اسلام سے صدیوں قبل یہ نام زبان زد خلائق ہو گیا تھا۔

علاوہ ازیں ممکن ہے کہ عبرانی لفظ یہوذا عربی میں بطور تخفیف یہود بولا گیا ہو، جیسا کہ عبرانی زبان کے شین کا تلفظ عربی میں سین سے کیا جاتا ہے۔ جیسے موشی کو موسی کہا گیا ہے۔ لہٰذا اس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ قرآن مجید نے یہود کا نام غلط طریقے سے بیان کیا ہے۔

قرآن نے مادہ (ہ و د) کو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔ ہادوا، ہود، یہود۔

بعض حضرات نے عربی لغت کے لحاظ سے ہاد، یہود کا معنی 'توبہ کرنا' یا 'پلٹنا' کیا ہے اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہودیوں نے گوسالہ پرستی سے توبہ کی تھی یا شریعت موسوی سے انحراف کیا تھا، اس لیے انہیں اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معنی اور تشریح درست نہیں کیونکہ یہود عربی نہیں، بلکہ عبرانی لفظ ہے۔

نصاریٰ: (ن ص ر) حضرت عیسیٰ (ع) کی پیروی اور ان کی نصرت کرنے والے۔ یہ لفظ نصران کی جمع ہے۔ جیسے ندمان کی جمع ندامی ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اصحاب مسیح (ع) نے حضرت مسیح (ع) کے سوال کے جواب میں نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ [1] کہا تھا اس لیے اس دین کے پیروکار نَصرَانی کہلاتے ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک نَصرَانی برخلاف قاعدہ، شہر ناصرہ سے منسوب ہے، جہاں حضرت عیسیٰ (ع) کی والدہ سکونت پذیر تھیں اور وہیں حضرت عیسیٰ (ع) کی پرورش ہوئی۔

صابئین: یہ لفظ عبری ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ عبری میں یہ صبع تھا، جسے عربی میں صباء کر دیا گیا۔ عبری میں اس کا مطلب ہے "پانی کے اندر جانا" جسے وہ تعمید کہتے ہیں اور جو اس دین کے بنیادی اعمال میں سے ایک ہے۔ عربی میں آخری حرف عین کو ہمزہ سے بدل دیا گیا جس کا معنی ہے 'دین سے خارج ہونا'۔ یہ لوگ اپنے مذہب کو حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے منسوب کرتے ہیں اور اس وقت عراق اور ایران کے علاقے 'خوزستان' میں ان کی قلیل تعداد آباد ہے۔

تفسیر آیات

آیۂ شریفہ کا ماحصل یہ بنتا ہے:

اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے اور اعمال صالحہ بجا لانے والے خواہ مسلمان ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جس ملت اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، انہیں اجر وثواب ملے گا۔ ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم، یعنی اپنے زمانے کے برحق نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے بعد عمل صالح بجا لانے والا نجات پائے گا۔

شان نزول

حضرت سلمانؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: میرے ان ساتھیوں کا کیا بنے گا جو اپنے دین پر عمل پیرا تھے اور عبادت گزار تھے؟ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

ابتدائے اسلام میں یہ سوال بہت سے مسلمانوں کو درپیش تھا کہ دین مسیح کے پیروکاروں کے آبا و اجداد کا انجام کیا ہوگا؟ ان کی تشفی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر وہ اپنے مذہب کے مخلص پیروکار اور عبادت گزار تھے تو نجات پائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ ہر دور کے اہل ایمان کو دونوں جہانوں میں امن و سکون ملے گا۔ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۵۲۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾	۶۳۔اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا (اور تمہیں حکم دیا کہ) جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اسے پوری قوت سے پکڑ رکھو اور جو کچھ اس میں موجود ہے اسے یاد رکھو (اس طرح) شاید تم بچ سکو۔
ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ۚ فَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۶۴﴾	۶۴۔پھر اس کے بعد تم پلٹ گئے، پس اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم گھاٹے میں ہوتے۔

تشریح کلمات

الطُّوۡرَ: پہاڑ کو طور کہتے ہیں اور سینا کے کوہستانی سلسلے میں سے ایک پہاڑ کا نام بھی طور ہے۔

تفسیر آیات

عہدو میثاق کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے۔کوہ طور کو بنی اسرائیل کے سروں پر بلند کرنے کا واقعہ قران میں تفصیل سے مذکور نہیں۔قرآن میں اس واقعے کی طرف مختصر اشارہ ملتا ہے:

وَ اِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَہُمۡ کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّہٗ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ۚ [1]	اور (یہ بات بھی یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اس طرح اٹھایا گویا وہ سائبان ہو اور انہیں یہ گمان تھا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے....

بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو معلق کرنے کی غرض و غایت بیان نہیں ہوئی۔ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی عظمت وقوت کا اظہار کرنا چاہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کی نشانی اور معجزے کے طور پر ان پر حجت پوری کی ہو۔کیونکہ اس کے فوراً بعد خُذُوۡا کا حکم ملتا ہے۔گویا کہا جا رہا ہے کہ حکم خدا اور دستور الٰہی کو اپنی پوری معنوی اور مادی طاقت کے ساتھ اخذ کرو، جس طاقت سے معجزے اور حجت کا اظہار ہوا ہے۔یعنی جس طاقت سے حجت پوری ہوتی ہے، اسی حساب سے مسئولیت اور ذمہ داری بھی سنگین ہوجاتی ہے۔

لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ: شاید تم بچ سکو۔لَعَلَّ کے معنی ہیں 'شاید'۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم 'شک و تردد' نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم پوری کائنات کے اسرار و رموز سے

---

[1] ۷ اعراف: ۱۷۱

واقف ہے اور عواقب امور کا علم رکھتا ہے، بلکہ اللہ اپنی پسندیدہ چیز کے لیے لَعَلَّ کا لفظ استعمال فرماتا ہے نیز اس مقام پر لَعَلَّ کا استعمال مخاطب اور محل کلام کی مناسبت سے ہے کہ مخاطب کے لیے یا محل کلام میں غیر خدا کے لیے لَعَلَّ کی گنجائش ہے۔ بنابریں اگر چہ متکلم کسی قسم کے شک و تردد میں مبتلا نہ ہو، پھر بھی یہ لفظ اس وقت استعمال کر سکتا ہے جب مخاطب کو شک ہو یا محل کلام میں شک و تردد کی گنجائش ہو۔ جیسا کہ اس مقام پر بنی اسرائیل کا تقویٰ اختیار کرنا چونکہ محل شک و تردد ہے، یعنی ان کا بیشتر کردار تقویٰ اور خدا ترسی سے عاری رہا ہے، لہٰذا لَعَلَّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حجت پوری ہونے کے بعد انکار کرنے پر عذاب کا نہ آنا، اللہ کے فضل رحمت کی بنا پر ہے: فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ ... ۔

تحقیق مزید: الوسائل ۱: ۵۲

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور تم اپنے ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جنہوں نے سبت (ہفتہ) کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے انہیں حکم دیا تھا: ذلیل بندر بن جاؤ۔

فَجَعَلۡنٰہَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہَا وَ مَا خَلۡفَہَا وَ مَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ چنانچہ ہم نے اس (واقعے) کو اس زمانے کے اور بعد کے لوگوں کے لیے عبرت اور تقویٰ رکھنے والوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

تشریح کلمات

السَّبۡتِ: (س ب ت) سنیچر۔ آرام کرنا۔ کام چھوڑنا۔ وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا ۔[1]

قِرَدَۃً: (ق ر د) قرد کی جمع ہے۔ بندر۔

خٰسِئِیۡنَ: (خ س ء) خاسیء کی جمع ہے۔ راندہ شدہ۔ دھتکارا ہوا۔ اخۡسَـُٔوۡا فِیۡہَا وَ لَا تُکَلِّمُوۡنِ ۔[2] خوار ہو کر اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ جب کتے کو حقارت سے دھتکارا جائے تو کہتے ہیں: خسأت الکلب۔

نَکَالً: (ن ك ل) خوف کھانا۔ پیچھے ہٹنا۔ عذاب۔ قید و بند میں رکھنا۔

۱۔ ۷۸ نباء: ۹۔ اور ہم نے تمہاری نیند کو (باعث) سکون بنایا۔		۲۔ ۲۳ مومنون: ۱۰۸

تفسیر آیات

سَبْت یعنی ہفتے کا دن یہودیوں کیلیے متبرک تھا۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیسائیوں کے لیے اتوار کا دن متبرک ہوتا ہے۔ ہفتے کے روز یہودیوں کے لیے سیر و شکار اور کام کاج کی ممانعت تھی۔ یہ دن فقط عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ اس دن مچھلی کا شکار ممنوع ہونے کی وجہ سے باقی دنوں کی نسبت اس دن زیادہ تعداد میں مچھلیاں سطح آب پر ظاہر ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ دریا پر بسنے والوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس دن بھی مچھلی کا شکار کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی: كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِئِيۡنَ اور انہیں ظاہری شکل وصورت اور باطنی عقل و ادراک، دونوں طرح سے بندر کی صورت میں مسخ کر دیا یا بقولے صرف باطنی عقل و ادراک کے لحاظ سے خواہش پرست اور عاقبت نااندیش بنا دیا۔ بہرحال مفسرین اس بارے میں یہی دو نظریات بیان کرتے ہیں۔ البتہ باطنی مسخ تو یقینی ہے، اگرچہ ظاہری مسخ بھی ممکن ہے، کیونکہ بعد والی آیت مسخ ظاہری کی دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ارشاد ہے: فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا. ”چنانچہ ہم نے اس (واقعے) کو اس زمانے کے اور بعد کے لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا“۔ واضح ہے کہ مسخ باطنی کسی کے لیے عبرت کا باعث نہیں بن سکتا۔

اہم نکات

۱۔ کچھ قوموں کی تاریخ پوری انسانیت کے لیے عبرت بن جاتی ہے: فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا.

۲۔ مسخ، غضب الٰہی کا مظہر رہا ہے، لیکن امت مرحومہ کے لیے مسخ کی سزا نہیں ہے۔

تحقیق مزید: مستدرک الوسائل ۱۶ : ۱۱۷۔ القصص ص ۳۵۵ ۔ ۳۵۷ ۔ الکافی ۲ : ۲۸

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: خدا تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ بولے: کیا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟ (موسیٰ نے) کہا: پناہ بخدا! میں (تمہارا مذاق اڑا کر) جاہلوں میں شامل ہو جاؤں؟

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ

۶۸۔ وہ بولے: اپنے رب سے ہماری خاطر درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو، کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو، پس جس

ذٰلِكَ ۚ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے، اب اسے بجا لاؤ۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ کہنے لگے: اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ اس گائے کا رنگ گہرا زرد اور دیکھنے والوں کے لیے فرحت بخش ہو۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔انہوں نے کہا: اپنے رب سے (پھر) درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو ہم اسے ضرور ڈھونڈ لیں گے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ وَلَا تَسۡقِى الۡحَرۡثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيۡهَا ؕ قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَقِّ ؕ فَذَبَحُوۡهَا وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔(موسیٰ نے) کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی سدھائی ہوئی نہ ہو جو ہل چلائے اور کھیتی کو پانی دے (بلکہ) وہ سالم ہو، اس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو، کہنے لگے: اب آپ نے ٹھیک نشاندہی کی ہے، پھر انہوں نے گائے کو ذبح کر دیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہیں لگتے تھے۔

تشریح کلمات

بَقَرَۃٌ: (ب ق ر) گائے اور بیل کے لیے یہ لفظ مشترک ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح اونٹنی کے لیے ناقۃ اور اونٹ کے لیے جَمل الگ لفظ ہیں، اسی طرح گائے کے لیے بَقرۃ اور بیل کے لیے ثَور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بَقرۃ یعنی شگاف ڈالنا۔ گائے بیل کو بَقرۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ زراعت کرتے وقت ہل کے ذریعے زمین کو شق کرنے اور اس میں شگاف ڈالنے کے لیے ان سے مدد لی جاتی ہے۔

هُزُوًا: (ہ ز و) الهزو۔ مذاق اڑانا۔
فَارِضٌ : (ف ر ض) حیوان فَارِض۔ ایسا حیوان جو عمر رسیدہ یا کمزور ہونے کی وجہ سے جوتنے کے قابل نہ رہے۔
بِكْرٌ: (ب ك ر) ہر چیز کا آغاز۔
عَوَانٌ: (ع و ن) درمیانی، جوانی اور پیری کا درمیانی حصہ۔
ذَلُوْلٌ: (ذ ل ل) رام۔ مسخر۔
تُثِيْرُ: (ث و ر) برانگیختہ کرنا۔ زیر و زبر کرنا۔ انقلاب کو ثَورۃ کہتے ہیں۔
الْحَرْثَ: (ح ر ث) کھیتی۔
مُسَلَّمَةٌ: (س ل م) سالم، بے عیب۔
شِيَةَ: (و ش ی) داغ، خال (تل)، دھبہ۔

تفسیر آیات

یہاں سے بقرۃ یعنی گائے کا قصہ شروع ہوتا ہے جس کے ذکر کی وجہ سے اس سورے کا نام سورۃ بَقَرۃ رکھا گیا ہے۔

قصہ یہ ہے:

بنی اسرائیل کا ایک شخص قتل ہو گیا۔ قتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کا ایک حصہ مقتول کی لاش پر ماریں تاکہ وہ زندہ ہو جائے اور قاتل کی نشاندھی کر دے۔

واقعاتی ترتیب کے لحاظ سے پہلے قتل کا اور بعد میں گائے ذبح کرنے کا تذکرہ ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ یہاں آدمی کا قتل محل کلام نہیں بلکہ گائے ذبح کرنے کے سلسلے میں اسرائیلیوں کے لیت و لعل اور ان کی سرکشی و نافرمانی کا بیان مقصود ہے، اس لیے گائے کا واقعہ پہلے مذکور ہوا۔ علاوہ ازیں سبب کے عدم بیان سے ایک تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر گائے ذبح کرنے کا حکم کس لیے دیا جا رہا ہے؟

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا: احکام دین کی تبلیغ کے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام سے مذاق، استہزاء اور تمسخر ہوتا رہا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آیت کی رو سے حضرت موسیٰ (ع) نے اس عمل کو جاہلانہ قرار دے کر جاہلانہ باتوں سے برائت کا اظہار کیا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں۔

فَذَبَحُوْهَا: بنی اسرائیل کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ لوگ اگر حکم کی تعمیل میں مخلص ہوتے تو فوراً ایک گائے ذبح کر دیتے، لیکن وہ فرمانبرداری پر قلباً آمادہ نہیں تھے۔ اس لیے وہ طرح طرح کی

حیل و حجت کرنے لگے۔ اس حکم سے پہلوتہی کی خاطر انہوں نے طرح طرح کے سوالات کیے۔ جب ان کے ہر بہانے کا جواب دیا گیا تو انہوں نے یہ کہ کر ٹالنے کی کوشش کی: اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیۡنَا ' گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی' اور جب اس کا جواب بھی تفصیل سے ملا اور کسی قسم کے اشتباہ اور حیلے بہانے کی گنجائش نہ رہی تو مجبوراً گائے ذبح کرنی ہی پڑی۔ ''حالانکہ ایسا کرنے کی امید نہ تھی۔''

اہم نکات

۱۔ تعمیل حکم میں بہانہ جوئی کی وجہ سے جرم سنگین ہو جاتا ہے: وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ۔

۲۔ تبلیغ انبیاء علیہم السلام میں مذاق و استہزاء کی کوئی گنجائش نہیں: قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ ....۔

تحقیق مزید: آیت ۶۷ العیون ۲: ۱۳۔ آیت ۶۹ الکافی ۶ : ۴۶۶۔ تفسیر القمی ۱: ۴۹ آیت ۷۔ التہذیب ۹: ۵۳۔

وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۚ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، پھر ایک دوسرے پر اس کا الزام لگانے لگے، لیکن جو بات تم چھپا رہے تھے، اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا۔

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ تو ہم نے کہا: گائے کا ایک حصہ اس (مقتول) کے جسم پر مارو، یوں اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

تشریح کلمات

اِدّٰرَءۡتُمۡ: (د ر ء) تدارء باب تفاعل ''اپنا دفاع کرنا''۔ ''ایک دوسرے پر الزام عائد کرنا''۔

تَكۡتُمُوۡنَ: (ك ت م) کِتمان۔ اس چیز کا چھپانا، جسے پوشیدہ رکھنا مناسب اور درست نہ ہو۔

تفسیر آیات

قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل کس باغیانہ سرشت کے مالک تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی تعمیل میں مختلف حیلے بہانوں سے کام لیا۔ اب اصل واقعہ بیان ہو رہا ہے کہ گائے ذبح کرنے کا مقصد تمہارے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ایک آیت (نشانی) کو ظاہر کرنا بھی ہے۔ چنانچہ

حکم ہوا: ”ذبح شدہ گائے کا ایک حصہ مقتول کے جسم پر مارو۔ یوں اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے.....۔“

بعض روشن خیال اور مفکر حضرات اس معجزے کی کچھ اس طرح تاویل کرتے ہیں:

اضۡرِبُوۡہُ اور بِبَعۡضِہَا دونوں کی ضمیریں مقتول کی طرف جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کا ایک عضو' مقتول ہی پر مارو'۔ بنا برین یہ ایک الگ حکم ہے، جس کا سابقہ واقعہ 'ذبح بقر' سے کوئی تعلق نہیں۔[1]

یہ تفسیر ان آیات کے ظاہری اور واضح مفہوم کے سراسر خلاف ہونے کے علاوہ ایک جسارت بھی ہے، کیونکہ یہ آیات لفظ اِذ کے ساتھ ذکر ہو رہی ہیں، جو کسی مخصوص واقعے کی طرف صریح اشارہ ہے اور گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارنے کا حکم فَقُلۡنَا سے شروع ہوتا ہے جو قتل کے واقعے سے مربوط ہے۔ نیز آیت سے یہی ظاہر اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقتول اس گائے کا ایک حصہ مارنے سے زندہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی نشانی تھی جو قتل کے کسی واقعے سے مربوط تھی اور قتل بھی پوشیدہ تھا۔ اس بات کی طرف آیت کے اس حصے میں اشارہ ہے: وَاللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ۔

کچھ افراد کا یہ نظریہ ہے کہ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی سے مراد وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ[2] کی طرح نفاذ شریعت ہے جو موجب حیات و نجات ہے مگر آیت کا ظاہری مفہوم اس تاویل کی بھی نفی کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عقل سے کام نہ لینے کی صورت میں معجزے بھی انسان کے لیے مؤثر ثابت نہیں ہوتے۔

۲۔ معجزات لوگوں کو عقل سے کام لینے کی دعوت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں: لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۔

تحقیق مزید: بحار الانوار ۱۳ : ۲۵۹

ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ فَہِیَ کَالۡحِجَارَۃِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَۃً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الۡحِجَارَۃِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنۡہُ الۡاَنۡہٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنۡہَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخۡرُجُ مِنۡہُ الۡمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنۡہَا لَمَا	۷۴۔ پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت رہے، پس وہ پتھر کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، کیونکہ پتھروں میں سے کوئی تو ایسا ہوتا ہے جس سے نہریں پھوٹتی ہیں اور کوئی ایسا ہے کہ جس میں شگاف پڑ جاتا ہے تو اس سے پانی بہ نکلتا ہے اور ان میں کوئی ایسا بھی

---

[1] پرتوی از قرآن۔ نقل از سر سید احمد خان　　[2] ۲ بقرۃ: ۱۷۹۔ تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾	ہے جو ہیبت الٰہی سے نیچے گر پڑتا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

تشریح کلمات

قَسَتۡ: (ق س و) قَسۡوَۃً قساوت، سخت دل ہونا۔

يَتَفَجَّرُ: (ف ج ر) راہ کھولنا، یکے بعد دیگرے نکل آنا، پھوٹنا، شق ہونا، فاش ہونا۔
فَجر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ رات کا پردہ چاک کرتی ہے۔ گناہ کو اس لیے فجور کہتے ہیں کہ اس کا ارتکاب کرنے سے گناہ گار کا ضمیر فاش اور اس کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔

نھر: (ن ہ ر) پانی بہنے کا راستہ، وسعت، جھڑکنا: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ۔[1] سائل کو مت جھڑکو۔ وَّ لَا تَنۡهَرۡهُمَا[2] والدین کو نہ جھڑکو۔

يَشَّقَّقُ: (ش ق ق) شق شگافتہ ہونا، ایک قطعہ بھی شق کہلاتا ہے۔ اسی لیے آج کل فلیٹ کو بھی شقة کہا جاتا ہے۔ شقاق مخالفت: وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ ..[3] اور جو رسول کی مخالفت کرے۔ شقشقة۔ اونٹ کا بلبلانا۔

خَشۡيَة: (خ ش ی) ایسا خوف جس میں تعظیم کا شائبہ بھی ہو: اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ[4] اللہ کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کی سنگدلی کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کی واضح نشانیاں دیکھنے، حق ثابت ہونے، توحید و رسالت پر کافی دلائل کا مشاہدہ کرنے اور حجت خدا پوری ہونے کے بعد بھی ہدایت نہ پا سکے۔

جب حضرت موسیٰ (ع) نے اللہ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَنۡ تَرٰىنِىۡ ..[5] تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر اس میں استقرار آ گیا تو مجھے دیکھ سکو گے:

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا ۚ[6]	جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ[7]	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

---

[1] ۹۳ ضحیٰ: ۱۰ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۲۳ [3] ۴ نساء: ۱۱۵ [4] ۳۵ فاطر: ۲۸
[5] و [6] ۷ اعراف: ۱۴۳ [7] ۵۹ حشر: ۲۱

بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے پہاڑ کو ریزہ ریزہ ہوتے اور چٹان سے بارہ چشموں کو پھوٹتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت رہے۔

اس آیت اور دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جمادات بھی ایک حد تک شعور رکھتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ [1]

اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

اہم نکات۔

۱۔ گمراہ انسان اتنا بھی اثر پذیر نہیں ہوتا، جس قدر جمادات اثر پذیر ہوتی ہیں۔

۲۔ پتھر بھی اپنے پتھریلے دل میں خوف خدا رکھتا ہے۔

تحقیق مزید: بحار الانوار ۹ : ۳۱۲۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ کیا تم اس بات کی توقع رکھتے ہو کہ (ان سب باتوں کے باوجود یہودی) تمہارے دین پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا رہا ہے جو اللہ کا کلام سنتا ہے پھر اسے سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتا ہے۔

تشریح کلمات

طَمَع: (ط م ع) خواہشات کی حسرت۔ البتہ کبھی نیک آرزوؤں کو بھی طَمَع کہتے ہیں۔

تحرِیف: (ح ر ف) بدل دینا۔ یعنی کسی چیز کو اس کے اصل رخ سے موڑ کر دوسری طرف کر دینا۔ تحریف کی دو قسمیں ہیں: تحریف لفظی اور تحریف معنوی۔ لفظی تحریف سے مراد یہ ہے کہ الفاظ میں تصرف کر کے کچھ سے کچھ بنا دینا اور معنوی تحریف کا مطلب یہ ہے کہ معنی اور مفہوم کی غلط توجیہ اور تاویل کرنا۔

تفسیر آیات

یہودیوں کی سرشت: اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں ان نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن سے اس نے بنی اسرائیل کو نوازا:

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

- انہیں تمام عالمین پر فضیلت دی۔
- آل فرعون سے نجات دلائی۔
- ان کے لیے دریا کو شق کیا اور فرعون کو غرق کیا۔
- ان کے لیے چٹان سے چشمے نکالے۔
- من وسلویٰ نازل کیا۔
- انہیں گناہوں سے پاک کرنے کے لیے باب حطہ عنایت فرمایا۔

لیکن بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے خدا کی نافرمانی کی:

- انہوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی۔
- من وسلویٰ کو ٹھکرایا۔
- جہاد سے انکار کیا۔
- باب حطہ جیسی عظیم نعمت کا مذاق اڑایا۔
- حضرت موسیٰ (ع) کے ہر حکم کی نافرمانی کی۔

سرکش یہودیوں کی تاریخ کے چند سیاہ باب ذکر فرمانے کے بعد اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے، جو دراصل مقصود کلام ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ... کیا تم یہودیوں سے اس بات کی توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے دین پر ایمان لے آئیں گے۔

ہمارے معاصر یہودیوں کے بارے میں اس آیہ شریفہ سے یوں رہنمائی لینی چاہیے کہ کیا ان یہودیوں سے انسان دوستی، انسانی حقوق اور باہمی تعاون کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ کیا یہودی انسانی و اخلاقی اقدار پر ایمان لے آئیں گے؟ ہرگز نہیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہودیوں کی سرشت اور خصلت سے آگاہ فرما رہا ہے کہ ان سے کسی قسم کی توقعات وابستہ رکھنا درست نہیں۔

امت مسلمہ اگر قرآن کو اپنا دستور حیات بناتی تو آج وہ یہودیوں اور یہودیت نواز طاقتوں کی دست نگر نہ ہوتی، بلکہ اقوام عالم کی قیادت کا الٰہی فریضہ سرانجام دے رہی ہوتی۔

آیت کے دوسرے حصے میں یہودیوں کے ایمان نہ لانے کا سبب بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ کس طرح ایمان لا سکتے ہیں، جب کہ ان میں ایک منظم گروہ ایسا بھی ہے، جو کلام خدا کو سمجھ کر بھی اس میں تحریف کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہودیوں سے کسی بھلائی کی توقع خام خیالی ہے: اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ....۔

۲۔ اگر کسی معاشرے میں ایسا گروہ پایا جائے جو منظم انداز میں احکام الٰہی میں تحریف (رد و بدل) کر رہا ہو تو اس معاشرے کی اصلاح مشکل ہے۔

تحقیق مزید: تفسیر القمی ۱: ۵۰۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَہُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِہٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لا چکے ہیں اور جب خلوت میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: جو (راز) اللہ نے تمہارے لیے کھولے ہیں وہ تم ان (مسلمانوں) کو کیوں بتاتے ہو؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ (مسلمان) اس بات کو تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف دلیل بنائیں گے؟

اَوَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ کیا (یہود) نہیں جانتے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے، خواہ وہ چھپائیں یا ظاہر کریں؟

تشریح کلمات

یُحَآجُّوۡکُمۡ: (ح ج ج) مُحَاجَۃ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، مناظرہ اور مجادلہ کرنا۔ حُجَّۃ غالب آنا۔ جس کے پاس دلیل ہوتی ہے وہ اپنے مد مقابل پر غالب آ جاتا ہے۔ اسی لیے دلیل کو حجت کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان لوگوں نے ایک خفیہ تنظیم قائم کر رکھی ہے اور وہ منظم انداز میں منافقت سے کام لیتے ہیں۔ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور جب آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کا محاسبہ کرتے ہیں کہ مبادا کوئی شخص بے توجہی میں راز کی باتیں مسلمانوں کو بتا دے۔ چنانچہ اگر کوئی بھولے سے رسول اکرم (ص) کی حقانیت اور ان کی آمد کے بارے میں توریت کی پیشگوئیاں بیان کر دے تو تنظیم اس کی سرزنش اس طرح کرتی ہے: قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَہُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِہٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ۔ جو

(راز) اللہ نے تمہارے لیے کھولے ہیں وہ تم ان (مسلمانوں) کو کیوں بتاتے ہو؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ (مسلمان) اس بات کو تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف دلیل بنائیں گے؟

دوسری آیت میں یہ بیان ہے کہ یہودیوں کا گمان ان کی مادی سوچ کی علامت ہے کہ اگر لوگوں سے کوئی بات چھپائی جائے تو وہ اللہ سے بھی چھپ سکتی ہے۔ وہ اپنے زعم باطل میں دلیل و حجت کو خدا سے پنہاں کر رہے ہیں، جب کہ اللہ ظاہر و باطن سب کو جانتا ہے۔

شان نزول

مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

كَانَ قَوْمٌ مِنَ الْيَهُودِ لَيْسُوا مِنَ الْمُعَانِدِينَ الْمُتَوَاطِئِينَ إِذَا لَقُوا الْمُسْلِمِينَ حَدَّثُوهُمْ بِمَا فِي التَّوْرَاةِ مِنْ صِفَةِ مُحَمَّدٍ فَنَهَاهُمْ كُبَرَائُهُمْ عَنْ ذَلِكَ وَ قَالُوا: أَ تُخْبِرُوهُمْ بِمَا فِي التَّوراةِ مِنْ صِفَةِ مُحَمَّدٍ فَيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ فَنَزَلَتْ الآيَة.[1]

یہودیوں کا ایک غیر متعصب گروہ مسلمانوں کو توریت میں موجود محمد (ص) کے اوصاف بتا دیتا تھا۔ چنانچہ سرکردہ یہودیوں نے اس گروہ کو روکا اور کہا: توریت میں مذکور محمد (ص) کے اوصاف سرعام بیان نہ کیا کرو، مبادا مسلمان انہیں اللہ کے سامنے حجت بنائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اہم نکات

۱۔ منافقین ہمیشہ خائف رہتے ہیں کہ کہیں حق ظاہر نہ ہو جائے۔

۲۔ یہودی اپنے مفادات کی خاطر حقائق کی پردہ پوشی کو عقل مندی سمجھتے تھے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ ان میں کچھ ایسے ناخواندہ لوگ ہیں جو کتاب (توریت) کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ اپنے خیال خام میں رہتے ہیں۔

تشریح کلمات

اُمِّیُّوْنَ: (ا م م) اُمِّی کی جمع ہے۔ یعنی "ناخواندہ" اور "ان پڑھ"۔ یہ لفظ ام سے مشتق ہے، کیونکہ

---

[1] مجمع البیان ۱: ۱۸۲۔ بحار الانوار ۹: ۶۵

انسان مادر زاد ان پڑھ ہی ہوتا ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ لفظ اُمّی امت (عوام) کی طرف منسوب ہو، کیونکہ اس زمانے میں عام لوگ ان پڑھ ہوتے تھے اور پڑھے لکھے لوگ خواص میں شمار ہوتے تھے۔

تفسیر آیات

تعلیم یافتہ یہودی طبقے کی منافقت اور ان کی خفیہ تنظیموں کا پردہ چاک کرنے کے بعد ان کے ناخواندہ (ان پڑھ) طبقے کا حال بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے توریت کو اپنی غلط اور جھوٹی آرزؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

وَ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً [1] — ہمیں تو جہنم کی آگ گنتی کے چند دنوں کے علاوہ چھو نہیں سکتی۔

وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی [2] — جنت میں یہودی یا نصرانی کے علاوہ کوئی ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔

نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ [3] — ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

یاد رہے کہ جھوٹی آرزوئیں اور بے بنیاد تمنائیں ناخواندہ اور ان پڑھ یہودیوں کا خاصہ تھیں۔ جیسا کہ ہر قوم کے ناخواندہ افراد ایسے ہی غلط اور فضول خیالات کی بنا پر بہک جاتے ہیں۔

مرحوم علامہ سید علی نقی نقویؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اب جائزہ لے لیجیے کہ سو فیصدی وہی خیالات اسلامی جماعت کے بہت سے افراد میں سرایت کیے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نجات کے لیے فرائض و اعمال، اخلاق حسنہ اور تکمیل نفس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔
> حالانکہ اسلام، ایمان، محبت اہل البیتؑ اور ولایت علی ابن ابی طالب (ع) ہر چیز کا لازمی نتیجہ اطاعت و اتباع ہے، جو استحقاق نجات کے لیے ضروری ہے۔ [4]

اہم نکات

۱۔ جھوٹی آرزؤں کو ذریعہ تسکین قرار دینا ناخواندہ افراد کا شیوہ ہے۔

۲۔ جاہ پسندی سے مسائل اور مشکلات جنم لیتی ہیں۔

تحقیق مزید: مستدرک الوسائل ۱۱ : ۲۰۶۔ بحار الانوار ۲ : ۸۶۔ الاحتجاج ۲ : ۴۵۶۔

---

[1] ۲ بقرۃ : ۸۰ [2] ۲ بقرۃ : ۱۱۱ [3] ۵ مائدہ : ۱۸ [4] فصل الخطاب ج ۱۔ اس آیت کے ذیل میں۔

فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ وَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو (توریت کے نام سے) ایک کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعے ایک ناچیز معاوضہ حاصل کریں۔ پس ہلاکت ہو ان پر اس چیز کی وجہ سے جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہو ان پر اس کمائی کی وجہ سے۔

تشریح کلمات

وَیل: ہلاکت۔ افسوس۔ جہاں ہلاکت اور مصائب سے نجات کا کوئی راستہ نہ ہو وہاں وَیل استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

توریت کی تحریف اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ خود یہودی بھی اب یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ توریت من وعن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ جدید تحقیقات سے تو یہاں تک عقدہ کشائی ہوئی ہے کہ توریت کے قوانین حمورابی اور بابلی قوانین[1] سے ملتے جلتے ہیں۔

تحقیق مزید: الوسائل ۲۷ : ۱۳۱۔ تفسیر الامام ص ۳۰۲

وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ؕ قُلۡ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا فَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ عَهۡدَهٗۤ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور (یہودی) کہتے ہیں: ہمیں تو (جہنم کی) آگ گنتی کے چند دنوں کے علاوہ چھو نہیں سکتی، (اے رسول) کہد یجیے: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ اپنے عہد کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا یا تم اللہ پر تہمت باندھ رہے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟

---

[1] حمورابی قدیم بابل کا ایک بادشاہ، جس نے سب سے پہلے قوانین حکومت وضع کیے۔

تفسیر آیات

یہودیوں میں پائی جانے والی عام غلط فہمیوں، خام خیالیوں اور غلط تمناؤں کا تذکرہ ہے، جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو اللہ کی ایسی برگزیدہ امت سمجھتے ہیں، جس پر جہنم کی آگ حرام ہے۔ ان کے زعم میں ان کا بہت زیادہ مجرم اور گنہگار شخص اگر سزا کا مستحق ٹھہرے بھی تو اسے صرف چند دنوں کے لیے سزا دی جائے گی۔

تحقیق مزید: تفسیر القمی ۱: ۵۰

بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ البتہ جو کوئی بدی اختیار کرے اور اس کے گناہ اس پر حاوی ہو جائیں تو ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال بجا لائیں، یہ لوگ اہل جنت ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

اللہ کی سنت اور اس کا عدل و انصاف یہ ہے کہ جزا عمل کے مطابق ہو۔ اگر گناہ اور معصیت، انسان کی زندگی کو ڈھانپ لے اور ہدایت کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔

اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ جب تک انسان کے گناہ مکمل طور پر اس پر حاوی نہ ہو جائیں اس وقت تک ہدایت، توبہ اور نجات کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ گناہوں میں مکمل طور پر گھر جانا جہنم میں ہمیشہ رہنے کا موجب ہے: اَحَاطَتۡ بِہٖ۔

۲۔ جنت کے حصول کا معیار ایمان کے ساتھ عمل صالح ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۸۱: الکافی ۱: ۴۲۹۔ المناقب ۴: ۲۸۳۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا (اور کہا) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (اپنے) والدین، قریب ترین رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر احسان کرو اور لوگوں سے حسن گفتار سے پیش آؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر چند افراد کے سوا تم سب برگشتہ ہو گئے اور تم لوگ روگردانی کرنے والے ہو۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَ لَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنے ہی لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے، پھر تم نے اس کا اقرار کر لیا جس کے تم خود گواہ ہو۔

تشریح کلمات

الۡقُرۡبٰی: (ق ر ب) قریب کا وصف تفضیلی ہے۔ مذکر کے لیے اقرب اور مؤنث کے لیے قربیٰ آتا ہے یعنی سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار۔

الۡیَتٰمٰی: (ی ت م) یتیم و یتیمہ کی جمع۔ ہر منفرد چیز کو یتیم کہتے ہیں۔ مثلاً دُرَّۃٌ یَتِیۡمَۃٌ منفرد موتی۔ بلوغ سے پہلے جس کا باپ مر جائے اسے یتیم کہتے ہیں۔ جس جانور کی ماں مر جائے، اسے بھی یتیم کہتے ہیں، کیونکہ یتیم منفرد چیزوں کی طرح تنہا ہوتا ہے۔

الۡمَسٰکِیۡنِ: (س ک ن) مسکین کی جمع۔ نادار کو فقیر اور زیادہ نادار کو مسکین کہتے ہیں۔

تَوَلَّیۡتُمۡ: (و ل ی) وَلی سے فعل ماضی ہے اور منہ پھیرنے کے معنی میں ہے۔

تَسۡفِکُوۡنَ: (س ف ک) ناحق کسی شے کو بہا دینا۔ اکثر خون ناحق بہانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اَنۡفُس: (ن ف س) نَفس کی جمع ہے۔ یعنی حقیقت اور ہستی۔ انسان کو بھی نفس سے تعبیر کرتے

ہیں، کیونکہ یہ موجودات میں سب سے زیادہ قیمتی ہستی ہے۔ کچھ حضرات کے نزدیک نفس نفاست سے ماخوذ ہے۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کے عبرت انگیز تاریخی واقعات بیان فرمانے کے بعد اب اس عہد و پیان کا تذکرہ ہے جو ان کے انفرادی و اجتماعی امور کی تنظیم کی خاطر کیا گیا۔ مخفی نہ رہے کہ بنی اسرائیل کے واقعات اس اہتمام کے ساتھ اس لیے بیان ہوئے ہیں کہ یہ انسانی تاریخ کی سب سے پہلی دینی تحریک کا حصہ تھے۔ عہد و پیان ان نکات پر مشتمل تھا:

۱۔ خدائے واحد کی عبادت۔
۲۔ والدین سے حسن سلوک اور نیکی۔
۳۔ قریب ترین رشتہ داروں سے نیکی و احسان۔

۴۔ یتیموں سے شفقت و نیکی۔
۵۔ مسکینوں اور ناداروں سے حسن سلوک۔
۶۔ لوگوں سے خوش کلامی۔
۷۔ اقامۂ نماز۔
۸۔ ادائے زکوٰۃ۔
۹۔ ناحق خونریزی سے اجتناب۔
۱۰۔ اپنی قوم کے افراد کو جلا وطن نہ کرنا۔

البتہ یہ سارا عہد صرف بنی اسرائیل سے ہی مخصوص نہیں، بلکہ اسلامی تعلیم و تربیت کے ہمہ گیر اصولوں کا حصہ بھی ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں خدائے واحد کی عبادت کے بعد والدین پر احسان کرنے کا عہد لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے بعد جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ والدین پر احسان ہے۔ ناشکرے انسانوں کو اس تاکید کی زیادہ ضرورت تھی۔

احسان ایک جامع ترین لفظ ہے، جس میں والدین کے تمام فطری، اخلاقی اور اجتماعی حقوق شامل ہیں۔

والدین کے بعد قریب ترین رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے نیکی اور احسان کا مرحلہ آتا ہے:

وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا ... اور لوگوں سے حسن گفتار سے پیش آؤ۔

قرآنی آداب اور اسلامی اصول، تربیت میں حسن گفتار کی خصوصی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ گفتار سے ہی انسان کے ما فی الضمیر کا اظہار ہوتا ہے، یہ باہمی تفاہم اور افہام و تفہیم کا اہم ترین ذریعہ

ہے۔حسن گفتار میں جادو کا اثر ہے۔ جب کہ بدکلامی سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خدائی دعوت و ارشادات میں گفتار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف تعبیرات کے ذریعے حسن گفتار کی تاکید فرمائی گئی ہے:

وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا [1]	اور ان سے اچھے پیرائے میں گفتگو کرو۔
وَلۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا [2]	انہیں چاہیے کہ سنجیدہ باتیں کریں۔
فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا [3]	ان سے نرمی کے ساتھ بات کریں۔

اس تاکید کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ حسن گفتار میں انسانی وقار اور احترام آدمیت محفوظ رہتا ہے جسے اسلام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ارشاد قدرت ہے :

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى [4]	نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (خیرات لینے والے کو) ایذا دی جائے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ آیہ: قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ [5] نے وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ قول حسن اور قتال، دو الگ الگ موضوعات ہیں۔ لہٰذا یہ نسخ درست نہیں، کیونکہ نسخ وہاں ہوتا ہے، جہاں موضوع ایک ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا کے بارے میں روایت ہے :

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ اَحْسَنَ مَا تُحِبُّونَ اَنْ يُقَالَ لَكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ يُبْغِضُ السَّبَّاب اللَّعَّان الطَّعَّان عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الفَاحِشَ المُفْحِشَ السَّائِلَ وَ يُحِبُّ الحَيِّي حَلِيْم الْعَفِيفَ الْمُتَعَفِّفَ۔ [6]	لوگوں سے ایسی اچھی باتیں کرو جنہیں تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ گالیاں دینے والے، مؤمنین کو طعن و تشنیع کرنے والے اور فحش گفتگو کرنے والے کو سخت ناپسند کرتا ہے، جب کہ باحیا، بردبار اور پاک دامن شخص کو پسند کرتا ہے۔

توریت کے صفحات میں اس عہد و میثاق کی بعض شقوں کا ہم آج بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خروج ۲۰ : ۲۔۵ میں آیا ہے :

> میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے ہے، مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر۔

---

[1] ۴ نساء: ۵　[2] ۴ نساء: ۹　[3] ۱۷ اسراء: ۲۸　[4] ۲ بقرہ: ۲۶۳
[5] ۹ توبہ: ۲۹　[6] المیزان جلد اول ذیل آیہ۔ مجمع البیان ۱: ۱۹۲۔ بحار الانوار ۶۵ : ۱۵۲۔

تحقیق مزید

آیت۸۳: الکافی ۲: ۱۶۴ ـ ۱۶۵ـ الفقیہ ۴ : ۴۰۷ـ الوسائل ۸ : ۳۰۱ـ مستدرک الوسائل ۸ : ۳۱۴ـ ۱۲: ۸۲ـ ۱۲ : ۳۷۷ـ

آیت۸۴ : الکافی ۲ : ۳۸۹ـ تفسیر العیاشی ۱ : ۴۸

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَاۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵ـ پھر تم ہی وہ لوگ ہو جو اپنے افراد کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو، پھر گناہ اور ظلم کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو اور اگر وہ قید ہو کر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو، حالانکہ انہیں نکالنا ہی تمہارے لیے سرے سے حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے سے کفر اختیار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو ایسا کرے دنیاوی زندگی میں اس کی سزا رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور آخرت میں (ایسے لوگ) سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶ـ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیاوی زندگی خرید لی ہے، پس ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہو گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

تشریح کلمات

دِیَار: (د و ر) دار کی جمع ہے۔ محل سکونت۔ بستی۔

تَظٰھَرُوۡنَ: (ظ ہ ر) پشتیبانی، تعاون، مدد۔

اِثۡم: (ء ث م) گناہ۔

الۡعُدۡوَانِ: (ع د و) زیادتی۔ ظلم پیشہ ہونا۔

اُسٰرٰی: (س ر ی) اسیر کی جمع۔ اس کے علاوہ اسریٰ بھی جمع ہے۔ اسی لیے ایک قرائت کی رو سے اسریٰ پڑھا گیا ہے۔ اگر قیدی بیڑیوں میں بند ہوں تو اساری ورنہ اسریٰ کہتے ہیں۔

تُفٰدُوۡھُمۡ: (ف د ی) تفادی۔ فدیہ ادا کرنا۔ فدیہ وہ مال ہے جو قیدی کو چھڑانے کے لیے ادا کیا جاتا ہے۔

خِزۡیٌ: (خ ز ی) رسوائی۔

تفسیر آیات

ثُمَّ اَنۡتُمۡ ہٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ: اس عہد و پیمان کے باوجود یہ لوگ اپنے ہی افراد کا خون بہاتے، انہیں بے گھر کرتے اور اس غیر انسانی عمل کے لیے غیروں سے مدد بھی حاصل کرتے تھے۔

عہد نبوی کے معاصر یہودی، دو بڑے قبائل بنی نضیر اور بنی قریظہ میں بٹے ہوئے تھے۔ دوسری طرف اوس اور خزرج مشرکین کے دو بڑے قبائل تھے۔ یہودی جب آپس میں لڑتے تو مشرکین سے مدد لیتے تھے اور جب کوئی یہودی دوسرے فریق کے اتحادی مشرکین کا اسیر بن جاتا تو یہ فدیہ دے کر اسے چھڑا لیتے تھے۔

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ: کیا تم کتاب خدا کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے سے کفر اختیار کرتے ہو؟

یعنی تم قتل و غارت اور اپنوں کو بے گھر کرتے وقت احکام خدا کو پس پشت ڈال دیتے ہو، لیکن جب فدیہ دے کر اسیروں کو چھڑانے کی نوبت آتی ہے تو حکم خدا کا حوالہ دیتے ہو۔ یہ تبعیض فی الایمان اور تضاد فی العمل کتنی غیر معقول روش ہے۔ یہ روش ایک حد تک مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے کہ بعض مقامات پر قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرنے میں تامل نہیں کرتے اور بعض کم اہمیت کے حامل مقامات پر قرآن کا حوالہ دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ تَبۡعِیۡضٌ فِی الۡاِیۡمَان اور تَضَادٌ فِی الۡعَمَلۡ باہمی جنگ و جدل، دوسروں کی حق تلفی، میثاق خداوندی سے انحراف، آخرکار دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں سخت ترین عذاب کا سبب بنتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آسمانی ادیان کی بنیادی تعلیمات یکساں اور ہم آہنگ ہیں۔

۲۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حسن گفتار کو اپنا شیوہ بنا لیں: وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا۔ مسلمان ہو کر دوسرے مسلمانوں کو گالی گلوچ دینا قرآن کی صریح مخالفت ہے۔

۳۔ والدین کے علاوہ قریب ترین رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر احسان کرنا بھی ایمان کا حصہ ہے۔

۴۔ اللہ سے عہد و پیمان کے باوجود اکثر اصحاب موسیٰ (ع) نے عہد خداوندی کو پامال کیا۔

۵۔ ایمان قابل تفکیک نہیں ہے: اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ ....

۶۔ رواداری کا فقدان دنیاوی ذلت کا موجب بنتا ہے: خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ....

۷۔ آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کا عذاب قابل تخفیف نہیں ہے: فَلَا یُخَفَّفُ ....

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَقَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَفَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے درپے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو نمایاں نشانیاں عطا کیں اور روح القدس کے ذریعے ان کی تائید کی، تو کیا جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف (احکام لے کر) آئے تو تم اکڑ گئے پھر تم نے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو تم لوگ قتل کرتے رہے؟

تشریح کلمات

قَفَّیۡنَا: (ق ف و) پے در پے۔ قفاء۔ پشت، پیچھے۔

الۡبَیِّنٰتِ: (ب ی ن) بینۃ کی جمع ہے۔ واضح دلائل۔ نمایاں نشانیاں۔ وہ نمایاں معجزے مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ بن مریم (ع) کو عطا کیے گئے۔ جیسے مردوں کو زندہ کرنا، مریضوں کو شفا دینا وغیرہ۔ ان معجزات کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

اَیَّدۡنَا: (ا ی د) طاقت دی ۔ اَیّد طاقت۔ تائید طاقت اور قوت دینا۔

رُوۡحِ الۡقُدُس: قُدس پاکیزگی، یعنی ہر نقص سے پاک ہونا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں قُدس

بھی ہے۔ اس آیت میں رُوْحِ الْقُدُس سے مراد جبرئیل یا کوئی اور مقرب فرشتہ ہے۔

تَهْوٰٓى: (ہ و ی) هَوٰى، خواہشات نفسانی۔ ہوا و ہوس اردو میں بھی مستعمل ہے۔

تفسیر آیات

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَقَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ: ہم نے موسیٰ (ع) کو کتاب دی یعنی توریت عطا کی جو پہلی آسمانی کتاب ہے۔ ان کے بعد رسولوں کا سلسلہ جاری رہا جو شریعت موسوی کی تجدید کرتے رہے۔

وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ: حضرت عیسیٰ (ع) بنی اسرائیل کے آخری اولو العزم نبی تھے۔ ان کی بعثت سے توریت کی شریعت منسوخ ہو گئی۔ بعض مفسرین کے نزدیک رُوْحِ الْقُدُس سے مراد جبرائیلؑ ہیں جو انبیاءؑ پر وحی لے کر نازل ہوتے رہے۔ تمام انبیاءؑ نے ان سے مدد لی۔ بالخصوص حضرت عیسیٰ (ع) کو ہمیشہ روح القدس کی تائید حاصل تھی جو ایام حمل سے لے کر آسمان پر اٹھانے تک شامل حال رہی۔ رُوْحِ الْقُدُس کی یہ تائید حضرت عیسیٰ (ع) کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہے۔ چونکہ آپ (ع) کی ولادت عام بشری طریقے سے ہٹ کر اور ملکوتی فیض سے ہوئی، اس لیے آپ (ع) کے مزاج پر ملکوتیت غالب رہی۔ چنانچہ آپ (ع) رُوْحِ الْقُدُس سے زیادہ مانوس تھے۔

مخفی نہ رہے کہ رُوْحِ الْقُدُس کا اس تثلیث مقدس سے کوئی تعلق نہیں جو مسیحی نظریہ ہے نیز حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ (ص) جبرائیل کے محتاج نہ تھے بلکہ وہ آپ (ع) کے خدمت گزار تھے۔

بعض مفسرین کے نزدیک رُوْحِ الْقُدُس سے مراد ایک ایسی غیبی طاقت ہے جو کم و بیش تمام مؤمنین میں ان کے ایمانی درجات کے مطابق موجود ہوتی ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰ (ع) میں یہ طاقت بدرجہ اتم موجود تھی اور انہیں ہمیشہ اس کی تائید حاصل رہی۔

اہم نکات

۱۔ خواہشات نفسانی انبیاءؑ کی تکذیب اور ان کے قتل کا باعث بنتی ہیں: تَهْوٰٓى اَنۡفُسُکُمُ ... الخ۔

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور وہ کہتے ہیں: ہمارے دل غلاف میں بند ہیں، (نہیں) بلکہ ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی ہے، پس اب وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۫ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۹﴾	۸۹۔ اور جب اللہ کی جانب سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس موجود باتوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور وہ پہلے کافروں پر فتح کی امید رکھتے تھے، پھر جب ان کے پاس وہ آ گیا جسے وہ خوب پہچانتے تھے تو وہ اس کے منکر ہو گئے، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہو۔

تشریح کلمات

غُلۡفٌ: (غ ل ف) غلاف یا جلد میں بند۔ غُلۡفٌ غلاف کی جمع ہے۔

لَعَنَ: (ل ع ن) لعنت۔ غیض و غضب کی وجہ سے راندۂ درگاہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا مطلب یہ ہے کہ ملعون دنیا میں اس کی رحمت و ہدایت سے دور اور آخرت میں اس کی نعمت سے دور ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

یہودی کہتے تھے: ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں۔ ان پر اسلام کی تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ہم اپنے آبائی دین کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان کے دل غلاف میں محفوظ نہیں، بلکہ کفر و نافرمانی کی وجہ سے یہ لوگ لعنتی اور ناقابل ہدایت ہو چکے ہیں۔

حضرت ختمی مرتبت (ص) کے مبعوث برسالت ہونے سے پہلے یہودی اہل کتاب اور مومن سمجھے جاتے تھے اور مشرکین کافر۔ لیکن رسالتمآب کی بعثت کے بعد یہودیوں پر بھی کفر کا اطلاق ہو گیا۔

شان نزول

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ: وَ لَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ ... کے بارے میں مروی ہے کہ فرمایا:

> یہودیوں نے اپنی کتب میں پڑھا تھا کہ رسول اکرم (ص) کا مقام ہجرت عیر اور احد کے درمیان ہو گا۔ وہ اس جگہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ جب وہ حداد نامی پہاڑ تک پہنچے تو کہنے لگے کہ حداد اور احد ایک ہی چیز ہے۔

چنانچہ وہ یہیں پر منتشر ہوگئے۔ کچھ تیما میں مقیم ہو گئے، بعض فدك میں بس گئے اور کچھ لوگ خیبر میں رہنے لگے۔ بعد میں تیما میں رہنے والوں نے اپنے دوسرے بھائیوں سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اسی دوران بنی قیس کا ایک عرب وہاں سے گزرا۔ انہوں نے اس سے سواریاں کرائے پر لیں۔ اس عرب نے کہا: میں تمہیں عیر اور احد کی پہاڑیوں پر لے جاؤں گا۔ انہوں نے کہا: جب وہاں پہنچو تو ہمیں بتا دینا۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو عرب نے کہا: عیر اور احد کی درمیانی جگہ یہی ہے۔ یہ سن کر یہودی سواریوں سے اتر پڑے اور بولے ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اب ہمیں تمہاری سواریوں کی ضرورت نہیں رہی۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ پھر انہوں نے فدك اور خیبر میں مقیم اپنے افراد کو اطلاع دی کہ ہم نے مقام ہجرت تلاش کر لیا ہے، تم بھی یہاں آ جاؤ۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم یہاں پر بس گئے ہیں۔ گھر بار اور مال و دولت کا اہتمام کر چکے ہیں۔ مدینہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ جب وہ وقت آیا تو ہم بھی تمہارے پاس آ جائیں گے۔ بہرکیف یہ لوگ مدینہ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ خبر تبع نامی بادشاہ تک پہنچی تو اس نے حملہ کر دیا۔ یہودی قلعہ بند ہو گئے۔ اس نے محاصرہ کر لیا لیکن بعد میں امان دے دی۔ جب یہ بادشاہ کے پاس آئے تو اس نے کہا: مجھے یہ جگہ پسند آ گئی ہے۔ میں یہاں تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ یہودیوں نے جواب میں کہا: ہرگز نہیں۔ یہ جگہ ایک پیغمبر (ص) کا مقام ہجرت ہے۔ ان کے علاوہ کوئی شخص یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے کہا: میں اپنے خاندان کے کچھ افراد چھوڑے جا رہا ہوں تاکہ جب وہ رسول (ص) آئیں تو یہ ان کی مدد کریں۔ چنانچہ اس نے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو یہاں ٹھہرایا۔ جب ان قبائل کی آبادی بڑھ گئی تو انہوں نے یہودیوں کے مال و دولت پر تجاوز کرنا شروع کر دیا۔ یہودی ان سے کہتے تھے کہ جب محمد (ص) مبعوث ہوں گے تو تمہیں ہمارے علاقے سے نکال باہر کریں گے۔ لیکن جب پیغمبر اکرم (ص) مبعوث ہوئے تو اوس و خزرج ان پر ایمان لے آئے اور انصار مشہور ہوئے، جب کہ یہودیوں نے کفر اختیار کیا۔ چنانچہ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: پہلے یہ لوگ کفار پر فتح کی امید رکھتے

تھے، لیکن جب ان کے پاس وہ آ گیا جسے وہ خوب پہچانتے تھے تو اس کے منکر ہو گئے۔[1]

اہم نکات

۱۔ انتظار قائم (عج) کے لیے عصیان سے بچنا ضروری ہے، ورنہ ظہور منتظر (عج) کے بعد گنہگار فیض سے محروم رہ جائیں گے۔

۲۔ اکثریت حق کی دلیل نہیں ہے: فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ....

۳۔ حق پرستی کا اعزاز ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ حق پرست افراد کی کمی کوئی عیب نہیں ہے۔

تحقیق مزید: الکافی ۸ : ۳۰۸۔ ۳۱۰۔ تفسیر العیاشی ۱ : ۴۹

بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ۝۹۰

۹۰۔ کتنی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کہ صرف اس بات کی ضد میں خدا کے نازل کیے کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا فضل نازل کرتا ہے، پس وہ اللہ کے غضب بالائے غضب میں گرفتار ہوئے اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

تشریح کلمات

بَآءُوۡا: فعل ماضی باء۔ یبوء ۔ مکان، بواء، ہموار جگہ۔ اللہ کے غضب کے لیے انہوں نے راہ ہموار کی یعنی اس کے سزاوار ٹھہرے۔

مُّهِيۡنٌ: (ہ و ن) اھانۃ سے اسم فاعل ہے۔ یعنی ذلیل و رسوا کرنے والا۔

تفسیر آیات

یہودی اس انتظار میں تھے کہ آنے والے رسول (ص) یہودی قبائل میں سے ہوں گے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ رسول (ص) قریش سے مبعوث ہوئے ہیں تو صرف حسد کی بنیاد پر کفر اختیار کیا۔ بدترین

---

[1] المیزان ۱ : ۲۲۳

کفر وہ ہے جو حق واضح ہو جانے کے بعد دوسرے عوامل کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت واضح ہوجانے کے باجود یہودی اس بنیاد پر کفر اختیار کر رہے ہیں کہ اس رسول (ص) کی تعلیمات میں یہودیوں کو دوسروں سے ممتاز مقام دینے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ حسد انسان کو کفر کی سرحد تک لے جاتا ہے

۲۔ حق کے واضح ہونے پر بھی کفر اختیار کرنے والوں پر اللہ کا غضب بالائے غضب ہوتا ہے

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا وَ یَکۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَہٗ ٭ وَ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَہُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰہِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو جواب دیتے ہیں: ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے، اس کے علاوہ وہ کسی چیز کو نہیں مانتے، حالانکہ وہ حق ہے اور جو کتاب ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے، کہدیجیے: اگر تم مومن تھے تو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو؟

تفسیر آیات

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ: جب یہودیوں کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اپنے دین کو آخری دین سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم صرف توریت پر ایمان لانے کے پابند ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ خود توریت کے مطابق یہودیت آخری دین نہیں بلکہ اس میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی خوشخبری موجود تھی۔

قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰہِ: اگر تمہارا یہ دعویٰ نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا ہم تو اس (توریت) پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی، درست ہے تو تم نے انبیاءؑ کو کیوں قتل کیا؟ حالانکہ وہ بِمَا اُنۡزِلَ عَلَیۡکُم یعنی توریت ہی کی تشریح و تفسیر اور اس کے احکام کی ترویج کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

وَلَقَدۡ جَآءَکُمۡ مُّوۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔اور بتحقیق موسیٰ واضح دلائل لے کر تمہارے پاس آئے پھر اس کے بعد تم نے گوسالہ کو اختیار کیا اور تم لوگ ظالم ہو۔

تفسیر آیات

وَلَقَدۡ جَآءَکُمۡ مُّوۡسٰی...الخ۔ بنی اسرائیل کی ضلالت اور مشرکانہ حرکات کی طرف تعجب کے انداز میں اشارہ ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے خود صاحب شریعت کی زندگی میں مشرکانہ عمل شروع کر دیا۔ صرف چند روز کی غیبت کی وجہ سے اکثر گمراہ ہو گئے اور وہ بھی گوسالہ پرستی جیسے ذلت آمیز اور پست عمل کو اختیار کر کے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسی نامعقول حرکت حضرت موسیٰ (ع) کی طرف سے واضح دلائل اور روشن نشانیاں آنے کے بعد عمل میں آئی۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّاسۡمَعُوۡا ؕ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا ٭ وَاُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ بِکُفۡرِہِمۡ ؕ قُلۡ بِئۡسَمَا یَاۡمُرُکُمۡ بِہٖۤ اِیۡمَانُکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور کوہ طور کو تمہارے اوپر اٹھایا تھا (اور حکم دیا تھا) جو چیز (توریت) ہم نے تمہیں دی ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور سنو، انہوں نے کہا: ہم نے سن تو لیا مگر مانا نہیں اور ان کے کفر کے باعث ان کے دلوں میں گوسالہ رچ بس گیا، کہد یجیے: اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تم سے بہت برے تقاضے کرتا ہے۔

تشریح کلمات

اُشۡرِبُوۡا: (ش ر ب) سے اشراب۔ سیراب کرنا۔ پینے پر آمادہ کرنا۔ پانی جڑوں تک پہنچانا۔ محبت کے لیے دل میں جگہ دینا۔ وَاُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ یعنی ان کے دل گوسالہ سے سیر ہوئے (مراد گوسالہ پرستی ہے)۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا..الخ۔اس آیت کی تفسیر کے لیے اسی سورہ کی آیت ۶۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

قُلۡ اِنۡ کَانَتۡ لَکُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ کہد یجیے: اگر اللہ کے نزدیک دار آخرت دوسروں کی بجائے خالصتاً تمہارے ہی لیے ہے اور تم (اس بات میں) سچے بھی ہو تو ذرا موت کی تمنا کرو۔

وَ لَنۡ یَّتَمَنَّوۡہُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور وہ موت کے متمنی ہرگز نہ ہوں گے ان گناہوں کی وجہ سے جو وہ اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

خَالِصَۃً: (خ ل ص) خلوص۔ ماسوی اللہ سے منقطع ہو کر صرف اللہ کا ہونا۔ یعنی ہر قسم کے شا ہے سے پاک۔

تفسیر آیات

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ اخروی زندگی صرف انہی کے لیے مخصوص ہے، جب کہ دوسرے لوگ اس سے محروم ہوں گے اور اگر کسی یہودی کو عذاب ہو گا بھی تو صرف چند دنوں کے لیے۔ مثلاً جتنے دن گوسالہ پرستی میں گزرے ہیں، وہ عذاب کے دن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس عقیدے کے مطابق الزامی تنبیہ فرمائی کہ اگر آخرت کی زندگی اور آسودگی صرف تمہارے لیے ہی چشم براہ ہے تو اس کے حصول کی کوشش ایک طبعی اور فطری امر ہے۔ بنابریں اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے تو دکھاؤ.

سورۂ جمعہ آیت ۶ میں بھی ارشاد ہے:

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ ہَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○

کہد یجیے: اے یہودیت اختیار کرنے والو! اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو دوسرے لوگ نہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

اس آیت سے اولیاء اللہ کا معیار بھی اجاگر ہو جاتا ہے کہ اللہ کا ولی موت کا مشتاق اور درگاہ الٰہی

میں جانے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ ولی خدا حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

وَ اللّٰہِ لَاِبْنُ اَبِی طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوتِ مِنَ الطِفْلِ بِثَدْیِ اُمِّہٖ۔[1]

قسم بخدا! ماں کے سینے سے بچے کے انس سے زیادہ ابو طالب کا بیٹا موت سے مانوس ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَوَ اللّٰہِ مَا اُبَالِیْ دَخَلْتُ اِلَی الْمَوْتِ اَوْ خَرَجَ الْمَوْتُ اِلَیَّ۔[2]

قسم بخدا! مجھے پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ گرتی ہے یا میں موت پر جا گرتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ خود پرستی انسان کو قبول حق سے باز رکھتی ہے۔

۲۔ اگر ایک نبی کے زندہ ہوتے ہوئے لوگ خدا کو چھوڑ کر گوسالہ پرست ہو سکتے ہیں تو دوسرے نبی (ص) رحلت کے بعد لوگ اس کے منصوص وصی کو چھوڑ دیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

۳۔ یہودی سابقہ گناہوں کے باعث گوسالہ پرستی کی ذلت میں مبتلا ہوئے: وَاُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ بِکُفۡرِہِمۡ ۔

۴۔ مومن ہمیشہ لقاء اللہ کا مشتاق رہتا ہے: فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ ....۔

۵۔ بدکار انسان لقائے رب سے ہراساں رہتا ہے۔

تحقیق مزید: آیت ۹۴: تفسیر القمی ۱: ۵۴

وَلَتَجِدَنَّہُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚۛ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚۛ یَوَدُّ اَحَدُہُمۡ لَوۡ یُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ وَمَا ہُوَ بِمُزَحۡزِحِہٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ (اے رسول) اور آپ ان لوگوں کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پائیں گے، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ، ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش اسے ہزار سال عمر ملے، حالانکہ اگر اسے یہ عمر مل بھی جائے تو یہ بات اس کے عذاب کو ہٹا نہیں سکتی اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اسے خوب دیکھتا ہے۔

تشریح کلمات

اَحۡرَصَ: (ح ر ص) سب سے زیادہ لالچی۔ لغوی معنی کپڑے کو پوری قوت سے نچوڑنے کے ہیں اور

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۵ ص ۱۰۸
[2] نہج البلاغۃ خ ۵۵ ص ۱۹۷

قرآن میں اس لفظ سے مراد کسی چیز کو پوری قوت سے چاہنا ہے۔

یَوَدُّ: (و د د) مودة محبت۔ دوستی۔

یُعَمَّرُ: (ع م ر) زندگی بسر کرنا۔ معمور ہونا۔ آباد ہونا۔

مُزَحْزِحِ (ز ح ز ح) زحزاح ہٹا دینا۔ جھاڑ کر الگ کر دینا۔

تفسیر آیات

یہودیوں کی طرف سے موت کی تمنا تو درکنار، یہ لوگ دوسروں کی نسبت زندگی کے زیادہ ہی حریص ہیں۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ اخروی زندگی کو اپنے لیے مخصوص سمجھنے والے دنیاوی زندگی کے زیادہ حریص ہیں۔ یہاں تک کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ جو معاد اور اخروی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔

قُلۡ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلۡبِکَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ ہُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ آپ کہد یجیے: جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے (وہ یہ جان لے کہ) اس نے (تو) اس قرآن کو باذن خدا آپ کے قلب پر نازل کیا جو اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو پہلے سے موجود ہے اور یہ (قرآن) ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

تشریح کلمات

جِبۡرِیۡل: غیر عربی لفظ ہے جو بنا برقولے جبر اور ایل سے مرکب ہے۔ یعنی 'قوت خدا'۔ جبرئیل ایک عظیم فرشتہ ہے جو انبیاء (ع) تک وحی پہنچانے کا کام سرانجام دیتا رہا۔

قَلۡب: اس کی بحث مقدمہ میں ہو چکی ہے کہ قلب سے مراد صنوبری شکل کا عضوء لحمی نہیں بلکہ اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ انسان کے اندر مختلف صلاحیتیں، پہلو اور جہتیں ہوتی ہیں جو ایک ہی مرکز سے مربوط و منسلک ہیں۔ خود عقل بھی ان میں سے ایک ہے، جو اسی مرکز سے مربوط ہے۔ یہ مرکز قلب کہلاتا ہے جسے نفس اور روح بھی کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

قُلۡ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ: اس آیہ شریفہ میں حضرت جبرائیلؑ کے بارے میں یہودی عقیدے

کی تردید ہے کہ جبرائیلؑ سے دشمنی اللہ سے دشمنی کے مترادف ہے، کیونکہ جبرائیل کا کام حضرت محمد (ص) پر وحی نازل کرنا ہے اور یہ کام وہ از خود نہیں، بلکہ خدا کے حکم سے کرتا ہے۔ پھر یہ بات کوئی انوکھی تو نہیں جو قابل قبول نہ ہو، بلکہ تمہاری کتب میں بھی موجود ہے۔

شان نزول

ابن عباس راوی ہیں کہ جب رسول خدا (ص) مدینہ تشریف لائے تو ابن صوریا فدک کے کچھ یہودیوں کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کچھ سوال کیے:

ابن صوریا: یا محمد (ص) آپ کو نیند کس طرح آتی ہے؟

حضور (ص): میری آنکھ سو جاتی ہے، لیکن دل بیدار رہتا ہے۔

ابن صوریا: بے شک آپ (ص) نے سچ کہا ہے۔ یہ بتائیں کہ بچہ مرد سے ہوتا ہے یا عورت سے؟

حضور (ص): ہڈی، اعصاب اور رگیں مرد کی طرف سے، لیکن گوشت، خون، ناخن اور بال عورت کی طرف سے ہوتے ہیں۔

ابن صوریا: آپ (ص) نے درست فرمایا۔ یہ فرمائیں: کیا وجہ ہے کہ بچہ جب ددھیال سے مشابہت رکھتا ہو تو ننھیال سے اس کی کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر ننھیال سے مشابہت ہو تو ددھیال سے مشابہت نہیں ہوتی۔

حضور (ص): جس طرف کا پانی غالب آئے، اسی سے مشابہت ہو جاتی ہے۔

ابن صوریا: آپ (ص) نے سچ فرمایا۔ اپنے رب کے بارے میں آپ کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟

حضور (ص) نے جواب میں سورہ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَد کی تلاوت فرمائی۔

ابن صوریا: اب صرف ایک ہی خصلت باقی رہ گئی ہے۔ اگر آپ (ص) نے صحیح جواب دیا تو ہم آپ (ص) پر ایمان لے آئیں گے اور آپ (ص) کی اتباع کریں گے۔ یہ فرمائیں کہ جو فرشتہ آپ (ص) کے پاس وحی لے کر آتا ہے، اس کا نام کیا ہے؟

حضور (ص): جبرائیل۔

ابن صوریا: یہ تو ہمارا دشمن ہے جو جنگ و جدال جیسے سخت احکام لے کر آتا ہے۔ جب کہ میکائیل ہمیشہ آسان اور راحت بخش احکام لے کر آتا ہے۔ اگر آپ (ص) پر وحی لے کر آنے والا فرشتہ میکائیل ہوتا تو ہم آپ (ص) پر ضرور ایمان لے آتے۔[1]

عَلٰی قَلۡبِكَ: اس بات کی تفصیل مقدمے میں بیان ہو چکی ہے کہ قلب سے مراد کیا ہے اور حضور (ص) وحی کا ادراک کیسے فرماتے تھے۔

---

[1] مجمع البیان ۱: ۳۲۵۔ بحار الانوار ۹: ۶۵

تحقیق مزید

تفسیر القمی ۱: ۵۴۔ علل الشرائع ۱: ۹۴

مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ جِبۡرِیۡلَ وَ مِیۡکٰلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ﴿۹۸﴾

۹۸۔ جو کوئی اللہ، اس کے فرشتوں، رسولوں اور (خاص کر) جبرائیل و میکائیل کا دشمن ہو تو اللہ (ایسے) کافروں کا دشمن ہے۔

تشریح کلمات

مِیۡکٰلَ: یہ بھی غیر عربی لفظ ہے اور ایک جلیل القدر فرشتے کا نام ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں فرشتوں اور رسولوں کے دشمن کو اللہ نے اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ معصومین (ع) کی اطاعت، عین اطاعت الٰہی اور ان کی مخالفت، عین مخالفت حق ہے۔ لیکن معصوم پر غیر معصوم کا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے معصوم نمائندوں سے دشمنی اللہ سے عداوت ہے، جو کفر ہے۔

وَ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَکۡفُرُ بِہَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور ہم نے آپ پر واضح نشانیاں نازل کی ہیں اور ان کا انکار صرف بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

اَوَ کُلَّمَا عٰہَدُوۡا عَہۡدًا نَّبَذَہٗ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ کیا (ایسا نہیں ہے کہ) ان لوگوں نے جب بھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے اٹھا پھینکا، بلکہ ان میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔

وَ لَمَّا جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَہُمۡ نَبَذَ فَرِیۡقٌ

۱۰۱۔ اور جب اللہ کی جانب سے ان کے پاس ایک ایسا رسول آیا جو ان کے ہاں موجود (کتاب)

مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

کی تصدیق کرتا ہے تو اہل کتاب میں سے ایک ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ اسے جانتے ہی نہیں۔

تشریح کلمات

فَاسِق: (ف س ق) فسق شرعی حدود سے تجاوز کرنا۔ عربی میں جب پھل پک کر چھلکے سے باہر نکل آئے تو کہتے ہیں: فسق الرطب عن قشرہ۔ چوہے کو فُوَيْسَقَه کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بار بار اپنے بل سے باہر نکلتا ہے یا اس لیے کہ چوہے میں خباثت زیادہ پائی جاتی ہے۔

فاسق کا مفہوم کافر سے زیادہ وسیع ہے۔ یعنی کافر اور غیر کافر دونوں فاسق ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ شرعی اور عقلی حدود سے تجاوز کے درجات و مدارج ہیں۔ معمولی تجاوز کو گناہ یا فسق کہتے ہیں۔ جب کہ بعض غیر معمولی اور بڑے گناہوں کو کفر کہا جاتا ہے۔ البتہ عرفاً صرف بڑے گناہوں کے ارتکاب کو فسق کہتے ہیں۔

نَبَذَ: (ن ب ذ) کسی چیز کو حقارت سے دور پھینک دینا۔

تفسیر آیات

قرآن مجید متعدد آیات میں ارشاد فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو من حیث القوم کتاب دی گئی۔ اگر چہ رسول خدا (ص) کے معاصر اہل کتاب کے پاس توریت و انجیل کا کامل نسخہ موجود نہیں تھا۔ ہم سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں بتائیں گے کہ توریت و انجیل کا ایک حصہ موجودہ تحریف شدہ توریت و انجیل میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی مفہوم اس آیت میں صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ... [1]

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے...۔

یہاں ”کچھ حصے“ سے مراد توریت و انجیل ہے۔ کیونکہ علمائے یہود و نصاریٰ کو اس میں سے صرف کچھ کا علم ہے، باقی تحریف ہو چکا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کس قدر افسوسناک ہے کہ یہودی اس قرآن کو بھی جھٹلاتے ہیں جو ان کی شریعت کی تصدیق کرتا ہے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۲۳

وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ ہَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ؕ فَیَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡہُمَا مَا یُفَرِّقُوۡنَ بِہٖ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ زَوۡجِہٖ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِہٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ ؕ وَ لَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ ۟ؕ وَ لَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ اور سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین جو کچھ پڑھا کرتے تھے یہ (یہودی) اس کی پیروی کرنے لگ گئے، حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین کفر کیا کرتے تھے، جو لوگوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتے تھے اور وہ اس (علم) کی بھی پیروی کرنے لگے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کیا گیا تھا، حالانکہ یہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے خبردار نہ کر لیں کہ (دیکھو) ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، کہیں تم کفر اختیار نہ کر لینا، مگر لوگ ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ لیتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی ڈال دیتے، حالانکہ اذن خدا کے بغیر وہ اس کے ذریعے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے اور یہ لوگ اس چیز کو سیکھتے تھے جو ان کے لیے ضرر رساں ہو اور فائدہ مند نہ ہو اور تحقیق انہیں علم ہے کہ جس نے یہ سودا کیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کاش وہ جان لیتے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کا بہت برا سودا کیا ہے۔

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَمَثُوۡبَۃٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ خَیۡرٌ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے پاس اس کا ثواب کہیں بہتر ہوتا، کاش وہ سمجھ لیتے۔

تشریح کلمات

الشَّیٰطِیۡنَ: شَیْطَان کی جمع اور شطن سے ماخوذ ہے۔ یعنی حق سے دوری اختیار کرنے والا۔ یہاں ابلیس نہیں بلکہ دوسرے سرکش عناصر مراد ہیں۔ جب یہ لفظ جمع کی صورت میں آئے تو اس سے شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں مراد لیے جا سکتے ہیں۔

مُلۡك: (م ل ك) حکومت۔ سلطنت۔ بادشاہت۔

سُلَیۡمٰنُ: عبرانی لفظ ہے۔ سلیمان (ع) حضرت داؤد علیہ السلام کے چار فرزندوں میں سے ایک کا نام ہے۔ وہ غالباً ۹۹۰ قبل مسیح مبعوث برسالت ہوئے۔ سلیمان (ع) شام و فلسطین کے علاوہ مشرق میں عراق اور مغرب میں مصر تک کے وسیع علاقے پر حکمران رہے۔

السِّحۡرَ: (س ح ر) کسی بات کو مسخ کر کے دکھانا۔ دھوکا دینا۔ جادو۔

بَابِل: ایک قدیم مملکت کے دار الحکومت کا نام ہے۔ یہ تاریخی شہر بغداد سے ۶۰ میل جنوب کی طرف موجودہ شہر حلہ کے قریب آباد تھا۔ اس کے شہرہ آفاق آثار قدیمہ آج بھی اس شہر کے تمدن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہاں کلدانی قوم آباد تھی۔ ان کی سلطنت ۳۰۰۰ قبل از مسیح موجود تھی۔ ۲۱۰۵ قبل از مسیح میں سوموا بوم اموری نے بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے کا چھٹا بادشاہ حمورابی تھا، بعض کے مطابق اس نے سب سے پہلے دنیا میں قوانین حکومت وضع کیے۔ برج بابل اور اس کے معلق باغات دنیا کے سات عجائبات میں شامل ہیں۔

هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ: دو فرشتوں کے نام ہیں جو اہل بابل کی اصلاح و ہدایت کے لیے انسانی قالب میں بھیجے گئے تھے۔

فِتۡنَۃٌ: (ف ت ن) امتحان و آزمائش۔ لغت میں سونے کو آگ میں ڈال کر اس کا کھوٹ الگ کرنا فتنہ کہلاتا ہے۔ فتانہ سے مراد وہ پتھر ہے جس سے سونے اور چاندی کو پرکھا جاتا ہے۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ... [1]	اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ○ [2]	کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ کہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

واضح رہے کہ اللہ کی طرف سے امتحان و آزمائش کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اچھے اور برے کو

---

[1] ۸ انفال: ۲۸ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲

پہچاننا چاہتا ہے، کیونکہ وہ تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہم سے قریب اور علام الغیوب ہے۔ اللہ کے امتحان سے خود انسان کا جوہر نکھرتا ہے۔ وہ ارتقا و تکامل کے لائق اور عملی اعتبار سے ثواب و عقاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ورنہ فقط علم خدا سے نہ تو ارتقائی مراحل طے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ثواب و عقاب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

فتنة اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو امتحان و آزمائش کہلاتا ہے اور کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے، لیکن جب یہ عمل بندوں سے منسوب ہو تو قابل مذمت مفہوم بن جاتا ہے اور فساد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے: وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ...[1] فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔

اِذْن : (ا ذ ن) اجازت دینا۔ مباح قرار دینا۔ امر کرنا۔ حکم دینا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ سے منسوب ہو تو ارادہ، مشیت اور الٰہی دستور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مَثُوْبَۃٌ: (ث و ب) ثواب۔ کسی چیز کا مناسب اور شائستہ مقام۔ منزل مقصود کی طرف بڑھنا۔ روئی سے دھاگہ تیار کرنے کے بعد مختلف مراحل سے گزار کر اس سے جو کپڑا تیار ہوتا ہے اسے ثوب کہتے ہیں، کیونکہ دھاگہ اپنی غایت اور منزل تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔

جزائے عمل کو بھی ثواب کہنے کی وجہ یہی ہے کہ انسانی عمل منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے: وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ۔[2] اور اللہ ہی کے پاس بہترین جزا ہے۔

تفسیر آیات

وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ : یہ یہودی وحی خدا کی اتباع کرنے کی بجائے سفلی علوم کے شیدائی ہیں، جنہیں ان لوگوں نے شیاطین سے اخذ کیا ہے۔

احادیث کے مطابق حضرت سلیمان (ع) کے عہد میں جب سحر و جادو عام ہونے لگا تو حضرت سلیمان (ع) نے ان تمام اوراق و اسناد کو ضبط کر لیا جن پر جادو تحریر تھا اور انہیں ایک جگہ محفوظ کر لیا۔ آپ (ع) کی وفات کے بعد کچھ افراد ان تحریروں کو منظر عام پر لے آئے۔ اس طرح جادو پھر سے رواج پکڑنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اس سے یہ عندیہ لیا کہ سلیمان (ع) پیغمبر نہ تھے بلکہ انہوں نے جادو کے ذریعے جن و انس کو مسخر کیا ہوا تھا۔ یہودیوں کے ایک فرقے نے بھی یہی نظریہ اختیار کیا۔ اس زعم باطل کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا ...۔ سلیمان نے کفر نہیں کیا جب کہ شیاطین کفر کیا کرتے تھے۔

سحر کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ یہ ایک خیالی فریب ہے:

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۹۱　[2] ۳ آل عمران: ۱۹۵

يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ○ [1]	...ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہوئیں۔

نیز سورۂ اعراف میں ارشاد فرمایا:

سَحَرُوۡۤا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَ اسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ ... [2]	لوگوں کی نگاہوں کو مسحور اور انہیں خوفزدہ کر دیا۔

ان دو آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سحر ایک خیالی فریب اور نظروں کا دھوکہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ کا جملہ وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّيٰطِيۡنُ پر عطف ہوتا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ یہودی، عہد سلیمان کے سفلی علوم اور ان چیزوں کی پیروی کرتے ہیں جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتاری گئی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس جملے کو السحر پر عطف کیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ بنتا ہے: شیطان لوگوں کو جادو اور ان چیزوں کی تعلیم دیتے تھے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتاری گئیں۔ البتہ پہلی ترکیب سیاق آیت کے مطابق ہے۔

بَابل: بابل اس دور میں جہاں تمدن کا مرکز تھا، وہاں سحر و جادو کا بھی گڑھ تھا۔ دنیا میں خرافات کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ یہ ایک اہم تجارتی مرکز اور پوری دنیا سے مربوط تھا۔ لہٰذا انبیائے کرام (ع) کی توجہ بھی یہیں پر مرکوز رہی۔

حضرت ابراہیم (ع) کی چراگاہ بانیتا قادسیہ میں اب بھی بابل کے قریب موجود ہے اور نمرود کا وہ ٹیلہ بھی اسی شہر میں موجود ہے، جہاں حضرت ابراہیم (ع) کو آگ میں پھینکا گیا تھا۔ اسی طرح مسجد کوفہ اور مسجد سہلہ میں مقام ادریس و ابراہیم علیہما السلام ابھی تک موجود ہیں۔

حضرت امام علی (ع) نے کوفہ کے بارے میں فرمایا: انها سرة بابل۔ [3] یہ جگہ بابل کی پشت ہے یعنی بابل سے متصل جگہ ہے۔

حضرت ہود اور صالح علیہما السلام کی قبور کوفہ سے باہر معروف و مشہور ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام جب خوارج کے واقعے میں بابل پہنچے تو آپ (ع) نے فرمایا:

هَذِهِ اَرۡضٌ مَلۡعُوۡنَةٌ قَدۡ عُذِّبَتۡ فِی الدَّهۡرِ مَرَّتَيۡنِ وَ هِیَ تَتَوَقَّعُ الثَّالِثَةَ وَ هِیَ اِحۡدَى الۡمُؤۡتَفِكَاتِ وَ هِیَ اَوَّلُ اَرۡضٍ عُبِدَ فِيۡهَا وَثَنٌ ۔ [4]	یہ ملعون سرزمین ہے جو دو بار عذاب میں مبتلا ہوئی اور تیسری دفعہ کی توقع ہے اور یہ الٹی ہوئی بستیوں میں سے ایک ہے اور یہی وہ پہلی سرزمین ہے جس میں بت پرستی ہوئی۔

---

[1] ۲۰ طہ: ۶۶　[2] ۷ اعراف: ۱۱۶　[3] بظاہر سرأة ہے　[4] مواهب الرحمن ۱: ۳۸۶

ہاروت ماروت: یہ ان دو فرشتوں کے غیر عربی نام ہیں جنہیں ابطال سحر کی غرض سے انسانی صورت میں بابل بھیجا گیا تھا۔ انہیں بابل بھیجنا اس لیے ضروری تھا کہ وہاں جادوگری عام ہو چکی تھی اور چونکہ جادو کے علل و اسباب مخفی ہوتے ہیں، لہٰذا سادہ لوح عوام اسے غیر معمولی کارنامہ اور معجزہ سمجھتے ہیں۔ بنا برایں ان حالات میں انبیاءؑ کی حیثیت کاہنوں اور جادوگروں کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ جو نبی بھی مبعوث ہوتے انہیں لوگ کاہن اور جادوگر قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز کے لیے ان دو فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے جادو کے مخفی اسباب کو آشکار کیا۔ یہودیوں نے اس موقع سے بھی غلط استفادہ کیا اور ان اسباب کے بارے میں معلومات حاصل کر کے انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

نزول سحر: اکثر مفسرین کے نزدیک وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَـكَيۡنِ سے مراد یہ ہے کہ ان دو فرشتوں پر جادو کا ہنر نازل ہوا تھا۔ اس پر دو اعتراض کیے گئے ہیں:

۱۔ سحر ایک ناپاک عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کفر قرار دیا ہے۔ ایسی چیز فرشتوں پر کیسے نازل ہو سکتی ہے اور فرشتے اسے لوگوں میں کیسے پھیلا سکتے ہیں؟۔

۲۔ اگر مَا تَتۡلُوا الشَّيٰطِيۡنُ کی طرح وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَـكَيۡنِ بھی سحر ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ سحر کو سحر پر عطف کیا گیا ہے اور معطوف و معطوف علیہ میں کسی قسم کی مغایرت نہ ہونے کی وجہ سے یہ عطف الشیء علی نفسہ ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سحر کا عمل ناپاک ہے، نہ کہ سحر کا سیکھنا، خاص کر اس صورت میں جب سحر کا سیکھنا ابطال باطل (باطل کو غلط ثابت کرنے) کے لیے ہو۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ دونوں فرشتے تنبیہ کے طور پر تعلیم دیتے تھے، دعوت کے طور پر نہیں۔[1] یعنی یہ فرشتے سحر کے پوشیدہ اسباب سے آگاہ کرتے تھے اور ان پر عمل کرنے سے روکتے تھے۔ اسی لیے یہ علم ان کے لیے آزمائش بن گیا۔

فرشتے برملا یہ کہتے تھے: اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ ۔ ہم تو صرف آزمائش ہیں، پس کفر اختیار نہ کرو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں طاقت آ جائے تو یہ اس کے لیے امتحان ہے۔ چنانچہ مغرب کے مادہ پرست انسان کے ہاتھوں میں ایٹمی طاقت ایک امتحان ہے کہ آیا وہ اس قوت کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے یا اس سے انسانی ہلاکت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے: فلسطین اور بابل جادوگری کے دو اہم مراکز رہے ہیں جو ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔ قرآن نے معاصر یہودیوں کو جادو کی دونوں اقسام کا وارث قرار دیا ہے۔ چنانچہ وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّيٰطِيۡنُ کہہ کر انہیں فلسطینی یہودیوں کی جادوگری کا وارث اور وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَـكَيۡنِ سے بابل کے جادو کا عامل قرار دیا۔ البتہ دونوں اقسام کے جادو منبع اور مصدر کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ پہلے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں بحار الانوار ۵۶: ۳۰۳

سِحر کا منبع شیاطین ہیں اور دوسرے کا منبع بابل کے دو فرشتے ہیں۔ پھر غرض و غایت کے لحاظ سے بھی مغایرت پائی جاتی ہے۔ یعنی شیاطین کا جادو ترویج باطل اور بابل کے فرشتوں کا جادو حق و باطل میں تمیز کے لیے تھا۔

ممکن ہے کہ ان فرشتوں کو جو علم دیا گیا تھا وہ سحر اور جادو نہ ہو بلکہ اس کی نوعیت مختلف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان پر آصف بن برخیا کے علم عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ[1] کی طرح نازل کیا گیا ہو جس کے اثرات کا مرتب ہونا اذن خدا پر موقوف ہے۔ اس بات کی تائید آیت کے اس حصے سے بھی ہوتی ہے:

وَمَا ہُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِہٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ — حالانکہ اذن خدا کے بغیر وہ اس کے ذریعے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کے سیاہ جرائم کے وہ فراموش شدہ صفحات بھی کھول کر بیان فرما رہا ہے، جن سے یہودیت کی اصلیت اجاگر ہونے کے ساتھ ساتھ رسول امی (ص) کی رسالت کا معجزہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ؕ — حالانکہ یہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے خبردار نہ کر لیں کہ (دیکھو) ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، کہیں تم کفر اختیار نہ کر لینا۔

ابطال سحر کی تعلیم اس شرط کے ساتھ دی جا رہی تھی کہ اسے مذموم مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس علم کا سیکھنا ایک امتحان تھا اور امتحان خیر و شر دونوں ذرائع سے لیا جاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ... [2] — اور ہم امتحان کے طور پر برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں مبتلا کرتے ہیں۔

لہٰذا خیر (اولاد، دولت اور جاہ و سلطنت) اور شر (مرض، افلاس وغیرہ) دونوں ہی ذریعہ امتحان ہیں۔ ابطال سحر کے سلسلے میں جادو کے مخفی اسباب کا علم بھی دو دھاری تلوار کی مانند ہے، جس سے صحیح کام بھی لیا جا سکتا تھا اور غلط بھی۔

اس جملے میں ان فرشتوں پر یہودیوں کی طرف سے عائد کردہ الزامات کا جواب بھی ہے کہ یہ دونوں احکام خداوندی کے مطابق عمل کرتے تھے اور لوگوں سے خیر کا عہد لے کر انہیں اس علم کی تعلیم دیتے تھے۔

ان دونوں فرشتوں سے متعلق اسرائیلیات میں ایک حکایت مشہور تھی جس کا خلاصہ یہ ہے:

انہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی جذبات دے کر زمین پر بھیجا تا کہ انہیں معلوم ہو

---

[1] ۲۷ نمل: ۴۰ [2] ۲۱ انبیاء: ۳۵

جائے کہ اگر وہ بھی انسان ہوتے تو گناہ سے نہ بچ سکتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
بابل کی زہرہ نامی ایک فاحشہ عورت سے ان کے غلط تعلقات استوار ہوئے اور
وہ اسی عورت کے ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔
اسی بنا پر زہرہ نامی ستارے کے بارے میں بے بنیاد باتیں گھڑی گئیں۔
مقام تعجب ہے کہ بعض مسلمان مصنفین نے بھی اس بے بنیاد داستان کو بڑے اہتمام سے نقل کیا ہے۔

چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں یہ بے بنیاد داستان، پچیس کے قریب اسناد سے نقل کی ہے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ: مگر لوگ ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ لیتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔

دین و مذہب کی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان محبت اور ربط قائم ہو۔ خاص طور پر عائلی نظام میں محبت اور ہم آہنگی کی فضا، نظام تمدن میں استحکام اور معاشرتی اصلاح کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہودی پست فطرت ہونے کی وجہ سے اس بنیادی اصول کو نہ صرف ترک کرتے تھے بلکہ اسے ختم کرنے کے لیے بلا تردد ہر وہ ذریعہ اور طاقت، جو ان کے ہاتھ آئے، استعمال کرتے تھے۔

حالانکہ وہ اس سحر کے ذریعے اذن خدا کے بغیر کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔ یعنی انہیں عام لوگوں سے ہٹ کر کوئی طاقت نہیں دی گئی تھی بلکہ انہیں جادو کے مخفی علل و اسباب کا پتہ چل گیا تھا۔ علل و اسباب کو بروئے کار لانے کے بعد اثرات کا مرتب ہونا قانون قدرت ہے اور یہی اِذن خدا ہے۔ جیسے زہر کے اثر سے ہلاکت یا تیز دھار تلوار سے مؤمن کا قتل۔ دوسرے لفظوں میں اِذن کا مطلب اِذن تکوینی ہے، نہ کہ امر تشریعی۔ چنانچہ زہر اِذن تکوینی کے تحت مہلک ہے، لیکن تشریعی امر کے تحت اس کے ذریعے بے گناہ کا قتل حرام ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہودیوں کی موجودہ و گزشتہ سیاہ کاریوں کے مسلسل تذکرے سے ظاہر ہے کہ دشمن شناسی سالکان راہ حق کے لیے کس قدر اہم ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۱۰۲: الوسائل ۱۷: ۱۴۷۔ مستدرک الوسائل ۱۳: ۱۰۷۔ بحار الانوار ۵۶: ۳۰۴۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾	۱۰۴۔ اے ایمان والو! راعنا نہ کہا کرو بلکہ (اس کی جگہ) انظُرنا کہا کرو اور (رسول کی باتیں) توجہ سے سنا کرو اور کافروں کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

رَاعِنَا: (ر ع ی) مراعاۃ ۔ ہماری رعایت کیجیے۔ رعایت غفلت اور بے توجہی کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔

اُنْظُرْنَا: (ن ظ ر) ہمیں مہلت دیجیے۔ چنانچہ انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ [1] میں بھی مہلت و انتظار کا معنی ہے۔ یعنی بروز قیامت مؤمنین سے منافق یہ کہیں گے: ہمیں مہلت دو کہ ہم تمہارے نور سے کچھ حاصل کریں۔

تفسیر آیات

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: قرآن مجید میں تقریباً اسی (۸۰) مقامات پر ان الفاظ میں مؤمنین سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ سب آیات مدنی ہیں۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خطاب کا یہ انداز اس امت کے لیے ایک اعزاز ہے، ورنہ دوسری امتوں کو قرآن نے لفظ قوم سے یاد کیا ہے۔ جیسے قوم نوح، قوم ہود اور قوم عاد وغیرہ۔ علامہ فرماتے ہیں:

فَالتَّعْبِیْرُ بِلَفْظَةِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِمَّا یَخْتَصُّ التَشَرُّفَ بِهٰذِهِ الْاُمَّةِ۔ [2]	الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ذریعے تعبیر کرنے کا مقصد خاص طور پر اس امت کو شرف بخشنا ہے۔

ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول خدا (ع) نے فرمایا:

مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اٰیَةً و فِیْهَا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِلَّا وَ عَلِیٌّ رَاْسُهَا و اَمِیْرُهَا۔ [3]	خدا نے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ جو بھی آیت نازل کی ہے حضرت علیؑ اس کے سردار اور امیر ہیں۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا:

شان نزول: رسول خدا (ع) جب اسلامی احکام بیان فرماتے تو اکثر ایسا ہوتا کہ بعض افراد سن یا سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس وقت وہ حضور (ع) کی توجہ مبذول کرانے کے لیے کہتے رَاعِنَا یعنی ہماری رعایت فرمائیں کہ ہم سمجھ نہیں سکے۔ ہمارا لحاظ فرمائیے اور دوبارہ ارشاد فرمائیے۔

بعض یہودی بھی ان علمی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ اس لفظ کو شرارتاً حضور (ع) کی شان میں

---

[1] ۵۷ حدید: ۱۳ [2] المیزان ۱: ۲۴۵ [3] بحار الانوار ۳۵: ۳۵۰

توہین کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بعض مفسرین کے نزدیک وہ رَاعِنَا کو اَلرَّعُوْنَۃُ کے حوالے سے احمق اور بے وقوف کے معنوں میں لیتے تھے اور بعض دیگر مفسرین کے مطابق وہ رَاعِنَا کی بجائے رَاعِیْنَا ہمارا چرواہا کہتے۔

امام موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام سے مروی ہے کہ لفظ راعینا عبرانی یہودی زبان میں ایک دشنام ہے۔ یہودی اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے تھے۔[1]

علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نجفی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں عبرانی زبان پر عبور حاصل تھا، فرماتے ہیں:

> عبرانی زبان میں رَاعِیی شریر کو کہتے ہیں اور نَا ضمیر متکلم کو واوَ کے ساتھ ملائیں تو رَاعِیْنُو کا کلمہ بن جاتا ہے۔ یعنی ہمارا شریر چنانچہ یہ لفظ اپنے معنوں میں توریت کے سفر ۵ فصل اول اور مزامیر فصل ۶۴ اور ۶۵ میں موجود ہے۔[2]

اہم نکات

۱۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے شاگردوں کو آداب تعلم سکھائے جا رہے ہیں کہ بے ادبی اور اہانت پر مشتمل الفاظ استعمال نہ کرو۔

۲۔ مقام رسول(ص) دیکھیے کہ اللہ کے لیے اشاروں اور کنایوں میں بھی رسول(ص) کی توہین قابل برداشت نہیں۔

۳۔ دین وملت کی توہین کا موقع فراہم کرنا بھی ایک سنگین جرم ہے۔

۴۔ ملت اسلامیہ کی اقتصادی، عسکری اور تہذیبی کمزوری کا سبب بننا بھی یہودی سازش کا حصہ بننے کے مترادف ہے۔

تحقیق مزید: کئی طُرُق سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما انزل اللّٰہ جل ذکرہ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الا و علی امیرھا۔

اللہ نے جب بھی یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نازل کیا ہے تو علی (ع) اس کے امیر ہوں گے۔

دیگر لفظوں میں آیا ہے: الا و علی امیرھا و شریفھا۔

اس کے راوی درج ذیل شخصیات ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباس: ملاحظہ ہو تفسیر الفرات ص ۴۷۔ شواھد التنزیل ۱: ۳۰۔[3]

۲۔ حضرت حذیفہ: کشف الغمہ ۱: ۳۱۷۔ المناقب ۳: ۵۲۔ بحار الانوار ۳۷: ۳۳۳

اس کے علاوہ حافظ نطنزی نے اپنی کتاب الخصائص میں تین طُرُق سے اور ابن مردویہ

---

[1] تفسیر الامام ص ۴۷۷ [2] تفسیر آلاء الرحمن ج اول اسی آیت کے ذیل میں

[3] ابن عباس سے سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، عطاء، عبایہ، ابو مالک نے روایت کی ہے۔

نے اپنی کتاب المناقب میں دس (۱۰) سے زیادہ طُرُق سے اور محمد بن العباس نے ما نزل من القرآن فی النبی و آلہ میں بیس سے زیادہ طُرُق سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الیقین ص ۴۶۱۔

تفسیر مجاہد میں آیا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے امیر علی علیہ السلام ہیں۔ اس طرح اللہ نے قرآن میں ۸۹ مرتبہ علی (ع) کو امیر المؤمنین کہا ہے واضح رہے کہ قرآن میں یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۸۹ مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو الصراط المستقیم ۳: ۵۳۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ لَا الۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ کفر اختیار کرنے والے خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین، اس بات کو پسند ہی نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کر دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ ہم کسی آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت نازل کرتے ہیں، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟

تشریح کلمات

نَنۡسَخۡ: (ن س خ) نسخ ایک چیز کو زائل کر کے اس کی جگہ دوسری چیز لانا۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ دھوپ نے سائے کو زائل کر دیا۔ تَنَاسُخِ الاَزْمِنَۃِ ایک قوم کا گزر جانا اور اس کی جگہ دوسری قوم کا آنا۔

نُنۡسِہَا: (ن س ی) اَنْسَاء، نَسِیْ سے ہے۔ یعنی فراموش کرنا۔ یا پھر نَسَاءْ سے ہے، یعنی تاخیر۔ عرب کہتے ہیں: اَنْسَاتُ الْاِبِلَ عَنِ الْحَوْضِ میں نے اونٹ کو حوض سے پیچھے کر دیا۔ اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ ...[1] (حرمت کے مہینوں میں) تقدیم و تاخیر بے شک کفر میں اضافہ

----

[1] ۹ توبہ: ۳۷

کرنا ہے۔

تفسیر آیات

قرآن امت مسلمہ کو اس بات سے آگاہ کر رہا ہے کہ اس کا دشمن حسد کی آگ میں جل رہا ہے اور وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت نازل ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ قوم تصور کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اللہ کی رحمتیں صرف انہی سے مخصوص ہیں۔ دوسرے مشرکین میں بھی یہودیوں والی صفات پائی جاتی ہیں:

وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی [1] 　اور وہ کہتے ہیں: جنت میں یہودی یا نصرانی کے علاوہ کوئی ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔

نسخ: آسمانی شریعتوں میں احکام کی منسوخی ایک مسلمہ امر ہے۔ اسلامی شریعت کے احکام میں بھی نسخ واقع ہوا ہے۔ کیونکہ یہ شریعت انسانی تربیت و ارتقا کے لیے ہے اور تربیت کا مطلب ہی تدریجی ارتقا ہے۔ اس لیے احکام میں رد و بدل ایک طبعی امر ہے۔ جس طرح پوری انسانی تاریخ میں مجموعی طور پر معاشروں کے بدلنے سے شریعتیں بدلتی رہی ہیں، اسی طرح ایک شریعت میں بھی جدید حالات کے مطابق بعض تبدیلیوں کا آنا ایک لازمی امر ہے۔

نسخ کی تعریف: اصطلاح میں نسخ سے مراد کسی موجودہ شرعی امر کو اس کی مدت ختم ہونے پر اٹھا لینا ہے۔ [2]

۱۔ جب شریعت میں نسخ واقع ہوتا ہے تو اس کا تعلق احکام سے ہوتا ہے، لہٰذا کسی آیت کے نسخ کا یہ مطلب نہیں کہ آیت ہر لحاظ سے منسوخ ہو گئی ہے، بلکہ آیت جس حکم پر مشتمل ہے، وہی حکم منسوخ ہو گا، جب کہ آیت کا اعجازی پہلو برقرار رہے گا۔

۲۔ منسوخ ہونے والا حکم درحقیقت ایک محدود مدت کے لیے ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ناسخ کے آنے کے بعد اس کے عارضی ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن کبھی حکم کے ساتھ ہی پہلے سے اس بات کا اشارہ موجود ہوتا ہے کہ یہ وقتی ہے اور بعد میں نسخ واقع ہونے والا ہے۔ مثلاً فَاعۡفُوۡا وَ اصۡفَحُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ [3] سو آپ درگزر کریں اور نظر انداز کر دیں یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے، میں اشارہ ہے کہ درگزر کرنے کا حکم عارضی ہے اور آئندہ نسخ ہونے والا ہے۔

۳۔ آیت سے ظاہر ہے کہ ناسخ ان تمام مصلحتوں پر مشتمل ہو گا جو منسوخ میں پائی جاتی ہیں یا ناسخ میں مصلحت زیادہ ہو گی۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۱　[2] البیان ص ۲۷۲　[3] ۲ بقرہ: ۱۰۹

اَوۡ نُنۡسِہَا: علماء نے نَسْخ اور اِنْسَاء (بھلوا دینا) میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ حکم شرعی کے ظاہری نفاذ کا اٹھانا نَسْخ اور اسے انسانی ذہن سے اٹھا لینا اَنْسَاء ہے۔

عموماً نسخ کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں: نسخ حکم، نسخ حکم مع التلاوۃ اور نسخ تلاوت۔ اس آیت میں نسخ کی پہلی اور دوسری قسم کا بیان ہے۔

نسخ تلاوت کے بارے میں ہم نے مقدمہ میں بتا دیا کہ اس کے نسخ پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے سوائے آحاد روایات کے اور اس بات پر تمام علمائے مسلمین کا اتفاق ہے کہ آحاد سے نسخ قرآن ثابت نہیں ہوتا۔

نسخ کی پہلی قسم واقع ہونے پر سب کا اتفاق ہے، لیکن نسخ کی دوسری قسم یعنی اِنْساء کے وقوع پر کوئی دلیل یا مثال موجود نہیں ہے۔

جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۶ ۔ ۸۷ میں فرمایا:

وَ لَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡہَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِہٖ عَلَیۡنَا وَکِیۡلًا ﴿ۙ﴾ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ فَضۡلَہٗ کَانَ عَلَیۡکَ کَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾	اور اگر ہم چاہیں تو ہم نے جو کچھ آپ کی طرف وحی کی ہے وہ سلب کر لیں پھر آپ کو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔ سوائے آپ کے رب کی رحمت کے، آپ پر یقیناً اس کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت کی رو سے رسول کریم (ص) پر اللہ کی رحمت اور فضل کا تقاضا یہ ہوا کہ وحی کا کوئی حصہ رسولؐ کے ذہن سے سلب نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی طرح ہے: وَ لَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ [1] اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا۔

مگر اللہ نے ایسا نہیں چاہا یعنی سب کی ہدایت نہیں کی کہ کوئی کافر نہ رہے، کیونکہ ایسا کرنا جبر کے ساتھ ممکن تھا۔ جبری ہدایت اللہ کو قبول نہیں ہے۔

بلکہ اِنْساء کے واقع نہ ہونے پر دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے کہ رسول (ص) کبھی فراموشی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ ... [2]	(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے مگر جو اللہ چاہے ....

واضح رہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ سے نسیان کا وقوع مراد نہیں بلکہ اس پر خدا کی قدرت کا اظہار مراد

---

[1] ۱۶ نحل: ۹　[2] ۸۷ اعلیٰ: ۶ ۔ ۷

ہے کہ اگر یہ عمل انجام دینا چاہے تو اللہ کے لیے ناممکن نہیں۔

لہٰذا وہ تمام روایات و اقوال جو قرآن کی اس نص صریح کے منافی ہیں، باطل اور ناقابل اعتنا ہیں بلکہ ان باتوں سے رسول (ص) کی رسالت مخدوش ہوتی ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کے ذیل میں ابن عباس کی طرف یہ قول منسوب ہے۔

کان مما ینزل علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الوحی باللیل و ینساہ بالنھار۔

کچھ وحی ایسی بھی ہوتی تھی جو رات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی اور دن کو بھول جاتے تھے۔

ابن جریر نے حسن سے یہ قول نقل کیا ہے:

ان نبیکم قرأ قرانا ثم نسیہ۔

تمہارے نبیؐ نے کچھ قرآن پڑھا اور بھول گئے۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل تعجب ہے کہ بعض آحاد روایت کی بنا پر بہت سی عبارتوں کو قرآن کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسے آیہ رجم الشیخ والشیخۃ اذا زَنَیا فارجموھما البتّۃ [1] پھر کہتے ہیں ان کو نسخ تلاوت کے ذریعہ اٹھا لیا گیا۔

اس سے زیادہ قابل تعجب یہ ہے کہ کہتے ہیں: ان آیات کو قرآن سے عصر حضرت ابوبکر میں اٹھا لیا گیا تھا۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی کے مقدمہ صفحہ ۲۴ میں آپ کو یہ عبارت ملے گی:

نَعَمْ اُسْقِطَ زَمَنَ الصِّدِّیْقَ ما لَم یَتَواتَر و ما نُسِخَتُ تلاوتُہ ۔

ہاں صدیق کے زمانے میں وہ آیات جو متواتر نہ تھیں اور جن کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی حذف کی گئیں۔

بعینہ یہی عبارت شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی نے تفسیر بیضاوی کے مقدمہ میں نقل کی ہے۔

اگر نُنۡسِهَا میں اِنۡسَاء سے مراد تاخیر لی جائے تو آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے: ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اسے مؤخر نہیں کرتے.....

شان نزول: یہودیوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ بھی تھا: اگر محمد (ص) خدا کے رسول ہوتے تو ایک بات پر قائم رہتے۔ یہ اپنے اصحاب کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر کچھ عرصے بعد یہ حکم واپس لے لیتے ہیں۔ وہ آج کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں کل کچھ اور۔ یہ قرآن محمد (ص) کا کلام ہے اور ان کا خود ساختہ ہے کیونکہ اس میں تضادات موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ ایک اور آیت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے:

---

[1] صحیح بخاری ۳ : ۶۸ طبع مصر

وَ اِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝

اور جب ہم ایک آیت کو کسی اور آیت سے بدلتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا نازل کرے، یہ لوگ کہتے ہیں: تم تو بس خود ہی گھڑ لاتے ہو، درحقیقت ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔[1]

تائید مزید

۱۔ خود یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کی شریعت سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے۔

۲۔ خود توریت میں بہت سے احکام منسوخ ہوئے ہیں۔ مثلاً سفر تکوین باب ۲۲، حضرت ابراہیم (ع) کے لیے اپنے فرزند کے ذبح کا حکم منسوخ ہو گیا۔

۳۔ نسخ میں درحقیقت حکم خدا نہیں بدلتا بلکہ علم بشر کے لحاظ سے نسخ واقع ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم شروع ہی سے عارضی ہوتا ہے، البتہ انسان کو نسخ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ عارضی تھا۔

۴۔ اللہ کا حکم بندوں کی مصلحتوں اور مفاد کے مطابق ہوتا ہے۔ نسخ میں درحقیقت مصلحتیں بدلتی ہیں، حکم نہیں بدلتا۔ جس طرح مریض کی کیفیات کے بدلنے سے طبیب کا نسخہ بدلتا ہے، لیکن درحقیقت علاج ایک ہی ہوتا ہے، جو منسوخ نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ شریعت میں نسخ کا تعلق احکام سے ہوتا ہے جب کہ آیت کا اعجازی پہلو منسوخ نہیں ہوتا۔

۲۔ نسخ ایک الٰہی سنت ہے جو تمام آسمانی شریعتوں میں جاری رہی ہے۔

۳۔ منسوخ شدہ حکم علم خدا میں شروع سے ہی عارضی ہوتا ہے، لیکن انسان کو نسخ کے بعد اس کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ انسانی تربیت اور تدریجی ارتقا کے لیے احکام میں رد و بدل ایک طبیعی امر ہے۔

۵۔ اللہ جس حکم کو منسوخ کرتا ہے، اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم لاتا ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۱۰۶: الکافی ۱: ۳۲۸۔ تفسیر العیاشی ۱: ۵۵ ۔ ۵۶۔ العمدۃ ص ۲۵۹۔ غیبۃ الطوسی ص ۲۰۰۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت صرف اللہ ہی کے لیے ہے؟ اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہے۔

---

[1] ۱۶ النحل: ۱۰۱

تشریح کلمات

مُـلْكُ: (م ل ك) بادشاہ۔ حکمران۔ زیر دست چیز کو بطور مالک استعمال کرنا مُلْك اور فقط زیر تصرف رکھنا مِلْك کہلاتا ہے۔ لہٰذا ہر مِلك، مُلك نہیں ہے، لیکن ہر مُلک کو مِلك کہا جا سکتا ہے۔

وَلِی: (و ل ی) ولایت سے ماخوذ ہے. وِلایۃ سے مراد ہے نصرت اور وَلایۃ سے مراد ہے غلبہ، اقتدار، آقا، سرپرست، حکومت اور اولی بالتصرف نیز دوست، ناصر اور رفیق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کی مزید تشریح آیہ: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ ...[1] کے ذیل میں آئے گی۔

تفسیر آیات

اس آیۂ شریفہ کو گزشتہ آیۂ نسخ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ قانون نسخ پر یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ نسخ سے جہل اور عجز لازم آتا ہے۔ آیۂ مبارکہ میں ظاہراً رسول کریم (ص) سے خطاب ہے، لیکن درحقیقت معترضین کو سمجھانا مقصود ہے: جب آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ان میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے تو بندوں کے مصالح و مفاسد کا اسے زیادہ علم ہے۔

اہم نکات

۱۔ آسمان و زمین کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے۔

۲۔ لامحدود حاکمیت مطلقہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب چاہے اپنے بندوں کے مصالح و مفاسد کے پیش نظر احکام میں رد و بدل کرے۔

اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ مَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ کیا تم لوگ اپنے رسول سے ایسا ہی سوال کرنا چاہتے ہو جیسا کہ اس سے قبل موسیٰ سے کیا گیا تھا؟ اور جو ایمان کو کفر سے بدل دے وہ حتماً سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

تشریح کلمات

سَوَآءَ: درمیانی راستہ، جو کسی طرف کج نہ ہو۔

----

[1] ۵ مائدہ: ۵۵

تفسیر آیات

اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی: رسول سے سوال اگر بغرض تحقیق و تعلیم ہو تو ایک مستحسن امر ہے۔ لیکن اگر بغرض استہزاء و اعتراض ہو تو یہ کفر ہو گا یا اس کے نزدیک۔ اس آیت میں معترضانہ سوال پر سرزنش کی گئی ہے۔

سیاق آیت اور بعض روایات کے مطابق کچھ لوگوں نے رسول اکرم (ص) سے ایسے سوالات کیے جیسے حضرت موسیٰ (ع) سے کیے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ (ع) سے ان کی قوم نے کہا تھا:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً ...[1] — ہم آپ پر ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں۔

دوسرا سوال یہ تھا:

اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـہًا کَمَا لَہُمۡ اٰلِـہَۃٌ[2] — ہمارے لیے بھی ایسا معبود بنا جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قوم موسیٰ (ع) ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالمحسوس کی خواہاں تھی۔ یہ محسوس پرستی بالفاظ دیگر بت پرستی ہے اور ایمان کی جگہ کفر اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول خدا (ص) سے بیہودہ سوالات کرنے والا گستاخ رسول ہے۔

۲۔ رسول (ص) پر بے جا اعتراض، انسان کو کفر کے نزدیک کر دیتا ہے۔

وَدَّ کَثِیۡرٌ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَوۡ یَرُدُّوۡنَکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِکُمۡ کُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡحَقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَ اصۡفَحُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ (مسلمانو!) اکثر اہل کتاب حق واضح ہو جانے کے باوجود (محض) اپنے بغض اور حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ایمان کے بعد تمہیں دوبارہ کافر بنا دیں، پس آپ درگزر کریں اور نظرانداز کر دیں، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۵۵ [2] ۷ اعراف: ۱۳۸

تشریح کلمات

حَسَد: کسی شخص سے زوال نعمت کی تمنا کرنا جب کہ وہ اس کا مستحق ہو۔

عَفْو: درگزر کرنا۔ اصلی معنی "مٹانا" ہے۔ عَفَتِ الرِّیْحُ الدَّار "ہوا نے گھر کے نشانات مٹا دیے"۔ "زائد" اور "بڑھانے" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے:

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ[1] یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ کہدیجیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

صفح: (ص ف ح) درگزر۔ نظر انداز کرنا۔ اصل میں ہر چیز کے چوڑے پہلو کو صَفْحَۃٌ کہتے ہیں۔ ترک ملامت کو عَفْوٌ اور صَفْحٌ کہتے ہیں۔ کسی تجاوز اور گناہ کی صورت میں اس سے درگزر کرتے ہوئے منہ موڑ کر ملامت نہ کرنے کو صَفْحٌ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن بار بار اس امر کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کراتا ہے کہ ان کے دشمن کیا عزائم رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ تمہارے ایمان کے درپے رہتے ہیں کہ یہ نعمت تم سے سلب ہو جائے اور اگر مسلمان یہودی یا مسیحی نہیں بنتے تو مسلمان بھی نہ رہیں۔

حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ: چونکہ دل میں زوال نعمت کی آرزو رکھنا حسد کہلاتا ہے، بنابریں اس آیت سے پتہ چلا کہ اہل کتاب، اسلام کو مسلمانوں کے لیے ایک نعمت سمجھتے ہیں۔ وہ دل سے اس کی حقانیت کے معترف ہیں۔ کیونکہ اسلام اگر حق نہ ہوتا تو نعمت نہ سمجھا جاتا اور اس سے حسد کوئی معنی نہ رکھتا۔

فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ: پس درگزر کرو اور نظر انداز کر دو تاآنکہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے۔ یہ فیصلہ بعد میں آنے والے ایک حکم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ آیۂ قتال میں یہ حکم بیان کر دیا گیا۔

اہم نکات

۱۔ کسی سے نعمت کے چھن جانے کی آرزو رکھنا حسد کہلاتا ہے۔

۲۔ اسلام مسلمانوں کے لیے خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔

۳۔ یہود و نصاریٰ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان ایمان سے تہی دست رہیں۔

۴۔ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ دشمن ان کے ایمان کے درپے ہیں۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۱۹

وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۰﴾	۱۱۰۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو کچھ نیکی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے، تم جو بھی عمل انجام دیتے ہو اللہ یقیناً اس کا خوب دیکھنے والا ہے۔

تشریح کلمات

الزَّکٰوۃَ: افزونی۔ نشو و نما۔ پاکیزگی۔ مال کا وہ حصہ جو بحکم خدا فقراء اور مساکین کو دیا جاتا ہے اور چونکہ یہ خیر و برکت اور فزونی نعمت کا باعث بنتا ہے یا اس سے مال و نفس پاک ہو جاتے ہیں، اس لیے اسے زکوٰۃ کہا گیا۔

تفسیر آیات

مشرکین سے وقتی طور پر درگزر کرنے کا حکم ایک صبر آزما حکم تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہیں اور مسلمان صبر و تحمل سے کام لیں اور حکم خدا کا انتظار کریں۔ صبر و انتظار ایک بارگراں ہے۔ اس سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے اور اس کے مقابلے میں قوت برداشت پیدا کرنے کے لیے نماز قائم کرنے کا حکم ہوا ہے۔ نماز کو ذریعہ بنانے کا حکم ایک اور جگہ بھی ہوا ہے:

وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ [1]　　صبر اور نماز کا سہارا لو۔

وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ: تم اس دنیا میں جو کار خیر اور عمل صالح انجام دیتے ہو، اس کا ثواب اللہ کے پاس موجود پاؤ گے۔ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ وہ وعدوں کو پورا کرنے والا اور ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ تمہارے نیک اعمال کو ضائع نہیں ہونے دے گا:

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ؕ﴿۷﴾ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿۸﴾ [2]	پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

ممکن ہے تَجِدُوۡہُ 'موجود پاؤ گے' کا مطلب یہ ہو کہ خود عمل کو موجود پاؤ گے۔ یعنی انسان روز قیامت اپنے اعمال کا خود مشاہدہ کرے گا۔ ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ [3]	اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۴۵　[2] ۹۹ زلزال: ۷۔ ۸　[3] ۱۸ کہف: ۴۹

نیز ارشاد ہے:

یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا ۚ[1] اس دن ہر شخص اپنا نیک عمل حاضر پائے گا۔

ہم انشاء اللہ آئندہ مناسب مقام پر 'انرجی' کے 'مادہ' میں تبدیلی کے قانون کی روشنی میں تجسم اعمال پر تفصیلی بحث کریں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن انسان اپنے اعمال کا خود مشاہدہ کرے گا۔ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ.

تحقیق مزید: فقه الرضا ص ۲۰۸۔ مستدرك الوسائل ۷ : ۱۳۹۔ ۱۲ : ۴۲۷۔ الاختصاص ص ۱۴۶۔

وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور وہ کہتے ہیں: جنت میں یہودی یا نصرانی کے علاوہ کوئی ہرگز داخل نہیں ہوسکتا، یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں، آپ کہد یجیے: اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

تشریح کلمات

اَمَانی: امنیة کی جمع۔ آرزو۔ اس کا تفصیلی معنی بیان ہو چکا ہے۔

ھَاتُوۡا: حاضر کرو۔ یہ لفظ عام طور پر انکار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی تم حاضر نہیں کر سکتے۔

بُرۡھَان: روشن اور واضح دلیل۔

تفسیر آیات

وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی: اس آیت میں نہایت فصیح و بلیغ اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جس میں اختصار بھی ہے اور مطلب کی مکمل ادائیگی بھی۔ ورنہ انداز بیان کچھ اس طرح ہوتا: 'یہودی کہتے ہیں کہ جنت میں یہودی کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوسکتا اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ جنت میں نصرانی کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوسکتا'۔

---

[1] ۳ آل عمران : ۳۰

یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو اہل جنت نہیں سمجھتے، لیکن مسلمانوں کو اہل جنت نہ سمجھنے میں دونوں متفق ہیں۔ یہ دونوں دِیَانَتَیْن آپس کے فکری و مذہبی اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ متحد اور متفق رہی ہیں۔ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ۔ ہماری معاصر تاریخ میں بھی اس کے ایسے شواہد بکثرت موجود ہیں کہ جہاں سارے کفار نے اسلام کے مقابلے میں متحدہ روش اختیار کی ہے۔

تِلْكَ اَمَانِیُّھُمْ : یہ ان کی خام خیالی اور جھوٹی آرزوئیں ہیں جو عقل و منطق اور دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ : اگر وہ اس بات پر دلیل اور عقل و منطق کی رو سے عقیدہ رکھتے تو وہ اس برہان و دلیل کو پیش کرتے۔ قرآن دعویٰ کر رہا ہے کہ اگر کوئی دلیل ہے تو پیش کرو اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔

اس آیت سے یہ قرآنی مؤقف واضح ہو جاتا ہے کہ ہر نظریے کے لیے ایک دلیل، ہر فکر کے لیے ایک برہان اور ہر عقیدے کے پس منظر میں ایک معقول منطق ہونی چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ یہود و نصاریٰ نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے مشترکہ دشمن ہیں۔

۲۔ یہود و نصاریٰ جنت کو اپنا نسلی حق سمجھتے ہیں۔

۳۔ جو بات کسی دلیل و برہان کے بغیر کی جائے، وہ خام خیالی اور جھوٹی آرزو کہلاتی ہے۔

بَلٰی ٭ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ ہاں! جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہے تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن۔

تشریح کلمات

بَلٰی: اثبات میں جواب دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ [۱] 'کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟' کے جواب میں قَالُوْا بَلٰی [۲] 'وہ بولے ہاں!'۔ یہ لفظ انکاری جواب کے لیے بھی آتا ہے۔

---

۱ و ۲۔ ۷ اعراف: ۱۷۲

اَسۡلَمَ: (س ل م) سر تسلیم خم ہو گیا۔ سپرد کر دیا۔ مطیع و فرمانبردار ہو گیا۔

وَجۡه: (و ج ہ) چہرہ۔ چونکہ چہرہ انسانی جسم میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم عضو ہے اور انسان چہرے ہی سے پہچانا جاتا ہے اس لیے لفظ وَجۡه سے صرف چہرہ نہیں بلکہ پوری ذات مراد لی جاتی ہے۔ ابرو کو بھی وَجۡه کہتے ہیں۔ کسی امر کی علت کو بھی وَجۡه کہتے ہیں۔ کسی مفہوم کو درست طریقے سے بیان کرنا بھی توجیہ کہلاتا ہے۔

اَجۡر: جزائے عمل اور بدلہ۔ اگر یہ دنیاوی ہو تو اجرت اور اخروی ہو تو اَجۡر کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محنت و مشقت کے معاوضے کو اس لیے اَجۡر کہتے ہیں کہ اس سے محنت و مشقت کی تکلیف کا جبران اور مداوا ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

دخول جنت اور سعادت ابدی کی امید وہ شخص رکھ سکتا ہے، جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا ہو نیز جو خلوص کے ساتھ نیکی کرنے والا، پاک باطن، صالح، مخلص، محسن اور مومن ہو، اس کا دل تسلیم و رضا سے سرشار اور لبریز ہو۔

فَلَہٗۤ اَجۡرُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ۪ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ: ایسے شخص کا اجر و ثواب اس کے رب کے پاس ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو نہ تو کوئی خوف ہو گا نہ غم۔ خوف و غم کا نہ ہونا سعادت و خوشحالی کے دو اہم بنیادی اصول ہیں، جب کہ خوف و غم کی موجودگی، بدبختی اور تکلیف دہ زندگی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ دخول جنت اور سعادت ابدی کا حقدار وہ ہے جو مومن، مخلص، صالح، محسن اور تسلیم و رضا کا پیکر ہو۔

۲۔ خوف کا ہونا عذاب و بدبختی اور نہ ہونا سعادت و خوش بختی ہے۔

وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ لَیۡسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیۡءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰی لَیۡسَتِ الۡیَہُوۡدُ عَلٰی شَیۡءٍ ۙ وَّ ہُمۡ یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ	۱۱۳۔ اور یہود کہتے ہیں: نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر استوار نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر استوار نہیں حالانکہ وہ (یہود و نصاریٰ) کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اس طرح کی بات جاہلوں نے بھی کہی، پس اللہ بروز قیامت ان کے درمیان اس

قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾	معاملے میں فیصلہ کرے گا جس میں یہ اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر آیات

یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا دین بے اساس ہے، حالانکہ وہ توریت میں حضرت مسیح (ع) کی آمد کی خبر پڑھ چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ، دین موسیٰ علیہما السلام کو آگے بڑھانے کے لیے آئے تھے۔ لیکن یہودی حضرت مسیح (ع) کو نہیں مانتے، بلکہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسیح آنے والے ہیں جو بنی اسرائیل کو ملک و سلطنت واپس دلائیں گے۔

ادھر نصاریٰ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ یہودیوں کا دین بے بنیاد ہے، حالانکہ یہ بھی انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔

کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ: کتاب اور علم سے محروم ناخواندہ افراد کا بھی یہی حال ہے۔ آیت میں بت پرست اور جاہل افراد کی طرف اشارہ ہے، جن کا کہنا ہے کہ تمام ادیان بے بنیاد ہیں۔

فَاللّٰهُ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ: ان تمام اختلافات کا صحیح فیصلہ خدا بروز قیامت خود کرے گا۔ یعنی حق پرستوں کو جنت نعیم اور باطل پرستوں کو نار جحیم میں پہنچائے گا۔

اہم نکات

۱۔ تعصب میں علم و جہل کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ کسی عقیدے کی بلا دلیل نفی کرنا جہالت و نادانی کی علامت ہے۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡهَا اسۡمُهٗ وَ سَعٰی فِیۡ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَهُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ۬ؕ لَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ	۱۱۴۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی مساجد میں اس کا نام لینے سے روکے اور ان کی ویرانی کی کوشش کرے؟ ان لوگوں کو مساجد میں داخل ہونے کا حق نہیں مگر خوف کے ساتھ، ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں

عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾　　عذاب عظیم ہے۔

تشریح کلمات

مَسٰجِدَ: (س ج د) جائے سجدہ۔ سجدے سے نماز مراد لی جاتی ہے۔ اس لیے مسجد جائے نماز کے معنوں میں ہے۔ مسجد سے مراد روئے زمین بھی ہے۔

خِزۡیٌ: (خ ز ی) ذلت و رسوائی۔

عَذَابٌ: (ع ذ ب) سخت اذیت دینا۔ یہ لفظ بعض کے نزدیک عذب سے ماخوذ ہے۔ یعنی شیریں۔ ماء عذب آب شیریں۔ بنابریں عذاب کا مطلب ہو گا کہ کسی کو زندگی کی شیرینی سے محروم کرنا۔

تفسیر آیات

اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو عبد اور معبود کے درمیان حائل ہوجائے اور بندگان خدا کو ان کے فطری حق سے محروم کر دے، ذکر خدا پر پابندی لگا دے اور اللہ کی عبادت کرنے کی جگہ کو تباہ کر کے خدا سے دشمنی کا اظہار کرے۔

اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ: ایسے تخریب کاروں سے نپٹنے کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو مساجد کی حفاظت کی خاطر ایسے انتظامات کی ضرورت ہے، جن کے باعث یہ لوگ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بلا خوف خطر مساجد میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرسکیں۔

لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ: اللہ کے گھر کے ساتھ ناپاک جسارت کرنے والوں کو دنیا میں بھی ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب عظیم ہو گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

> مساجد کے احترام کے اسی اصول کے تحت مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ کی حالت میں بھی ان کے گرجوں اور معابد کے ہدم یا ان کی توہین کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ مقام ان مسلمانوں کے لیے قابل غور ہے جو محض گروہی تعصّبات کے تحت اپنے سے ذرا مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں اور بعض اوقات دوسرا مسلک رکھنے والوں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے کی جسارت بھی کر گزرتے ہیں۔[1]

---

[1] جیسا کہ کراچی، لاہور اور ۱۹۸۸ء میں صوبہ سرحد کے بعض علاقوں سے آنے والے مسلمانوں نے گلگت میں شیعہ امامیہ کی مساجد کو نہ صرف منہدم بلکہ نذر آتش بھی کیا اور ان میں موجود قرآنی نسخوں کو جلا دیا۔

شان نزول

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب قریش نے رسول خدا (ص) کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا تو یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

اہم نکات

۱۔ بندگان خدا کوان کے فطری حق سے محروم کرنا، ذکر خدا پر پابندی لگانا اور عبادت گاہوں کو منہدم کرنا بہت بڑا ظلم، خدا سے دشمنی اور مذہبی دہشت گردی ہے۔

۲۔ تخریب کاری کا سد باب ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔

۳۔ تخریب کاروں کا قرآنی علاج یہ ہے کہ طاقت کا مظاہرہ کر کے انہیں خوفزدہ کیا جائے۔

۴۔ تخریب کار دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا ہوں گے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں، پس جدھر بھی رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے، بے شک اللہ (سب چیزوں کا) احاطہ رکھنے والا، بڑا علم والا ہے۔

تشریح کلمات

تُوَلُّوْا: (و ل ی) چہرہ پھیرنا۔ متوجہ ہونا۔ اگر اس لفظ کے بعد عَن آ جائے جیسے تَوَلّٰی عَنْهُ تو منہ پھیرنے کا معنی دیتا ہے اور اگر اِلٰی آ جائے، تَوَلّٰی اِلَيْهِ تو متوجہ ہونے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

وہ مشرق و مغرب کا خالق و موجد ہے۔ وہ تمام سمتوں کا پیدا کرنے والا ہے اور خود اس کے لیے کوئی سمت نہیں۔ وہ بے پایاں اور لا محدود ہے۔ وہ کسی مشرق یا مغرب کی حدود میں نہیں سما سکتا۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ اس کی ملکیت ہماری ملکیت کی طرح قابل سلب و نقل و انتقال نہیں ہے۔ وہ تمام جہات کا مالک ہے۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کسی ایک سمت کو تقدس یا کوئی اور خصوصیت حاصل نہیں۔ ہر سمت اور جہت اس کے لیے یکساں ہے۔ پس جدھر بھی رخ کرو ادھر اللہ کی ذات موجود ہے۔

اس آیت میں دو باتوں کی نفی کی گئی ہے:

۱۔ کسی خاص سمت اور جہت کے تقدس کی نفی ہوئی ہے۔ مشرق و مغرب کا ذکر اس لیے ہوا کہ یہ

سمت کے تعین کا ذریعہ ہیں۔ اس آیت میں مشرق و مغرب کے بارے میں دوسرے ادیان کے جاہلانہ نظریات کی بھی نفی کی گئی ہے۔

۲۔ اللہ کے لیے جسم و جسمانیت کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کسی سمت کی طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ کو اس سمت میں محدود ماننا پڑتا۔

اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ : ذات و علم کے لحاظ سے اللہ کا محیط ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ کسی خاص جہت میں کوئی خصوصیت نہیں۔ اللہ کے لیے تمام جہتیں یکساں ہیں۔

وضاحت:

۱۔ بعض کے نزدیک یہ حکم قبلے کے تعین سے پہلے کی بات ہے۔

۲۔ یہ حکم جہت اور سمت سے متعلق ہے اور قبلہ سمت کا نام نہیں، بلکہ مقام ہے۔

۳۔ یہ آیت دعا، نافلہ اور قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت سے متعلق ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

شان نزول

امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے روایت ہے کہ آپ (ع) نے اس آیت کے بارے میں فرمایا:

یہ آیت نماز نافلہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اگر انسان سفر میں ہو تو جدھر چاہے رخ کر کے نافلہ پڑھ سکتا ہے۔ لیکن فرائض کے بارے میں حکم ہوا ہے: حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ شَطۡرَہٗ ۔[1] تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اس کی طرف رخ کرو۔

یعنی فرائض قبلہ رخ ہو کر ہی پڑھے جا سکتے ہیں۔

تفسیر در منثور میں ہے:

جب آیت: وَ قَالَ رَبُّکُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ [2] نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا: ہم کس طرف رخ کر کے دعا کریں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ....۔

اہم نکات

۱۔ کسی سمت اور جہت کو تقدس حاصل نہیں۔ مشرق و مغرب سمت کے تعین کا ذریعہ ہیں، کسی تقدس کے حامل نہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیت سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کسی سمت کی ضرورت نہیں، ورنہ محدودیت لازم آئے گی جو جسم کی خاصیت ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۴۴　　[2] ۴۰ غافر: ۶۰

تحقیق مزید: التہذیب ۲ : ۴۹ ۔ الوسائل ۴ : ۳۳۲ ۔ تفسیر العیاشی ۱ : ۵۶ ۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنالیا ہے، پاک ہے وہ ذات (ایسی باتوں سے) بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے۔

تشریح کلمات

قٰنِتین: (ق ن ت) قنوت۔ خضوع کے ساتھ عبادت کا دائمی التزام۔

بَدِیۡعُ: (ب د ع) کسی سابقہ مثال اور تقلید کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنے والا۔ اس لفظ کا اطلاق جب اللہ تعالیٰ پر ہو تو معنی یہ ہوگا: آلے، مادے اور زمان و مکان کے بغیر ایجاد کرنے والا۔ ہر نئی شے جس کی مثال پہلے نہ ملتی ہو اسے بدع کہتے ہیں۔ شرعی دلیل کے بغیر کسی نئی بات کو مذہب میں شامل کرنا بدعت کہلاتا ہے۔

قَضٰی: (ق ض ی) ماضی۔ فیصلہ کرنا، تقدیر بنانا، پورا کرنا، انجام دینا۔

تفسیر آیات

اللہ کو صاحب اولاد قرار دینے والے یہودیوں اور نصرانیوں کا تذکرہ ہے۔ یہودیوں کے زعم میں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ آیہ شریفہ میں دو دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ اللہ کی ذات اس بات سے بالاتر اور پاک و منزہ ہے:

پہلی دلیل: اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہو تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ یہ بیٹا اللہ سے جدا شدہ ایک حصہ ہو جو بعد میں تدریجاً بڑا ہو کر اللہ کی مثل ایک الگ ذات بن جائے، جب کہ یہ ناممکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مثل سے منزہ ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ وہ ہر چیز کا حقیقی مالک ہے۔ سب اللہ کے فرمانبردار اور اس کے عبد ہیں۔

دوسری دلیل: بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۔ یہ آیۂ

کریمہ دوسری دلیل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو کسی مثال کے بغیر ایجاد کرنے والا ہے۔ پوری کائنات کا سبب ایجاد وہی ہے اور کوئی چیز اس کی تخلیق کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا جس وجود کو بھی اللہ کا بیٹا فرض کیا جائے، وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ہو گا۔ پس اس کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔

عدم سے وجود کیسے؟: جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے تو یہاں مادہ پرستوں کا ایک فرسودہ اعتراض سامنے آتا ہے کہ عدم وجود کا منبع کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ عدم سے کسی چیز کو وجود دیا جائے؟

جواب یہ ہے کہ عدم کسی چیز کو وجود نہیں دے سکتا۔ نیستی سے ہستی کی پیدائش ممکن نہیں۔ نیستی و عدم کا کوئی وجود نہیں ہوتا کہ وہ کسی اور کو وجود دے سکے۔ عدم سے وجود میں لانے کا مطلب یہ نہیں کہ عدم وجود کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتا ہو، جیسے لکڑی کرسی کے لیے خام مال ہوتی ہے۔ اگر عدم وجود کا سبب بن سکتا تو وہ عدم نہ ہوتا۔ وجود اور ہستی دینے والا جب تک خود موجود نہ ہو کسی دوسری چیز کو وجود نہیں دے سکتا۔ لہٰذا ضروری ٹھہرتا ہے کہ ابتدائی مادے کو وجود بخشنے والا خود مادے اور زمان و مکان سے ماوراء ہو، کیونکہ مادہ زمان و مکان کا اسیر ہے۔ ایک لامحدود ذات ہی مادے کی موجد بن سکتی ہے، کیونکہ محدودیت مادے کا لازمی حصہ ہے۔

ثانیاً خلق و ابداع کی بہت سی مثالیں روزانہ دنیا میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ مثلاً فکری، شعری، تصویری، خیالی اور تخلیقی عمل وغیرہ عدم سے وجود میں آتے ہیں۔

کُنۡ فَیَکُوۡنُ: اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کے نفاذ اور تخلیق و ابداع کی لا متناہی قدرت کے لیے لفظ کُن کی تعبیر استعمال فرماتا ہے، ورنہ خلق و ایجاد میں 'کاف' اور 'نون' بھی استعمال نہیں ہوتے، بلکہ جب وہ ارادہ کرتا ہے تو اس کی مراد حسب منشا وجود میں آ جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر جو چیز خدا کے علم و ارادے میں قابل تصور ہوتی ہے، وہی کُن کی مخاطب قرار پاتی ہے اور منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہو جاتی ہے۔

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہو گیا جو الٰہی ذوق سے محروم لوگ کرتے ہیں کہ جب کوئی چیز خلق سے پہلے موجود ہی نہیں ہے تو اس سے کُن کا خطاب کس طرح ہو سکتا ہے؟

اہم نکات

۱۔ اولاد تولید مثل کا نام ہے اور خدا کی کوئی مثل نہیں۔

۲۔ اولاد والدین کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ جب کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی ملکیت ہے۔

۲۔ اولاد کی ضرورت احتیاج کی دلیل ہے۔ جب کہ اللہ محتاج نہیں۔

۳۔ وجود، عدم کی پیداوار نہیں، بلکہ ایک لامحدود ذات کے ارادے کا نتیجہ ہے: کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔

۴۔ کُنْ خدا کے لیے ارادے کی تعبیر ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو کاف ونون کا بھی محتاج نہیں۔

۵۔ ایک قادر و صادق الوعد ہستی سے تمسک انسان کو احساس تحفظ، امید اور روحانی قوت عطا کرتا ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۱۱۷: الکافی ۱: ۱۲۵۔ ۲۵۶۔ بصائر الدرجات ص ۱۱۳

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اور بے علم لوگ کہتے ہیں: اللہ ہم سے ہمکلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ان سے پہلے لوگ بھی اسی طرح کی بات کر چکے ہیں، ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں، ہم نے تو اہل یقین کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کی ہیں۔

تفسیر آیات

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ: بے علم لوگ (مشرکین عرب) حضرت محمد مصطفیٰ (ص) کی نبوت کو اپنے خود ساختہ معیار پر جانچتے تھے اور اسے بشری فہم کے مطابق قابل قبول نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مادی و جاہلی معیار کے مطابق خود ان میں سے کچھ بلند پایہ شخصیات اس منصب کے لیے موزوں تھیں اور ان کے زعم باطل میں یہ مقام انہیں ملنا چاہیے تھا اور اللہ کو ان سے ہمکلام ہونا چاہیے تھا:

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ ۱　　اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ: یعنی اس قسم کے مطالبے سابقہ امتوں نے بھی اپنے رسولوں سے کیے اور بہت سے مطالبے قبول ہونے کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔ ان کے دل ایک جیسے، افکار ہم آہنگ اور سوچیں یکساں ہیں: اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ۔

قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ: ہم نے ایک نہیں بلکہ متعدد نشانیاں بڑی وضاحت سے بیان کی ہیں۔ رسول کریم (ص) کا ہر عمل اور ہر حکم معجزہ ہے اور ان کی سیرت و کردار کا ہر حصہ اللہ کی نشانی ہے۔ اس کے علاوہ رسول کریم (ص) کے ہاتھوں بے شمار معجزات صادر ہوتے رہے ہیں، جنہیں دیکھنے کے لیے چشم بینا

---

۱ ۴۳ زخرف: ۳۱

اور سمجھنے کے لیے عقل و ہوش کی ضرورت ہے۔

اہم نکات

۱۔ خدا سے ہمکلام ہونے کا مطالبہ جہل و نادانی کی علامت ہے۔

۲۔ انسان کا قول و عمل اس کے عقیدے اور نظریے کا آئینہ دار ہے۔

۳۔ خدا کی نشانیوں سے اہل یقین ہی مستفیض ہوتے ہیں۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ سے اہل دوزخ کے بارے میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

تشریح کلمات

بَشِیۡرًا: (ب ش ر) بشارت دینے والا۔ یہ بشرة سے ماخوذ ہے جو انسانی جلد کی اوپر کی سطح کا نام ہے. خوش کن خبر سن کر انسانی چہرے کی جلد میں انبساط آ جاتا ہے۔ اسی لیے اسے بشارت کہا جاتا ہے۔ بشارت دینے والے کو بشیر کہتے ہیں۔

الۡجَحِیۡمِ: دوزخ کی بھڑکتی آگ۔

تفسیر آیات

اے رسول (ص)! ناخواندہ اور بے علم لوگوں کے تصورات اور خود ساختہ معیاروں کے برعکس ہم نے آپ (ص) کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے۔ خدائی معیار کے مطابق یہ منصب آپ (ص) ہی کے لیے سزاوار ہے۔ آپ (ص) پوری انسانیت کے ہادی ہیں۔ ان میں سے جو مومن ہوں گے ان کے لیے آپ بشیر ہیں، حیات و سعادت کی نوید سنانے والے ہیں اور منکرین کے لیے ابدی ہلاکت کی خبر دینے والے نذیر ہیں۔

وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ: جو آپ کی دعوت کے منکر ہیں اور حجت پوری ہونے اور واضح نشانیاں اور معجزے دیکھنے کے باوجود راہ راست پر نہیں آتے اور جنت پر دوزخ کو ترجیح دیتے ہیں، جہنم کے ایسے شیدائیوں کے آپ (ص) ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ آپ (ص) نے حق رسالت ادا کر دیا ہے اور اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ تَبۡشِیۡر اور اِنۡذَار (تبلیغ دین) خدا کے نزدیک عظیم ترین منصب ہے۔

۲۔ رسول (ص) کا کام حق و باطل کی صحیح نشاندہی کرنا ہے نہ کہ ایمان لانے پر مجبور کرنا۔
۳۔ تبلیغ و تربیت کے عمل میں تشویق و تنبیہ دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔

وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ اور آپ سے یہود و نصاریٰ اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ بن جائیں، کہد یجیے: یقیناً اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کے لیے اللہ کی طرف سے نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔

تشریح کلمات

مِلَّت: دستور، مذہب اور دین کا قریب المعنی کلمہ ہے۔

اَھۡوَآءَ: (ہ و ی) خواہشات نفسانی۔ ھوی کی جمع ہے۔ یعنی اوپر سے نیچے گرنا: وَ النَّجۡمِ اِذَا ھَوٰی [1] خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والا دراصل اپنا بلند انسانی مقام چھوڑ کر حیوانی پستی میں گر جاتا ہے۔

تفسیر آیات

یعنی اے رسول (ص) یہود و نصاری کے سامنے لاکھ دلائل و براہین پیش کریں اور اپنی حقانیت پر بے شمار معجزات اور نشانیاں دکھائیں، وہ کبھی خوش نہیں ہوں گے۔ یہ خیال نہ کریں کہ وہ آپ (ص) سے مختلف معجزات اور نشانیوں کا مطالبہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ حق کے متلاشی ہیں، بلکہ اگر حق ان پر واضح ہو جائے، تب بھی وہ اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ ان کے عزائم کچھ اور ہیں۔ ان کے ذہن میں پنہاں مقصد یہ ہے کہ آپ (ص) اپنا مشن ترک کر کے ان کی ملت میں شامل ہو جائیں تاکہ آپ ایک امت مسلمہ اور امت قرآن کو وجود میں لا کر ان کے لیے ایک دائمی مسئلہ کھڑا نہ کر سکیں۔ وہ آپ (ص) سے صرف اس وقت راضی ہوں گے، جب آپ (ص) رسالت سے دستبردار ہو کر ان کے مذہب (ملت) کی پیروی کریں۔ آیت کے

----
[1] ۵۳ نجم: ۱

آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کی اتباع کا مطلب ان کی خواہشات کی اتباع ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ ....۔

ہماری معاصر تاریخ میں رونما ہونے والے یہودی اور صلیبی جرائم اس آیت کی صداقت پر شاہد ہیں اور شاید ہماری آئندہ نسلیں بھی ایسے جرائم کا مشاہدہ کریں گی۔ کیونکہ لَنۡ تَرۡضٰی 'وہ کبھی بھی خوش نہیں ہوں گے' ایک ایسی قرآنی تعبیر ہے جس سے ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے عزائم دائمی ہیں، جن سے مسلمان دوچار ہوتے رہیں گے۔

قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی : اللہ کے عطا کردہ دستور کے علاوہ کوئی اور دستور انسانی فلاح کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ فلاح و نجات کا راستہ چھوڑ کر ہلاکت و گمراہی کا راستہ اختیار کیا جائے اور یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی کی جائے؟

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ : اگرچہ یہاں بظاہر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے کہ اگر آپ(ص) ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے تو اللہ آپ(ص) کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ لیکن درحقیقت پوری امت سے خطاب ہے کہ اگر یہ امت قرآن کا علم آنے کے بعد یہود و نصاریٰ کی پیروی کر کے انہیں خوش کرے گی تو اللہ اس کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ یہ مسئلہ چونکہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے اسے پوری تاکید و شدت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے خود رسول کریم (ص) کو مخاطب قرار دیا گیا کہ اگر خود مقام عصمت و طہارت سے بھی یہ عمل صادر ہو جائے تو بھی نتیجہ یہی ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ یہود و نصاریٰ اسلام و مسلمین کی بھلائی اور برتری کو ہرگز پسند نہیں کرتے: لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡكَ ۔

۲۔ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کا استحصال کرنا چاہتے ہیں اور انہیں غلام دیکھنا چاہتے ہیں: حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ۔

۳۔ مسلمانوں کو اہل کتاب کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے: لَنۡ تَرۡضٰی ۔

۴۔ غیر مسلموں کو اپنا ہمدرد سمجھنا خود فریبی اور قرآن کی عملی تکذیب ہے: لَنۡ تَرۡضٰی ... الخ

۵۔ لا دینی افکار و نظریات کبھی برحق نہیں ہوسکتے اور ان کی پیروی کھلی گمراہی ہے: قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ ....۔

۶۔ کفار کے اہداف و مقاصد اور خواہشات کی پیروی نصرت و تائید خداوندی سے دوری کا موجب ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ ....۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾	۱۲۱۔ جنہیں ہم نے کتاب عنایت کی ہے اور وہ اس کا حق تلاوت ادا کرتے ہیں، وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے اور جو اس سے کفر اختیار کرے گا پس وہی گھاٹے میں ہے۔

تفسیر آیات

تلاوت کا حق ادا کرنے کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

(حق تلاوت ادا کرنے والے لوگ وہ ہیں) جو آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں، اس کے وعدوں کی امید رکھتے ہیں، اس کی تنبیہوں سے خائف رہتے ہیں، اس کے قصوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں، اس کے اوامر کی تعمیل کرتے ہیں اور اس کی نواہی سے باز رہتے ہیں۔

حق تلاوت اس طرح ادا نہیں ہوتا کہ صرف آیات کو حفظ کر لیا جائے، اس کے حروف پڑھ لیے جائیں، سورتوں کی تلاوت کی جائے اور اس کے دسویں یا پانچویں حصے کو پڑھ کر ختم کیا جائے۔ ان لوگوں نے اس کے حروف کو تو حفظ کر لیا ہے، مگر اس کے احکام کا تحفظ نہیں کیا۔ حالانکہ حق ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آیات میں تدبر اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ (ص) پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور کریں۔[1]

رسول کریم (ص) سے منقول ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ یَلْعَنُہُ۔[2] — بہت سے قاریان قرآن ایسے بھی ہیں جن پر قرآن لعنت کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تلاوت قرآن فہمی اور اس پر عمل کرنے کا نام ہے صرف پڑھنے کا نہیں۔

تحقیق مزید: الوسائل ۶ : ۲۱۷۔ مستدرک الوسائل ۴ : ۲۳۷۔

---

[1] روایت کے لیے رجوع فرمائیں ارشاد القلوب ص ۷۸۔ مواہب الرحمن ۱ : ۴۶۳

[2] بحار الانوار ۸۹ : ۱۸۴ باب ۱۹ فضل حامل القرآن و حافظ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾	۱۲۲۔اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی ہے اور یہ کہ میں نے تمہیں اہل عالم پر فضیلت دی ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو متعدد نعمتیں نازل فرمائی تھیں، قبل ازیں ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ اختتام کلام میں ایک بار پھر ابتدائے کلام کی طرف اشارہ کرنا ایک تو فصاحت کا پہلو رکھتا ہے، ثانیاً اس سے مقصد کلام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ بقرہ آیت ۴۷۔

اہم نکات

۱۔ دوسروں پر بنی اسرائیل کی فضیلت کا مکرر ذکر ان کے کفران نعمت کے بیان کے لیے ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾	۱۲۳۔اور اس روز سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، نہ اس سے معاوضہ قبول ہو گا، نہ شفاعت اسے فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ ہی انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔

تشریح کلمات

جَزَاء : پاداش۔ بدلہ۔ خیر کا بدلہ خیر۔ شر کا بدلہ شر۔

جَزِيه : ذمی کافر سے وصول ہونے والا ٹیکس، جو دراصل اس کی جان و مال کی حفاظت کا بدلہ ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

شفاعت کے موضوع سے متعلق اسی سورے کی آیت ۴۸ ملاحظہ فرمائیں۔

کسی ابتلا سے نکلنے کے تین راستے ہو سکتے ہیں: کوئی دوسرا شخص اس کے جرم کی ذمہ داری لے یا

اس جرم کا فدیہ ادا کرے یا کوئی اس کی سفارش کر کے جرم معاف کرائے۔ مجرموں کو قیامت کے عذاب سے نجات کے لیے ان میں سے کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ اس دن کوئی شخص اس کے جرم کی ذمہ داری نہیں لے سکتا، نہ کوئی فدیہ ادا کر سکتا ہے، نہ ان کے لیے کوئی شفاعت کرنے والا ہو گا۔

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾

۱۲۴۔ اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انہوں نے انہیں پورا کر دکھایا۔ ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

تشریح کلمات

بْراھیم : حضرت ابراہیم (ع) ابو الانبیاء ہیں۔ وہ دنیا کے تین بڑے ادیان کے پیشواؤں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور حضرت محمد (ص) کے جد اعلیٰ ہیں۔ آپ (ع) قدیم کلدانی سلطنت بابل اور موجودہ عراق کے ایک شہر اُر (UR) میں پیدا ہوئے۔ عام خیال یہ ہے کہ آپ حبرون میں دفن ہوئے، جسے اب الخلیل کہتے ہیں۔

آپ (ع) نے اپنے فرزندوں کے ذریعے دنیا میں دعوتِ توحید کے دو مراکز قائم کیے۔ ایک حرم مکہ (حجاز) میں اور دوسرا حرم اقصیٰ (فلسطین) میں۔ حجاز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور فلسطین میں حضرت اسحاق علیہ السلام کو متعین فرمایا۔ توریت میں آپؑ کا نام ابرام اور ابراھم دونوں طرح مذکور ہے۔ اہل لغت کے نزدیک ابراھیم، اب اور راھم سے مرکب ہے۔ اَب یعنی باپ یا رئیس اور راھم یعنی بلند پایہ۔ بنابرین ابراھم یعنی عظیم باپ اس نام کے متعدد تلفظ ہیں: ابرام، ابراھم، ابراھام، ابراھیم۔

اِبۡتَلَاء: (ب ل و) بلاء لاغر اور کہنہ۔ آزمائش اور امتحان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جسے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔

کَلِمَات: (ك ل م) کلمہ کی جمع ہے۔ یعنی وہ لفظ جو معنی پر دلالت کرے۔ اصل میں کلم کا مفہوم زخم لگانا ہے۔ لفظ چونکہ معنی کے نشانے پر لگتا ہے، اس لیے اسے کلمہ کہا جاتا ہے۔

اِمَام: (ا م م) جس کی پیروی کی جائے۔ چاہے وہ شخص ہو یا کتاب اور شخص چاہے حق پر ہو یا باطل پر:
یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِہِمۡ [1] قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔
یاد رہے کہ قیامت کے دن ہر ایک اپنے اپنے پیشوا کے ساتھ محشور ہوگا خواہ وہ پیشوا برحق ہو یا نہ ہو۔

ذُرِّیَّۃ: اولاد۔

تفسیر آیات

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ ... الخ: دعوت خدا کے بانی، انسانی ارتقائی سفر کے میر کارواں، دعوت توحید کے مؤسس، تحریک جہاد کے اولین قائد، راہ خدا کے پہلے مجاہد، بیت اللہ کے معمار، اللہ کی راہ میں نکلنے والے پہلے مہاجر، تاریخ انسانیت کے عظیم بت شکن، ابو الانبیاء، خلیل خدا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ ذکر خلیلؑ کے لیے قرآن نے جس مقام کا انتخاب کیا ہے، وہ نظم و ترتیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے۔

اہل کتاب اپنے آپ کو حضرت اسحاق (ع) کے ذریعے حضرت ابراہیم (ع) سے مربوط کرتے ہیں۔ ادھر بنی اسرائیل سمجھتے ہیں کہ وہی اللہ کی برگزیدہ قوم اور روئے زمین پر الٰہی منصب خلافت کے اہل ہیں۔ یہ لوگ نسل اسماعیل کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اسماعیلی اور اسرائیلی نسلی رقابت کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قرآن نے بنی اسرائیل کی طویل تاریخ بیان فرماتے ہوئے اس بات کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے کہ یہ قوم کس قدر بدعہد، بدکردار اور ناشکری ہے۔ قرآن کے طرز بیان اور سیاق عبارت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم اس الٰہی منصب کی اہل نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جن بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا، اب یہ نعمتیں اس سے چھن رہی ہیں۔ یہاں تک کہ منصب خلافت بھی اب ان سے لے کر کسی اہل اور امین کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی حضرت خلیل (ع) کی امامت، ان کی اولاد میں اس منصب کے تسلسل، ظالموں کو اس منصب سے دور رکھنے بیت اللہ کی تعمیر، اس خانۂ خدا کو ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک رکھنے کی ذمہ داری، تبدیلی قبلہ اور نسل اسماعیلؑ کے لیے منصب رسالت کی دعا کا ذکر آتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ دنیاوی امامت کے لیے نسل اسرائیل کی جگہ اب نسل اسماعیل کو منتخب کر لیا گیا ہے۔

فلسفۂ امتحان: وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ ۔ خداوند عالم کسی بندے کو اس لیے امتحان میں نہیں ڈالتا کہ اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بندہ کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور کیا کچھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا تو پہلے ہی سے ہر چیز کا علم رکھتا ہے، بلکہ امتحان و آزمائش کا مقصد بندے کو میدان عمل فراہم کرنا ہے تاکہ وہ حسن کارکردگی کی

---

[1] ۱۷ اسراء: ۷۱

بنا پر اللہ کے فضل و کرم کا مستحق ٹھہرے یا بدکرداری کی وجہ سے غضب الٰہی کا سزاوار قرار پائے۔ یہاں بھی اللہ کی مرضی یہ تھی کہ ابراہیم (ع) کا امتحان لیا جائے تا کہ امتحان میں کامیابی کے نتیجے میں استحقاق کی بنیاد پر نہیں برگزیدہ فرمائے اور منصب امامت و رسالت پر فائز کرے۔ یہ درست ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، مگر یاد رہے کہ اللہ کی مشیت اور چاہت ایک حکیمانہ بنیاد پر قائم ہے، جس کے مطابق وہ صرف اہل اور مستحق افراد کو عزت دیتا ہے اور نااہل و غیر مستحق افراد کو عزت و وقار سے محروم کر دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

فَاِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَقْصِمْ جَبَّارِیْ دَھْرٍ قَطُّ اِلَّا بَعْدَ تَمْھِیْلٍ وَ رَخَاءٍ وَ لَمْ یَجْبُرْ عَظْمَ اَحَدٍ مِنَ الْاُمَمِ اِلَّا بَعْدَ اَزْلٍ وَ بَلَاءٍ۔[1]

اللہ تعالیٰ نے زمانے کے کسی سرکش کی گردن نہیں توڑی، جب تک اسے مہلت نہیں دی اور کسی امت کی (شکستہ) ہڈی نہیں جوڑی جب تک اسے سختی اور آزمائش میں نہیں ڈالا۔

خود قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ؕ[2]

اور ہم برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہاری آزمائش کرتے ہیں۔

بلکہ امتحان سے تو انسان کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور اس کی عظمت کے خد و خال روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے انبیاء اور علماء کی آزمائش زیادہ سخت ہوتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق آزمائش جتنی کڑی ہوگی اجر و ثواب اتنا ہی زیادہ ہوگا:

کُلَّمَا کَانَتِ الْبَلْوٰی وَ الْاِخْتِبَارُ اَعْظَمَ کَانَتِ الْمَثُوْبَۃُ وَ الْجَزَاءُ اَجْزَلَ۔[3]

جتنا کڑی اور سخت آزمائش ہوگی، اتنی ہی جزا بڑی ہوگی۔

انبیاء اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی آزمائش ان کے عظیم مقام اور بلند رتبے کے لحاظ سے زیادہ کڑی ہوتی ہے۔

انبیاء (ع) کی آزمائش کے سلسلے میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ لِاَنْبِیَائِہٖ حَیْثُ بَعَثَھُمْ اَنْ یَفْتَحَ لَھُمْ کُنُوْزَ الذِّھْبَانِ وَ مَعَادِنَ الْعِقْیَانِ وَ مَغَارِسَ الْجِنَانِ وَ اَنْ یَحْشُرَ مَعَھُمْ طُیُوْرَ السَّمَاءِ وَ

انبیاء (ع) کو مبعوث کرتے وقت اگر خداوند عالم یہ چاہتا کہ ان کے لیے سونے کے خزانوں اور خالص طلا کی کانوں کے منہ کھول دے اور باغوں کے کشت زار انہیں مہیا کرے نیز فضا کے پرندوں اور صحرائی

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ: ۸۶ ص ۲۵۰　[2] ۲۱ انبیاء: ۳۵　[3] نہج البلاغۃ خطبہ: ۱۹۰ ص ۵۲۳

وُحُوْشَ الْاَرَضِیْنَ لَفَعَلَ وَ لَو فَعَلَ لَسَقَطَ الْبَلَاءُ وَ بَطَلَ الْجَزَاءُ وَ اِضْمَحَلَّتِ الْاَنْبَاءُ ۔[1]	جانوروں کو ان کے ہمراہ کر دے، تو کر سکتا تھا۔ لیکن اگر ایسا کرتا تو پھر آزمائش ختم، جزا و سزا بیکار اور آسمانی خبریں اکارت ہو جاتیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنا بار امانت ایسے لوگوں کے کندھوں پر ڈالتا ہے جنہیں وہ کڑی سے کڑی آزمائش سے گزار چکا ہوتا ہے۔ امانت و رسالت کا بارگراں تو اپنی جگہ، ان ہستیوں سے وابستگی کے لیے بھی آزمائش کا کٹھن راستہ عبور کرنا پڑتا ہے۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام سے وابستہ رہنا انتہائی مشکل امر ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اَمْرَنَا صَعْبٌ مُسْتَصْعَبٌ لَا یَحْمِلُہٗ اِلَّا عَبْدٌ اِمْتَحَنَ اللّٰہُ قَلْبَہٗ لِلْاِیْمَانِ ۔[2]	ہمارا معاملہ مشکل اور دشوار ہے۔ جس کا متحمل وہی بندہ مؤمن ہوگا جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے آزما لیا ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امتحان و آزمائش ارتقا و تکامل کا ذریعہ ہے، جس سے گزرے بغیر کوئی شخص خدا کی جانب سے کسی منصب پر فائز نہیں ہوسکتا۔

بِکَلِمٰتٍ: کَلِمَات سے کیا مراد ہے؟ عربی زبان میں کلمہ وہ لفظ ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے اور وہ معنی بھی کلمہ کہلاتا ہے جو کسی اور معنی پر دلالت کرے۔ لہٰذا کلمہ کا بنیادی مفہوم "دلالت" ہے:

۱۔ یہ دلالت لفظ کے ذریعے ہو تو اس لفظ کو کلمہ کہتے ہیں۔

۲۔ جو ذات اللہ کے وجود پر دلالت کرے وہ کلمہ کہلائے گی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا ہونے کی وجہ سے وجود خدا پر ایک دلیل ہیں۔ اس لیے انہیں کلمہ کہا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ۚ اَلْقٰہَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ ...[3]	بیشک مسیح عیسیٰ بن مریم تو اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جو اللہ نے مریم تک پہنچا دیا....

حضرت رسول خدا (ص) کے بارے میں ارشاد ہے:

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا ...[4]	بے شک اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کیا ہے، ایک ایسا رسول .....

۳۔ دلیل و برہان کو بھی کلمہ کہتے ہیں اس لیے کہ یہ حق پر دلالت کرتی ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

وَ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۷﴾	جب کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنے فرامین کے ذریعے ثبات بخشے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

---

[1] و [2] حوالہ سابق ص ۵۲۲ [3] ۴ نساء: ۱۷۱ [4] ۶۵ طلاق: ۱۰-۱۱ [5] ۸ انفال: ۷

وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ہِیَ الۡعُلۡیَا ... [1]　　اور اللہ کا کلمہ تو سب سے بالاتر ہے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کن کلمات سے آزمایا گیا اور ان کلمات کی نوعیت کیا تھی؟

قرآن کریم کی طرف رجوع کریں تو ایک مقام ملتا ہے جس سے امتحان کی نوعیت کا علم ہو جاتا ہے اور چونکہ امتحان کَلِمات کے ذریعے ہوتا تھا، اسی لیے کلمات کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ وہ مقام ذبح عظیم کا ہے، جس کے بارے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ [2]　　یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا۔

الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ سے ابتلائے ابراہیم کی نوعیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ''بیٹے کی قربانی'' ایک ایسا کلمہ ہے جو کَلِمَہ کُنْ کی طرح فوری طور پر واجب التعمیل ہے۔ پس حضرت ابراہیم (ع) کو ایسے امور کے ساتھ آزمایا گیا جن کی فوری تعمیل ضروری تھی۔ اسی لیے انہیں کلمہ کہا گیا ہے۔ چونکہ کلمہ کُنْ فَیَکُوْن سے دائمی تکوینی وجود لازم ہوتا ہے، اس لیے اس کی تعمیل کو قیامت تک شعائر اللہ میں داخل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس واقعے کی یاد مناتے وقت مکہ میں جو قربانی دی جاتی ہے وہ بھی شعائر اللہ میں داخل ہے:

وَ الۡبُدۡنَ جَعَلۡنٰہَا لَکُمۡ مِّنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ... [3]　　اور قربانی کے اونٹ میں جسے ہم نے تم لوگوں کے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم (ع) کو ان امتحانات میں مختلف مراحل سے گزارا گیا۔ ہر مرحلے میں وہ ایک دوسرے عالم میں داخل ہوتے تھے۔ ان کے لیے نئی راہیں کھلتی تھیں اور اللہ کا مزید قرب حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ بت شکنی اور اس کے مقدمے میں پیشی، آتش نمرود میں پھینکا جانا، سرسبز و شاداب وطن چھوڑ کر مکہ کی بے آب و گیاہ سرزمین کی طرف ہجرت، اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلانا اور دیگر مراحل سے گزر کر حضرت ابراہیم (ع) ملکوت الٰہی تک جا پہنچے:

وَ کَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿﴾ [4]　　اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی حکومت دکھاتے تھے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں۔

عالم ملکوت اس کائنات کا باطنی چہرہ ہے اور اس عالم میں حضرت ابراہیم (ع) کے وارد ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَتَمَّہُنَّ یعنی ابراہیم (ع) نے ان کلمات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اَتَمَّ یعنی کمال تک پہنچانا۔ ارشاد ہے:

وَ یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾ [5]　　مگر اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے کے علاوہ کوئی بات نہیں مانتا اگرچہ کافروں کو ناگوار گزرے۔

---

[1] ۹ توبہ: ۴۰　[2] ۳۷ صافات: ۱۰۶　[3] ۲۲ حج: ۳۶　[4] ۶ انعام: ۷۵　[5] ۹ توبہ: ۳۲

بعض مفسرین کے مطابق اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کو اللہ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، نہ کہ ابراہیم (ع) نے۔ لیکن سیاق عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کلمات کا امتحان ابراہیم (ع) سے لیا گیا تو انہیں مکمل کرنا ابراہیم (ع) ہی کی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد انہیں امامت کا مقام حاصل ہوا۔ اگر اللہ نے ان کلمات کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہوتا تو حضرت ابراہیم (ع) کو مقام امامت کے حصول کی خصوصیت حاصل نہ ہوتی۔

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا: اِمَام یعنی وہ شخصیت جس کی لوگ اقتدا کریں۔ چونکہ لوگ رسول کی بھی اقتدا کرتے ہیں اور یہ واجب بھی ہے، اس لیے کچھ لوگوں کو شبہ ہوا کہ اِمَام سے مراد رسول ہی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ چند وجوہات کی بنا پر درست نہیں ہے:

۱۔ حضرت ابراہیم (ع) کو متعدد کلمات سے آزمانے کے بعد درجہ امامت پر فائز کیا گیا جن میں سر فہرست حضرت اسماعیل (ع) کی قربانی تھی۔ اسماعیل (ع) حضرت ابراہیم (ع) کے بڑھاپے میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم (ع) کا یہ قول قرآن مجید میں بیان ہوا ہے:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ...[1]	ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔

توریت میں ہے کہ حضرت اسماعیل (ع) کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم (ع) کی عمر ۸۴ سال تھی۔[2] نیز توریت میں ہی مرقوم ہے کہ حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہا السلام کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔ بنا بریں حضرت ابراہیم (ع) مقام امامت پر فائز ہونے سے پہلے ہی رسول تھے۔ کیونکہ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ سے ثابت ہے کہ امامت پر فائز ہوتے وقت آپ (ع) کی اولاد موجود تھی۔

۲۔ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ ... کا خطاب بذات خود درجہ رسالت کی تصدیق کرتا ہے، کیونکہ یہ وحی ہے اور وحی کا نزول نبوت کا ثبوت ہوتا ہے۔

نبوت: نبی وہ ہے جو عالم خواب میں آواز سنتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم (ع) کا خواب یا رسالتمآب (ص) پر وحی نازل ہونے سے قبل جو کچھ خواب میں سنائی دیتا تھا۔[3]

رسالت: رسول وہ ہیں جن پر جبرئیل نازل ہوتا ہے اور انہیں فرشتۂ وحی نظر آتا ہے۔

امامت:

۱۔ امام تبلیغ و ارشاد اور تربیت امت کے منصب کے ساتھ ولایت و حاکمیت اور مؤمنین کے نفوس پر ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے۔ چنانچہ رسالت مآب کے حق میں ارشاد ہوا:

---

[1] ۱۴ ابراہیم: ۳۹　[2] پیدائش ۱۶: ۱۶　[3] اصول الکافی ۱: ۱۷۶۔ باب الفرق بین الرسول و النبی

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ... [1]	نبی مؤمنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے۔

یعنی رسول خدا (ص) کو مؤمنین کے نفوس پر جو ولایت و حاکمیت اور حق تصرف حاصل ہے، وہ خود مؤمنین کو اپنے نفوس پر حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ جب ولایت و حاکمیت کے لحاظ سے نفاذ امر خدا کا مرحلہ آتا ہے تو امامت کی ذمہ داری شروع ہو جاتی ہے۔

۲۔ امام مقام امر کے تحت ہدایت کرتا ہے۔ وہ رہبر ہونے کے ناطے امت کی ہدایت کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَ جَعَلۡنَا مِنۡہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ۟ؕ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یُوۡقِنُوۡنَ ○ [2]	اور جب انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھے ہوئے تھے تو ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔

عالم امر و ملکوت اس کائنات کی حقیقی و باطنی صورت ہے۔ لہٰذا امام کی ہدایت صرف تبلیغ و ارشاد سے ہی نہیں بلکہ نفاذ سے بھی مربوط ہے۔ امر الٰہی کے عملی نفاذ کے موقع پر جب انہیں رہبری کا مقام حاصل ہو گا تو امام کہلائیں گے۔

۳۔ امام دنیا و آخرت میں یکساں رہنما ہوتے ہیں۔ وہ کونین اور دارین کے پیشوا اور ان دونوں جہانوں میں مؤمنین کو خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِہِمۡ ... [3]	قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔

۴۔ امام سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کو ان کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ تمام زمانوں میں امام موجود ہوں۔

۵۔ امام معصوم عن الخطاء ہوتا ہے کیونکہ اگر (بفرض محال) امام سے معصیت صادر ہو جائے تو رہبر و رہنما اور مقتدیٰ ہونے کی بنا پر اس کی اقتدا ہم پر واجب ہو گی جب کہ دوسری طرف سے معصیت کا ارتکاب حرام ہو گا اور چونکہ ایک ہی وقت میں ایک چیز میں واجب اور حرام کا اجتماع محال ہے، لہٰذا امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

بہت سے انبیاء صرف نبوت کے مقام پر فائز رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی نبی نبوت و رسالت دونوں منصبوں پر فائز ہو۔ اسی طرح اولو العزم شخصیات تینوں مناصب (نبوت، رسالت اور امامت) پر فائز

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶ [2] ۳۲ سجدہ: ۲۴ [3] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۱

ہوتی ہیں، جیسے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلوات اللہ علیہم۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی نبوت و رسالت کے مقام پر فائز نہ ہو بلکہ صرف امامت کے منصب پر فائز ہو۔ البتہ یہ صورت اس وقت قابل تصور ہوگی جب وحی احکام اور رسالت آسمانی، پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوں اور مزید وحی اور جدید شریعت کی ضرورت باقی نہ رہے۔ جیسے حضرت محمد مصطفیٰ صلوات اللہ علیہ وآلہ کے ذریعے آسمانی پیام اور الٰہی دستور حد کمال کو پہنچ چکا تو ارشاد ہوا: اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ ... اب نبوت کا سلسلہ ختم ہوا اور اس آسمانی رسالت اور الٰہی دستور کے نفاذ کے لیے امامت عظمٰی اور ولایت کبریٰ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم (ع) کو مقام امامت کی اہمیت اور ہر زمانے میں اس کی ضرورت کا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلسلۂ امامت لوگوں کی ہدایت کے لیے قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ خود قرآن مجید حضرت ابراہیم (ع) کے علم وفہم اور کمال ادراک کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ رُشۡدَہٗ مِنۡ قَبۡلُ وَکُنَّا بِہٖ عٰلِمِیۡنَ ۝[1]

اور بتحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کامل عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے باخبر تھے۔

اسی رشد وکمال کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ عظیم الٰہی منصب صرف ان کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ ان کی اولاد میں نسل در نسل جاری و ساری رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی یہ خواہش پوری کی اور فرمایا:

فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَاٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ۝[2]

ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی اور ان کو عظیم سلطنت عنایت کی۔

حضرت ابراہیم (ع) نے ساری اولاد کے لیے سوال نہیں فرمایا بلکہ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ کے ذریعے بعض کے لیے اس منصب کی درخواست کی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میری تمام اولاد اس منصب کی اہل نہیں ہوگی۔

چنانچہ قرآن مجید بھی اس بات کی وضاحت فرماتا ہے:

وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ مُبِیۡنٌ ۝[3]

ان دونوں (ابراہیم و اسحاق علیہما السلام) کی اولاد میں نیکی کرنے والا بھی ہے اور اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا بھی ہے۔

حضرت ابراہیم (ع) کی استدعا کے جواب میں خالق نے ارشاد فرمایا: لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ میرا یہ عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ چونکہ یہ عہدہ اسلامی احکام کے نفاذ سے مربوط ہے، لہٰذا جو اپنے نفس پر کوئی حکم نافذ نہ کر سکے وہ دوسروں پر اس کے نفاذ کی ضمانت کیسے فراہم کر سکتا ہے؟ مرحوم علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۵۱ [2] ۴ نساء: ۵۴ [3] ۳۷ صافات: ۱۱۳

نقل کرتے ہیں کہ ان کے ایک استاد محترمؒ سے سوال کیا گیا کہ یہ آیت عصمت امام پر کیسے دلالت کرتی ہے؟
تو جواب میں فرمایا:

عقلی تقسیم کے مطابق لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ جو اپنی ساری زندگی ظالم رہے ہوں۔

۲۔ جو زندگی میں کبھی ظالم نہ رہے ہوں۔

۳۔ جو ابتدائے عمر میں ظالم رہے ہوں۔

۴۔ آخر عمر میں ظالم ہوں۔

حضرت ابراہیم (ع) کی شان اس سے بالاتر ہے کہ وہ پہلی اور آخری قسم کے لوگوں کے لیے امامت کی خواہش کرتے۔ باقی دو قسمیں رہ جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک کے لیے اللہ تعالیٰ نے امامت کی نفی فرما دی، لہٰذا وہی لوگ منصب امامت کے اہل رہ گئے جو پوری عمر میں کبھی ظالم نہ رہے ہوں۔[1]

پس نسل اسماعیل (ع) کے وہ لوگ اس منصب کے اہل نہیں جو بت پرستی جیسے ظلم کے مرتکب ہوئے ہوں۔

ظلم کیا ہے؟: کسی چیز کو اس کے مناسب مقام سے ہٹانا ظلم ہے۔ ظَلَمَتِ السَّقَّا کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب مشکیزے میں دودھ ڈالنے کے بعد اس کے جمنے اور دہی بننے سے پہلے ہی اسے پی لیا جائے۔ اس لیے حق سے تجاوز کرنا بھی ظلم کہلاتا ہے۔ اس کے مختلف درجے ہیں۔ سب سے بڑا ظلم، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے:

اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ [2]	یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

حق سے تجاوز اگر قلیل ہو تو اسے معصیت کہتے ہیں۔ ہر قسم کی معصیت ظلم کے اطلاق میں شامل ہے۔ آیہ شریفہ میں مطلق ظلم کا ذکر ہے۔ اس لیے امام کا ہر قسم کے ظلم سے پاک ہونا ضروری ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ وَ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ۔ [3]	جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا یہی لوگ امن میں ہیں اور یہی ہدایت یافتہ ہیں.

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اِتَّخَذَ اِبۡرَاھِیۡمَ عَبۡداً قَبۡلَ اَنۡ یَتَّخِذَہُ نَبِیًّا وَ اَنَّ اللّٰہَ اِتَّخَذَہُ	خداوند عالم نے ابراہیم (ع) کو عبد بنایا قبل اس کے کہ انہیں نبی بناتا، خداوند عالم نے انہیں نبی بنایا،

---

[1] المیزان ۱: ۲۷۴ [2] ۳۱ لقمان: ۱۳ [3] ۶ انعام: ۸۲

نَبِيًّا قَبْلَ اَنْ يَتَّخِذَهُ رَسُوْلاً وَ اِنَّ اللّٰهَ اِتَّخَذَهُ رَسُوْلاً قَبْلَ اَنْ يَتَّخِذَهُ خَلِيْلاً وَ اِنَّ اللّٰهَ اِتَّخَذَهُ خَلِيْلاً قَبْلَ اَنْ يَجْعَلَهُ اِمَاماً فَلَمَّا جَمَعَ لَهُ الْاَشْيَاءَ قَالَ: اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا. قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: فَمِنْ عِظَمِهَا فِيْ عَيْنِ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ: وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ ـ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَا يَكُوْنُ السَّفِيْهُ اِمَامُ التَّقِي۔[1]

قبل اس کے کہ انہیں رسول بناتا۔ خدا نے انہیں رسول بنایا، قبل اس کے کہ انہیں خلیل بناتا اور خدا نے انہیں خلیل بنایا، قبل اس کے کہ انہیں امام بناتا۔ جب حضرت ابراہیم (ع) ان تمام مناصب پر فائز ہو گئے تو اللہ نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ امام (ع) فرماتے ہیں کہ جب ابراہیم (ع) کو امامت کی عظمت کا اندازہ ہوا تو عرض کی: میری اولاد سے بھی! ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: کم عقل آدمی متقی لوگوں کا امام نہیں ہوسکتا۔

یہاں امام علیہ السلام نے ظلم کے مرتکب کو کم عقل قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰھٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ[2]

اب ملت ابراہیم سے کون انحراف کرے گا سوائے اس شخص کے جس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا.

ابن مسعود نے رسول اکرم (ص) سے اس آیت کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ آپ (ص) نے دعائے ابراہیم (ع) کے ذکر کے بعد فرمایا:

فَانْتَهَتِ الدَّعْوَةُ اِلَيَّ وَ اِلٰى اَخِيْ عَلِيٍّ لَمْ يَسْجُدْ اَحَدٌ مِنَّا لِصَنَمٍ قَطُّ فَاتَّخَذَنِيْ اللّٰهُ نَبِيًّا وَ عَلِيًّا وَصِيًّا۔[3]

دعائے ابراہیم (ع) کا سلسلہ مجھ تک اور میرے بھائی علی (ع) تک پہنچا۔ ہم میں سے کسی نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی (ص) اور علی (ع) کو وصی بنایا۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی مناصب، امتحان میں کامیابی اور صلاحیتوں کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔

۲۔ امامت، احکام خداوندی کے عملی نفاذ کے لیے حاصل شدہ ولایت اور حکمرانی کے حق سے عبارت ہے۔

۳۔ امام جمہوری، استبدادی یا خاندانی بنیاد پر نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے منصوب ہوتا ہے: اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔

۴۔ امام کسی خاص گروہ کا نہیں بلکہ عالم انسانیت کا رہبر و رہنما ہوتا ہے: لِلنَّاسِ ....۔

---

[1] اصول کافی ۱: ۱۷۵ [2] بقرہ: ۱۳۰ [3] مواہب الرحمن ۲: ۲۰۔ الامالی للطوسی ص ۳۷۸

۵۔ جس کا ماضی داغدار ہو وہ امامت کا اہل نہیں ہو سکتا: لَا یَنَالُ ...۔

۶۔ امامت کا مقصد پوری انسانیت کی ہدایت اور دنیاوی و اخروی فلاح ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۱: ۱۷۵۔ الامالی صدوق ص ۳۷۸۔ شواہد التنزیل ۱: ۴۱۱۔

وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا ؕ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی ؕ وَ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو مرجع خلائق اور مقام امن قرار دیا اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو مصلیٰ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل پر یہ ذمے داری عائد کی کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

تشریح کلمات

الۡبَیۡتَ: انسان کا رات کا ٹھکانا۔ بعد میں مکان و منزل کے لیے استعمال کیا گیا۔

مَثَابَۃً: (ث و ب) جائے بازگشت۔

اِسۡمٰعِیۡلَ: عبرانی لفظ ہے جو ایشمع یعنی سماع اور ایل یعنی اللّٰہ سے مرکب ہے، جس کا معنی ہے سموع من اللّٰہ ''اللہ کو خوب سننے والا''۔

تفسیر آیات

خانہ کعبہ کو خدا نے چند جہات سے مرجع خلائق اور عالمی مرکز قرار دیا ہے:

الف۔ محل وحی ہونے کے لحاظ سے مرکز شریعت و احکام۔

ب۔ تحریک و قیام کے لحاظ سے تحریک ابراہیمی و انقلاب محمدی کا مرکز۔

ج۔ عبادت و خشوع کے لیے قبلۂ عالم۔

د۔ حج کی انجام دہی کے لیے مرکز مسلمین۔

ھ۔ امن و آشتی کا گہوارہ۔

ایمان و اسلام کے بعد دنیا و آخرت کے امن کا ایک نمونہ، خانہ کعبہ کا امن ہے۔ چنانچہ حرم کے

احاطے میں انسان وحیوان تو اپنی جگہ نباتات تک کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔

وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی: مَقَام کھڑا ہونے کی جگہ۔ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم (ع) کے قدموں کے آثار موجود ہیں۔ اس کے بارے میں حضرت ابوطالبؑ فرماتے ہیں:

وَ مَوْطِئُ اِبْرَاهِيْمَ فِيْ الصَّخْرَةِ وَطْاَةً　　یہ وہ مقام ہے، جس پتھر پر حضرت ابراہیم (ع) نے

عَلَى قَدَمَيْهِ حَافِيًا غَيْرَ نَاعِلٍ۔　　ننگے پاؤں اپنے دونوں قدم رکھے تھے۔

حضرت ابراہیم (ع) جب خانہ کعبہ کی دیوار اٹھا رہے تھے تو اس پتھر پر قدم رکھتے تھے۔

اسی مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں میں حج کا اعلان فرمایا تھا۔

اس مقام کو اللہ تعالیٰ نے آیات بینات میں شامل فرمایا ہے:

فِيۡهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ [1]　　اس میں واضح نشانیاں ہیں (مثلاً) مقام ابراہیم۔

طواف میں واجب ہے کہ اس مقام کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی جائے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: مقام ابراہیم (ع) پر نماز پڑھو، بلکہ فرمایا: مقام ابراہیم (ع) کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اس سے مقام ابراہیم (ع) کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ: حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے اس گھر کو پاک رکھنے کا عہد لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند کریم اپنے اس گھر کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ خاص کر بَيْتِيَ کہکر اللہ نے اس کی نسبت اپنی طرف دی اور اس کی شان و رفعت کو چار چاند لگا دیے۔

پاک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اس گھر کی حرمت (احترام) کے منافی ہے، اس سے اس گھر کو پاک رکھا جائے۔ چنانچہ بتوں کے ساتھ ساتھ دیگر تمام خرافات سے پاک رکھنا بھی ضروری اور واجب ہے۔

لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ: یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مستقبل میں بھی یہ گھر طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کا مرکز رہے گا۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ دَخَلَ الْحَرَمَ مِنَ النَّاسِ مُسْتَجِيْراً بِهٖ فَهُوَ آمِنٌ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ مَنْ دَخَلَهٗ مِنَ الْوَحْشِ وَ الطَّيْرِ كَانَ آمِناً مِنْ اَنْ يُّهَاجَ اَوْ يُؤْذَى حَتّٰى يَخْرُجَ مِنَ الْحَرَمِ۔ [2]

جو شخص حرم میں پناہ لینے کے لیے داخل ہوتا ہے، وہ اللہ کے غیظ و غضب سے مامون ہوتا ہے اور جو وحشی جانور اور پرندہ اس میں داخل ہوتا ہے وہ بھی ہر قسم کے گزند اور اذیت سے امن میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حرم سے خارج ہو جائے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۹۷　[2] اصول الکافی ۴: ۲۲۶

اہم نکات

۱۔ انسانیت ایک ہمہ گیر مرکزیت کی محتاج ہے: مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا۔

۲۔ کعبہ انسانیت کا مرکز و محور اور اس کے امن کا گہوارہ ہے۔

۳۔ مرکز کو ہر قسم کی آلودگیوں اور خرافات سے پاک رکھنا چاہیے۔

۴۔ عبادت گاہوں کو جہاں ظاہری نجاست سے پاک رکھنا ضروری ہے، وہاں فکری و عملی خرافات اور آلودگیوں سے پاک رکھنا بھی واجب و لازم ہے: طَهِّرَا بَيْتِيَ۔

۵۔ فتح مکہ کے وقت رسول خدا (ص) اور حضرت علیؑ کے ہاتھوں بت شکنی سے ان ہستیوں کا پتہ چلتا ہے جو حضرت ابراہیم (ع) کی وارث ہیں۔

تحقیق مزید

مجمع البیان ذیل آیہ۔ الکافی ۱: ۱۳۴۔ التہذیب ۵: ۹۸۔ ۱۳۷، ۴: ۳۰۴۔ الوسائل ۱۳: ۳۳۱۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم نے دعا کی: اے رب! اسے امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائیں، انہیں ثمرات میں سے رزق عنایت فرما، ارشاد ہوا: جو کفر اختیار کریں گے انہیں بھی کچھ دن (دنیا کی) لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا، پھر انہیں عذاب جہنم کی طرف دھکیل دوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

اضطر: (ض ر ر) کسی ناپسندیدہ بات پر مجبور کرنا۔

تفسیر آیات

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ....۔ شہر مکہ اور مؤمنین مکہ کے لیے دعائے خلیل کے دو حصے ہیں: ۱۔ امن ۲۔ پھلوں کی فراوانی۔

مکہ جس علاقے میں واقع ہے، وہاں نہ تو امن تھا اور نہ ہی کوئی ذریعہ معاش۔ اس کی دلیل یہ ہے:

۱۔ علاقے میں امن و آشتی کے فقدان کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ ...[1]

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنا دیا ہے جب کہ لوگ ان کے گرد و نواح سے اچک لیے جاتے تھے۔

۲۔ علاقے میں زراعت کے فقدان کا تذکرہ خود حضرت ابراہیم (ع) کی زبانی سنتے ہیں:

رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ...[2]

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا۔

یہ علاقہ آج بھی زرخیزی و زراعت سے محروم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو اس پرخطر علاقے میں امن فراہم کیا، جہاں لوٹ مار اور قتل و غارتگری ایک رسم بن چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہر قسم کے فساد و انتشار اور بدامنی کو ممنوع قرار دیا اور داخلی و بیرونی خطرات سے امن و امان کی ضمانت فراہم کی۔

داخلی امن کے لیے حرم کی حدود میں داخل ہونے والے شخص کو ہر قسم کی اذیت اور نقصان سے محفوظ قرار دیا بلکہ ان حدود میں بسنے والے جانوروں تک کو اذیت پہنچانا بھی ممنوع قرار دیا۔

بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے حج و زیارت کے چار مہینوں میں لڑائی و خونریزی کو حرام قرار دیا۔ دعائے خلیل علیہ السلام کی قبولیت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾[3]

انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے انہیں امن دیا۔

نیز ارشاد ہوا:

اَوَلَمۡ نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ ...[4]

کیا ہم نے ایک پرامن حرم ان کے اختیار میں نہیں رکھا جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں؟

مَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ : خلیل (ع) کی دعا اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۶۷ [2] ۱۴ ابراہیم: ۳۷ [3] ۱۰۶ قریش: ۳۔۴ [4] ۲۸ قصص: ۵۷

لیے مخصوص تھی، تاہم اللہ تعالیٰ اپنی رحیمانہ روش کے تحت سب کو روزی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار کو دنیا کی چند روزہ زندگی میں ڈھیل دیتا ہے، جب کہ کفر و ایمان کا حقیقی امتیاز بروز آخرت ہی معلوم ہوگا۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: وَمَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا ... جو لوگ کفر اختیار کریں گے، انہیں بھی کچھ دن دنیا کی لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔

مومن و کافر کے لیے رزق کی فراوانی دعائے خلیل (ع) کی برکات میں سے ایک ہے۔ اس میں اہل مکہ کو کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ چنانچہ اگر وہ عہد خلیل (ع) پر قائم نہ رہیں اور نمرودوں کے دامن میں پناہ لے لیں اور مغرب و مشرق کے استعماری بتوں کی پرستش کریں تو طاغوت شکن خلیل (ع) کی دعا آخرت میں انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی، ہر چند کہ وہ دنیا کے ثمرات سے بہرہ مند ہوتے رہیں گے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمنین کے لیے امن و امان اور معاشی خوشحالی انبیاء کی ترجیحات میں شامل رہی ہے۔

۲۔ کفار اگرچہ دنیا کی عارضی خوشحالی سے بہرہ مند ہوں گے، لیکن آخرت کے حقیقی اور دائمی امن و آسائش سے محروم رہیں گے۔

۳۔ مکہ کو خدا نے جائے امن بنایا ہے۔

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور دعا کر رہے تھے کہ) اے ہمارے رب! ہم سے (یہ عمل) قبول فرما یقیناً تو خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کے دو عظیم معماروں کا تذکرہ ہے۔ چند مربع میٹر کے ایک گھر کی نہیں بلکہ ایک تاریخ کی تعمیر کا ذکر ہے۔ پتھروں کی ایک دیوار کی نہیں، بلکہ ایک ابدی و سرمدی امت کی بنیاد رکھنے کا بیان ہے۔ اس گھر اور اس کی دیواروں کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو اس امت اور اس کی تاریخ کو حاصل ہے.

قرآنی تعبیر کے مطابق حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام تو صرف اس کی تعمیر نو کر رہے تھے۔ دوسرے قرآنی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ اس سے پہلے بیت کے نام سے

موجود تھا۔ حضرت ابراہیم (ع) نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تھی:

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ [1] میرے رب میں نے اپنی اولاد کو ایک بنجر وادی میں تیرے محترم گھر کے قریب بسایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم (ع) جس وقت حضرت اسماعیل (ع) کو عالم طفولیت میں سرزمین مکہ میں بسا رہے تھے اس وقت کعبہ بعنوان بیت موجود تھا۔

بیت اللہ (کعبہ): دنیا میں عبادت کی خاطر تعمیر ہونے والا پہلا گھر تھا، جسے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور گردش زمانہ سے اس عمارت کے آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔ حضرت ابراہیم (ع) اپنے وطن سے ہجرت فرما کر فلسطین آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے فرزند اسماعیل (ع) اور ان کی والدہ ہاجرہ کو لے کر بلاد عرب کی طرف ہجرت کریں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم (ع) مکہ تشریف لائے اور جب حضرت اسماعیل (ع) جوان ہو گئے تو ان کی مدد سے حضرت خلیل اللہ (ع) نے خانہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کیا۔ کعبۂ حضرت ابراہیم (ع) کی تعمیر کردہ شکل میں ایک مدت تک باقی رہا۔ بعد میں عمالقہ نے اس کی تعمیر نو کی۔ ان کے بعد قبیلہ جرہم نے از سر نو اسے تعمیر کیا۔

ہجرت سے دو صدی قبل رسول اکرم (ص) کے اجداد میں سے قصیٰ بن کلاب نے کعبہ کی تعمیر نو کی اور اس کے پہلو میں دار الندوۃ تعمیر کیا۔

حضور (ص) کی بعثت سے تقریبا پانچ سال قبل ایک سیلاب سے کعبہ کی عمارت منہدم ہو گئی۔ عرب قبائل نے تعمیر سے متعلقہ امور آپس میں تقسیم کر لیے، لیکن حجر اسود کو دوبارہ نصب کرتے وقت ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ یہ شرف خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آخرکار فیصلہ یہ ہوا کہ ۳۵ سالہ محمد بن عبد اللہ (ص) کو ثالث بنایا جائے۔ آپ (ص) نے اپنی فہم و فراست کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھا جائے اور تمام قبائل مل کر اسے اٹھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب حجر اسود دیوار کے قریب لایا گیا تو آپ (ص) نے اپنے دست مبارک سے اٹھا کر اسے نصب فرما دیا۔

عبد اللہ بن زبیر نے جب مکہ پر حکومت قائم کی تو یزیدیوں نے کعبہ پر منجنیق سے حملہ کیا اور اسے منہدم کر دیا۔ اس حملے میں غلاف کعبہ بھی جل گیا۔

کعبہ کی قدامت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ گھر بَیۡتُ اللّٰہ ہی کے نام سے مشہور تھا۔ عبرانی زبان میں اسے بیت ایل (بَیۡتُ اللّٰہ) کہتے تھے۔ غیر عرب اقوام اسی قدامت کی بنیاد پر اس کی عظمت کی قائل تھیں۔ ہندو اس عقیدے کی بنیاد پر اس کا احترام کرتے تھے کہ جب سیفا اپنی زوجہ کے ساتھ حجاز گئے تھے تو ان کی روح حجر اسود میں حلول کر گئی تھی۔

---

[1] ۱۴ ابراہیم: ۳۷

کلدانی کعبہ کو سات بڑے مقدس گھروں میں شمار کرتے تھے۔
اہل فارس کا عقیدہ تھا کہ ہرمز کی روح اس میں حلول کر گئی ہے۔ اس لیے وہ بھی اسے محترم سمجھتے تھے۔
یہودی اس بنیاد پر کعبہ کا احترام کرتے تھے کہ اسے حضرت ابراہیم (ع) نے تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کعبہ میں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے مجسمے نصب کر رکھے تھے۔
تمام عرب قومیں کسی نہ کسی عقیدے کی بنیاد پر کعبہ کو محترم سمجھتی تھیں۔ ہر قوم یا قبیلے نے اس میں بت نصب کر رکھے تھے، جن کی تعداد تین سو ساٹھ تھی۔[1]
فتح مکہ کے موقع پر، حضرت ابراہیم (ع) بت شکن اور حضرت اسماعیل (ع) کی ذریت میں سے ہی ان کے دو وارثوں حضرت محمد (ص) وعلی (ع) نے بت شکنی کے فرض منصبی پر عمل کرتے ہوئے خانہ کعبہ کو ان تمام بتوں سے پاک کیا۔

اہم نکات

۱۔ قرآن اپنی امت کو کعبہ کی تاریخ بتا رہا ہے۔
۲۔ دعائے ابراہیم (ع) میں دین اسلام کی تاریخی سند پیش کی جا رہی ہے کہ حضرت محمد (ص) کی رسالت دعائے ابراہیم (ع) کے عین مطابق ہے۔
۳۔ کعبہ کی اہمیت اس کی توحیدی مرکزیت کی وجہ سے ہے۔
۴۔ کعبہ حضرت ابراہیم (ع) سے پہلے بھی مرکز توحید رہ چکا تھا۔
۵۔ اعمال کی قدر و قیمت ان کے ہدف اور ان کی قبولیت پر موقوف ہے۔

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸۔ اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر اور ہمیں ہماری عبادت کی حقیقت سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما، یقیناً تو بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

مُسْلِمْ: (س ل م) اسلام قبول کرنے والا۔ سِلْمٌ سے مراد صلح ہے، تاکہ دو فریق ایک دوسرے کے

---
[1] دائرۃ المعارف قرن عشرین ۸: ۱۴۶

شر سے سالم رہیں۔ سلامتی۔ تسلیم و رضا۔ ہر نقص و عیب اور رذائل سے سالم ہونا۔ ارتقا و عروج کا ذریعہ۔

اُمَّۃً: جس جماعت کے افراد کے درمیان دینی رشتہ، جغرافیائی ربط یا عصری وحدت ہو۔ لہٰذا ایک مذہب سے منسلک افراد کو امت کہتے ہیں۔ جیسے امت مسلمہ، اسلامی امت وغیرہ۔ علاقائی بنیادوں پر بھی امت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مشرقی یا مغربی امت۔ اسی طرح ایک زمانے میں موجود ہونے کے لحاظ سے بھی امت کہا جاتا ہے، جیسے قرون وسطیٰ کی امت، آخری زمانے کی امت وغیرہ۔

مناسك: (ن س ك) نسك کی جمع۔ نسک سے مراد پاک کرنا اور دھونا ہے: نسك الثوب کپڑے کو دھویا اور پاک کیا گیا۔ اسی بنا پر یہ لفظ قربانی کے لیے استعمال ہوا، کیونکہ قربانی انسان کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کرتی ہے۔ منسک قربانی کا طریقہ، قربانگاہ۔ مناسک، حج کے اعمال و مراسم۔

تفسیر آیات

امت مسلمہ: رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ ...۔ اسلام کی تعریف بطور دین یہ ہے:

هُوَ الْاِنْقِيَادُ لِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالَى بِالْخُضُوْعِ وَ الْاِقْرَارِ بِجَمِيْعِ مَا اَوْجَبَ عَلَيْهِ۔[1]

اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے خضوع کے ساتھ سر تسلیم خم کر لینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب کردہ تمام امور کا اقرار کرنا۔

اس ضابطہ حیات میں ہر قسم کی سلامتی بھی ہے، ہر نقص و عیب سے نجات بھی اور انسانی ارتقا و عروج بھی۔

اسلام کے مختلف درجات و مراتب ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اسلام کا کلمہ اپنی زبان پر جاری کرے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ اب اس کا مال و جان محترم ہیں۔ مگر اسلام کے کامل ترین درجے تک رسائی کے لیے حضرت ابراہیم (ع) جیسے اولوالعزم رسول بھی دست دعا بلند کرتے ہیں۔

اسلام کا یہ اعلیٰ ترین درجہ فَنَا فِی اللّٰہ کا مقام ہے، جس پر فائز ہونے کے بعد انسان اپنی ذات اور اپنی ہر چیز کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ مقام "تسلیم و رضا" ہے اور یہی "مقام خلیل (ع)" ہے۔

وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ: آل ابراہیم (ع) میں سے جو جماعت "تسلیم و رضا" کے اس

---

[1] التبیان ۱: ۴۶۴

اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوگی، امامت کا منصب بھی اسی کے لیے مخصوص ہوگا۔ توجہ رہے کہ یہ دعا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام مل کر مانگ رہے ہیں: ''اے ہمارے پرور دگار! ہم دونوں کی آل سے ایک امت مسلمہ قرار دے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد الٰہی حضرت اسماعیل (ع) کی نسل سے مخصوص تھا۔ حضرت اسحاق (ع) کی نسل کا اس عہد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا: ہمیں اپنی عبادت کا طور طریقہ دکھا۔ اس سے تعلیم عبادت بھی مراد لی جا سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کی روح اور حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کی دعا ہو۔ یعنی ہمیں بتا کہ تیری بارگاہ میں قربانی پیش کرنے اور فَنَا فِی اللّٰہ کا مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آیت کے اس حصے سے عشق ابراہیمی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و تسلیم، توفیق خداوندی کے بغیر ممکن نہیں: رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ ...۔

۲۔ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ایمانی اور معنوی کمالات کی دعا کرنا سنت ابراہیمی ہے: وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ۔

۳۔ صرف خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیے: مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ ...۔ مُّسۡلِمَۃً لَّکَ۔

۴۔ پہلے روح تسلیم پھر عبادت۔

۵۔ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اجتماعی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ نسل اسماعیل سے تعلق رکھتی ہے: وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ۔

تحقیق مزید: بحار الانوار ۲۴: ۱۵۴

رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ اے ہمارے رب! اور ان میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں (ہر قسم کے رذائل سے) پاک کرے، بے شک تو بڑا غالب آنے والا، حکیم ہے۔

تفسیر آیات

رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ ...۔ اے ہمارے پروردگار اس امت مسلمہ کے درمیان میری

آل سے ایک رسول مبعوث فرما۔ مِنۡهُمۡ کا مرجع ذُرِّيَّة ہے، کیونکہ یہ دعا ذریت کے لیے مانگی جا رہی ہے۔

حضرت رسول اکرم (ص) نے فرمایا:

اَنَا دَعۡوَۃُ اَبِیۡ اِبۡرَاهِیۡمُ۔[1] میں اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیم (ع) کی دعا ہوں.

حضرت ابراہیم (ع) نے اپنی اس دعا میں رسول آخر زمان (ص) کے مبعوث ہونے کے تین اہم مقاصد بیان فرمائے ہیں:

۱۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ ....۔ آیات خدا کی تلاوت، اللہ کی نشانیوں میں تدبر سے عبارت ہے نیز قرآنی آیات کی تلاوت بھی مراد ہے۔

۲۔ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ ....۔ کتاب سے مراد یا تو قرآن ہے یا کائنات کی تکوینی و آفاقی کتاب، جس میں قرآن بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہاں تعلیم کتاب اور تلاوت آیات دو الگ چیزوں کے طور پر مذکور ہیں۔ حکمت سے مراد سنت نبوی (ع) بھی لی گئی ہے، جو اسلامی احکام و دستورات پر مشتمل ہے۔ سنت نبوی (ص) انسانیت کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق حکیمانہ فیصلہ موجود ہے۔

۳۔ وَ یُزَكِّیۡهِمۡ ۔ رسول اکرم (ع) کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری انسانی تربیت و تزکیہ ہے۔ اسی سے انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ بقرہ آیت ۱۵۱۔

اہم نکات

۱۔ شریعت اسلامی سے فکری اور عملی انحراف، انسانی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ اور جہل پرستی کی علامت ہے۔

۲۔ آیات الٰہی کی تعلیم نیز لوگوں کی تربیت اور ان کے تزکیے کا عمل سب سے عظیم اور قابل فخر ذمہ داری ہے۔

وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰهُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ اور ملت ابراہیم سے اب کون انحراف کرے گا سوائے اس شخص کے جس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا، ابراہیم کو تو ہم نے دنیا میں برگزیدہ بنا لیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہو گا۔

---

[1] الفقیہ ۴: ۳۶۸

تشریح کلمات

سَفِہَ : جسمانی ہلکا پن۔ ثوب سفیہ، ناقص، ردی اور بیکار کپڑا۔ بعد میں یہ لفظ نقصان عقل کی وجہ سے خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

صطفی: (ص ف و) صفاء۔ ہر قسم کی آمیزش سے صاف اور پاک ہونا۔ اصطفی برگزیدہ کیا۔ چن لیا۔

تفسیر آیات

وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ: اس آیت میں دو اہم نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ یہودیوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ملت ابراہیم سے منحرف ہو چکے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف یہودی ہی ابراہیم (ع) کے وارث ہیں۔

۲۔ یہودیوں کا یہ زعم باطل ختم کرنا مقصود ہے کہ وہ کوئی برگزیدہ مخلوق ہیں، بلکہ دین ابراہیمی (ع) سے انحراف ان کی کم عقلی کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ یہ لوگ ملت ابراہیم (ع) کی حقیقت جان لینے کے بعد اس سے انحراف کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دین ابراہیمی(ع) سے انحراف کو بیوقوفی قرار دینا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام عقل و منطق کا دین ہے: وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ ....۔

۲۔ انسان کے لیے سب سے بڑا خدائی اعزاز، اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کی صف میں شامل ہونا ہے: وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ....۔

اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾

۱۳۱۔ (ابراہیم کا یہ حال بھی قابل ذکر ہے کہ) جب ان کے رب نے ان سے کہا: (اپنے آپ کو اللہ کے) حوالے کردو، وہ بولے: میں نے (اپنے آپ کو) رب العالمین کے حوالے کر دیا.

تفسیر آیات

فَنَا فِی اللّٰہ ایمان کا اعلیٰ ترین رتبہ ہے۔ یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دینا۔ تسلیم و رضا کی اس منزل پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابراہیم (ع) اللہ کے تمام احکام کی تعمیل و اطاعت کا مکمل مجسمہ بن گئے۔

بیٹے کی قربانی، تسلیم و رضا کے اس مقام کا ایک مظہر ہے۔ قرآن اس منظر کی کچھ اس طرح نقشہ کشی کرتا ہے:

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ ۚ[1] پس جب دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا۔

اہم نکات

۱۔ تسلیم و رضا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان کی آخری منزل ہے۔

وَوَصّٰی بِہَاۤ اِبۡرٰہٖمُ بَنِیۡہِ وَیَعۡقُوۡبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲۔ اور ابراہیم نے اپنی اولاد کو اسی ملت پر چلنے کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنی اولاد کو یہی وصیت کی) کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا تم تادم مرگ مسلم ہی رہو۔

تشریح کلمات

وَصّٰی: (و ص ی) توصیة۔ وصیت کرنا۔ تعلیم و تلقین۔ نصیحت۔ زندگی کے آخری مرحلے میں جو تعلیم و تلقین کی جائے، عام طور پر اسے وصیت کہا جاتا ہے۔ کسی واقعے کے پیش آنے کے بعد ناصحانہ انداز میں جو ہدایات دی جائیں، انہیں بھی وصیت کہا جاتا ہے۔

یَعۡقُوۡبُ: حضرت ابراہیم خلیل اللہ (ع) کے پوتے اور حضرت اسحاق (ع) کے فرزند۔ آپ کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ آپ کنعان میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے بیٹے حضرت یوسف (ع) کے پاس مصر منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

تفسیر آیات

وَصّٰی میں بِہَاۤ کا مرجع ملة ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنے فرزندوں کو اسی دین کے اتباع کی تلقین کی، کیونکہ یہی اللہ کا برگزیدہ دین ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ ...[2] اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

اہم نکات

۱۔ اصلاح کی ابتدا اپنے گھر سے ہوتی ہے: وَصّٰی بِہَا اِبۡرٰہٖمُ بَنِیۡہِ ۔

---

[1] ۳۷ صافات: ۱۰۳ [2] ۳ آل عمرآن: ۱۹

۲۔ انسان کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو: فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا؟ اس وقت انہوں نے اپنے بچوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ سب نے کہا: ہم اس خدائے واحد کی بندگی کریں گے جو آپ کا اور آپ کے آبا و اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود واحد ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں ۔

تفسیر آیات

حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہودیت کا پیروکار سمجھنے والوں کو دعوت فکر دی جا رہی ہے کہ کیا تم نے آخری عمر میں یعقوب علیہ السلام کی وصیت اور تعلیم کا مشاہدہ کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت یعقوب علیہ لسلام نے اپنے فرزندوں کو یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ اس کے برعکس (اسلام کی) تعلیم دی تھی:

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ[۱]

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ پوچھیے: کیا تم بہتر جانتے ہو یا اللہ؟

اہم نکات

۱۔ والدین کو اولاد کے دینی مستقبل کی زیادہ فکر رہنی چاہیے ۔

۲۔ انسان کی آخری وصیت توحید اور خدا پرستی پر مشتمل ہونی چاہیے ۔

۳۔ تمام انبیاء اپنے بعد رونما ہونے والے حالات کے بارے میں فکر مند رہتے تھے: مَا تَعْبُدُوْنَ

----

[۱] ۲ بقرہ: ۱۴۰

مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ....

۴۔ سارے انبیاء (ع) ایک ہی خدا کی نمائندگی کرتے تھے۔

تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔ یہ گزشتہ امت کی بات ہے، ان کے اعمال ان کے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے اور تم لوگوں سے (گزشتہ امتوں کے بارے میں) نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے.

تفسیر آیات

تمہارے اسلاف کتنے ہی مقرب بارگاہ کیوں نہ ہوں، ان پر فخر و مباہات کرنا لاحاصل ہے۔ اگر وہ صالحین میں سے تھے تو یہ فخر صرف انہیں حاصل تھا، جب کہ تمہیں اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا یہ نظریہ غیر منطقی ہے کہ بزرگ اسلاف کی عبادتوں کا صلہ تمہیں مل جائے گا۔ تم یہ امید نہ رکھو، تم سے ہرگز یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کیا کرتے تھے۔

آیت کا خطاب اگرچہ عصر رسول (ص) کے یہودیوں سے ہے، تاہم اس خطاب کو قرآن میں اس لیے درج کیا گیا کہ اس میں تمام امتوں کے لیے ایک حکم کلی ہے کہ پدرم سلطان بود کامیابی نہیں ہے۔ ہر شخص اور ہر امت کی تقدیر اپنے عمل سے بنتی ہے۔ دنیا و آخرت کی کامیابی اپنے ہی عمل سے مربوط ہے۔

وَ قَالُوۡا کُوۡنُوۡا ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی تَہۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہٖمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں: یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، ان سے کہدیجیے: (نہیں) بلکہ یکسوئی سے دستور ابراہیمی کی پیروی کرو اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھے.

تشریح کلمات

مِلَّۃَ: الٰہی دستور کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے بندوں کی تنظیم حیات کے لیے جاری فرمایا۔ یہ لفظ امللت سے ماخوذ ہے یعنی لکھوانا۔ دستور چونکہ مدون ہوتا ہے اس لیے اسے مِلَّۃ

کہا گیا ہے۔

حَنِیۡفًا: استقامت کے ساتھ راہ راست کی طرف مائل ہونے والا۔ یکسوئی سے اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا۔

تفسیر آیات

ملت ابراہیم (ع)، تعلیم ابراہیم (ع)، دعائے ابراہیم (ع) اور وصیت ابراہیم (ع) کے بیان کے بعد یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ کتنا بے اساس اور بے معنی لگتا ہے کہ یہودیت یا نصرانیت ہی ہدایت کے دو راستے ہو سکتے ہیں۔ کتنا فرق ہے ملت ابراہیم (ع) اور یہودیت و مسیحیت میں اور کس قدر فرق ہے دین توحید اور دین شرک میں۔ ابراہیم (ع) موحد بلکہ تحریک توحید کے بانی تھے۔

اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیم (ع) کی ملت ہدایت کی سند ہے۔ ملت ابراہیم (ع) کا بنیادی نقطہ یکسوئی سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے: بَلۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہٖمَ حَنِیۡفًا...۔

تحقیق مزید: تفسیر عیاشی ۱: ۶۱۔ تفسیر قمی ۱: ۵۸

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰی وَ مَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ ۫ۖ وَ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾

۱۳۶۔ (مسلمانو) کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا اور جو موسیٰ و عیسیٰ کو دیا گیا اور جو انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا (ان سب پر ایمان لائے) ہم ان میں سے کسی میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔

تشریح کلمات

الۡاَسۡبَاطِ: سبط کی جمع یعنی بڑھنا اور پھیلنا۔ ایک باپ کی اولاد کے لیے لفظ سبط استعمال کیا جاتا ہے اولاد یعقوب (ع) مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے کئی پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ان

شاخوں کو اَسْبَاط کہا جاتا ہے۔اسی طرح اولاد اسماعیل (ع) کی شاخوں کو قبائل کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہودیوں کے اس دعوے کے مقابلے میں تم اپنے دین و مذہب کے اصول ایمان بیان کرو اور کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے، ہم اسے بھی تسلیم کرتے ہیں اور جو ابراہیم (ع) پر نازل ہوا ہے، اس پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کے بعد کے تمام انبیاء (ع) پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ہم تمہاری طرح انبیاء (ع) کے درمیان کسی فرق کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک ابراہیم (ع) سے لے کر محمد (ص) تک سب اللہ کے نمائندے ہیں۔ ہم اسحاق و اسماعیل علیہما السلام میں کسی فرق کے قائل نہیں ہیں۔ اگر ہمارا رسول نسل اسماعیل (ع) ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم حضرت اسحاق (ع) کے خلاف ہیں ۔ جب کہ تم نے حضرت اسماعیل (ع) اوران کی اولاد سے معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جہاں تمام انبیاء (ع) پر ایمان توحید کا لازمہ ہے،وہاں ان کی طرف منسوب غلط اور جعلی تعلیمات کا انکار بھی ضروری ہے۔

۲۔ اندھا تعصب، گمراہی کا سبب اور حق جوئی، ہدایت کی موجب ہے۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا ہُمۡ فِیۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَکۡفِیۡکَہُمُ اللّٰہُ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۷۔اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پر ہیں اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ مخالفت کے درپے ہیں،ان کے مقابلے میں تمہاری حمایت کے لیے اللہ کافی ہو گا اور وہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

اگر وہ بھی تمہاری طرح تمام انبیاء پر بلا تفریق ایمان لے آئیں اور نسلی تعصب سے کام نہ لیں تو حتمی طور پر وہ نسل اسماعیل کے رسول برحق محمد مصطفیٰ (ص) پر بھی ایمان لے آئیں گے۔ اس صورت میں وہ بھی ہدایت یافتہ شمار ہوں گے اور اگر وہ نسل پرستی اور آبائی تقلید کی پرانی عادت پر ڈٹے رہے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ لوگوں میں پھوٹ ڈالنے اور امت مسلمہ کی مخالفت کے درپے ہیں۔

فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ: (اے رسول (ص) اس صورت میں اللہ تعالیٰ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے۔ ان کی تمام سازشیں ناکام اور عزائم ادھورے رہ جائیں گے اور وہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول (ص) کی نصرت کا وعدہ بھی ہے اور پیش گوئی بھی۔

اہم نکات

۱۔ نسل پرستی، انتشار و پراگندگی اور ہدایت سے دوری کا موجب ہے۔

۲۔ اللہ کی حمایت نبی کو تمام سازشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۫ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

۱۳۸۔ خدائی رنگ اختیار کرو، اللہ کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اور ہم صرف اسی کے عبادت گزار ہیں۔

تشریح کلمات

صِبۡغَةَ: (ص ب غ) رنگ۔

تفسیر آیات

جس طرح اجسام کے رنگ ہوتے ہیں، جن کی مدد سے وہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح نفوس اور ارواح کے بھی رنگ ہوتے ہیں۔ کفر و شرک سے روح، سیاہ اور مکدر ہو جاتی ہے۔ جب کہ توحید و نبوت پر ایمان لانے سے روح میں زندگی کا حقیقی اور الٰہی رنگ نکھر آتا ہے اور اللہ نے اسے فطرت کے جس صاف و شفاف رنگ میں خلق کیا ہے، وہ اجاگر ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں نصاریٰ کے عقیدۂ تعمید، بپتسما کی طرف اشارہ ہے۔ ان کا یہ رواج تھا کہ جب بھی ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا یا کوئی شخص ان کا مذہب اختیار کرتا تو اسے غسل دیتے تھے۔ اسے وہ صِبۡغَة کہتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس نے زندگی کا نیا رنگ اختیار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: زندگی کا بہترین رنگ، خدائی فطری رنگ ہے اور اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ صرف اسی کی عبات کی جائے: وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ۔

احادیث

حدیث معصوم (ع) میں ہے: اَلصِّبْغَةُ هِیَ الْاِسْلَامُ۔[۱] صِبْغَة سے مراد اسلام ہے۔

۱۔ بحار الانوار ۶۳: ۱۳۳

اہم نکات

۱۔ زندگی کا وہ روپ سب سے بہتر ہے، جو یکتا پرستی پر استوار اور فطری ہو: صِبۡغَۃَ اللّٰہِ ۚ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبۡغَۃً ۔

۲۔ انسان کی زندگی خالصانہ عبادت سے پاکیزہ ہوتی ہے، نہ کہ بے روح ظاہری رسومات سے: وَّ نَحۡنُ لَہٗ عٰبِدُوۡنَ ۔

تحقیق مزید: الکافی ۲ : ۱۴۔ معانی الاخبار ص ۸۸۔ الکافی ۱ : ۴۲۲

قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰہِ وَ ہُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ۚ وَ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۚ وَ نَحۡنُ لَہٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾

۱۳۹۔ کہد یجیے: کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے مخاصمت کرتے ہو؟ حالانکہ ہمارا اور تمہارا رب وہی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو اسی کے لیے خالص ہیں۔

تشریح کلمات

محاجۃ: (ح ج ج) اختلاف۔ نزاع۔ مخاصمت۔

تفسیر آیات

یہودی، نصرانی اور مسلمان ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اللہ کے بارے میں نزاع کیا اور کہا کہ اللہ صرف ہمارا رب ہے اور ہم اس کی برگزیدہ مخلوق ہیں۔ قرآن اس دعوے کو باطل گردانتا ہے اور اس مخاصمت کو بیہودہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ خودساختہ نزاع لاحاصل ہے۔ خدا کسی مخصوص گروہ کا نہیں، بلکہ سب کا رب ہے۔ البتہ ہر گروہ اپنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔

تم اپنے مشرکانہ اعمال کا حساب دو گے۔ جب کہ ہم تو ہر قسم کے شرک سے پاک خالص توحید کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ برگزیدہ مخلوق ہونے کا معیار اخلاص ہے: وَ نَحۡنُ لَہٗ مُخۡلِصُوۡنَ ۔

۲۔ ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے: وَ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۔

۳۔ مشترکہ اقدار کو فروغ ملنا چاہیے: اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰہِ ....

۴۔ مذہبی رواداری ایک پسندیدہ عمل ہے: وَلَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۔

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطَ کَانُوۡا ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾

۱۴۰۔ کیا تم کہتے ہو: ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ پوچھیے: کیا تم بہتر جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جس کے ذمے اللہ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر تو نہیں ہے۔

تفسیر آیات

قرآن یہودیوں اور نصرانیوں سے ان کے ایک عام عقیدے پر تنبیہ اور سرزنش کے انداز میں فرماتا ہے: کیا تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ ابراہیم اور آل ابراہیم یہودی یا نصرانی تھے؟

قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰہُ: ابراہیم (ع) اور آل ابراہیم (ع) کے دین کا تمہیں بہتر علم ہے یا اللہ کو؟ ظاہر ہے کہ اللہ ابراہیم (ع) اور ذریت ابراہیم (ع) کا خالق ہے۔ اسی نے انہیں رسول منتخب کیا اور انہیں دین و شریعت سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر احساس حسرت پیدا کرنے کے لیے فرمایا: وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ۔

توریت میں اس بات کی وضاحت موجود تھی کہ ابراہیم (ع) اور ان کی ذریت کا مذہب کیا تھا؟ اور ان لوگوں سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے اس بات کی شہادت دیں گے، لیکن انہوں نے اس حقیقت کو چھپا کر ایک بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا۔

اہم نکات

۱۔ دینی حقائق کو چھپانا بڑا سنگین ظلم ہے: وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ۔

۲۔ تمام انبیاء (ع) ایک ہی دین کے ماننے والے تھے اور اسی کی تبلیغ کیا کرتے تھے: اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ ..

تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱۔ یہ امت گزر چکی ہے، ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے اور تم سے (گزشتہ امتوں کے بارے میں) نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

اسلاف کے اعمال سے امیدیں وابستہ رکھنے اور خود بدعمل ہونے کی یہ روش اتنی عام تھی کہ آیت ۱۳۴ کے بعد دوسری مرتبہ پھر تاکید کے ساتھ وہی مطلب بیان فرمایا گیا ہے۔

علامہ علی نقی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اس سے ان مسلمانوں کو بھی سبق لینے کی ضرورت ہے جو صرف بزرگان دین کی طرف انتساب کو ذریعہ نجات خیال کرتے ہیں اور ان کی اتباع اور عملی پیروی کی اہمیت کا احساس نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی دعوت کے بانی، تحریک توحید کے مؤسس اور ابو الانبیاء (ع) ہونے کے اعتبار سے حضرت ابراہیم (ع) تمام ادیان کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے تمام سماوی ادیان ان کی عظمت و حقانیت پر متفق ہیں اور اپنی حقانیت کی سند کے طور پر حضرت ابراہیم (ع) سے اپنے انتساب کو حجت اور برہان سمجھتے ہیں۔

۲۔ یہودیوں کی طرح صرف اسلاف کی طرف انتساب کو ہی ذریعہ نجات سمجھنا بھی دین سے انحراف کی ایک صورت ہے۔

سَیَقُوۡلُ السُّفَہَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىہُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِہِمُ الَّتِیۡ کَانُوۡا عَلَیۡہَا ؕ قُلۡ لِّلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَ الۡمَغۡرِبُ ؕ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ لوگوں میں سے کم عقل لوگ ضرور کہیں گے: جس قبلے کی طرف یہ رخ کرتے تھے اس سے انہیں کس چیز نے پھیر دیا؟ (اے رسول ان سے) کہد یجیے: مشرق اور مغرب (سب) اللہ کے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت فرماتا ہے۔

تشریح کلمات

اَلسُّفَهَآءُ: (س ف ہ) سفیہ کی جمع ہے۔ کم عقل اور بے وقوف۔

قِبْلَة: (ق ب ل) وہ مکان جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔ یہ لفظ اصل میں بالمقابل یا سامنے واقع ہونے کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

قبلے کی مرکزیت کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کسی خاص سمت میں موجود ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قبلہ کسی نظام یا نظریے کا محسوس شعار اور امتیازی علامت ہے، جس سے اس نظام و نظریے کی عظمت اور تاریخ وابستہ ہے۔

جب تک امامت اولاد اسحاق کے پاس تھی، یہ خصوصیت بیت المقدس کے ساتھ وابستہ رہی، لیکن جب امامت عظمیٰ کا سلسلہ اولاد اسحاق سے منتقل ہو کر اولاد اسماعیل (ع) کے پاس آیا تو کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا، کیونکہ دین ابراہیمی اور نسل اسماعیل کی لازوال عظمتیں خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔

خانہ کعبہ کی یہ خصوصیت اس لیے نہیں کہ وہ فن تعمیر کا کوئی نادر نمونہ ہے۔ درحقیقت تعمیراتی، فنی اور مادی اعتبار سے خانہ کعبہ کسی قابل توجہ خصوصیت کا حامل نہیں ہے۔ نہ تو اہرام مصر کی طرح ضخیم ہے اور نہ تاج محل کی طرح فن تعمیر کا شاہکار اور نہ ہی آثار بابل کی طرح تہذیب و تمدن کی یادگار، بلکہ خانہ کعبہ کی تمام خصوصیات غیر مادی ہیں:

۱۔ کعبہ سب سے پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا۔

۲۔ جہاں ابو البشر خَلِیْفَةُ اللّٰہِ فِی الْاَرْض حضرت آدم (ع) نے نزول فرمایا اور انسانی نسل اور الٰہی دعوت کا آغاز ہوا۔

۳۔ جہاں مقام ابراہیم (ع) اور خانۂ اسماعیل (ع) ہے اور جو انقلاب انبیاء (ع) کا مرکز و محور ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ....[۱]

۴۔ جس کی طرف حضرت ابراہیم (ع) نے ہجرت فرمائی۔

۵۔ جہاں سے رسالت مآب (ص) نے ہجرت فرمائی۔

۶۔ جہاں تاریخ انسانیت کی عظیم قربانی پیش کی گئی: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔[۲]

۷۔ جہاں تاریخ کی سب سے بڑی بت شکنی ہوئی۔

۸۔ جہاں سے دعوت اسلام کی ابتدا ہوئی۔

---

[۱] مائدہ ۵ : ۹۷۔ اللہ نے محترم گھر کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا۔

[۲] ۳۷ صافات : ۱۰۷۔ اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا۔

۹۔ جہاں اسلام کی عظیم فتح (فتح مکہ) کا واقعہ پیش آیا۔

۱۰۔ جہاں حضرت ابراہیم (ع) کے ایک عظیم فرزند حضرت علی ابن ابی طالب (ع) پیدا ہوئے۔

لہٰذا کعبہ رمز جہاد اور مرکز انقلاب ہے۔ اس کے ساتھ دعوت و تحریک کی ایک لازوال تاریخ وابستہ ہے۔

تحویل قبلہ: گزشتہ آیات میں بطور تمہید معمار کعبہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام اور کعبہ کی تاریخی اہمیت کا ذکر ہوا نیز حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے لیے دعائے خلیل (ع) کا تذکرہ ہوا۔ اس مقام پر بیت المقدس کی جگہ، کعبہ کو قبلہ قرار دینے کے نہایت اہم اعلان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

چنانچہ ہجرت کے سترہ یا انیس ماہ بعد بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا حکم ہوا اور ساتھ اس تبدیلی پر یہودیوں کے اعتراض کا جواب بھی دیا گیا:

۱۔ پہلے تو اس اعتراض کی معقولیت زیر بحث آئی کہ کیا یہ اعتراض عقل و خرد کی کسوٹی پر پورا بھی اترتا ہے یا نہیں؟ جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ جس خالق نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا اسی نے کعبہ کو قبلہ بنایا ہے۔ بنا برایں اللہ کے فیصلے پر یہ اعتراض حماقت پر مبنی ہے۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب، غرض ہر سمت کا حقیقی مالک ہے۔ یہاں دو باتیں سامنے آتی ہیں:

الف۔ خدا کسی خاص سمت میں محدود نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور سمت کی طرف رخ کرنے سے اللہ سے روگردانی لازم آتی ہو۔

ب۔ بیت المقدس یا کعبہ میں سے کسی کو کوئی ذاتی خصوصیت حاصل نہیں ہے، جس کی بنا پر قبلہ صرف وہی ہو سکتا ہو اور بس، بلکہ قبلہ قرار پانے کے لیے جگہ کے تقدس کے ساتھ اللہ کا فیصلہ بھی معیار ہے، کیونکہ قبلہ اس کے حکم سے بنتا ہے۔

تحویل قبلہ ایک واضح اشارہ تھا کہ بنی اسرائیل کو دنیا کی امامت و رہبری سے معزول اور آل اسماعیل کو اس مقام پر فائز کیا جا رہا ہے، اس لیے یہودیوں کا اعتراض قرین قیاس تھا۔

اہم نکات

۱۔ تحویل قبلہ، تحویل امامت و رہبری کی علامت ہے۔

۲۔ تحویل قبلہ کسی خاص سمت میں خدا کے محدود نہ ہونے کی دلیل ہے۔

۳۔ منبع تقدس و مرکزیت صرف ذات خداوندی ہے۔

تحقیق مزید

تفسیر قمی ۱: ۶۲۔ التہذیب ۲: ۴۳۔ الاحتجاج ۱۰: ۱۰

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہیں اور آپ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کرتے تھے، اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ ہم رسول کی اتباع کرنے والوں کو الٹا پھر جانے والوں سے پہچان لیں اور یہ حکم اگرچہ سخت دشوار تھا، مگر اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے اس میں کوئی دشواری نہیں اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا، اللہ تو لوگوں کے حق میں یقیناً بڑا مہربان رحیم ہے۔

تفسیر آیات

بعض مفسرین وسط سے مراد میانہ روی لیتے ہیں:

> یعنی اس امت میں افراط وتفریط نہیں ہے، بلکہ اس کے عقائد و افکار میں میانہ روی ہے۔ یہ مادی اشیاء کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی اور نہ ہی ترک دنیا اور رہبانیت کی قائل ہے۔ اپنے ادراکات اور نظریات میں میانہ رو ہے۔ اندھی تقلید اس کا شیوہ نہیں۔ اس میں فکری جمود نہیں پایا جاتا۔ یہ عقل کو مقام دیتی ہے اور تجربات کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ باہمی تعلقات اور اجتماعی امور میں بھی میانہ رو ہے۔ انفرادی اور اجتماعی حقوق کی مخالف نہیں ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے بھی یہ امت کرۂ ارض کے عین وسط میں واقع ہے اور مغرب و مشرق دونوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ عہد و زمانے کے اعتبار سے بھی وسط میں واقع ہوئی ہے کہ انسانیت کی فکری ناپختگی وطفولیت کے بعد عقلی رشد کا آغاز

بھی اسی امت سے ہوا۔[1]

یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر آیت سے یہ مطلب مراد نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ مذکورہ خصوصیات کے پیش نظر نہ تو یہ امت دوسرے لوگوں پر گواہ بن سکتی ہے، نہ رسول (ص) اس امت پر گواہ بن سکتے ہیں۔ یعنی گواہ بننے کے ساتھ ان باتوں کا کوئی ربط نہیں ہے، جب کہ آیت میں وسط اور شہادت کے درمیان ربط بیان کیا گیا ہے نیز امت کو اعمال و کردار کے درمیان نہیں، بلکہ رسول اور لوگوں کے وسط میں قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت کا مفہوم جاننے کے لیے درج ذیل امور کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ آیات کا تسلسل امامت کی منتقلی سے مربوط ہے کہ یہ منصب حضرت اسماعیل (ع) کی ذریت کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔

۲۔ امت وسط کا تعلق دعائے ابراہیم (ع) سے ہے، کیونکہ آپ (ع) نے دعا کی تھی:

وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ...[2] اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر

نیز اس امت وسط کو مخاطب کر کے فرمایا:

مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِىۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَ تَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ ...[3]

یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس (قرآن) سے پہلے اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ یہ رسول تم پر گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو۔

اس آیت کی دلالت زیادہ واضح ہے، کیونکہ اس میں دو موارد ایسے ہیں جو ائمہ طاہرین (ع) کے کے امت وسط ہونے پر واضح دلیل ہیں۔

i۔ آیت کے اول میں مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ کا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ امت وسط سے مراد ذریت ابراہیمؑ ہے، جو ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔

ii۔ دوسرا مورد وَ تَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہے کہ امت وسط لوگوں پر گواہ ہے اور لوگوں پر گواہ تو صرف ائمہ اور انبیاء ہو سکتے ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ امت وسط سے مراد ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔

۳۔ دیگر قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت اور گواہی فقط وہ دے سکتا ہے جس کا لوگوں

---

[1] فی ظلال القرآن اسی آیت کے ذیل میں۔ [2] ۲ بقرہ: ۱۲۸ [3] ۲۲ حج: ۷۸

کے اعمال کے ساتھ کوئی تعلق اور ربط ہو۔ جس طرح انسانی اعمال پر موکل فرشتے اور انسانی اعضا و جوارح بروز قیامت گواہی دیں گے:

يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۝[1] — اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں، ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں.

لہٰذا غیر مربوط لوگ گواہ نہیں بن سکتے، کیونکہ لوگ اپنے اعمال انجام دینے میں ان کی طرف رجوع کرنے کے پابند نہیں ہیں اور نہ ہی وہ لوگوں کے اعمال کے عینی شاہد ہیں۔ بنابریں بروز قیامت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قائم ہونے والی عدالت میں فقط وہی ہستیاں گواہی دے سکیں گی جو لوگوں کے اعمال کی صحت یا بطلان کی کسوٹی ہیں۔ ارشاد قدرت ہے :

وَ يَقُوۡلُ الۡاَشۡهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ كَذَبُوۡا عَلٰى رَبِّهِمۡ[2] — اور گواہ کہیں گے: یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔

۴۔ قیامت کے دن ظاہری اعمال کا نہیں، بلکہ حقائق پر مبنی حساب و کتاب ہو گا:

وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ[3] — ہاں جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کا مواخذہ ہو گا۔

۵۔ خطاب اگرچہ امت سے ہے لیکن مراد امت کے اعیان اور سرکردہ افراد ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا:

وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ۔[4] — اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی۔

لیکن مراد یہ ہے کہ یہ فضیلت سب کو نہیں، بلکہ بعض کو دی گئی۔

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ امت وسط سے مراد ذریت ابراہیم (ع) کے وہ افراد ہیں جن کے لیے آپ (ع) نے دعا کی اور جو اعمال امت کی حقیقت سے آشنا ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے مالک ہیں اور ان اقدار کو لوگوں سے نہیں، بلکہ رسول اللہ (ص) سے لیتے ہیں، وہ عند اللہ اور عند الرسول (ص) جوابدہ ہیں اور لوگ ان کے سامنے جوابدہ ہیں۔

لہٰذا امت وسط سے مراد ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں جنہیں رسول خدا (ص) نے بحکم خدا امت پر گواہ قرار دیا ہے، کیونکہ یہ حق و باطل میں تمیز کرنے کے لیے معیار و میزان ہیں۔ جب کہ غیر معصوم لوگ نہ تو معیار بن سکتے ہیں اور نہ ہی شاہد ہو سکتے ہیں۔

---

[1] ۲۴ نور: ۲۴ [2] ۱۱ ہود: ۱۸ [3] ۲ بقرہ: ۲۲۵ [4] ۲ بقرہ: ۴۷

احادیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

وَ لَا یَكُوْنُ شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ اِلَّا الْاَئِمَّةَ وَ الرُّسُلَ۔ وَ فَاَمَّا الْاُمَّةُ فَاِنَّهٗ غَيْرُجَائِزٍ اَنْ يَّسْتَشْهِدَهَا اللّٰهُ عَلَى النَّاسِ وَ فِيْهِمْ مَنْ لَّا تَجُوْزُ شَهَادَتُه فِی الدُّنيا عَلٰى حُزْمَةِ بَقْلٍ [1]

لوگوں پر گواہ صرف ائمہ اور انبیاء (ع) ہی ہو سکتے ہیں۔ اللہ کا پوری امت سے شہادت طلب کرنا درست نہیں، کیونکہ ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کی شہادت ایک گٹھی ساگ کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق (ع) سے مروی ہے:

نَحْنُ الْاُمَّةُ الْوُسْطٰى وَ نَحْنُ شُهَدَاءُ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ۔ [2]

ہم ہی امت وسط ہیں اور ہم ہی مخلوق خدا پر اس کے گواہ ہیں۔

وَ مَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ: تحویل قبلہ کے پیچھے جو حکمت اور فلسفہ کارفرما تھا، اسے بیان کرنا مقصود ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ کون لوگ سابقہ جاہلانہ روایات، قومی تعصّبات اور گروہی ترجیحات کے پرستار ہیں اور کون ہیں جو ان فرسودہ خیالات سے آزاد ہو کر صدق دل سے حکم رسول (ص) کی پیروی کرتے ہیں؟ کون لوگ ہیں جو آبائی اور قبائلی اعتبار سے قبلے کو تسلیم کرتے ہیں اور کون ہیں جو قبلے کو فرمان الٰہی کے تحت مانتے ہیں؟ درحقیقت بیت المقدس کو قبلہ بنانا ایک طرف تو عربوں کی نخوت اور قوم پرستی پر ایک کاری ضرب تھی تو دوسری طرف نسل پرست اور متعصب بنی اسرائیل کے لیے ایک ناقابل تحمل امر تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا نفاذ اور ان کی تنسیخ، بندوں کی تربیت و تہذیب کی خاطر ہوتی ہے، لہٰذا جو لوگ اللہ کی طرف سے کسی ہدایت اور تربیت کے اہل نہ تھے، ان کے لیے تحویل قبلہ ایک دشوار معاملہ بن گیا۔ چنانچہ اس مرحلے پر دونوں گروہوں کے قوم پرست اور خدا پرست افراد نمایاں ہو گئے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کعبہ ہی قبلہ ہے تو بیت المقدس کی طرف پڑھی جانے والی نمازوں کا کیا ہوگا؟ اس کا جواب اس آیت میں یوں دیا گیا ہے: وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ کہ اللہ تعالیٰ ایمان باللہ کی بنیاد پر بجا لائی گئی گزشتہ نمازوں کو ضائع نہیں کرے گا، کیونکہ بیت المقدس وقتی طور پر سہی، لیکن حقیقی قبلہ تھا۔ سابقہ قبلے کا حکم اگرچہ منسوخ ہو گیا، لیکن نسخ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس وقت نسخ واقع ہو تو سابقہ حکم اٹھ جاتا ہے، لیکن نسخ سے پہلے وہی سابقہ حکم حقیقی اور واقعی حکم ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت میں نماز کو ایمان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ (ع) نے فرمایا:

---

[1] بحار الانوار ۲۳ : ۳۵۱　　[2] الکافی ۱ : ۱۹۰

اَلْاِیْمَانُ عَمَلٌ کُلُّہٗ۔ وَ الْقَوْلُ بَعْضُ ذٰلِکَ الْعَمَلِ۔[1] ایمان پورے کا پورا، عمل ہی سے عبارت ہے۔ اس عمل کا ایک حصہ قول ہے۔

اہم نکات

۱۔ امت وسط سے مقصود آئمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔

۲۔ امت وسط فیض خداوندی کا ذریعہ ہیں، ان کے دامن سے متمسک رہنا چاہیے۔

۳۔ بندے کو چاہیے کہ امت وسط کو اپنے اچھے اعمال کا شاہد سمجھتے ہوئے نیک اعمال بجا لائے، ورنہ یہ شہادت اس کے خلاف جائے گی۔

۴۔ امت وسط کو تمام امتوں پر برتری حاصل ہے: لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ....

۵۔ بعض احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے نفاذ سے لوگوں کے ایمان کا وزن معلوم ہوتا ہے: لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ ....

۶۔ نماز سے ایمان کا ثبوت فراہم ہوتا ہے: وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ۔

تحقیق مزید

الکافی ۱: ۱۹۰ ـ ۱۹۱، تفسیر العیاشی ۱: ۶۳، تفسیر فرات ص ۶۲، شواہد التنزیل ۱: ۱۱۹، کتاب سلیم ص ۹۴۴ ۔

قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡہِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَۃً تَرۡضٰہَا ۪ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ شَطۡرَہٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾

۱۴۴۔ ہم آپ کو بار بار آسمان کی طرف منہ کرتے دیکھ رہے ہیں، لہٰذا اب ہم آپ کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں، جسے آپ پسند کرتے ہیں، اب آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کریں اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف کرو اور اہل کتاب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق پر مبنی (فیصلہ) ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۲: ۳۳

تفسیر آیات

یہودی مسلمانوں پر یہ طنز کرتے تھے کہ تمہارا اپنا کوئی قبلہ نہیں۔تم ہمارے قبلے کی طرف رخ کرتے ہو، لہٰذا ہمارا مذہب ہی اصل مذہب ہے۔ رسالت مآب(ص) اس بات سے غمزدہ ہو گئے۔ آپ(ص) رات کے وقت بار بار آسمان کی طرف رخ کرتے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کے اس طعنے کا کوئی جواب نازل ہو۔ چنانچہ ایک دن نماز ظہر کے دوران جبرائیل(ع) نازل ہوئے اور رسول خدا (ص) کو بازوؤں سے پکڑ کر آپ (ص) کا رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں نے بھی اپنی صفوں کا رخ بدلا، عورتوں نے اپنی جگہ مردوں کو اور مردوں نے اپنی جگہ عورتوں کو دے دی۔ چونکہ بیت لمقدس مدینے کے شمال میں اور کعبہ جنوب میں ہے، اس لیے امام اور مقتدیوں کو رخ بدلنے کے لیے صفیں نئے سرے سے مرتب کرنی پڑیں۔

رسول (ص) کا انتظار: نبی اکرم (ص) کو علم تھا اور اہل کتاب بھی جانتے تھے کہ رسول آخر الزمان(ص) دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے۔ یصلی الی القبلتین۔نسل ابراہیمی(ع) کی طرف امامت کی منتقلی اور یہودیوں کے طعنوں کے پیش نظر ضروری تھا کہ قبلے کو تبدیل کر دیا جائے۔

پسندیدہ قبلہ : کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے حضور (ص) کا پسندیدہ قبلہ قرار دیا، چنانچہ فرمایا:" اب ہم آپ (ص) کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے آپ(ص) پسند کرتے ہیں"۔ اس سے پہلے مکہ میں نازل ہونے والے سورہ ضحیٰ میں وعدہ فرمایا تھا:

وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی [1]	اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ یہ مقام مصطفیٰ (ص) ہے کہ پروردگار آپ (ص) کی رضا کو مدنظر رکھتا ہے: فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَۃً تَرۡضٰہَا ....۔

۲۔ تحویل قبلہ مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کی علامت ہے۔

تحقیق مزید

التہذیب ۲ : ۲۸۶، الوسائل ۴ : ۳۰۱، فقہ القرآن ۱ : ۹۱۔

---

[1] ۹۳ ضحی: ۵

وَ لَئِنۡ اَتَیۡتَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَۃٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَکَ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَہُمۡ ۚ وَ مَا بَعۡضُہُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَۃَ بَعۡضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾

۱۴۵۔اور اگر آپ اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانی لے آئیں پھر بھی یہ لوگ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی اتباع کر سکتے ہیں اور نہ ان میں سے کوئی دوسرے کے قبلے کی اتباع کرنے پر تیار ہے اور (پھر بات یہ ہے کہ) آپ کے پاس جو علم آچکا ہے، اس کے بعد بھی اگر آپ لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ زیادتی کرنے والوں میں ہوں گے۔

تفسیر آیات

اہل کتاب اسلام کے قبلے کو یہ کہکر رد نہیں کرتے تھے کہ اس کی حقانیت پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ وہ تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے منکر تھے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر آپ (ص) ہر قسم کے دلائل پیش کر دیں جن سے حق آشکار ہو جائے، تب بھی یہ لوگ آپ (ص) کا قبلہ تسلیم نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ (ص) کے لیے ممکن ہے کہ ان کے قبلے کو قبول کریں، کیونکہ آپ (ص) کے پاس اپنے قبلے کی حقانیت پر دلیل و برہان موجود ہے اور آپ (ص) علم و ایقان کی منزل پر فائز ہیں۔ آپ (ص) لوگوں کی رضامندی کی خاطر اصولوں پر سودے بازی نہیں کریں گے، یہ منصب امامت و رسالت کے ساتھ ناانصافی ہے، جو کسی رسول یا امام معصوم سے سرزد نہیں ہو سکتی۔

اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ کا خطاب اگرچہ رسول کریم (ص) سے ہے، لیکن اس سے مراد پوری امت ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق (ع) سے مروی ہے:

نُزِّلَ الْقُرْآنُ بِاِيَّاكَ اَعْنِیْ فَاسْمَعِیْ يَا جَارَ۔[1] قرآن کا طرز بیان یہ ہے کہ خطاب کسی سے ہوتا ہے جب کہ سنانا کسی اور کو مقصود ہوتا ہے۔

ع سر دلبراں در حدیث دیگراں

اہم نکات

۱۔ اسلامی قیادت کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ لوگوں کی خواہشات کے برعکس اس کا محور حق

---

[1] الکافی ۲: ۶۰۳ باب النوادر ...۔

ہوتا ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ ....

۲۔ اگر دل میں تعصب موجود ہو تو دلائل و براہین بے اثر ہو جاتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ هُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

۱۴۶۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (رسول) کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپا رہا ہے۔

تفسیر آیات

اہل کتاب اپنی کتب میں رسول آخر الزمان (ص) کے تمام اوصاف پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اہل کتاب کا پڑھا لکھا شخص پہلی نظر میں ہی آپ (ص) کو پہچان لیتا تھا، جس طرح اپنی اولاد کو پہچاننے میں انسان کو دشواری نہیں ہوتی۔ کیونکہ اولاد کی پہچان کا تعلق صرف مشاہدات سے نہیں ہوتا بلکہ قلبی تعلق اور محبت اس پہچان کے اہم عنصر ہیں جن کی وجہ سے باپ دور سے اپنی اولاد کی خوشبو سونگھ لیتا ہے اور بیٹے کی قمیص سے چشم پدر میں روشنی لوٹ آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کی معرفت کے بعد انکار حق سب سے بڑا جرم ہے: لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ ....

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ حق صرف وہی ہے جو آپ کے پروردگار کی طرف سے ہو، لہٰذا آپ شک و تردد کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہوں۔

تشریح کلمات

الۡمُمۡتَرِیۡنَ: (م ر ی) امتراء یعنی ایسے کام میں نزاع، جس کے تسلیم کرنے میں شک و تردد ہو۔

تفسیر آیات

قبلے کی تبدیلی کے سلسلے میں ممکنہ اعتراضات اور شک و تردد کی نفی کے لیے یہ ایک تاکیدی حکم ہے۔

یہاں بھی خطاب کا رخ اگرچہ رسول کریم (ص) کی طرف ہے، لیکن مراد امت ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق ہر قسم کے شک و تردد سے بالاتر ہوتا ہے، خواہ اکثر لوگ حق سے بے خبر ہی کیوں نہ ہوں ۔

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

۱۴۸۔اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، پس تم لوگ نیکیوں کی طرف سبقت کرو، تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ (ایک دن) تم سب کو حاضر کرے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

وِّجْهَةٌ : (و ج ہ) وہ سمت جس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

قبلے کے بارے میں ہونے والی بحث و گفتگو اور اختلافات کے سلسلے میں بیان قاطع کے ساتھ ارشاد ہے کہ یہودیوں کا اپنا اور نصاریٰ کا اپنا قبلہ ہے۔ ہر فرقے کا اپنا اپنا قبلہ ہے۔ آپ (ص) اس موضوع میں زیادہ مت الجھیں۔ زندگی کا اصل مقصد نیکیوں میں سبقت حاصل کرنا ہے۔ بروز قیامت جب اللہ تعالیٰ سب کو ایک جگہ جمع فرمائے گا تو وہاں نیکیاں دیکھی جائیں گی، قبلہ نہیں دیکھا جائے گا۔ قبلہ تو ایک قرار دادی چیز (حکم) ہے، جس میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ کل بیت المقدس قبلہ تھا، آج کعبہ قبلہ ہے ۔ اگر کسی کا قبلہ درست ہو، لیکن نیکیاں نہ ہوں تو اس صورت میں قبلے کی حقانیت اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

شیعہ امامیہ کی متعدد روایات میں وارد ہوا ہے کہ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا سے مراد حضرت امام مہدی علیہ السلام کے انصار ہیں۔

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: اِنَّهٗ مِنَ التَّطْبِيْقِ وَ الْجَرْيِ۔[۱] یہ آیت امام مہدی علیہ السلام کے انصار پر بھی قابل تطبیق ہے۔ مراد اور تطبیق میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور ہم نے مقدمے میں تطبیق کی وضاحت بیان کی ہے۔

۱۔ المیزان ج ۱ ذیل آیت

اہم نکات

۱۔ انسان کو اختلافی مسائل سے زیادہ نیکیوں کی بجا آوری پر اپنا وقت صرف کرنا چاہیے: وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ....

تحقیق مزید

غیبۃ الطوسی ص ۴۷۷، فقہ القرآن ۱: ۹۳۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

۱۴۹۔ اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف موڑیں کیونکہ یہ آپ کے رب کا برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر آیات

قبلے کے بارے میں پیش آنے والی الجھنوں کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ جدید حکم صرف مدینے سے مختص نہیں بلکہ ایک عمومی حکم ہے۔ مسلمان دنیا کے جس گوشے میں ہو، نماز کے وقت اسے اپنا رخ مسجد الحرام ہی کی طرف کرنا ہوگا۔ اس پرزور اور واضح بیان سے کمزور ایمان والوں اور منافقوں کے لیے حیلے بہانے کا موقع ختم ہو گیا کہ مبادا وہ مدینے سے باہر جا کر اپنی قدیم روایات کو اپناتے ہوئے بیت لمقدس کی طرف رخ کرنا شروع کر دیں۔

ابتدائے آیت میں روئے سخن رسول خدا (ص) کی طرف ہے، جب کہ مقصود پوری امت ہے۔ مخاطبین کو متنبہ کرنے کا یہ ایک بلیغ انداز ہے کہ خطاب کسی سے ہو، لیکن کسی دوسرے کو سنانا مقصود ہو۔ قرآن کا طرز بیان یہی ہے۔ چنانچہ آیت کا آخری حصہ ”اللہ تم لوگوں کے اعمال سے غافل نہیں ہے“ بتاتا ہے کہ مقصود کلام دوسروں کو متنبہ کرنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ برحق قبلہ وہی ہے جو اللہ کی طرف سے متعین ہو: وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۔

۲۔ انسان جہاں کہیں بھی ہو اسے حق سے متمسک رہنا چاہیے: وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ....

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

۱۵۰۔اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف موڑیں اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رخ اسی (کعبے) کی طرف کرو تاکہ ان میں سے ظالموں کے علاوہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے، لہٰذا تم ان سے نہیں صرف مجھ ہی سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمتیں پوری کروں اور شاید تم ہدایت پاؤ۔

تشریح کلمات

حُجَّۃٌ: (ح ج ج) اس دلیل کو کہا جاتا ہے جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے۔

خَشیَۃ: (خ ش ی) وہ خوف جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے۔

تفسیر آیات

تحویل قبلہ کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز میں بیان فرما کر کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں چھوڑی اور مؤمنین کو مطمئن اور معاندین کو مایوس کر دیا۔ یہ بے جا تکرار نہیں ہے، بلکہ ہر آیت میں تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ ایک نیا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اکرم (ص) کی دو احادیث ”نماز معراج مومن ہے“ اور ”نماز دین کا ستون ہے“ میں نماز کے ذکر کا تکرار نہیں، بلکہ ہر بار نماز کے ذکر کے ساتھ ایک نیا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ بعینہ اسی طرح مختلف آیات میں تحویل قبلہ کے مکرر ذکر کے ساتھ مختلف مفاہیم کو بیان فرمایا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ تحویل قبلہ میں مضمر حکمت و فلسفہ۔

۲۔ تحویل قبلہ کے سلسلے میں رسول اکرم (ص) کا انتظار اور آپ (ص) کی خواہش کے مطابق تحویل قبلہ کا حتمی فیصلہ۔

۳۔ تحویل قبلہ کے بارے میں اہل کتاب کا غیر منطقی مؤقف اور ان کی ہٹ دھرمی۔

۴۔ رسول اسلام (ص) کے قبلے کی حقانیت۔

۵۔ آخری آیت میں درج ذیل نکات کی طرف اشارہ فرمایا گیا:

الف: تحویل قبلہ یہودیوں کے اس طعنے کا عملی جواب ہے: ’’اگر مسلمان ہمارے قبلے کو تسلیم کرتے ہیں تو دیگر اعمال میں ہم سے الگ راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں اور اگر محمد (ص) دین یہودیت و نصرانیت پر نہیں ہیں تو پھر ہمارے دین کا قبلہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟‘‘ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں کے پاس حجت اور دلیل آ گئی جو یہودیوں کے اعتراض کا دندان شکن جواب بن گئی۔ البتہ ہٹ دھرمی اور تعصب برتنے والے پھر بھی غیر منطقی اعتراضات اٹھاتے رہیں گے جن کی کوئی پرواہ نہیں۔

ب۔ اس حکم کے بعد تکمیل دین کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی اور مسلمانوں پر اللہ کی نعمتیں پوری ہو جائیں گی۔

ج۔ اس امت کو اللہ کی طرف سے ہدایت کی عظیم نعمت بھی نصیب ہوگی۔ سورۂ حمد کی تفسیر میں ہدایت کی تفسیر بیان ہو چکی ہے کہ انسان ہر لحہ محتاج ہدایت ہے اور اللہ کا فیض کبھی منقطع نہیں ہوتا۔

تحویل قبلہ کے بعد اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ آیات اگرچہ تحویل قبلہ کے حکم پر مشتمل ہیں اور بظاہر تکرار معلوم ہوتی ہیں، لیکن فی الواقع تکرار نہیں بلکہ ہر آیت ایک الگ دلیل اور نکتے پر مشتمل ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی الفاظ و عبارات میں تکرار کے اندر خدائی حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں۔

۲۔ باطل اپنے تعصب کی بنا پر ہمیشہ غیر منطقی اعتراضات کے ذریعے حق کو ختم کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ...۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ

۱۵۱۔ جیسے ہم نے تمہارے درمیان خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاکیزہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں

وَ یُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾　　ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لِیۡ وَ لَا تَکۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾　　۱۵۲۔لہٰذا تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

تشریح کلمات

رَسُوۡل: (ر س ل) یہ اَلرِّسۡل سے مشتق ہے یعنی نرمی کے ساتھ چل پڑنا۔کبھی صرف روانہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس شخص کو رسول کہتے ہیں جسے پیغام دے کر روانہ کیا گیا ہو۔قرآن مجید میں لفظ رسول اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یَتۡلُوۡا: (ت ل و) کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ درمیان میں کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو۔ تلاوت میں اتباع و پیروی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اتباع کی غرض سے پڑھا جائے تو اسے تلاوت کہیں گے، بصورت دیگر صرف پڑھنے کو قرائت کہتے ہیں۔

یُزَکِّیۡکُمۡ: (ز ك و) لغوی معنی نمو و فزونی ہے۔تزکیہ یعنی پاک کرنا اور تربیت کے ذریعے ارتقائی منازل سے گزارنا۔

اشۡکُرُوۡا: (ش ك ر) کسی نعمت کے اظہار کو شکر کہتے ہیں، خواہ یہ اظہار منعم کی زبانی تعریف کے ذریعے ہو یا عملی سپاس کے ذریعے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت پر اتمام نعمت اور احسانات کا ذکر ہو رہا ہے۔ احسان کے ذکر کے لیے: اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ یعنی ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ...[1]　　ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔

اس کے برخلاف اگر اتمام حجت کا مقام ہو تو اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ..[2] ”تمہاری طرف رسول بھیجا“ کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

اس آیہ کریمہ میں رسول کے درج ذیل فرائض منصبی بیان ہوئے ہیں:

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۶۴　　[2] ۷۳ مزمل: ۱۵

۱۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا ... تلاوت: یعنی بیان احکام۔
تلاوت چونکہ صرف پڑھنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بغرض اطاعت و اتباع پڑھنے سے عبارت ہے، اس لیے رسول کریم (ص) نے قرآن کی یہ تلاوت ۲۳ سال کے عرصے میں پوری کی۔
لِتَقۡرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکۡثٍ ...[1] تاکہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔
۲۔ وَ یُزَکِّیۡکُمۡ: تزکیہ یعنی فکری و عملی خبائث سے پاک کر کے ارتقائی منازل کی طرف لے جانا۔ اس کا تعلق فکری، عملی، ظاہری، باطنی، مادی، عقلی، جسمانی، روحانی، انفرادی، اجتماعی اور سماجی امور سے ہوگا تاکہ ان تمام میدانوں میں انسانوں کو اخلاقی اور انسانی اقدار کا مالک بنایا جائے اور ان کے ظاہر و باطن کو سدھارا اور سنوارا جائے، جس سے انسان کو حیات ابدی اور جاوداں زندگی مل جاتی ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۚ[2]
اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔

۳۔ وَ یُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ... تعلیم: پہلے دو مرحلوں میں اجمالی اور کلی طور پر اسلامی احکام کی تبلیغ اور اسلامی معاشرے کے افراد کا تزکیہ کر کے شرعی احکام کے نفاذ کا راستہ ہموار کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ علوم قرآن کے امین بن جائیں۔ اس استعداد کے حصول کے بعد تعلیم کتاب کا مرحلہ آتا ہے۔
تعلیم کتاب: یعنی قرآن کے کلی احکام کی تفصیل و تشریح، مجملات و متشابہات کے قواعد و ضوابط، اشارات کا بیان، عمومات کی تخصیص اور مطلقات کی تقیید۔ بالفاظ دیگر تعلیم کتاب یعنی سنت۔ کیونکہ کتاب اللہ کی تعلیم و تشریح و تفسیر کا واحد ذریعہ سنت معصوم (ع) ہے۔ حکمت کی تعلیم کیا ہے؟ اس موضوع کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔

فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ: اس کلمے کے ابتدائی فاء کو فاء تفریعی کہتے ہیں۔ یہ حرف سابقہ کلام کے نتیجے کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امامت کا منصب عطا کر دیا، اسے امت وسط اور امت شہید بنایا، اس کا پسندیدہ قبلہ مقرر کر دیا اور بالآخر ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول (ص) مبعوث فرما کر اسے منصبی فرائض بھی سونپ دیے تو نتیجۂ کلام کے طور پر ارشاد قدرت ہے کہ میری ان لا تعداد نعمتوں اور احسانات کو کبھی فراموش نہ کرنا: فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ۔ پس تم مجھے یاد رکھو اور میرا ہی ذکر کیا کرو۔ ذکر کے مختلف طریقے ہیں:

---

[1] ۱۷ اسراء: ۱۰۶ [2] ۸ انفال: ۲۴

ذکر لفظی: جیسے تسبیح و تہلیل۔

ذکر عملی: جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی عبادت اور نیک اعمال بجالانا۔

ذکر قلبی: اپنے دل میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو حاضر سمجھنا اور خدا کے عشق و محبت کو ہمیشہ دل میں رکھنا۔

پس ذکر خدا زبان سے بھی ہوتا ہے، اعضا و جوارح سے بھی اور قلب و ضمیر سے بھی۔ ذکر کے مقابلے میں نسیان اور غفلت ہے، جس کا لازمی نتیجہ عدم اطاعت اور اللہ کی رضا سے دوری ہے:

اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ [1]	شیطان نے ان پر قابو پا لیا ہے اور انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا ہے۔
نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمۡ ... [2]	انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا.
وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ ... [3]	اور آپ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے.

اَذۡکُرۡکُمۡ: میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ مفسرین یہاں متعدد توجیہات پیش کرتے ہیں۔ مثلاً تم مجھے اطاعت و عبادت سے یاد کرو، میں تمہیں اپنی رحمت کے ذریعے یاد رکھوں گا۔ بعض کے نزدیک مقصود یہ ہے: تم مجھے شکر کے ذریعے یاد رکھو، میں تمہیں نعمتوں میں اضافے کے ساتھ یاد رکھوں گا وغیرہ۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ ذکر کا وسیع تر مفہوم ہی مراد لیا جائے۔ یعنی اللہ کو بندگی کے تمام مظاہر میں یاد رکھا جائے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم اور احسان سے اپنی ربوبیت کے تمام مظاہر میں اپنے بندے کو یاد رکھتا ہے۔

وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَ لَا تَکۡفُرُوۡنِ: شکر سے مراد اظہار نعمت ہے، خواہ زبان سے ہو یا عمل سے۔ اس کے مقابلے میں کفران نعمت ہے۔ یعنی چھپانا اور اظہار نہ کرنا۔ پس اللہ کی نعمتوں کے شکر کا مطلب یہ ہوا کہ ہر جگہ اور ہر عمل میں ان نعمتوں کا اظہار کرو۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

شُکْرُ کُلِّ نِعْمَۃٍ اَلْوَرِعُ عَنْ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْکَ۔ [4]	ہر نعمت کا شکر اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب برتنا ہے۔

بندے کے شکر کرنے سے اللہ کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کا شکر کرنے سے آخر کار خود شکر گزار کو ہی فائدہ پہنچتا ہے:

وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ. [5]	جو شکر کرتا ہے وہ اپنے (فائدے کے) لیے شکر کرتا ہے.

---

[1] ۵۸ مجادلہ: ۱۹　[2] ۹ توبہ: ۶۷　[3] ۱۸ کہف: ۲۸　[4] بحار الانوار ۶۷: ۳۱۰　[5] ۳۱ لقمان: ۱۲

شکر کرنا اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۔[1] اور اللہ بڑا قدردان، جاننے والا ہے۔

اسی لیے حکم ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ۔[2] اپنے آپ کو خدائی اخلاق سے آراستہ کرو۔

احادیث

رسول خدا (ص) سے مروی ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُحِبُّ اَنْ يَّعْلَمَ مَنْزِلَتَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ فَلْيَنْظُرْ كَيْفَ مَنْزِلَةُ اللّٰهِ عِنْدَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُنْزِلُ الْعَبْدَ حَيْثُ اَنْزَلَ الْعَبْدُ اللّٰهَ مِنْ نَفْسِهٖ ۔[3]

اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کا کیا مقام ہے تو وہ یہ دیکھے کہ اس کے نزدیک اللہ کا کیا مقام ہے۔ کیونکہ اللہ اپنے بندے کو اتنا ہی مقام دیتا ہے، جتنا بندہ اللہ کو دیتا ہے۔

رسول اسلام (ص) سے مروی ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

مَنْ اُعْطِيَ لِسَانًا ذَاكِرًا فَقَدْ اُعْطِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۔[4]

جسے ذکر کرنے والی زبان عنایت ہوگئی گویا اسے دنیا و آخرت کی خوبیاں مل گئیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

شِيْعَتُنَا الَّذِيْنَ اِذَا خَلَوْا ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ۔[5]

ہمارے شیعہ وہ ہیں جو خلوت میں کثرت سے ذکر خدا کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء (ع) کے فرائض منصبی یہ ہیں:

الف۔ بیان احکام: يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا ....۔

ب۔ تزکیہ یعنی خبائث سے پاک کر کے پاکیزہ ارتقائی منازل کی طرف رہنمائی کرنا: وَ يُزَكِّيْكُمْ ....۔

ج۔ تعلیم کتاب و حکمت: وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ....۔

۲۔ آنحضرت (ص) عالمین کے لیے اللہ کی نعمت ہیں: اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ ....۔

۳۔ اگر بندہ اپنی زندگی کے تمام مظاہر میں اللہ کو یاد رکھے تو اللہ اپنی ربوبیت کے تمام مظاہر میں بندے کو یاد رکھتا ہے: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ...۔

۴۔ شکر کا مطلب گناہوں سے اجتناب کرتے ہوئے ہر قول و عمل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار

---

[1] ۴ نساء ۱۴۷ [2] بحار الانوار ۵۸: ۱۲۹ [3] حوالہ سابق ۹۰: ۱۶۳ [4] الوسائل ۷: ۱۷۷ [5] حوالہ سابق ۷: ۱۵۸

کرنا ہے۔

۵۔ شکر تقرب الٰہی کا سبب ہے۔ اس کا فائدہ شکرگزار بندے کو ہی پہنچتا ہے: وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ ۔

تحقیق مزید

الوسائل ۶: ۴۴۲، ۷: ۱۵۷، مستدرک الوسائل ۵: ۲۰۲ ۔ ۲۸۶، تفسیر القمی ۲: ۱۵۰، عدۃ الداعی ص ۲۵۳، الکافی ۲: ۵۰۲، المحاسن ۱: ۳۹۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾

۱۵۳۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ یقیناً صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ کریمہ اور بعد والی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے عظیم اور صبر آزما واقعات کے لیے مؤمنین کو تیار فرما رہا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں صبر و صلوٰۃ سے مدد لینے، شہداء کو مردہ نہ کہنے اور خوف، بھوک، جانی و مالی آزمائش اور مصیبت کے موقع پر کلمہ استرجاع اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

واضح ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی میں قانون خلقت کے تحت بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر اسلام جیسی انقلابی تحریک سے وابستہ ایک نظریاتی انسان کو تو اس انسانی اور الٰہی مشن میں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا سہارا لینے کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک صبر جو انجام سے آگاہی کے ساتھ حاصل ہونے والی ایک روحانی طاقت کا نام ہے:

وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا [۱]

اور اس بات پر بھلا آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں جو آپ کے احاطۂ علم میں نہیں ہے؟

اگر انسان اس داخلی اور روحانی طاقت سے سرشار ہو تو وہ اندر سے کبھی کھوکھلا نہیں ہوگا، اس میں استقامت آئے گی اور کامیاب انجام سے عشق، اسے پہاڑ سے بھی زیادہ بلند و مضبوط حوصلہ دے گا۔ چنانچہ وہ کبھی کسی نمرود کی آگ یا کسی یزید کی تلوار سے مرعوب نہیں ہوگا۔

---

[۱] ۱۸ کہف: ۶۸

صبر کی ضد جزع ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ مَّحِیۡصٍ ؏[1]

ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہم فریاد کریں یا صبر کریں، ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔

نماز اور صبر کا رشتہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ۙ﴿۲۱﴾ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿ۙ۲۲﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۪ۙ۲۳﴾[2]

انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

انسان کو اقامۂ نماز کے ذریعے اللہ کی ذات پر بھروسا کرنا چاہیے۔ کیونکہ نماز ایک شخصیت ساز اور انسان ساز تربیتی نظام ہے، جس کی بدولت یہ بے ہمت انسان کائنات کی طاقت کے سرچشمے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ پس وہ انسان کس قدر عظیم اور طاقتور ہوگا، جس کا بھروسا ذات الٰہی پر ہو۔

اسی سورہ کی آیت ۴۵ میں صبر و نماز کے سلسلے میں تفسیر بیان ہو چکی ہے۔

احادیث

☆ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَتَهَاوَنْ به وَ لَا بِصَلَاتِكَ فَاِنَّ النَّبِیَّ قَالَ عِنْدَ مَوْتِهِ: لَيْسَ مِنِّي مَنْ اِسْتَخَفَّ بِصَلَاتِهِ لَا يَرِدُ عَلَىَّ الْحَوْضَ لَا وَ اللّٰهِ ۔[3]

تم اپنی نماز سے تساہل نہ برتو کیونکہ رسول خدا (ص) نے اپنی وفات کے وقت فرمایا: وہ شخص مجھ سے نہیں ہے جو نماز کو خفیف سمجھتا ہے۔ وہ میرے پاس حوض پر نہیں پہنچ سکے گا۔ قسم بخدا وہ نہیں پہنچے گا۔

اِنَّ شَفَاعَتَنَا لَا تَنَالُ مُسْتَخِفًّا بِالصَّلَاةِ ۔[4]

ہماری شفاعت اس شخص کو نہیں پہنچے گی جو نماز کو سبک و خفیف سمجھے۔

☆ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع) نے صبر کی تفسیر میں فرمایا:

اَلصَّبْرُ اَلصِّيَامُ وَ قَالَ اِذَا نَزَلَتْ بِالرَّجُلِ النَّازِلَةُ وِ الشَّدِيدَةُ فَلْيَصُمْ.[5]

صبر سے مراد روزہ ہے اگر کسی کو کوئی حادثہ اور شدید وقت پیش آئے تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے۔

---

[1] ١۴ ابراہیم: ٢١　[2] ٧٠ معارج: ١٩ تا ٢٣　[3] بحار الانوار ٨٠: ٩　[4] الفقیہ ١: ٢٠٦　[5] اصول الکافی ۴: ٦٣

اہم نکات

۱۔ نماز کے ذریعے یہ کمزور انسان کائنات کی عظیم ترین طاقت (اللہ) سے قوت حاصل کرتا ہے۔

۲۔ الٰہی انسان کامیاب انجام سے آگاہی کے باعث اضطراب کا شکار نہیں ہوتا اور ثابت قدمی کے ساتھ کامیابی کی منازل طے کرتا ہے: اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ...۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۷۹ : ۲۳۲، مصباح الشریعۃ ص ۱۸۵۔

وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ﴿۱۵۴﴾

۱۵۴۔اور جو لوگ راہ خدا میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم (ان کی زندگی کا) ادراک نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

بعض مفسرین کے نزدیک شہیدوں کی حیات سے مراد ان کی خدمات ،ان کے نام اور کارناموں کی بقا ہے۔لیکن اس قسم کی حیات کی نفی خود یہی آیت کر رہی ہے: وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ کہ جو حیات ہمارے شعور میں آتی ہے، وہ یقیناً مراد نہیں ہے، بلکہ شہیدوں کی حیات ہمارے شعور و حواس سے ماوراء ہے۔ پس حیات سے مراد ان کے زندہ و جاوید کارنامے وغیرہ نہیں، کیونکہ انہیں تو ہم بخوبی جانتے ہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حیات بعد الموت مسلمانوں کے بنیادی عقائد میں سے ہے اور اس آیت کے مخاطبین بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ اس جہان سے جانے کے بعد انسان نے ایک ابدی زندگی گزارنی ہے۔ پس اگر شہید زندہ ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جو شہید کے ساتھ مخصوص ہو، بلکہ ہر انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے۔

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد عالم برزخ یا عالم آخرت میں اگرچہ ہر انسان کو آثار حیات سے دور ایک عام قسم کی زندگی ملتی ہے۔لیکن شہداء کی زندگی میں وہ آثار حیات موجود ہوتے ہیں جو عام زندوں میں نہیں ہوتے۔شہید کی حیات کے آثار میں سے ایک کا ذکر دوسری آیت میں کیا گیا ہے کہ وہ عند اللہ رزق پاتے ہیں۔اس رزق کی نوعیت بھی ہمارے شعور و حواس کے لیے قابل ادراک نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شہید اپنی اس حیات میں لذت یاب ہوتے ہیں اور اللہ سے عطائے جاری حاصل

کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ سے رزق پانے کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ وہ آرام و راحت اور خوشی میں ہیں۔ ان کے پاس حیات و کمال سے متعلق سب کچھ موجود ہے اور موت یا نقص سے مربوط کوئی شے ان میں نہیں ہے۔

آل عمران کی آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱ میں حیاتِ شہید کے درج ذیل آثار بتائے گئے ہیں:

۱۔ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ: اپنے پروردگار کی بارگاہ سے رزق پاتے ہیں۔

۲۔ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ: ان نعمتوں پر مسرور ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں۔

۳۔ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِھِمۡ مِّنۡ خَلۡفِھِمۡ: بعد میں آنے والے شہداء کے بارے میں بھی یہ لوگ خوش ہیں۔

۴۔ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ ....۔ وہ اللہ کے انعام اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے ارواح مؤمنین کی باہمی ملاقات کے بارے میں فرمایا:

مِنۡھُمۡ مَنۡ یَزُوۡرُ کُلَّ جُمۡعَۃٍ وَ مِنۡھُمۡ مَنۡ یَّزُوۡرُ عَلٰی قَدۡرِ عَمَلِہٖ۔[1]　ان میں سے کچھ ہر جمعہ کو اور کچھ اپنے عمل کے مطابق ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ برزخ کی زندگی کی نوعیت ہر شخص کے لیے اس کے عمل کے مطابق ہے۔

ثانیاً: اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ حیات، شہداء کے ساتھ مخصوص ایک امتیازی حیات نہیں ہے تو آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ تم راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، کیونکہ مؤمن کے لیے فنا نہیں ہے اور حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے:

وَ اِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ لَھِیَ الۡحَیَوَانُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ۝[2]　بے شک آخرت کا گھر ہی زندگی ہے، اگر انہیں کچھ علم ہوتا۔

بنا بریں یہ آیت مؤمن کے ذہن میں اس نظریے کو راسخ کرتی ہے کہ تم ظاہر بینی سے کام لیتے ہوئے انہیں مردہ نہ کہو۔ حقیقت میں عالم آخرت، مؤمنین کے لیے ''دار حیات'' ہے۔ البتہ کفار کے لیے ''دار بوار''، یعنی ہلاکت ہے:

ثُمَّ لَا یَمُوۡتُ فِیۡھَا وَ لَا یَحۡیٰی۝[3]　پھر اس میں نہ مرے گا اور نہ جیے گا۔

---

[1] بحار الانوار ۶: ۲۵۶　[2] ۲۹ عنکبوت: ۶۴　[3] ۸۷ اعلیٰ: ۱۳

مؤمنین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً ۚ[1]

جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی ضرور عطا کریں گے۔

احادیث

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول خدا (ص) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: میں جہاد میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ (ص) نے فرمایا:

فَجَاھِدْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ عِزَّ وَ جَلَّ فَاِنَّکَ اِنْ تُقْتَلْ تَکُنْ حَیًّا عِنْدَ اللّٰہِ تُرْزَقْ وَ اِنْ تَمُتْ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُکَ عَلَی اللّٰہِ۔[2]

راہ خدا میں جہاد کرو کہ اگر تم قتل ہو گئے تو تم زندگی اور رزق پاؤ گے، لیکن اگر فوت ہو گئے تو تمہارا اجر اللہ کے ذمے ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ جس چیز کی حقیقت کا علم نہ ہو اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے: وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ ...۔

۲۔ شہید اللہ کی نعمتوں سے مالا مال زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مردہ سمجھنا قرآنی تصریحات کے خلاف ہے: بَلۡ اَحۡیَآءٌ۔

۳۔ دوسری زندگی کے بہت سے حقائق ہمارے شعور سے بالاتر ہیں: لَّا تَشۡعُرُوۡنَ۔

تحقیق مزید

تفسیر القمی، موضوع: حیات برزخی ا: ۳۶۹، الفقیہ ا: ۱۳۷، الکافی ۳: ۲۳۰، ۲۳۵، ۲۴۴۔

وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾

۱۵۵۔ اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک اور جان و مال اور ثمرات (کے نقصانات) سے ضرور آزمائیں گے اور آپ ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

---

[1] ۱۶ نحل: ۹۷ [2] اصول الکافی ۲: ۶۰

الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾

۱۵۶۔ جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں: ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

تفسیر آیات

فلسفۂ آزمائش: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے؟ اس بارے میں ہم نے آیۂ وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ ...[1] کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ استحقاق، تکامل، ارتقا اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے آزمائش عمل میں لائی جاتی ہے کیونکہ آزمائش سے عمل اور عمل سے استحقاق لازم آتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۝[2]

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ کہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ اِنْ کَانَ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ بِھِمْ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَ لٰکِنْ لِتُظْھِرَ الْاَفْعَالَ الَّتِیْ بِھَا یُسْتَحَقُّ الثَّوَابُ وَ الْعِقَابُ ۔[3]

اگرچہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے احوال سے خود ان سے زیادہ آگاہ ہے، لیکن پھر بھی (آزمائش اس لیے ہوتی ہے کہ) ان سے ایسے افعال صادر ہوں جن سے ثواب و عقاب کا استحقاق بن جاتا ہے۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے، لیکن علم خدا کے باعث نہ کوئی شخص ثواب کا مستحق بن سکتا ہے نہ عذاب کا سزاوار، بلکہ استحقاق ثواب و عقاب کا معیار عمل ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے درج ذیل باتیں ذکر فرمائی ہیں جن سے امتحان لیا جاتا ہے:

۱۔ خوف: درپیش خطرے کے اندیشے کو خوف اور مطلوبہ فائدے کی توقع کو رجاء کہتے ہیں:

وَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ وَ یَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ ؕ[4]

اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے خائف بھی۔

خوف کے مقابلے میں اَمن ہے۔ جنہیں خوف لاحق ہوتا ہے انہیں اَمن کی قدر ہوتی ہے۔ جس طرح بیماری میں مبتلا ہونے پر صحت کی قدر ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے:

نِعْمَتَانِ مَجْھُوْلَتَانِ اَلْاَمْنُ وَ الْعَافِیَۃُ ۔[5]

صحت اور امن دو پوشیدہ نعمتیں ہیں۔

---

[1] بقرہ: ۱۲۴ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲ [3] بحار الانوار ۹۱: ۱۹۷
[4] بنی اسرائیل ۱۷: ۵۷ [5] روضة الواعظین ۲: ۴۷۲

۲۔جو ع : (فاقہ کشی) انسانی جسم ہمیشہ تحلیل ہوتا رہتا ہے۔اس کے عدم تدارک کا نام فاقہ ہے جو نہایت کربناک حالت ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام روایت ہے:

وَ لَقَدْ كَانَ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْہِ وَ آلِہٖ مَا يَدُلُّكَ عَلٰی مَسَاوِی الدُّنْيَا وَ عُيُوْبِھَا اِذْ جَاعَ فِيْھَا مَعَ خَاصَّتِہٖ۔خَرَجَ مِنَ الدُّنْيَا خَمِيْصًا وَ وَرَدَ الْاٰخِرَۃَ سَلِيْمًا۔ (۱)

رسول خدا (ص) کی سیرت میں ایسی چیزیں ہیں جو تمہیں دنیا کے عیوب اور اس کی قباحتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ کیونکہ آپ اس دنیا میں اپنے خاص افراد سمیت بھوکے رہا کرتے تھے۔دنیا سے آپ (ص) بھوک و فاقے کے ساتھ تشریف لے گئے اور آخرت میں سلامتی کے ساتھ پہنچ گئے۔

یعنی اس انقلاب کی راہ میں تمہیں ان معاشی مشکلات کا مقابلہ بھی کرنا ہو گا جو مخالفین کی اقتصادی ناکہ بندی اور تجارتی پابندیوں کی وجہ سے پیش آ سکتی ہیں۔مثال کے طور پر دعوت الی الحق کے جرم میں حضور(ص) اور آپ (ص) کے حامیوں کو تین سال تک شعب ابی طالب میں قریش کی طرف سے اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح دس ہجری میں اقتصادی بحران کے خطرے کے باوجود مسجد الحرام میں مشرکین کے داخلے پر پابندی لگائی گئی۔ (یاد رہے کہ مکہ ان دنوں اہم ترین تجارتی مرکز تھا اور اہل مکہ کی اقتصادی آمدنی کا انحصار مختلف علاقوں سے آنے والے مشرکین کے ساتھ تجارت پر تھا) ۔ اس سلسلے میں جب بعض لوگوں کو تشویش ہوئی تو ارشاد ہوا:

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَۃً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖٓ اِنْ شَاۗءَ [۱،۲]

اور اگر(مشرکین کا داخلہ بند ہونے سے) تمہیں غربت کا خوف ہے تو (اس کی پرواہ نہ کرو) اگر اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا۔

۳۔نقصان اموال: آزمائش کا یہ تیسرا مرحلہ ہے۔ارشاد فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَۃٌ ... [۳]

اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہیں۔

جس طرح مالی نقصان آزمائش ہے، اسی طرح دولت کی فراوانی بھی آزمائش ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلْمَالُ مَادَّۃُ الشَّھَوَاتِ۔ [۴]

خواہشات کا سرچشمہ مال ہے۔

۴۔نقص انفس: یعنی جانوں کا ضیاع۔ مثلاً عزیزوں اور دوستوں کی موت، نیز وبا، زلزلہ اور جنگ

۱۔نہج البلاغہ خ ۱۵۸　۲۔۹ توبہ: ۲۸　۳۔۸ انفال: ۲۸　۴۔نہج البلاغۃ کلمات قصار حکمت:۵۸۔ بحار الانوار ۷۵: ۱۴

سے ہونے والی اموات کے ذریعے بھی آزمایا جائے گا۔

۵۔ نقص ثمرات: ثمرات کے نقصان سے مراد پھلوں کا نقصان بھی ہو سکتا ہے، جس سے قحط سالی آجاتی ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ثمرات سے مراد ثمرات دل یعنی اولاد ہے۔ اولاد کی موت کا امتحان سب سے کڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اسی لیے اگرچہ یہ نقصان نقص انفس میں شامل ہے، لیکن اسے علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔

ان آیات میں مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیاوی زندگی کو عیش و عشرت سے عبارت نہ سمجھو اور نہ خدا و رسول(ص) پر ایمان لانے کا یہ مطلب لو کہ تم پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی بلکہ خدا تمہاری ارتقا کے لیے ہی تمہیں آزمائش کے کٹھن مراحل سے گزارے گا۔ کچھ لوگ ان آزمائشوں میں ناکام رہیں گے۔ وہ ان مشکلات کے تحمل کا حوصلہ نہیں رکھتے، کیونکہ ان کی شخصیت اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے اور کچھ لوگ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہیں گے، آزمائش خواہ کتنی کڑی ہو، ان کا صبر اس سے بھی عظیم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے صابرین کو بشارت دیجیے: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ۔

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ صبر کے پیچھے کچھ عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں پر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کے لوگ صابر ہوتے ہیں؟ ان میں صبر کا جذبہ کہاں سے آتا ہے؟ ان کا نظریہ کیا ہے؟ ان میں کون سی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ صبر کرتے ہیں اور ان کے لیے خداوند عالم فرماتا ہے کہ ایسے صابروں کو بشارت دیجیے جو مصیبت کے وقت یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

صابرین کا نظریۂ کائنات: کائنات کے بارے میں صابرین کے دو نہایت اہم نظریے ہیں جو ان کے صابرانہ اور شجاعانہ کردار کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

ا۔ اِنَّا لِلّٰہِ: ”ہم اللہ کے لیے ہیں“۔ اس نظریے سے انسانی وجود کی منطقی توجیہ میسر آتی ہے۔ یہ انسان مادے کے ہاتھوں ایک لایعنی اور عبث کھلونا نہیں ہے کہ وہ بلا وجہ اسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دے، بلکہ یہ انسان اللہ کے لیے ہے:

الف: اس کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ اس کی ذات کا مالک، اس کے امور کی تدبیر کا مالک اور اس کی زندگی پر اثر انداز علل و اسباب کا مالک اللہ ہے۔

ب: اللہ نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ وہ غفور و رحیم ہے۔

ج: وہ کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ دراصل وہ محتاج نہیں کہ ظلم کرے۔ زندگی میں پیش آنے والے ہر نشیب و فراز کے پیچھے اس مالک حقیقی اور اس رحیم و کریم کا ہاتھ ہے جو کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ لہٰذا اس نظریے کا حامل انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس زندگی

میں پیش آنے والے مصائب و آلام میرے اپنے ارتقا کا سبب اور یہ دونوں جہانوں کی مصلحتوں اور سعادتوں کے امین ہیں۔ اس نظریے اور اس طرز فکر کا مالک یقیناً صبر کرے گا۔

۲۔ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ: اور ہم نے اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اس نظریے کے تحت صابرین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آخر کار ہم سب نے اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے، جہاں نیکیوں کا ثواب ملے گا اور برائیوں پر عقاب ہو گا۔ اس جملے میں مظلوم کے لیے تسلیت اور ظالم کی تنبیہ ہے۔

رجوع الی اللہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ رجوع اضطراری: شرعی احکام کی مکلّف تمام مخلوقات کو اللہ کے پاس جانا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ [۱]	اے انسان! تو مشقت اٹھا کر اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، پھر اس سے ملنے والا ہے۔

۲۔ رجوع اختیاری: یعنی مؤمن اللہ کی خدمت میں جانے کے لیے فکری اور عملی طور پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے۔ یہ تیاری اور آمادگی اس کے ہر عمل اور ہر قدم میں نظر آتی ہے۔

رجوع اختیاری والے تین گروہ ہیں:

الف: وہ مومن جس کے ہر عمل اور قدم میں رجوع الی اللہ پر ایمان کا عنصر غالب ہو اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

فَاِنَّہٗ مَنۡ مَّاتَ مِنۡکُمۡ عَلٰی فِرَاشِہٖ وَ ھُوَ عَلٰی مَعۡرِفَۃِ حَقِّ رَبِّہٖ وَ حَقِّ رَسُوۡلِہٖ وَ اَھۡلِ بَیۡتِہٖ مَاتَ شَھِیۡدًا وَ وَقَعَ اَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ۔ [۲]	بلا شبہ تم میں سے جو شخص اللہ اور اس کے رسول (ص) اور ان کے اہل بیت (ع) کے حق کو پہچانتے ہوئے بستر پر بھی دم توڑے، وہ شہید مرتا ہے اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

ب: وہ شہید جو راہ خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں اپنے اختیار سے چل کر جاتا ہے۔ اسی لیے حدیث نبوی (ص) ہے:

فَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ بِرٍّ بِرٌّ حَتّٰی یُقۡتَلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَاِذَا قُتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَلَیۡسَ فَوۡقَہٗ بِرٌّ۔ [۳]	ہر نیکی سے بالاتر ایک اور نیکی ہوتی ہے، سوائے راہ خدا میں شہادت کے۔ راہ خدا میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کی اس نیکی سے بالاتر کوئی اور نیکی نہیں ہے۔

ج۔ اولیاء اللہ: اللہ کے ولی بھی مرضی اور رغبت کے ساتھ اللہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے

۱؎ ۸۴ انشقاق: ۶　　۲؎ نہج البلاغہ خ ۱۸۸ ص ۵۱۰　　۳؎ الوسائل ۱۵: ۱۶

ہیں۔ اس لیے وہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے فرمایا:

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ ہَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ [1]

کہدیجیے: اے یہودیت اختیار کرنے والو! اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو، دوسرے لوگ نہیں، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ، لقائے رب کے مشتاق اور موت کے متمنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ سردار اولیاء حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان مشہور ہے: موت میرے لیے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے۔

نیز آپ(ع) سے مروی ہے:

وَاللّٰہِ لَابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ آنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّہٖ۔ [2]

خدا کی قسم ابوطالب کا بیٹا موت سے اتنا مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے انس رکھتا ہے۔

احادیث

رسول خدا (ص) سے روایت ہے:

مَنْ اِسْتَرْجَعَ عِنْدَ الْمُصِیْبَۃِ جَبَرَ اللّٰہُ مُصِیْبَتَہٗ وَ اَحْسَنَ عُقْبَاہُ وَ جَعَلَ لَہٗ خَلَفًا صَالِحًا یَرْضَاہُ۔ [3]

جو مصیبت کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہِ کہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کا تدارک فرماتا ہے، اس کی عاقبت کو بہتر بنا دیتا ہے اور اسے نیک اور پسندیدہ نعم البدل عنایت فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی انسان کی زندگی کا ہدف صرف اللہ ہے، وہ اللہ کو اپنا مالک سمجھتا ہے: اِنَّا لِلّٰہِ۔

۲۔ انسانی ارتقا کی آخری منزل بارگاہ الٰہی ہے: وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

۳۔ مؤمن کا مبدا و منتہی اللہ کی ذات ہے کہ اللہ کے پاس سے آیا ہے اور پلٹ کر اللہ ہی کے ہاں جانا ہے: اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

۴۔ مؤمن، شہید اور اولیاء اللہ فکری اور عملی تیاری کے ساتھ اپنی رضا و رغبت سے واپسی کا یہ سفر طے کرتے ہیں۔

۵۔ مبدا و معاد پر مشتمل مؤمن کی جہاں بینی کی جامع ترین، مختصر ترین اور فصیح ترین تعبیر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ہے۔

---

[1] ۶۲ جمعہ: ۶ [2] نہج البلاغہ خ ۵ ص ۱۰۸۔ بحار الانوار ۲۸: ۲۳۳ [3] مجمع البیان۔ مستدرک الوسائل ۲: ۴۰۲

۶۔ آزمائش خداوند عالم کا ایک تکوینی قانون ہے: وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ ۔

۷۔ آزمائش کا مقصد انسانی صلاحیتوں کا ارتقا ہے۔

۸۔ خوف، معاشی مشکلات، مالی نقصانات، جانوں کا ضیاع اور اولاد کی مصیبت، یہ سب آزمائش کی مختلف صورتیں ہیں: وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ ۔

۹۔ ان آزمائشوں میں وہی شخص کامیاب ہو کر ارتقائی مراحل طے کرے گا جو اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کے مستحکم قلعے میں بیٹھ کر ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرے گا۔

تحقیق مزید

آیت ۱۵۵: مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۶۱، الارشاد ۲: ۳۷۷، تاویل الایات ص ۸۷، مسکن الفواد ص ۵۳

اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۵۷۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے درود ہیں اور رحمت بھی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

تشریح کلمات

صَلَوٰتٌ: (ص ل و) یہ کلمہ دعا، رحمت، شفقت اور ہمدردی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے صَلَوات اس کی عنایت ہے۔ فرشتوں کی صَلَوات سے مراد ہمدردی ہے کہ وہ وسیلۂ فیض بن جاتے ہیں اور انسانوں کی صَلَوات دعا سے عبارت ہے۔ اس لفظ پر کچھ تحقیق سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ہو چکی ہے۔

تفسیر آیات

آزمائشوں میں صبر کے ذریعے کامیاب ہونے والوں پر رحمتیں اور عنایات نازل ہوں گی۔ اللہ کی رحمت و عنایت (صَلَوات) کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس بارے میں قرآن دوسری جگہ فرماتا ہے:

ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ [۱]

وہی تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (دعا کرتے ہیں) تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لائے۔

---

[۱] ۳۳ احزاب: ۴۳

رسول کریم (ص) سے صَلَوات کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ...[1]

اور انہی بدووں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے تقرب اور رسول سے دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ہاں یہ ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے، اللہ عنقریب انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

دوسری جگہ رسول (ص) کی صَلَوات (دعا) کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَ صَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ؕ[2]

اور ان کے حق میں دعا بھی کریں یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

لہٰذا خدا کی صَلَوات اور رسول کی صَلَوات کے اثرات یہ ہیں کہ ہر قسم کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، قربت الٰہی و رحمت خداوندی کا حصول ہوتا ہے اور دلوں کو سکون و راحت میسر آ جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہدایت وسعادت سے ہمکنار ہونا ہے: اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ ۔

احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے درجات کے مطابق آزمائش کے بھی مراحل ہوتے ہیں ۔حضرت امام جعفر صادق (ع) سے منقول ہے:

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم مَنْ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاء فِی الدُّنْیَا ؟ فَقَالَ: النَّبِیُّوْن ثُم الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ وَ یُبْتَلَی الْمُؤْمِنُ بَعْدُ عَلَی قَدْرِ اِیمَانِہِ.[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: دنیا میں کن لوگوں کی کڑی آزمائش ہوتی ہے؟ فرمایا: انبیاء کی، پھر درجہ بدرجہ، پھر مؤمن کی آزمائش اس کے ایمان کے مطابق ہو گی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو تاریخ کی سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ائمہ علیہم السلام کو کن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، اس کی امام شافعی نے ایک جامع صورت بیان کی ہے

تَزَلْزَلَت الدُّنْیا لِآلِ مُحمُدٍ وَ کَادَتْ لَھُمْ صُمُّ الجِبَالِ تَذُوْبُ

آل محمد کی مصیبتوں سے دنیا ہل کر رہ گئی جن سے سخت چٹانیں بھی پگھل جائیں۔

ان مصائب کے مقابلے میں ائمہ نے تَسْلِیْماً لِاَمْرِہِ وَ رِضاً بِقَضَائِہِ[4] یعنی تسلیم و رضا کا مؤقف اختیار کر کے صبر و تحمل کا وہ مظاہرہ فرمایا جس سے وہ صبر و رضا کے سب سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور

---

[1] ۹ توبہ: ۹۹ [2] ۹ توبہ: ۱۰۳ [3] اصول الکافی ۲: ۲۵۲ [4] بحار الانوار ۷۸: ۲۶۲

اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ کے اولین مصداق قرار پائے۔ جب وہ اللہ کی طرف سے صلوٰۃ و درود کے اہل قرار پائے تو ہم بھی انہیں علیهم السلام کہتے ہیں ۔ واضح رہے ائمہ اہل بیت کے لیے علیهم السلام کہنا اور لکھنا صرف شیعہ امامیہ کا مؤقف نہیں ہے، جیسا کہ بعض ناآگاہ لوگوں کا خیال ہے بلکہ یہ بات اہل بیت علیهم السلام کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر ائمہ اہل بیت کے اسمائے مبارکہ کے ساتھ علیه السلام لکھا ہے ۔ ملاحظہ ہو: جلد سوم صفحہ ۹۱۷، کتاب توحید میں ''حسین بن علی علیهما السلام '' کتاب فرض الخمس جلد سوم صفحہ ۸۶۲ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی میں ''فاطمه علیها السلام'' کتاب فرض الخمس میں'' حسین بن علی علیهما السلام '' کتاب الاعتصام میں'' فاطمه علیها السلام '' کتاب المغازی میں'' علی بن حسین ان حسین بن علی علیهم السلام '' کی عبارات تحریر ہیں ۔

اہم نکات

۱۔ آزمائشوں میں صبر و صلوٰۃ کے ذریعے کامیابی رحمت خداوندی اور ہدایت الٰہی سے فیضیاب ہونے کا ذریعہ ہے ۔

۲۔ سکون قلب اور روشن مستقبل اللہ سے لو لگائے بغیر اور مشکلات میں صبر و استقامت دکھائے بغیر ممکن نہیں ۔

تحقیق مزید

الکافی ۲ : ۹۲، غیبة النعمانی ص ۶۳

اِنَّ الصَّفَا وَ الۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا ؕ وَ مَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۵۸﴾

۱۵۸۔ صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور جو اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرتا ہے تو یقیناً اللہ قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

صَفَا: (ص ف و) آمیزش سے پاک اور صاف ہونا۔ صَفَا، صاف چٹان کو کہتے ہیں۔ یہاں وہ

چٹان مقصود ہے جو حرم کعبہ کے دائیں جانب ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم صفی اللہ (ع) نے یہاں نزول فرمایا تھا، اس لیے اسے صَفَا کہتے ہیں۔

مَرْوَة: یعنی سفید و نرم پتھر۔ یہ حرم کے بائیں جانب ہے۔ حج بجا لانے والا ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ آمد و رفت کرتا ہے جسے سَعی کہتے ہیں۔ یہاں حضرت حوا نے نزول فرمایا تھا، اس لیے اسے مَرْوَة کہتے ہیں۔

شَعَآئِر: (ش ع ر) شَعیرة کی جمع ہے۔ یعنی علامت۔ دینی اصطلاح میں یہ وہ محسوس مظاہر ہیں جن سے اس دین کی تعلیمات اور حقائق وابستہ ہیں۔ چنانچہ صَفَا و مَرْوَہ کی پہاڑیوں کے ساتھ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی عظیم تحریک کی یادیں وابستہ ہیں۔

حَج: (ح ج ج) یکے بعد دیگرے قصد کرنے سے عبارت ہے۔ اسلام کے نزدیک مکہ میں بجا لائے جانے والے مخصوص اعمال کا نام حَج ہے۔

عمرہ: (ع م ر) آباد کرنا۔ یہاں زیارت مراد ہے۔ یہ کلمہ عِمْران ''آبادی'' سے ماخوذ ہے، کیونکہ زیارت کے لیے زیادہ لوگوں کی آمد و رفت علاقے کی تعمیر و ترقی کا سبب بنتی ہے، اس لیے زیارت کو عُمْرَہ کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

شان نزول: شیعہ اور سنی دونوں کے ہاں اس آیت کے شان نزول میں مذکور ہے کہ مشرکین مکہ نے صَفَا اور مَرْوَہ دونوں پہاڑیوں پر کچھ بت نصب کئے تھے۔ وہ سعی کرتے ہوئے ان بتوں کو چھوتے اور چومتے تھے۔ توحید کی درس گاہ کے تربیت یافتہ مسلمانوں نے خیال کیا کہ کہیں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت (سعی کرنا) شرک کے شعائر میں شامل نہ ہو۔ اس خیال کو دور کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ صَفَا و مَرْوَہ شرک کے نہیں، اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ ان کے درمیان سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فَلَا جُنَاحَ: کوئی حرج نہیں۔ یہ جملہ اس وہم و خیال کو دور کرنے کے لیے ہے کہ کہیں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا مشرکانہ عمل نہ ہو۔ فَلَا جُنَاحَ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صَفَا و مَرْوَہ کے درمیان سعی کرنا فقط جائز ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ واجب حج کی بجا آوری میں صَفَا و مَرْوَہ کے درمیان سعی کرنا بھی شامل ہے اور اس میں کوئی مضائقہ و ممانعت نہیں ہے۔

اس آیت کے لب و لہجے کا سمجھنا شان نزول کے علم پر موقوف ہے۔ اس کے بعد فَلَا جُنَاحَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ شعائر الٰہی کی تعظیم شرک نہیں، بلکہ عبادت ہے، اگرچہ وہ بے جان پتھر ہی کیوں نہ ہو:

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ ؀[1]
بات یہ ہے کہ جو شعائر اللہ کا احترام کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۲۴۵ ۔ ۴۳۱، التہذیب ۵ : ۳۹۴۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

۱۵۹۔ جو لوگ ہماری نازل کردہ واضح نشانیوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم کتاب میں انہیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر چکے ہیں تو ایسے لوگوں پر اللہ اور دیگر لعنت کرنے والے سب لعنت کرتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾

۱۶۰۔ البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور (اپنی) اصلاح کر لیں اور (جو چھپاتے تھے اسے) بیان کر دیں تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا اور میں تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

تشریح کلمات

لَعن : (ل ع ن) بوجہ ناراضگی اپنی درگاہ سے دھتکار دینا۔ خدا کی طرف سے لعنت کا مطلب ہے دنیا میں رحمت و توفیق سے محرومی اور آخرت میں مغفرت سے محرومی اور عذاب کا مستحق قرار پانا.

تفسیر آیات

یہ آیت یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اولاً اللہ کی طرف سے نازل شدہ تعلیمات کو اپنے عوام تک نہیں پہنچاتے تھے، بلکہ انہیں چند افراد تک محدود رکھتے تھے اور ثانیاً وہ حضرت محمد مصطفیٰ (ص) کی رسالت اور ان کی حقانیت کے بارے میں توریت میں مذکور حقائق کو نہ صرف چھپاتے تھے، بلکہ ان کے خلاف

---

[1] ۲۲ حج: ۳۲

باتیں نشر کیا کرتے تھے۔

شان نزول اگرچہ یہودی علماء کے بارے میں ہے، لیکن قرآن فہمی کا ایک ضابطہ ہے کہ شان نزول کے خاص ہونے سے آیت کے عموم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آیت کے عموم کے تحت حکم خدا کو چھپانے والے سب لوگ اس آیت میں شامل ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث اس مطلب کی مؤید ہیں۔

احادیث

رسول خدا (ص) سے مروی ہے:

اِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فِیْ اُمَّتِیْ فَلْیُظْهِرِ الْعَالِمُ عِلْمَهٗ فَمَنْ لَمْ یَفْعَلْ فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ۔[1]

میری امت میں جب بدعتیں ظاہر ہونا شروع ہو جائیں تو عالم پر فرض ہے کہ وہ اپنے علم کا اظہار کرے، وگرنہ اس پر اللہ کی لعنت ہے۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ یَعْلَمُهٗ ثُمَّ کَتَمَهٗ اَلْجَمَهُ اللّٰه تعالٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِلَجَامٍ مِنْ نار۔[2]

اگر کسی سے ایسی بات پوچھی جائے جسے وہ جانتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اسے پوشیدہ رکھے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

اہم نکات

۱۔ دینی حقائق کو چھپانے والے ملعون ہیں: یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ۔

۲۔ لوگوں کو بھی چاہیے کہ ان پر لعنت بھیجیں: یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ۔

۳۔ لعنت سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ توبہ و اصلاح کے ساتھ ان حقائق کو آشکار کریں۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا ....۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾

۱۶۱۔ جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں، ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾

۱۶۲۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی

---

[1] اصول الکافی ۱: ۵۴. باب البدع　[2] مجموعہ ورام ۲: ۷۔ بحار الانوار ۲: ۷۸۔ معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ

تفسیر آیات

یہ آیات ان کافروں کے بارے میں ہیں جو حق کو سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر کفر اختیار کرتے ہیں۔
کفر کا لغوی مفہوم چھپانا ہے۔ یہ مفہوم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی چیز کی حقانیت کا علم ہو جانے کے بعد بھی زبان و کردار سے اس کا اظہار نہ کیا جائے۔ اسلام کی حقانیت کا اعتراف نہ کرنے والوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ اسلام کی حقانیت کا علم ہونے کے باوجود اس پر ایمان نہ لانے والے۔ ایسے لوگ اس آیت میں شامل ہیں۔

۲۔ انہیں اسلام کی حقانیت کا علم تو نہیں ہے، لیکن اس علم کا حاصل کرنا ان کے لیے ممکن ہے اور وہ اس میں کوتاہی اور تساہل کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں اسلام کی حقانیت معلوم نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو جاہل مقصر کہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اس آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

۳۔ انہیں اسلام کی حقانیت کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا علم حاصل کرنا ان کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جاہل قاصر اور مستضعف کہتے ہیں۔ قیامت کے دن ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک نہ ہوگا۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

حالت کفر کی موت: مجموعی طور پر آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر کافر پر اللہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں کافر ہونے والے سب اس میں شامل ہو جاتے، بلکہ اس کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ وہ کفر کی حالت میں مر جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت سے قبل کسی بھی مرحلے میں اس کے لیے کفر چھوڑنے کی گنجائش موجود ہے اور وہ کافروں کی صف سے نکل سکتا ہے۔

احادیث

کلینیؒ نے کافی میں روایت کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِسَنَةٍ قَبِلَ اللّٰهُ تَوْبَتَهٗ ثُمَّ قَالَ : اِنَّ اَلسَّنَةَ لَكَثِيْرَةٌ مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِشَهْرٍ قَبِلَ اللّٰهُ تَوْبَتَهٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الشَّهْرَ لَكَثِيْرٌ، مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِجُمْعَةٍ قَبِلَ اللّٰهُ تَوْبَتَهٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الْجُمْعَةَ لَكَثِيْرٌ، مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِيَوْمٍ قَبِلَ اللّٰهُ تَوْبَتَهٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّ

جو شخص موت سے ایک سال پہلے توبہ کر لے، اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ پھر فرمایا: سال کا عرصہ تو بہت ہے جو شخص موت سے ایک ماہ قبل توبہ کر لے، اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا۔ پھر فرمایا: مہینہ بھی بہت ہے، جو شخص موت سے ایک جمعہ پہلے توبہ کر لے اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ پھر فرمایا: جمعہ بھی بہت ہے جو شخص موت سے ایک دن قبل توبہ کر لے، اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ پھر فرمایا:

يَوْماً لَكَثِيْرٌ مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ يُّعَايِنَ قَبِلَ اللّٰهُ تَوْبَتَہٗ۔[1]

دن بھی بہت ہے، جو شخص موت نظر آنے سے پہلے توبہ کر لے، اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔

اہم نکات

۱۔ موت سے قبل کسی وقت بھی کفر چھوڑ کر مذکورہ لعنت سے بچنے کی گنجائش موجود ہے۔

وَ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۳﴾

۱۶۳۔ اور تمہارا معبو د ایک ہی معبود ہے، اس رحمٰن رحیم کے سوا کوئی معبود نہیں۔

تفسیر آیات

خطاب امت محمدی(ص) سے ہے کہ دوسرے مذاہب و ادیان کے برخلاف تمہارا معبود ایک ہی ہے اور وہی رحمٰن و رحیم ہے۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے جھوٹے خداؤں کو تسلیم کرتے ہیں۔ تعدد الٰہ کے مشرکانہ نظریات کی رد میں قرآن نے توحید کا معقول ترین نظریہ پیش کیا ہے۔

الٰہ: معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ واحد ہے۔ اس کی ذات ایک ہے۔ وہ صفات میں بھی ایک ہے۔ اس کی ذات اور صفات میں بھی تعدد نہیں ہے۔ یعنی اس کی حیات، قدرت، علم اور ذات ایک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ذات خدا اور اس کی صفات دو متعدد چیزیں ہوں۔ صفت اور موصوف الگ ہوں ۔ چنانچہ دیگر اشیاء میں ذات، صفات سے الگ اور ان سے متصف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ذات کا صفات سے اتصاف اس وقت معقول ہے، جب یہ دونوں الگ ہوں ۔

وہ جس طرح ذات میں یکتا ہے، اسی طرح صفات میں بھی اسے یکتائی حاصل ہے۔ اس کا علم دوسروں کے علم کی طرح نہیں ۔اس کی حیات دوسروں کی حیات کی مانند نہیں۔ اس کی قدرت بھی اپنی نوعیت میں یکتا ہے۔ وہ واحد علی الاطلاق ہے۔ جس میں کسی اور کی شرکت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

تحقیق مزید

الخصال ۱: ۲، التوحید ص ۸۳۔

اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ

۱۶۴۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات اور دن کے آنے جانے میں، ان کشتیوں

---

[1] اصول الکافی ۲: ۴۴۰

الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

میں جو انسانوں کے لیے مفید چیزیں لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسایا، پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلایا اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

خَلۡق: (خ ل ق) متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ ابداع یعنی ایک شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے خلق ابداعی کہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ کہا گیا ہے وہاں بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ[1] سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خلق ابداعی خداوند عالم کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۔ ایک شے کو دوسری چیز سے بنانے کو بھی خلق کہتے ہیں: جیسے: خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ...[2] اس معنی میں یہ لفظ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ (ع) سے خطاب کر کے فرمایا:

وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ ...[3] — اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا پتلا بناتے تھے۔

۳۔ اندازہ گیری کے معنوں میں آتا ہے۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے:

الخلق التقدیر۔ جیسے: فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ۔[4] ۔ خدا سب سے بہتر اندازہ کرنے والا ہے۔

اس مطلب کی وضاحت اسی آیت کے ذیل میں آئے گی۔ انشاء اللہ۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۷۔ ترجمہ: وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔

[2] ۱۶ النحل: ۴۔ ترجمہ اس نے انسان کو ایک بوند سے پیدا کیا۔　[3] ۵ مائدہ: ۱۱۰

[4] ۲۳ مومنون: ۱۴۔ پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔

۴۔ جھوٹ تراشنے کو بھی خلق کہتے ہیں جیسے فرمایا: وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ۔[1] اور جھوٹ گھڑ لیتے ہو۔

اخۡتِلَافِ: (خ ل ف) کسی کے پیچھے آنا۔ ایک دوسرے کے طریقۂ کار میں ہم آہنگی نہ ہونا۔ آمد و رفت (آنے جانے) کو بھی اختلاف کہتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

یَعْلَمُ ... اِخْتِلَافَ النِّیْنَانِ فِی الْبِحَارِ الْغَامِرَاتِ ۔[2]	وہ (اللہ) اتھاہ سمندروں میں مچھلیوں کی آمد و رفت کو بھی جانتا ہے۔

معصوم (ع) کی زیارت میں پڑھتے ہیں: وَ مُخْتَلَفُ الْمَلَائِکَۃِ ۔[3] "فرشتوں کے آنے جانے کی درگاہ" اور ممکن ہے اسی سے ہو: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ ۔[4] "میری امت کی آمد و رفت میں رحمت ہے۔" یعنی جس جگہ یہ لوگ جائیں گے وہاں اسلام کا فیض پہنچائیں گے اور لوگوں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے آداب سکھائیں گے۔

دَآبَّۃٍ: (د ب ب) آہستہ آہستہ چلنا۔ زمین پر رینگنے والے جاندار۔ عرف عام میں چوپاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

الۡمُسَخَّرِ: (س خ ر) مسخر، مطیع و فرمانبردار، رام کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔

تَصۡرِیۡفِ: (ص ر ف) کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا۔ یعنی نقل و انتقال اور تغییر۔

یَّعۡقِلُوۡنَ: (ع ق ل) عقل وہ قوت ہے جو قبول علم کی اہلیت رکھتی ہے۔ اصل میں عقل روکنے اور پابند رکھنے کے معنوں میں ہے۔ چنانچہ اونٹ کے پاؤں باندھ دینے کو عِقَال کہتے ہیں اور مضبوط قلعہ کو مَعۡقِلٌ کہا جاتا ہے۔ عقل انسان کو خطرات اور نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے اور مفید چیزوں کا پابند بنا دیتی ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مخلوقات سے خالق اور مصنوعات سے صانع کے وجود کو ثابت کرنے کا طرز استدلال اختیار فرمایا ہے۔ یہ طرز استدلال، ایک فطری استدلال ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ ترین اور آسان ترین استدلال ہے جسے سطحی ذہن رکھنے والے لوگ بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ اپنے تمام تر معاملات میں یہی طرز استدلال اپناتے ہیں جہاں براہ راست حس و مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم ایک دوسرے کے دلوں میں براہ راست جھانک کر تو دیکھ نہیں سکتے کہ کس کے دل میں کیا ہے، تو وہاں ایک دوسرے کے قول و عمل سے دلوں کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔

کبھی ہمیں براہ راست معلوم نہیں ہوتا کہ زید ریاضی دان ہے، سعید ماہر نفسیات ہے اور ماجد ادیب،

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۱۷　[2] بحار الانوار ۴: ۹۲　[3] الفقیہ ۲: ۶۰۹ زیارت جامعۃ　[4] وسائل الشیعۃ ۲۷: ۱۴۰

شاعر ہے۔ یعنی ہم ان لوگوں کے ذہن کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے اذہان میں کون سا علم ہے، لیکن ان لوگوں کی کتب، ان کے کار ہائے نمایاں اور ان کے اشعار کے ذریعے ہم ان کے علوم سے باخبر ہوتے ہیں۔ اگر علامہ اقبالؒ کے اشعار ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم نہیں سمجھ سکتے تھے کہ علامہ اقبالؒ کس پایے کے مفکر ہیں۔

خداوند عالم نے اس آیہ مجیدہ میں ہمیں اپنی آفاقی کتاب (کائنات) کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ اس کتاب کا ہر باب اس کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور اس کی ہر سطر اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس کا ہر کلمہ وجود خداوندی کی براہین میں سے ایک برہان ہے۔ اس کی کتاب آفاق اور کتاب اَنۡفُس کا ہر ورق بتا رہا ہے کہ اس کے اندر موجود حیرت انگیز مواد اور مطالب ارادے و شعور سے ہی مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان حکمتوں اور پیچیدہ ترین خلقت و صنعت کے پیچھے ایک حکیمانہ ارادہ کارفرما ہے۔

مردہ مادے سے ایک زندہ خلیے کا از خود اور اتفاقاً وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔ ایک کمپیوٹر کا اتفاقیہ طور پر خود بخود وجود میں آنا شاید ممکن ہو، لیکن اس کمپیوٹر کو ایجاد کرنے والے دماغ کا خود بخود وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔

اتفاق کی امکانی صورت

ایک مغربی مفکر اپنی کتاب میں لکھتا ہے (جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے):

> دس ٹوکنوں پر ایک سے دس تک نمبر لگائیں پھر انہیں اپنی جیب میں ڈال کر خوب ہلائیں۔ اس کے بعد ترتیب کے ساتھ جیب سے نکالیں۔ جس ٹوکن کو جیب سے نکالا ہے، اسے دوبارہ جیب میں ڈال کر ہلائیں پھر دوسری بار دوسرا ٹوکن نکالیں۔ اس طرح ایک نمبر ٹوکن کے اتفاقیہ طور پر نکلنے کا امکان دس میں سے ایک ہے۔ ایک اور دو کے بالترتیب نکل آنے کا امکان سو میں سے ایک ہے۔ ایک دو اور تین کے ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک دو تین اور چار کے ترتیب سے نکل آنے کا احتمال دس ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک دو تین چار اور پانچ کے ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا امکان ایک لاکھ میں سے ایک ہے۔ اس طرح ایک سے لے کر دس تک کے ترتیب کے ساتھ اتفاقیہ طور پر نکل آنے کا احتمال دس ارب میں سے ایک ہے.

اس سادہ مثال کے بعد انسانی خلقت پر ایک نظر ڈالیں کہ انسان کئی ملین خلیوں کی ترتیب و ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ گویا انسان کی خلقت اربوں ٹوکنوں کو ترتیب کے ساتھ رکھنے سے ہوئی ہے۔ اب سوچیے کہ دس ٹوکنوں کے ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا احتمال دس ارب احتمالات میں سے ایک ہے تو اگر یہ ٹوکن کئی

ملین ہوں تو ترتیب کا احتمال کتنا ہوگا؟ جواب صفر ہے۔ آسمانوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○[1]

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بنا برایں عقل، منطق کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ عظیم کائنات کسی علیم وحکیم و قادر ہستی کے ارادے کے بغیر اتفاقاً اور خودبخود وجود میں آئی ہو۔ اثبات رب کے لیے عقلی استدلال کی یہ معقول ترین روش قرآن کا طرہ امتیاز ہے۔

۱۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ: آسمانوں کا ذکر قرآن مجید میں جمع کے ساتھ تقریباً دوسو آیات میں اور مفرد کے ساتھ تقریباً ایک سو آیات میں ہوا ہے۔ جب کہ زمین (ارض) کا ذکر ہمیشہ مفرد لفظ کے ساتھ ہوا ہے۔ صرف ایک آیت ہے جس سے یہ خیال ظاہر ہوا ہے کہ زمین بھی متعدد ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ... خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۔[2]

کتاب کائنات کا سماواتی باب توحید کے گوناگوں مباحث و دروس سے لبریز ہے۔ نظام کی وحدت سے نظم دہندہ کی وحدت کا ثبوت ملتا ہے۔ وحدتِ خلقت سے توحید خالق کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آج کا ہر طالبعلم جانتا ہے کہ ایٹم کی تشکیل اور نظام شمسی کی تشکیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نظام شمسی اور کہکشاؤں کے نظام میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام کائنات میں ایک ہی طرز تنظیم اور ایک ہی طریقے کا نظام رائج ہے۔ اگر ایٹمی نظام میں پروٹون کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور دیگر الیکٹرونی سیارے اپنے مرکز کے گرد گھومتے ہیں تو نظام شمسی اور کہکشاؤں کا نظام بھی تو یہی ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

ماہرین کا اندازہ ہے کہ ہر کہکشاں میں کم از کم ایک سو بلین (ایک کھرب) ستارے موجود ہوتے ہیں۔ اب تک ایک سو بلین (ایک کھرب) کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے دو ملین نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ آسمانوں کی وسعت اور عظمت کا اندازہ لگا لیجیے۔

اب آپ ہر کہکشاں میں موجود ایک لاکھ ملین (سو ارب) ستاروں کو خود ایک لاکھ ملین (سو ارب) کہکشاؤں سے ضرب دیں۔ تو حیرت انگیز تعداد سامنے آتی ہے۔

واضح رہے کہ ان ستاروں میں سے ہر ایک اپنی جگہ ہمارے سورج کی طرح ایک مجموعہ شمسی ہے بلکہ دیگر ستارے ہمارے سورج سے لاکھوں گنا بڑے ہیں۔

---

[1] ۴۰ مومن: ۵۷　[2] ۶۵ طلاق: ۱۲۔ ترجمہ... سات آسمان بنائے، انہی کی طرح زمین بھی۔

یہ اعداد و شمار انسان کی اب تک کی علمی رسائی کا نتیجہ ہیں، ورنہ کائنات کا وہ حصہ جو انسان کی علمی رسائی سے ماوراء ہے، اس حصے سے کہیں زیادہ عظیم ہے جس کو انسان جان چکا ہے:

وَ السَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡٮدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ○[1]　　اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں

صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

۲۔ وَالۡاَرۡضِ: زمین۔ زمین جسامت کے لحاظ سے نظام شمسی کا پانچواں اور سورج سے فاصلے کے لحاظ سے تیسرا سیارہ ہے۔ اس کی متعدد حرکات ہیں:

۱۔ حرکت محوری: اس حرکت کے تحت زمین اپنے مدار کے گرد لٹو کی طرح گھومتی ہے، جس سے روز و شب وجود میں آتے ہیں۔

۲۔ حرکت انتقالی: اس حرکت کے تحت زمین ۳۶۵ روز پانچ گھنٹے ۲۸ منٹ اور ۴۰ سیکنڈ میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔ اس طرح سال میں ۹۳۰ ملین کلومیٹر کی مسافت ۲۹ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے طے کرتی ہے۔

۳۔ سورج کے ہمراہ حرکت: سورج اپنے سیاروں کے ساتھ مجموعی طور پر ایک خاص انداز میں اپنے پورے نظام کے ساتھ حرکت میں ہے اور زمین چونکہ اس نظام شمسی کی ایک اہم فرد ہے، اس لیے یہ بھی سورج کے ہمراہ نظام شمسی کے مدار میں حرکت کرتی ہے۔

اگر زمین موجودہ حجم سے بڑی ہوتی تو ہوا کے ذرات کشش زیادہ ہونے کی وجہ سے سطح زمین میں جذب ہو جاتے اور زمین قابل سکونت نہ رہتی اور اگر زمین موجودہ حجم سے چھوٹی ہوتی تو ہوا کے ذرات اس کی فضا میں محفوظ نہ رہتے اور کشش کم ہونے کی وجہ سے منتشر ہو جاتے۔

اگر زمین سورج سے زیادہ دور ہوتی تو سردی کی وجہ سے یہ قابل سکونت نہ رہتی اور اگر سورج سے زیادہ نزدیک ہوتی تو گرمی کی وجہ سے قابل سکونت نہ رہتی۔ لہٰذا زمین مناسب فاصلے پر ہے۔ سورج سے یہاں پہنچنے والی حرارت بھی مناسب ہے۔ زمین کی کشش بھی مناسب ہے۔ زمین کا حجم اس کی محوری (روزانہ کی) حرکت کے ساتھ متناسب ہے اور سالانہ گردش بھی مختلف موسموں کے لیے مناسب ہے۔ زمین کا وزن اس کی کشش کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ زمین پر موجود حرارت پانی کے مزاج کے لیے بھی مناسب ہے، ورنہ بہت زیادہ درجہ حرارت یا بہت کم درجہ حرارت میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا اتحاد ممکن نہیں رہتا۔

زمین اگر موجودہ صورت حال سے زیادہ نرم ہوتی تو اس پر کوئی عمارت قائم نہ ہو سکتی اور اگر موجودہ صورت سے زیادہ سخت ہوتی تو سبزہ اگنا ممکن نہ ہوتا۔

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۷

زمین ستر (۷۰) سے زائد عناصر پر مشتمل ایک قابل حیات اور مہمان نواز سیارہ ہے، جس کے اندر بے شمار نعمتیں موجود ہیں:

وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۙ[1]　　اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۔ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ: رات اور دن کی آمد و رفت۔ نور اور تاریکی کا تبادلہ، شروق و غروب کا یکے بعد دیگرے آنا، شعور و ارادہ اور حکمت وصنعت کی ایک دلیل ہی نہیں، بلکہ اس صاحب قصد و ارادہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ دن میں سورج کا نور سرچشمۂ حیات ہے اور اس تاریک و سرد فضا میں نور و حرارت کا منبع ہے۔ اگر یہ عظیم چراغ گل ہو جائے تو زندگی کا یہ کاروان فوراً رک جائے گا۔

تاہم اگر یہ حیات بخش نور بلا وقفہ جاری رہے اور رات کے ذریعے اس نور اور شعاع کی تابش کو قابو میں نہ رکھا جائے تو یہ نور سبب حیات بننے کی بجائے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پانی اگرچہ منبع حیات ہے، لیکن اس کی کثرت سیلاب کی شکل اختیار کر کے مہلک ثابت ہوتی ہے:

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الَّیۡلَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ ؕ[2]　　کہد یجیے! یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ ؕ[3]　　کہد یجیے! یہ تو بتاؤ کہ اگر قیامت تک اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے دن کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے جس میں تم سکون حاصل کرو؟

۴۔ وَالۡفُلۡکِ: سمندروں میں چلنے والی کشتیاں اگرچہ انسانی صنعت و حرفت کا نتیجہ ہیں، لیکن انسان چونکہ خود اللہ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے، اس لیے اس کے ہاتھ سے وجود میں آنے والی صنعتیں اور ایجادات بھی اللہ کی نشانیاں ہیں نیز سمندروں کے پانی کا رخ اور پانی کا قدرتی مزاج جو اپنے سے ہلکی چیزوں کو اپنی پشت پر اٹھا لیتا ہے۔ بنا برایں ہوا یا کسی اور قوت و طاقت کے ذریعے غول پیکر بحری جہازوں کو آسانی دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچانا بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

۵۔ وَمَاۤ اَنۡزَلَ: آسمان سے پانی کا نزول۔ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی و دیگر مائعات، مثلاً تیل وغیرہ منتقل کرنے کے لیے ٹینکر، پائپ لائن اور نہروں کا استعمال کرتے ہیں اور اس پر بے پناہ سرمایہ اور طاقت خرچ ہو جاتی ہے اور پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے جاتے ہیں، ان پر بھی کثیر سرمایہ اور وقت صرف ہوتا ہے۔ قدرت بھی یہی کام سرانجام دیتی ہے۔ مگر اس پر جو سرمایہ خرچ ہوتا ہے، وہ

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۲۰　[2] ۲۸ قصص ۷۱　[3] ۲۸ قصص: ۷۲

ہے فقط سورج کی شعاعوں کے ذریعے حرارت پہنچانا۔ البتہ یہ شعاعیں صرف اسی مقصد کے لیے نہیں ہیں، ان کی سینکڑوں دیگر ذمے داریاں بھی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی حرارت کے ذریعے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہیں۔ یہ بخارات ہوا کے دوش پر سوار ہو کر فضا میں منڈلانے لگتے ہیں، پھر ایک خاص درجے کی برودت اور سردی پا کر بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ بادل ٹینکروں، نہروں اور پائپ لائنوں سے ہزار گنا بہتر، سریع تر اور مفید انداز میں ایک جگہ سے دوسری اطراف میں لاکھوں ٹن پانی لے کر جاتے ہیں۔ جس علاقے کی سیرابی مقصود ہو، اس پورے علاقے پر پانی کا وسیع چھڑکاؤ کیا جاتا ہے، جسے ہم بارش کہتے ہیں۔ سُبۡحَانَ الۡخَلَّاقِ الۡعَظِیۡمِ۔

۶۔ خشک اور بے جان زمین میں جان پڑ جانا: زمین ابتدا میں سلگتی آگ کا ایک آتشی کرہ تھی۔ اس میں زندگی کے آثار نہ تھے اور نہ ہی یہ زندگی کے لیے سازگار تھی۔ یہاں نہ تو نباتاتی حیات ممکن تھی اور نہ حیوانی حیات۔ زمین مردہ مادے پر مشتمل ایک مردہ کرے کی شکل میں تھی۔

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مردہ مادے سے حیات وجود میں نہیں آ سکتی، بلکہ حیات کا سرچشمہ حیات ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سوال الحادی نظریہ رکھنے والوں کے لیے تشنۂ جواب ہے کہ مردہ زمین سے حیات کس طرح وجود میں آئی؟ جب کہ اسلامی مؤقف کے مطابق مردہ زمین اور بے جان مادے میں حیات کا پیدا ہونا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اللہ ہی بے جان زمین کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔

۷۔ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ: ہواؤں کی گردش۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی کائنات کی مختلف چیزوں میں ارتباط اور ہم آہنگی ہے۔ مثلاً اگر پستان مادر میں موجود دودھ اور نومولود بچے کے معدے اور تنفس کے نظام میں باہمی ہم آہنگی نہ ہوتی تو زندگی کا یہ قافلہ رواں دواں نہ رہ سکتا تھا۔

ہم ہوا اور دیگر موجودات میں ربط و ہم آہنگی پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں کہ دیکھیں اس نظام میں ہوا کیا کردار ادا کرتی ہے:

۱۔ تنفس: حیوانات اور نباتات کی زندگی اس ہوا کے ذریعے سانس لینے کی مرہون منت ہے۔ انسان ایک سو دس لیٹر فی گھنٹہ ہوا خرچ کرتا ہے۔ یہ ہوا اگر پانچ منٹ تک میسر نہ آئے تو انسان اپنی زندگی کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

۲۔ آواز کی لہروں کو دور تک منتقل کرنے کا ذریعہ بھی ہوا ہے۔

۳۔ آگ بھی ہوا کے وجود کی مرہون منت ہے۔

۴۔ ہوا کے ذریعے جسم پر ایک خاص دباؤ برقرار رہتا ہے۔ اگر یہ دباؤ کم ہو جائے تو ہمارے جسم کی رگیں پھٹ جائیں اور ان سے خون جاری ہو جائے۔

۵۔ بادلوں کی نقل و حرکت ہوا کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

۶۔ آسمان سے روزانہ ہزاروں شہاب ثاقب زمین پر گرتے ہیں۔ اگر یہ ہوائی کرہ ڈھال کا کام دیتے ہوئے انہیں فضا ہی میں جلا کر راکھ نہ کرتا تو زمین پر تباہی پھیل جاتی اور زندگی ناممکن ہو جاتی۔

۷۔ روشنی کا پھیلاؤ بھی ہوا کے ذریعے ہوتا ہے۔

۸۔ بارداری: یہ عمل ہوا کے ذریعے انار، مالٹے، روئی اور خوبانی جیسے دانہ دار نباتات میں انجام پاتا ہے۔ شگوفوں کے اندر دانے پک جاتے ہیں تو ان کے اندر موجود کلیاں کھل جاتی ہیں اور یہ نہایت باریک دانے ہواؤں کے ذریعے اڑ کر مادہ پودوں کے پھولوں پر جا گرتے ہیں۔ اس طرح بارداری کا عمل انجام پاتا ہے:

وَاَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ ...۔[1]　　اور ہم نے باردار کنندہ ہوائیں چلائیں۔

۹۔ ہوا حیوانات اور نباتات میں تبادلۂ حیات کا ذریعہ بھی ہے۔

۱۰۔ سورج کی شعاعیں خلا سے گزرتی ہوئی فضا میں داخل ہوتی ہیں۔ فضا میں ایک خاص ہوائی غلاف ہے، جسے اوزون کہتے ہیں۔ یہ غلاف سورج سے آنے والی بہت سی قاتل شعاعوں کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ ان میں ماورائے بنفش شعاعیں بہت خطرناک ہیں۔ گرین ہاؤس کے عمل سے جہاں جہاں اوزون کے غلاف میں شگاف پڑے ہیں وہاں سے ماورائے بنفش شعاعوں کی زمین کی طرف آمد میں اضافہ ہوا ہے جو ایک خطرہ ہے۔

۱۱۔ خوشبو اور بدبو کو دماغ تک پہنچانے کا ذریعہ بھی ہوا ہے۔

۸۔ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ: فضا میں مسخر بادل۔ بادل کا فضا میں معلق ہونا، ہوا کے ذریعے اس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، بادل کا خشک اور بے جان زمینوں کو اپنے پانی سے سیراب کرنا، ایسے امور ہیں جن سے ایک باشعور حکیمانہ ارادے کا پتہ ملتا ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق کے اندر اس نظام کی بقا کے کتنے سامان موجود ہیں نیز یہ کہ ہوا، بادل، پانی، خاک اور دھوپ میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ اگر یہاں کوئی شعور اور ارادہ نہ ہوتا تو ان میں سے ہر کوئی دوسرے کے لیے اگر متضاد نہ سہی تو غیر ضروری اور غیر مفید ضرور ہوتا۔

یہ سب حکمتیں، یہ معجزات اور یہ محیر العقول کارنامے چشم بینا نہ رکھنے والوں اور غفلت برتنے والوں کے لیے روزانہ کے معمولات اور ہمیشہ سے مانوس چیزیں ہیں۔ یہ ان نادانوں کے لیے نہ تعجب کا مقام ہے، نہ حیرت کی بات۔ بھلا بادل سے بارش برسنا کوئی تعجب کی بات ہے؟ یہ تو روز کا معمول ہے۔ جس طرح ایک نہایت خوبصورت وادی میں آنکھیں کھولنے والا اس مقام کی خوبصورتی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ باہر سے آنے والا جانتا ہے کہ یہ وادی کس قدر حسین ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات پر عقل و تدبر کے ساتھ نگاہ ڈالنے

---

[1] ۱۵ حجر: ۲۲

والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کائنات کس قدر حسین اور پراسرار ہے اور اس میں خالق کائنات کے دست قدرت کی کس قدر نشانیاں ہیں: لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ. صَدَقَ اللّٰہُ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡم۔

احادیث

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

وَیْلٌ لِمَنْ سَمِعَ ہَذِہِ الْاٰیَاتِ فَمَجَّ فیھا۔

ان آیات کو سننے کے بعد ان میں تفکر نہ کرنے والوں پر افسوس ہو۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَکْمَلَ لِلنَّاسِ الْحُجَجَ بِالْعُقُوْلِ...۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے عقول کے ذریعے لوگوں پر اپنی حجت پوری کی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل سے فرمایا:

وَ حَسْبُکَ بِھَذَا النَّسِیْمِ اَلْمُسَمّٰی ھَوَاءً عِبْرَۃً و ما فیہ من المصالح، فَاِنَّہٗ حَیَاۃُ ھَذِہِ الْاَبْدَان وَ الْمُمْسِکُ لَھَا مِنْ دَاخِلٍ بِمَا یَسْتَنْشِقُ مِنْہُ مِنْ خَارِجٍ بِمَا یُبَاشِرُ مِنْ رَوْحِہٖ وَ فِیْہِ تطرد ھَذِہِ الْاَصْوَاتُ فَیُؤَدِّی الْبُعْدَ الْبَعِیْدَ و ھُوَ الْحَامِلُ ھذِہِ الْاَرْوَاحَ یُنْقِلُھَا مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ۔ اَلَا تَرَی کَیْفَ تَاتِیْکَ الرَّائِحَۃُ مِنْ حَیْثُ تَھَبُ الرِّیْحُ فَکَذٰلِکَ الصَّوْتُ وَ ھُوَ الْقَابِلُ لِھَذَا الْحَرِّ وَ الْبَرْدِ الَّذَیْنِ یَتَعَاقَبَان عَلَی الْعَالَمِ لِصَلَاحِہٖ۔ وَ مِنْہُ ھَذِہِ الرِّیْحُ الْھَابَّۃُ فَالرِّیْحُ تُرَوِّحُ الْاَجْسَامَ وَ تُزْجِی السَّحَابَ مِنْ مَّوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ لِیَعُمَّ نَفْعُہٗ حَتّٰی یَسْتَکْثِفَ فَیُمْطِرَ وَ

سمجھنے کے لیے یہی نسیم اور اس میں جو مصلحتیں ہیں کافی ہے جسے ہوا کہتے ہیں۔۱۔ کیونکہ یہ ہوا ان جسموں کی زندگی ہے۔۲۔ باہر سے ہوا کے ساتھ سانس لینے سے داخلی اعضا کا تحفظ ہوتا اور راحت ملتی ہے۔۳۔ اس ہوا کے فوائد میں آوازوں کا سننا ہے کہ یہ آواز کو دور دراز تک پہنچا دیتی ہے۔۴۔ تمہیں معلوم ہے کہ خوشبو تمہارے پاس ہوا کے ساتھ آتی ہے اسی طرح آواز بھی ہے۔۵۔ یہ ہوا اس جہاں کے فائدے کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والی حرارت اور ٹھنڈک کو قبول کرتی ہے۔۶۔ چلنے والی ہوائیں فرحت بخش ہوتی ہیں۔۷۔ بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں اور اس کا فائدہ عام ہو جاتا ہے کہ جب بادل سنگین ہوتا ہے تو بارش برساتا ہے۔ جب بارش برس جاتی ہے تو یہ بادل ہلکا ہو کر پراگندہ ہو جاتا ہے۔۸۔ یہ ہوا درختوں میں بارداری کا عمل انجام دیتی ہے۔۹۔ سمندر میں کشتیوں

۱؎ اصول الکافی ۱: ۱۳ کتاب العقل

تَفِضَّهٗ حَتّٰی یَسْتَخِفَّ فَیَتَقَشّٰی۔ وَ تُلَقِّحُ الشَّجَرَ وَ تَسَیِّرَ السُّفُنَ۔ وَ تَرَخّی الْاَطْعِمَۃَ۔ وَ تَبَرَّدَ الْمَآءَ۔ وَ تَشَبَّ النَّارَ۔ وَ تَجَفَّفُ الْاَشْیَآءَ النَّدِیَّۃِ وَ بِالْجُمْلَۃِ اَنَّھَا تُحْیِی کَلَّمَا فِی الْاَرْضِ۔[1]

کو چلاتی ہے۔ ۱۰۔ کھانے کی چیزوں کو نرم کر دیتی ہے۔ ۱۱۔ پانی کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ ۱۲۔ آگ جلانے میں مدد دیتی ہے۔ ۱۳۔ مرطوب چیزوں کو خشک کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین کی تمام موجودات کے لیے ہوا حیات بخش ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی منظم، ہم آہنگ، عظیم اور حکیمانہ خلقت ایک علیم وحکیم اور عظیم خالق کے وجود کی دلیل ہے۔

۲۔ انسانی ایجادات بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ کیونکہ انسان خود اللہ کی ایجاد ہے: وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ....۔

۳۔ مخلوقات کے ذریعے خالق کو پہچاننا عقل وتفکر پر موقوف ہے: لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔

۴۔ نظام کائنات کی وحدت، خالق کائنات کی توحید پر دلیل ہے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

۱۶۵۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے اور ایمان والے تو سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم لوگ عذاب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد جو کچھ سمجھنے والے ہیں اب سمجھ لیتے کہ ساری طاقتیں صرف اللہ ہی کی ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں نہایت شدید ہے۔

تشریح کلمات

اَنْدَادًا: (ن د د) نِدّ کی جمع۔ ہمسر۔ مدمقابل۔ نظیر۔

[1] توحید مفضل ص ۱۴۱

تفسیر آیات

اپنی وحدانیت پر واضح اور نہایت منطقی اور فطری دلائل کی نشاندہی کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے خود ساختہ شریکوں سے اس طرح پر خلوص محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایمان والے، ان سے بہتر اللہ کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

مشرکین اپنے خود ساختہ خداؤں اور دیوتاؤں سے محبت اس لیے کرتے تھے کہ وہ ان خود ساختہ خداؤں کو بھی وجود اشیاء میں مؤثر اور صاحب قوت و طاقت سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ ان خداؤں سے اپنی حاجات طلب کرتے اور انہی سے پناہ مانگتے تھے۔ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا سے واضح فرمایا کہ نفع ونقصان کا مالک خدا ہے اور ساری قوت و طاقت کا سرچشمہ وہی ذات ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی اور کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر اس سے محبت کرنا شرک ہے۔

اگر کسی ہستی کو محبوب خدا سمجھ کر اس سے محبت کی جائے تو یہ عین توحید ہے۔ چنانچہ قرآن نے اللہ کی محبت اور رسول (ص) کی محبت دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے:

قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ جِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ [۱]

کہد یجیے: تمہارے آبا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ اموال جو تم کماتے ہو اور تمہاری وہ تجارت جس کے بند ہونے کا تمہیں خوف ہے اور تمہاری پسند کے مکانات، اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو ٹھہرو! یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ ... [۲]

کہد یجیے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

کل بروز قیامت جب یہ لوگ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کریں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ساری طاقت کا سرچشمہ وہی ذات ہے۔ کیونکہ یہ صرف مشاہدات اور محسوسات کو سمجھتے ہیں۔ دنیا میں اگر یہ لوگ معقولات کو بھی سمجھ لیتے اور جانتے کہ طاقت کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے تو یہ لوگ عذاب الٰہی میں مبتلا نہ ہوتے۔

۱۔ ۹ توبہ: ۲۴　　۲۔ ۳ آل عمران: ۳۱

اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتۡ بِہِمُ الۡاَسۡبَابُ﴿۱۶۶﴾

۱۶۶۔(اس وقت کا خیال کرو) جب رہنما اپنے پیروکاروں سے اظہار برائت کریں گے اور عذاب کا مشاہدہ کریں گے اور تمام تعلقات ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔

تشریح کلمات

تَبَرَّاَ: (ب ر ء) برے کام سے نجات حاصل کرنا۔ برائت۔ بیزاری کا اظہار کرنا۔

تفسیر آیات

قیامت کے روز جب عذاب کا مشاہدہ ہوگا اور اس سے بچنے کے سارے وسائل منقطع اور امید کے سارے راستے بند ہو جائیں گے تو لوگ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھیں گے۔ تب یہ دیکھ کر ان پر دہشت طاری ہوگی کہ وہ بھی ان سے برائت کا اظہار کر رہے ہیں، حالانکہ انہوں نے دنیا میں ان کے کہنے پر عمل کیا اور انہیں ذریعہ نجات سمجھا تھا اور آج یہ ان سے اعلان بیزاری کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شخصیت معیار حق نہیں، بلکہ حق معیار شخصیت ہے۔

۲۔ بروز قیامت صرف رہبران برحق ہی مددگار ثابت ہوں گے۔

۳۔ ایسے رہبروں کی پیروی نہیں کرنی چاہیے جن کی اپنی نجات مشکوک ہو۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡہُمۡ کَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ کَذٰلِکَ یُرِیۡہِمُ اللّٰہُ اَعۡمَالَہُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ﴿۱۶۷﴾

۱۶۷۔ اور (دنیا میں) جو لوگ (ان کے) پیروکار تھے وہ کہیں گے: کاش ہمیں ایک بار دنیا میں واپس جانے کا موقع مل جاتا تو ہم بھی ان سے (اسی طرح) اظہار برائت کرتے جس طرح یہ (آج) ہم سے اظہار برائت کر رہے ہیں، اس طرح اللہ ان کے اعمال کو سراپا حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں پائیں گے۔

تشریح کلمات

کَرَّۃً: (ک ر ر) پلٹنا۔ دوسری بار واپسی۔ پلٹ کر بار بار حملہ کرنے والے کو کرار کہتے ہیں۔

حسرۃ: (ح س ر) ندامت و پشیمانی کا انتہائی درجہ۔

تفسیر آیات

قائدین کے خلاف پیروکاروں کے جذبۂ انتقام کا اظہار ہے کہ دنیا میں یہ لوگ رہبر و پیشوا بن کر عزت و تکریم کے ساتھ ہم پر مسلط رہے۔ کاش! ہمیں ایک بار دنیا میں واپس جانے کا موقع مل جاتا تو ہم ان سے اظہار برائت و بیزاری کرتے۔

قرآن مجید گمراہ کرنے والے رہبروں، پیشواؤں اور قائدین کے بارے میں اپنی امت کو آگاہ کر رہا ہے کہ لوگ رہبروں اور پیشواؤں میں امتیاز کرنا سیکھیں۔ عموماً لوگ شخصیت کے جاہ و حشم سے متاثر ہوتے ہیں اور اسے حق و باطل کا معیار قرار دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اس سلسلے میں ایک روایت کے مطابق فرماتے ہیں:

اَلۡحَقُّ لَا یُعۡرَفُ بِالرِّجَالِ ۔ اِعۡرِفِ الۡحَقَّ تَعۡرِفۡ اَھۡلَہ۔[1]

شخصیات سے حق نہیں پہچانا جاتا، حق کو پہچانو، اہل حق کو پہچان لو گے۔

دوسری جگہ مروی ہے کہ حارث بن حوط سے فرمایا:

اِنَّکَ لَمۡ تَعۡرِفِ الۡحَقَّ فَتَعۡرِفَ مَنۡ اَتَاہُ وَلَمۡ تَعۡرِفِ الۡبَاطِلَ فَتَعۡرِفَ مَنۡ اَتَاہُ.[2]

تو حق ہی کو نہیں جانتا کہ اہل حق کو پہچان سکے اور نہ ہی باطل کو جانتا ہے کہ اہل باطل پہچان لے۔

مزید مروی ہے کہ آپ (ع) فرمایا:

وَ اعۡلَمُوۡا اَنَّکُمۡ لَنۡ تَعۡرِفُوۡا الرُّشۡدَ حَتّٰی تَعۡرِفُوۡا الَّذِیۡ تَرَکَہٗ. وَ لَنۡ تَاۡخُذُوۡا بِمِیۡثَاقِ الۡکِتَابِ حَتّٰی تَعۡرِفُوا الَّذِیۡ نَقَضَہٗ وَ لَنۡ تَمَسَّکُوۡا بِہٖ حَتّٰی تَعۡرِفُوۡا الَّذِیۡ نَبَذَہٗ۔[3]

اور جان لو کہ تم ہدایت کو اس وقت تک نہیں پہچان سکو گے جب تک اس کے چھوڑنے والوں کو نہ پہچان لو اور قرآن کے عہد و پیمان کے پابند نہ رہ سکو گے جب تک اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو اور اس سے وابستہ نہیں رہ سکو گے جب تک اسے دور پھینکنے والے کی شناخت نہ کر لو۔

اہم نکات

۱۔ اگر برحق رہنما دنیا میں مل جائے تو آخرت میں حسرت نہ رہے گی۔

۲۔ ناقص رائے کی بنیاد پر قیادت جیسے اہم اور حساس مسئلے کا حل ڈھونڈنا باعث حسرت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ذمے لیا ہے۔

---

[1] روضۃ الواعظین ۱: ۳۱ [2] نہج البلاغۃ کلمات قصار۔ حکمت: ۲۶۲۔ ص ۸۹۳ [3] اصول الکافی ۸: ۳۸۹

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۴۲، امالی مفید ص ۲۰۵

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

۱۶۸۔لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

۱۶۹۔ وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا ہی حکم دیتا ہے اور اس بات کا کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔

تشریح کلمات

حلال: (ح ل ل) حلّ۔ گرہ کشائی کے معنوں میں ہے: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ۔ [۱] "اور میری زبان کی گرہ کھول دے"۔ کسی جگہ فروکش ہونے کو بھی کہتے ہیں۔ مقام کو مَحَل کہا جاتا ہے۔ لہٰذا حلال سے مراد ہے آزادی و حریت۔ اس کے مقابلے میں حرام آتا ہے، جو گرہ، پابندی اور قید کے معنوں میں ہے۔

طیّب: (ط ی ب) پاکیزہ و حلال چیز، جس سے انسان کو مادی و روحانی لذت حاصل ہو۔ اگر کوئی چیز صرف مادی طور پر لذت دے، لیکن اخلاقی اور انسانی اقدار کے خلاف ہو تو وہ طیّب نہیں ہے۔ طیّب انسان وہ ہے جو جہالت اور فسق و فجور کی نجاست سے پاک ہو، اس کی ضد خبیث ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کا خطاب پوری انسانیت سے ہے۔ زیر بحث مسئلہ سب انسانوں سے مربوط ہے کہ زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ یہ سب کچھ انسان کے لیے خلق ہوا ہے:

---

[۱] ۲۰ طہ : ۲۷

اَلَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ... [1] 　جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا۔

یہ فرمان دین اسلام کے آفاقی مزاج، کائناتی تقاضوں اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے کہ انسان مَافِی الۡاَرض سے صرف کھانے میں ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے تصرف میں آزاد ہے۔ اس میں کسی قسم کی ناروا اور غیر ضروری پابندی نہیں ہے۔ اگر کوئی پابندی ہے تو دراصل یہ بھی پاکیزگی کے لیے ہے۔ البتہ حلال و حرام کے سلسلے میں ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ حلال و حرام، رازق کی طرف سے ہو، شیطان کی طرف سے نہ ہو۔ جس نے رزق دیا ہے وہی پابندی لگا سکتا ہے، کیونکہ وہ جائز پابندی لگائے گا۔ پابندی اگر شیطان کی طرف سے ہوگی تو وہ برائی اور فسق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس حکم میں درج ذیل لوگ شامل ہیں:

۱۔ مشرکین: جنہوں نے اللہ کی حلال کردہ بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ جن کا ذکر خود قرآن مجید نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔

۲۔ رہبانیت: ترک دنیا کرنے والے۔ جنہوں نے خود اپنے اوپر بہت سی حلال اور طیب چیزوں کو حرام قرار دیا ہو۔ یہ باتیں اذنِ خدا کے بغیر خود اپنی طرف سے تشریع و تقنین میں دخل اندازی شمار ہوتی ہیں، جو شیطانی عمل ہے۔ کچھ سادہ مسلمان بھی اس توہم کا شکار ہیں کہ مؤمن کے لیے زمین کی تمام چیزیں جائز نہیں۔ اس کی تفصیل کسی مناسب مقام پر ذکر ہوگی۔

احادیث

کافی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

اِیَّاکَ وَ خَصْلَتَیْنِ فَفِیْھِمَا ھَلَکَ مَنْ ھَلَکَ: اِیَّاکَ اَنْ تُفْتِیَ النَّاسَ اَوْ تَدِینَ بِرَأْیِکَ وَ تُدِیْنَ بِمَا لَا تَعْلَمْ۔ [2]

دو باتوں سے اجتناب کرو، کیونکہ ان دو باتوں کی وجہ سے لوگ ہلاکت میں پڑتے رہے ہیں۔ اپنی ذاتی رائے سے فتویٰ نہ دو اور جن چیزوں کا تمہیں علم نہیں ہے، انہیں اپنے دین کا حصہ مت بناؤ۔

اس آیت اور دیگر متعدد آیات سے ایک ضابطہ سامنے آتا ہے کہ اسلام کے نزدیک بنیادی طور پر زمین کی تمام نعمتیں حلال ہیں۔ کسی چیز کی حرمت کے لیے دلیل ضروری ہے۔ لیکن کسی چیز کے حلال ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہ ہو، مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسا کہ انسان بنیادی طور پر بے گناہ ہوتا ہے، جب تک کہ جرم ثابت نہیں ہو جاتا۔

اہم نکات

۱۔ 　خدا کی پاک اور حلال نعمتوں سے لطف اندوز ہونا دنیا پرستی نہیں ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۹　[2] اصول الکافی ۱: ۴۲

۲۔ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دینا رہبانیت اور شیطانی عمل ہے: وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ....۔

۳۔ رزق دینے والا ہی حلال و حرام کا تعین کر سکتا ہے۔

۴۔ علم اور دلیل کے بغیر اللہ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا شیطانی عمل ہے۔

تحقیق مزید

مستدرک ۱۶: ۳۳۳۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

۱۷۰۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے، خواہ ان کے آباء و اجداد نے نہ کچھ عقل سے کام لیا ہو اور نہ ہدایت حاصل کی ہو۔

تفسیر آیات

اس آیت میں اندھی تقلید کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔ اندھی تقلید وہ ہے جو عقل کی میزان پر پوری نہ اترے اور نہ ہی اس کی حقانیت پر کوئی سند ہو۔ اسلام کی حقانیت کی ایک بین دلیل یہ ہے کہ اسلام عقل و تدبر کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ ایک چیز اگر مبنی برحق نہ ہو تو اس کا داعی عقل و تدبر کے خلاف ہوتا ہے تاکہ اس کا پول کھل نہ جائے۔ اس کے برعکس حق و حقیقت کی دعوت دینے والا چاہتا ہے کہ لوگ عقل سے کام لیں تاکہ اس کی دعوت کی حقانیت ان پر واضح ہو جائے۔ بنا برایں قرآن کسی بات کو تسلیم کرنے کے دو اصول بتاتا ہے۔

۱۔ انسان اپنی عقل و فہم کے ذریعے خود حقیقت کو سمجھ لے تو یہ عقلی معیار کے مطابق ہونے کی وجہ سے تقلید نہیں ہے۔

۲۔ایسی دلیل پر اعتماد کرے جو علم پر منتہی ہو نیز وہ اس کی ہدایت و رہنمائی بھی کرتی ہو۔

کچھ محسوس پرست حضرات کا کہنا ہے کہ مذہب بھی علم کے خلاف ایک اندھی تقلید کا نام ہے۔ یہ انسانی تاریخ کے چار ادوار (داستانی دور، مذہبی دور، فلسفی دور اور سائنسی دور) میں سے دوسرے دور کی پیداوار

ہے۔علامہ طباطبائی قدس سرہ جواب میں فرماتے ہیں :

مذہب اندھی تقلید کا نام نہیں ہے کیونکہ مذہب توحید و معاد سے متعلق معارف کا ایک علمی مجموعہ ہے۔ اس میں معاشرت، عبادات اور معاملات سے متعلق ایسے قوانین موجود ہیں جو وحی اور نبوت کے ذریعے ثابت ہیں۔ جب کہ وحی و نبوت دلیل و برہان کے ذریعے ثابت ہیں، جس پر ہمیں علم و یقین حاصل ہے۔ لہٰذا مذہب علمی ہے، تقلیدی نہیں۔ مقام تعجب ہے کہ ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس نہ تو کوئی دستور حیات ہے اور نہ ہی معاشرتی آداب۔ مثلاً وہ خورد و نوش اور لباس و نکاح کے سلسلے میں صرف اندھی تقلید پر عمل کرتے ہیں۔

انسانی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں یہ درست نہیں ہے کہ دین، فلسفے سے پہلے کی پیداوار ہے، بلکہ دین ابراہیمی (ع) سے پہلے ہندوستان، مصر اور کلدان میں فلسفہ موجود تھا۔ اسی طرح مسیحیت سے پہلے یونان میں فلسفہ ظہور پذیر ہوا تھا اور دین اسلام سے پہلے یونان کا فلسفہ اپنے عروج پر تھا یعنی عروجِ مذہب سے پہلے فلسفہ اپنے عروج پر تھا۔

فروع دین میں تقلید: جس اندھی تقلید کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے وہ اصول دین کے بارے میں اور مَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کے مقابلے میں وہ آبائی تقلید ہے، جو عقل و ہدایت سے عاری ہو۔ لیکن دلیل و برہان کے ذریعے اصول دین کو سمجھنے ،اس پر مَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کے مطابق ایمان لانے کے بعد، شرعی احکام کی تفصیل معلوم کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے ماہرین (مجتہدین) کی طرف رجوع کرنے کو اندھی تقلید نہیں کہتے، بلکہ یہ تو علم و ہدایت پر عمل کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کی اللہ، رسول اور آئمہ علیہم السلام کی طرف سے نہ صرف اجازت ہے بلکہ اسے تاکید کے ساتھ واجب قرار دیا گیا ہے۔

مومن راہ وحی و ہدایت سے متصادم دوسری باتوں کو اس بنا پر ہرگز قبول نہیں کرے گا کہ یہ ہماری دیرینہ مسلمات اور آبائی روایات ہیں۔ مثلاً علم حاصل کرنا از روئے عقل نیک عمل ہے اور زکوۃ دینا حکم خدا کے مطابق نیک عمل ہے۔ ان دونوں کے علاوہ اندھی تقلید ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام اندھی تقلید سے منع کرتا ہے۔

۲۔ بہت سی عادات و رسوم عقلی و شرعی دلیل سے محرومی کے باعث گمراہی کا باعث ہوسکتی ہیں، لہٰذا وہ حجت نہیں ہیں۔

۳۔ نسلی تعصب، انسان کو شناخت کی صلاحیت سے محروم کرتا ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کَمَثَلِ الَّذِیۡ یَنۡعِقُ بِمَا لَا یَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

۱۷۱۔ اور ان کفار کی حالت بالکل اس شخص کی سی ہے جو ایسے (جانور) کو پکارے جو بلانے اور پکارنے کے سوا کچھ نہ سن سکے، یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، پس (اسی وجہ سے) یہ لوگ عقل سے بھی عاری ہیں۔

تشریح کلمات

نعِقُ: (ن ع ق) چلانے اور پکارنے کے معنوں میں ہے: نعق الراعی بغنمہ۔ چرواہے نے اپنے ریوڑ کو پکارا۔

تفسیر آیات

اندھی تقلید کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے کفار کو دعوت دینے کی مثال ان جانوروں کو پکارنے کی طرح ہے جو صرف آواز کا ارتعاش سنتے ہیں لیکن دعوت کے مضمون اور فکر کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ فکر و عقل کے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لِلّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾

۱۷۲۔ اے ایمان والو! اگر تم صرف اللہ کی بندگی کرنے والے ہو تو ہماری عطا کردہ پاک روزی کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو۔

تفسیر آیات

مشرکانہ رسوم و عادات اور آبا و اجداد کی اندھی تقلید کی مذمت کے بعد اب روئے سخن مومنوں کی طرف ہے کہ اگر تم اہل ایمان ہو تو عہد جاہلیت کی بیہودہ رسومات ختم کر دو اور جو چیزیں تمہارے راہبوں، پادریوں اور آبا و اجداد نے بے جا حرام کر رکھی ہیں، انہیں بلاتکلف استعمال کرو۔ البتہ ان چیزوں سے اجتناب ضروری ہے جو طیب اور پاکیزہ نہیں ہیں۔ ان کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔

تحقیق مزید

شرح نہج البلاغۃ ۱۱: ۳۶۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَ الدَّمَ وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۷۳﴾

۱۷۳۔ یقیناً اسی نے تم پر مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام قرار دیا، پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ بغاوت کرنے اور ضرورت سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

اُہِلَّ: (ہ ل ل) ہلال۔ آشکار کرنا۔ چاند نظر آنے پر آواز بلند کرنا۔ پھر یہ لفظ ہر آواز بلند کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا: وَمَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ: جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

بَاغٍ: (ب غ ی) بغاوت اور سرکشی کرنے والا۔

عَادٍ: (ع د و) تعدی اور تجاوز کرنے والا۔

تفسیر آیات

مقصود کلام یہ نہیں کہ اسلامی شریعت میں فقط مذکورہ چیزیں ہی حرام ہیں، بلکہ مشرکین نے جو چیزیں اپنے لیے حلال قرار دے رکھی تھیں، ان میں سے حرام اشیاء کو الگ کر کے بیان کیا جا رہا ہے۔

مَیۡتَہ یعنی مردار وہ جانور ہے جو ذبح شرعی کے بغیر مر جائے۔ اس قسم کے مردار سے ہرطرح کا استفادہ حرام ہے۔ فقہ جعفری میں مردار کا چمڑا دباغت کے ذریعے بھی پاک اور جائز الاستفادہ نہیں ہوتا، جب کہ دیگر فقہی مذاہب میں مردار کا چمڑا دباغت سے پاک اور جائز الاستفادہ ہو جاتا ہے۔

مردار اور خون حرام ہونے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں، لیکن جہاں تک انسانی تجربات کی رسائی ہوئی ہے، ان کے مطابق خون کے اندر بہت سی حل شدہ غذائی اشیاء پائی جاتی ہیں اور خون کے پلازما میں متعدد بیماریوں کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم اس خون کو ذبح کے شرعی طریقے کے مطابق کاٹی گئی رگوں سے خارج نہ کریں تو یہ جراثیم ذبیحہ کا گوشت کھانے والے کے جسم کو متاثر کر سکتے ہیں۔

خون کے تمام جرثومے ہڈیوں کے گودے میں بنتے ہیں۔ سفید خلیے حیوانی جسم پر کسی بھی جراثیمی حملے کی صورت میں دفاعی فوج کا کردار ادا کرتے ہیں اور حملہ آور جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ عام حالات میں خون کے سرخ خلیے ایک سو بیس (۱۲۰) دن تک زندہ رہتے ہیں، جب کہ سفید خلیے صرف دس دن تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ بنا بریں کسی حیوان کے مرنے پر اس کا دفاعی نظام جلد ہی ختم ہو جاتا ہے، جب کہ پلازما اور سرخ خلیے رگوں میں موجود رہتے ہیں۔ یہ پلازما سرخ خلیے کی موجودگی میں مہلک جراثیم کی افزائش نسل کا بہترین ذریعہ بنتا ہے۔ بیماری کے یہ جراثیم یا تو خون میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں جو سفید خلیوں سے بچنے کے لیے اپنے اوپر دفاعی خول چڑھا لیتے ہیں یا پھر ہوا اور پانی کے ذریعے اس مردہ جسم میں شامل ہو جاتے ہیں جو آخر کار حیوانی گوشت کو قابل استفادہ نہیں رہنے دیتے۔ شرعی ذبیحے میں چونکہ رگوں سے خون پوری طرح خارج ہو جاتا ہے، لہٰذا پلازما اور سرخ خلیے گوشت میں موجود نہیں رہتے۔ اس طرح گوشت بیماری کے جراثیم سے پاک ہو جاتا ہے۔

یہاں مشرکین کا ایک قیاس قابل توجہ ہے۔ کہتے تھے: مسلمان اس جانور کو حلال کہتے ہیں جسے انہوں نے خود مارا ہے اور جسے اللہ نے مارا ہے (مردار) اسے حرام سمجھتے ہیں۔

خنزیر کا گوشت: سور کے گوشت کی حرمت میں بہت سی مصلحتیں ہوسکتی ہیں۔ انسان ان تمام مصلحتوں کا ادراک نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان تمام رازوں تک رسائی حاصل کرسکتا ہے جن پر شرعی احکام کا دارومدار ہے۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق سور کا گوشت انسانی نفسیات اور صحت پر نہایت برے اثرات چھوڑتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ سور کے گوشت میں دو قسم کے جراثیم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کے جراثیم کو TRICHIN کہتے ہیں جو ایک جھلی کے ذریعے سور کا گوشت کھانے والے کے معدے میں اتر جاتا ہے اور نظام انہضام کی وجہ سے جب جھلی ختم ہو جاتی ہے تو یہ جراثیم انسانی جسم میں بری طرح پھیل جاتے ہیں۔

نیز سور کے گوشت میں نفسیاتی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ سور کا گوشت کھانے والا انسان غیرت و حیا سے عاری ہو جاتا ہے، جیسا کہ مغرب والوں کا حشر ہے۔ کیونکہ ہر جاندار کے اجزائے بدن اس کے خلق و خو کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ: اس سے مراد مشرکین کا عمل ہے کہ وہ اپنے بتوں کے نام لے کر جانور ذبح کرتے اور ان سے تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسلامی شریعت میں ایسا جانور مردار ہوتا ہے۔ اسی لیے جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

استثنائی حالت: درج بالا اشیاء عام حالات میں حرام ہیں، لیکن بوجہ مجبوری ان چیزوں کو کھانا اور صرف ضرورت پر اکتفا کیا جائے تو اس صورت میں یہ گناہ شمار نہ ہوگا۔ اس قسم کے احکام کو ثانوی اور متحرک

احکام کہتے ہیں جو حالت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی نقطہ نظر سے مردار سے ہر قسم کا استفادہ حرام ہے۔

۲۔ کسی ذی روح کی حیات کو ختم کر کے اسے کھانا حیات دینے والی ہستی کی اجازت سے ہی جائز ہوگا۔

۳۔ انسان کی بے راہ روی اور اخلاقی برائیوں میں حرام اور نجس غذاؤں کا بڑا عمل دخل ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۳ : ۴۳۸، الفقیہ ۳ : ۳۴۳، تفسیر العیاشی ۱ : ۷۴۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۴﴾

۱۷۴۔ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض میں حقیر قیمت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ بس اپنے پیٹ آتش سے بھر رہے ہیں اور اللہ قیامت کے دن ایسے لوگوں سے بات نہیں کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

جو لوگ حقیر دنیاوی مفادات کی خاطر احکام خداوندی کو درست بیان نہیں کرتے، دراصل وہ اپنے شکم کو آگ سے بھر رہے ہیں۔ یہ آیت تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی انسان اس دنیا میں جو بھی عمل انجام دیتا ہے، وہ آخرت میں مجسم ہو کر سامنے آئے گا۔ جو لوگ احکام خدا کو چھپا کر دنیا میں مال و دولت کماتے ہیں، قیامت کے دن یہی مال آگ کی شکل اختیار کرے گا۔

قیامت کے دن اللہ ایسے لوگوں سے نہ بات کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔ دنیا میں اللہ سے ہمکلام ہونے کا شرف صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے، لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں سے ہمکلام ہوگا۔ قیامت کے دن سب کو اللہ ہی کے سامنے جوابدہی کے لیے حاضر ہونا ہے اور حساب و کتاب

دینا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ [1]　　پس آپ کے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔

اگر بندہ گنہگار ہو تو بھی اللہ اسے معاف کر دیتا ہے اور اسے گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل کرتا ہے۔ احکام خدا کو چھپانے والوں سے نہ تو اللہ کلام کرے گا اور نہ ہی انہیں معاف کرے گا، بلکہ یہ لوگ بلاحساب و کتاب سیدھے جہنم کی طرف روانہ کیے جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ یہ آیت اگرچہ یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن حکم میں ہر وہ شخص شامل ہے جو اپنے مفادات اور مصلحتوں کی بنا پر احکام خدا کو بیان نہیں کرتا۔

۲۔ ذاتی مفادات کی خاطر دین فروشی اور احکام خدا کو صحیح بیان نہ کرنا یہودیوں کا شیوہ ہے۔

۳۔ دین فروشی اور حقائق کو چھپانے والا کمال اور ارتقا کے حصول سے محروم رہ جاتا ہے۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشۡتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالۡهُدَىٰ وَالۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

۱۷۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے عوض ضلالت اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا ہے، (تعجب کی بات ہے کہ) آتش جہنم کے عذاب کے لیے ان میں کتنی برداشت ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ ان کی نادانی اور بے عقلی بیان فرماتا ہے کہ یہ لوگ احکام خدا کو بھی جانتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کے چھپانے کا انجام ضلالت اور جہنم ہے۔ اس علم کے باوجود یہ لوگ آتش جہنم میں جانے کے لیے آمادہ ہیں جو مقام تعجب ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس سے بڑھ کر نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ ہدایت و مغفرت کو چھوڑ کر ضلالت و گمراہی اختیار کریں۔

۲۔ جو شخص اطاعت پر صبر نہیں کر سکتا، وہ جہنم کے دردناک عذاب پر کیسے صبر کر سکے گا؟

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۲

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِى الۡكِتٰبِ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۱۷۶﴾

۱۷۶۔ یہ (سزا) اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے کتاب تو حق کے مطابق نازل کی تھی اور جن لوگوں نے کتاب کے بارے میں اختلاف کیا یقیناً وہ دور دراز کے جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔

تشریح کلمات

شقاق: (ش ق ق) افتراق۔ دور ہونا۔ شگاف۔ مخالفت۔

تفسیر آیت

احکام خدا چھپانے والوں کو یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے اور ان کا یہ گناہ نا قابل معافی کیوں ہے؟ آیہ شریفہ میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اللہ نے حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی، ان لوگوں نے حق کو چھپایا ہے۔ حق پوشیدہ رکھنے کی صورت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ضلالت و گمراہی اور استحقاق عذاب ہے۔ چنانچہ دنیا میں رونما ہونے والے تمام اختلافات اور نفرتوں کے ذمے دار یہی لوگ ہیں۔ اس لیے ان کا یہ جرم قابل معافی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اس جرم کے آثار آنے والی تمام نسلوں میں جاری رہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہر گناہ کا ایک طبعی اثر ہوتا ہے اور اختلاف و پراگندگی کتمان حق کے طبعی اثرات میں سے ایک ہے۔

۲۔ حق کے چھپانے کی وجہ سے فرقے وجود میں آئے۔

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ

۱۷۷۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی اللہ، روز قیامت، فرشتوں، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اپنا پسندیدہ مال

وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾

قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے نیز جب معاہدہ کریں تو اسے پورا کرنے والے ہوں اور تنگدستی اور مصیبت کے وقت اور میدان جنگ میں صبر کرنے والے ہوں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

تشریح کلمات

الۡبِرَّ: (ب ر ر) نیکی خواہ اعتقادی ہو یا عملی۔ بر وسعت کے معنوں میں ہے اور وسیع پیمانے پر نیکی کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

الۡقُرۡبٰی: (ق ر ب) زیادہ نزدیکی رشتے دار۔ ذَوِی الۡقُرۡبٰی زیادہ قرابت رکھنے والے۔

الرِّقَابِ: (ر ق ب) رقبۃ کی جمع۔ گردنیں۔ غلام مراد ہیں، جن کی گردنیں آزاد نہیں ہوتیں۔

الۡبَاۡسَآءِ: (ب ء س) سختی، تنگدستی اور ناگواری۔

الضَّرَّآءِ: (ض ر ر) بیماری۔ دوستوں کی موت سے آنے والی مصیبت۔

الۡبَاۡسِ: (ب ء س) جنگ۔

تفسیر آیات

نصاریٰ کی طرح مشرق کی طرف رخ کرنا یا یہودیوں کی طرح مغرب کی طرف رخ کرنا، کسی بھی دین میں نیکی کے بنیادی عناصر میں شامل نہیں ہے۔ ایک خاص سمت کی طرف رخ کرنا کسی مذہب کا محسوس شعار ضرور ہو سکتا ہے، لیکن اس دین کی روح صرف اسی میں منحصر نہیں ہو سکتی۔ یعنی دین محض چند ظاہری رسوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن پر ایمان لانے کا مطلب فقط قرآنی نسخے

کا احترام ہی نہیں، بلکہ ایمان بالقرآن کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ دیگر ادیان کو اس بات پر نازاں نہیں ہونا چاہیے کہ ہم درست قبلہ رکھتے ہیں، کیونکہ یہ کوئی فضیلت اور نیکی نہیں، بلکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے نیکی کے اعتقادی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں کو پورا کرنا ضروری ہے:

۱۔ اعتقادی پہلو میں بنیادی چیز اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، کتاب اللہ اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ہے۔

۲۔ عملی پہلو یہ ہے کہ مؤمن اپنے معاشرے کا ایک فیاض اور فعال فرد ہو، جس کا فیض قرابت داروں، آزادی کی خواہش رکھنے والے غلاموں، بلکہ ہر مستحق اور نادار شخص تک پہنچے۔ خدا سے مربوط رہنے کی خاطر نماز گزار ہو اور معاشرے میں اقتصادی توازن برقرار رکھنے میں اتنا کردار ہو کہ خوشحالی کی وجہ سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے قابل ہو۔

۳۔ اخلاقی پہلو میں وفائے عہد کی پابندی، تنگی و مصیبت میں صبر و استقامت اور دلیر انسان ثابت ہونا ہے۔

آیہ کریمہ میں نیکی کے درج ذیل بنیادی عناصر بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ خدا پر ایمان ہر نیکی کے لیے اساس اور بنیاد ہے۔ خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد انسان بہت سے خود ساختہ خداؤں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

۲۔ روز آخرت پر ایمان سے اس چند روزہ دنیاوی زندگی کو قدر و قیمت ملتی ہے اور انسان کا کائناتی تصور بلکہ تصور حیات بھی بامعنی بن جاتا ہے۔ روز قیامت پر ایمان کے بعد انسان کا ہر عمل بامقصد، باثمر اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

۳۔ فرشتوں پر ایمان لانا بھی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس تکوینی اور تشریعی نظام میں فرشتوں کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ فرشتے بھی اللہ کے رسول اور پیغام بر ہوتے ہیں.

۴۔ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے۔ جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ خواہ وہ صحف ابراہیم (ع) ہوں یا توریت و انجیل یا قرآن مجید، یہ سب انسان کی ارتقا اور اس کی تعلیم و تربیت کا نصاب ہیں۔ کتاب پر ایمان لائے بغیر انبیاء (ع) پر ایمان لانا بے سود ہے۔

۵۔ انبیاء پر ایمان لانا نیکی کے لیے اساس ہے، کیونکہ نبی انسانیت کا معلم اور اللہ کی طرف سے دستور حیات لانے والا ہے۔

مندرجہ بالا عناصر انسان کی جہاں بینی اور اصول عقائد سے متعلق ہیں، جن کے تحت اس کی نظریاتی بنیاد قانون، قانون بنانے والے اور قانون لانے والے پر ایمان کی شکل میں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان عناصر کا بیان ہے جو انسان کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں معاندین کے زعم باطل کے علی الرغم کہ دین عوام کے لیے افیون ہے، معاشرے میں نیکی کے پیداواری اور اقتصادی مقام کو

عبادتی پہلو سے پہلے بیان فرمایا گیا ہے، چونکہ مال کی پیداوار کے بغیر مال کا خرچ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

۶۔ انفاق: نیکی کا اہم عملی پہلو یہ ہے کہ اپنا پسندیدہ مال عَلٰی حُبِّہٖ خرچ کرے۔ عَلٰی حُبِّہٖ کی ضمیر اللہ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ یعنی اللہ کی محبت میں مال خرچ کرے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف لوٹائی جائے۔ چنانچہ دوسری آیات سے اس بات کی تائید ملتی ہے۔ ارشاد ہے:

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ [۱]　　جب تک تم اپنی پسند کی چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔

نیز فرمایا:

وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ [۲]　　اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج ہوں۔

لہٰذا انسان جب اپنے پسندیدہ مال کو اس ذات کے لیے خرچ کرتا ہے جو سب سے زیادہ محبوب ہے تو اسے فضیلت ملتی ہے۔ نیز حب مال کے باوجود مال خرچ کرنے کا ہدف ''حب خدا'' ہے۔ لہٰذا حب اللہ تو ہر صورت میں موجود رہنی چاہیے ورنہ دوسری اغراض کے لیے مال خرچ کرنے میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔

آیت کی رو سے معاشرے کے مندرجہ ذیل طبقے مؤمنین کے پسندیدہ مال کے مستحق ہیں:

الف۔ ذوی القربیٰ: یعنی انفاق کرنے والے کے قریب ترین رشتہ دار۔ یہ بات فطرتاً بھی نہایت اہم اور مناسب ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے محتاج قرابت داروں پر توجہ دے، کیونکہ وہ اپنے رشتہ داروں کی ضروریات اور احتیاجات کا بہتر علم رکھتا ہے نیز اس سے صلہ رحمی بھی ہو جاتی ہے اور اہل خاندان کے درمیان الفت و محبت بڑھ جاتی ہے اور محتاجی کا راز اپنی برادری سے باہر نہیں جاتا۔

ب۔ یتیم: یتیم عموماً بے سرپرست اور بے کس ہوا کرتے ہیں۔ ان کی فریادرسی ایک انسانی مسئلہ ہے

ج۔ مساکین: خصوصاً وہ تنگ دست افراد جو فقر و تنگی کے باوجود سوال نہ کریں اور اپنی حیا و عفت کو محفوظ رکھیں۔

د۔ ابن سبیل: وہ مسافر جو اپنے خاندان سے کٹ کر رہ گیا ہو اور اس کے پاس زاد راہ نہ رہے۔ اگرچہ اپنے وطن میں یہ شخص نہ مسکین ہو، نہ یتیم بلکہ مسافر ہونے کی وجہ سے محتاج ہو گیا ہو۔

ھ۔ سائل: جو انتہائی مجبوری کے عالم میں دست سوال دراز کر رہا ہو۔

---

[۱] ۳ آل عمران: ۹۲　[۲] ۵۹ حشر: ۹

و۔ غلاموں کی آزادی: یعنی مال خرچ کر کے انہیں آزاد کرانا۔ ہم آئندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے کہ اسلام میں غلامی کے جواز کی کیا صورت ہے۔

۷۔ نماز قائم کرنا۔

۸۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔

۹۔ معاہدوں کی پاسداری: یہ بات معاشرے کی روح اور بقائے باہمی کی بنیاد ہے۔ معاہدہ خواہ انسان کا اللہ کے ساتھ ہو یا دوسرے انسانوں کے ساتھ یا قوموں اور حکومتوں کے ساتھ، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر نظام بشریت قائم ہے۔ اگر معاہدوں پر سے اعتماد اٹھ جائے تو بقائے باہمی کا مسئلہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل کچھ طاقتیں معاہدوں کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے یہ خطرہ پیدا کر دیتی ہیں۔

۱۰۔ تنگی، مصیبت اور میدان جنگ یعنی معرکہ حق و باطل میں ثابت قدم رہنا: یہ نیکی وہ شخص انجام دے سکتا ہے جو داخلی خطرات، تنگی اور مصیبت کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو نیز ساتھ ہی خارجی خطرات اور حق و باطل کی جنگ میں بھی مرد میدان ہو۔

یہ ہیں صاحبان بِرّ یعنی ابرار کے اوصاف۔ اللہ تعالیٰ نے ابرار کے مزید اوصاف قرآن میں یوں بیان فرمائے ہیں: ... وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا ...[1] آخر میں فرمایا: یہی لوگ سچے ہیں یعنی مذکورہ بالا کردار و سیرت کے مالک ہی اپنے دعوائے ایمان میں صادق القول ہیں جن کا ساتھ دینے کا حکم ہے: ... کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ۔[2] اور یہی صاحبان تقویٰ ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

مَنْ عَمِلَ بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ فَقَدْ اِسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔[3]　　جس نے اس آیت پر عمل کیا اس نے ایمان مکمل کر لیا۔

اہم نکات

۱۔ نیکی رسم و رواج کی پابندی کا نام نہیں، بلکہ حقائق پر غیر متزلزل ایمان، عبادت اور بندگان خدا کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی رویے کا نام ہے۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۶۶ : ۳۴۶۔ من عمل ھذہ الایۃ فقد استکمل الایمان تفسیر القمی ۱ : ۶۳ تفسیر العیاشی ۲ : ۹۳۔

---

[1] ۷۶ دہر: ۵ تا ۲۲　　[2] ۹ توبہ: ۱۱۹　　[3] بحار الانوار ۶۶ : ۳۴۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾

۱۷۸۔ اے ایمان والو! تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، ہاں اگر مقتول کے بھائی کی طرف سے قاتل کو (قصاص کی) کچھ چھوٹ مل جائے تو اچھے پیرائے میں (دیت کا) مطالبہ کیا جائے اور (قاتل کو چاہیے کہ) وہ حسن و خوبی کے ساتھ اسے ادا کرے، یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے، پس جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا، اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

قصاص: (ق ص ص) کسی کا تعاقب کرنا۔ کہانی کو قصہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں صاحب کردار کے حالات کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ قتل کے بعد قاتل کا تعاقب کیا جاتا ہے، اسی لیے خون کا بدلہ لینے کو قصاص کہتے ہیں۔

شان نزول

شیخ طوسی علیہ الرحمہ تفسیر التبیان میں قتادہ سے نقل فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب زمانۂ جاہلیت میں ایک قوم کو کسی اور جاہل قوم سے کوئی حق لینا تھا لیکن حق کے یہ دعویدار اس سلسلے میں زیادتی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ وہ غلام کے بدلے میں آزاد اور عورت کے بدلے مرد سے قصاص لینے پر تل گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں۔

تفسیر آیات

قصاص کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاتل نے جو طریقۂ قتل اختیار کیا ہے، وہی اختیار کیا جائے یعنی قصاص میں صرف جرم کا بدلہ لیا جاتا ہے طریقۂ جرم کا نہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں خون کے بدلے میں انسانی اقدار کی بجائے غیر انسانی اقدار کو معیار قرار دیتے

تھے۔ اگر کسی قبیلے کا کوئی معزز آدمی مارا جاتا تو قبیلے والے اپنے ایک آدمی کا بدلہ سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے اور اصل قاتل کے قتل پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔

جدید مہذب جاہلیت تو اس سلسلے میں غیر مہذب قدیم جاہلیت سے بھی آگے نکل گئی کہ یہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ مدمقابل کی پوری قوم سے لیتی ہے۔

قصاص کی سزا یہودیوں کے ہاں ایک حتمی اور ناقابل تلافی سزا ہے۔ ملاحظہ ہو خروج ۲۱، ۲۲ اور ۳۵ نیز احبار ۲۴۔۲۰ میں آیا ہے:

> توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اس سے ویسا ہی کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں قصاص کی سزا نہیں ہے سوائے خاص حالات کے۔ اسلام قصاص کا قانون برقرار رکھتا ہے، لیکن اس میں ایک عادلانہ اور فراخدلانہ راستہ اختیار کرتا ہے یعنی نہ تو قصاص کو متروک اور نہ ہی ضروری قرار دیتا ہے، بلکہ عفو اور دیت کے لیے بھی گنجائش رکھتا ہے۔ اسلام نے قتل کے بارے میں تین راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے کا حق دیا ہے:

۱۔ قصاص یعنی خون کے بدلے خون۔

۲۔ دیت، یعنی خون کے بدلے مال۔

۳۔ عفو، یعنی نہ خون، نہ دیت۔

۱۔ قصاص: اسلام کے تعزیراتی قوانین میں نہ فقط انتقام پسندی ہے، اور نہ صرف عفو پروری، بلکہ ان دونوں کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس طرح اس قانون میں خون آدم کا احترام بھی ملحوظ ہے اور قاتل کی تنبیہ بھی۔ اس حکم میں اجمال سے کام نہیں لیا گیا، جیسا کہ قرآن مجید کا شیوہ صرف کلیات کو بیان کرنا اور تفصیل کو سنت پر چھوڑ دینا ہے، بلکہ یہاں قصاص میں عدل و مساوات کو یقینی بنانے کے لیے اس قانون کی کچھ جزئیات ذکر فرمائیں:

اگر قاتل آزاد ہے تو اس آزاد قاتل کو ہی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل عورت ہے تو اسی کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل کی بجائے کسی دوسرے کو قتل کرنا جائز نہیں، بلکہ جو قاتل ہوگا وہی سزا پائے گا۔

شان نزول کے مطابق آیت کا موضوع یہ ہے کہ جس نے قتل کیا ہے قصاص اسی سے لیا جائے گا خواہ قاتل غلام اور عورت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ عورت کے بدلے مرد قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر عورت کے بدلے مرد قتل کیا جائے تو چونکہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے، اس لیے اس کا نصف مرد کے ورثاء کو ادا کیا جائے گا۔

۲۔ دیت : یہ اس صورت میں ہے کہ مقتول کا وارث قصاص کی جگہ دیت لینے پر راضی ہو جائے اور قصاص سے درگزر کرے۔

۳۔عفو: یعنی قصاص اور دیت دونوں سے درگزر کیا جا سکتا ہے۔

فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ سے مراد قاتل ہے کہ اس کو چھوٹ مل جائے۔ مِنۡ اَخِیۡہِ اپنے بھائی کی طرف سے۔ یہاں لفظ اخ (بھائی) کی تعبیر سے امت قرآن کو یہ درس دیا جا رہا ہے کہ تمہارے درمیان میں قتل و کشتار کی نوبت آ بھی جائے، پھر بھی قاتل تمہارا انسانی بھائی ہے اور بقولے، قاتل فاسق ہونے کے باوجود اسلامی برادری سے خارج نہیں ہوتا۔

شَیۡءٌ سے مراد وہ حق ہے جو قاتل پر عائد ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اس حق میں سے کچھ کو بخش سکتے ہیں۔یعنی اگر قاتل کئی ہوں تو کچھ کو معاف کر دیں یا خون بہا کا کچھ حصہ معاف کر دیں۔

انسانی و اخلاقی اقدار: قصاص کی جگہ دیت طے ہونے کے بعد اس کی ادائیگی کے دوران طرفین مشکلات میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔جن کا حل یوں بیان ہوا ہے:

۱۔ دیت ادا کرنے والا اس کی بروقت ادائیگی پر قادر نہ ہو تو مقتول کے ورثاء کی طرف سے مطالبے میں شدت آ سکتی ہے اور تاخیر کی وجہ سے وہ مقتول کے خون کو رائیگاں سمجھنے لگتے ہیں۔ دیت ادا کرنے والے بار بار کے مطالبے سے نفسیاتی طور پر انتہائی اذیت میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لہٰذا خالق رحیم فرماتا ہے: فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ یعنی دیت کا مطالبہ اچھے پیرائے میں کیا جائے۔ یہ ہدایت دیت لینے والے کے لیے ہے۔

۲۔ دیت دینے والا قادر ہونے کے باوجود حسن وخوبی سے ادا نہیں کرتا تو معاملہ بگڑ سکتا ہے اور قتل وکشت کی نوبت دوبارہ آ سکتی ہے، اس لیے خالق نے فرمایا: وَاَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ۔ قاتل کو چاہیے کہ وہ حسن وخوبی کے ساتھ دیت ادا کرے اور بروقت ادا کرنے کے ساتھ دیت کی نوعیت میں لاپرواہی نہ کرے۔ مثلاً اونٹوں یا بکریوں کی صرف خانہ پری کرے اور لاغر و مریض جانور دے تو یہ احسان فراموشی ہو گی جس سے کدورتیں دوبارہ بھڑک سکتی ہیں۔

ذٰلِکَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَرَحۡمَۃٌ : یعنی قصاص کی جگہ خون بہا کا قانون سزا میں تخفیف اور رحمت ہے۔عفو کے بعد دوبارہ قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ایسا کرنا عذاب الٰہی کا باعث ہو گا۔

کیا اسلامی تعزیرات غیر انسانی ہیں؟: کچھ لوگ اسلامی تعزیرات پر بالعموم اور قصاص پر بالخصوص یہ اعتراضات کرتے ہیں:

۱۔ مجرم ذہنی عدم توازن اور فکری انتشار کا شکار ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کے علاج اور اصلاح و

تربیت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ قصاص ان کا علاج نہیں ہے۔

۲۔ قصاص انسانی جانوں کے ضیاع کا اعادہ ہے، علاج نہیں۔

۳۔ قصاص ایک انتقامی کاروائی ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ عمل ہے۔

جواب: ا۔ قصاص کے حکم کا تعلق پوری انسانیت سے ہے اور یہ تمام اقوام کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ اگر اقوام عالم میں سے کچھ قومیں عقل وشعور کی اس منزل پر فائز ہو جاتی ہیں کہ وہ تربیت و اصلاح کے ذریعے قتل کے ارتکاب سے باز آ جائیں تو اسلامی تعزیرات اس کی نفی نہیں کرتیں۔ ایسے حالات میں عفو و درگزر کا قانون نافذ ہوسکتا ہے اور قصاص کا قانون اس کے منافی نہیں ہے۔ لیکن وہ اقوام جو شعور کی اس منزل پر فائز نہیں ہیں، ان میں مجرم قابل اصلاح نہیں ہوتا، بلکہ قوم کے جسم میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسے کاٹ کر جسم سے علیحدہ کردیا جائے، جیسا کہ مشاہدہ بھی اس بات پر گواہ ہے۔ ایسے مجرم نہ تو زندانوں سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی دوسری سزاؤں سے۔ ان کے لیے زندانوں کی زندگی اتنی کربناک نہیں ہوتی جتنی کہ سزا تجویز کرنے والے سمجھتے ہیں، بلکہ ان میں سے کچھ تو قید کو آزاد زندگی سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں نیز قانون قصاص خود قتل میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ خواہ عملاً معاف ہی کر دیا جائے یا دیت ادا کر دی جائے۔

۲۔ پہلے اعتراض کے جواب سے ظاہر ہوا کہ قصاص معاشرے میں مجموعی طور پر ہونے والے قتل کے لیے ایک لگام ہے۔ یہ کہنا کہ قصاص قتل کی تکرار ہے، ایک نہایت سطحی سوچ ہے۔ اعتراض کرنے والے کی محدود نگاہ صرف قاتل اور مقتول پر ہے، جب کہ قانون قصاص پورے انسانی معاشرے کے لیے ہے۔ لہٰذا پورے انسانی معاشرے کے لحاظ سے قصاص اس تکرار کے لیے نہایت مؤثر لگام ہے۔ جب انسان کو یقین ہو کہ مدمقابل کو قتل کرنے کے بعد وہ بچ نہیں سکتا بلکہ خود اسے بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا تو انسان کے اندر حب ذات اور حب بقاء کی طاقتور خواہش اسے دوسروں کے قتل سے روکے گی۔ بنابریں قصاص پورے انسانی معاشرے میں قتل کی روک تھام کا مؤثر ترین قانون اور وسیلہ ہے، تکرار قتل نہیں۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے اگلی آیت میں نہایت فصیحانہ انداز میں یہ جواب دیا ہے:

وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ ...[1] اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

۳۔ اول تو قصاص انتقام کے اندھے جذبے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مہذب اور منظم قانون ہے۔ چنانچہ مقتول کے ورثاء کو قاتل سے خود انتقام لینے کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرعی حاکم کی طرف رجوع کریں۔ قانون قصاص پر عملدرآمد اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے، خواہ کسی مقتول

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۷۹

کا کوئی وارث ہو یا نہ ہو۔ اگر مقتول کا وارث شرعی حاکم کی اجازت کے بغیر اقدام قتل کرتا ہے تو یہ انتقام ہے۔ لیکن اگر قانون کا سہارا لے کر حکومت کی طرف رجوع کرتا ہے اور حکومت قصاص نافذ کرتی ہے تو یہ انتقام نہیں بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے نافذ شدہ قانون ہے۔

ثانیاً اپنے مال و جان کا دفاع ایک فطری حق ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں کہ اگر کوئی شخص اسے قتل کرنا چاہے تو وہ اپنے دفاع کی خاطر اسے قتل کرنے کے حق میں نہ ہو۔ بنا بریں اگر حالت دفاع میں قتل واقع ہونے سے پہلے قتل کرنا جائز اور معقول ہے تو قصاص میں قتل واقع ہونے کے بعد کیسے جائز نہیں ہوگا؟

یہ نام نہاد ترقی یافتہ قومیں اپنے خودساختہ استقلال، آزادی اور مفادات کے تحفظ اور دفاع کے بہانے دوسری قوموں کی نسل کشی تک سے باز نہیں آتیں۔ وہ قصاص کو غیر انسانی اور ناپسندیدہ عمل قرار دیتی ہیں تاکہ مظلوم اقوام کے جذبۂ انتقام کو ختم کر کے اپنی سیاہ کاریوں کا دائرہ مزید پھیلائیں۔

اہم نکات

۱۔ قصاص معاشرے میں عدل و انصاف کو یقینی بنانے کے لیے ایک مہذب اور منظّم قانون ہے، انتقام کا اندھا جذبہ نہیں۔

۲۔ اسلامی قانون قصاص کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خون کا احترام بھی ہے اور قاتل کی تنبیہ بھی۔

۳۔ بظاہر سنگین اور سخت نظر آنے والی اسلامی تعزیرات رواداری، باہمی محبت، احترام اور الٰہی عطوفت کی آئینہ دار ہیں۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِکَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۔

تحقیق مزید

الکافی ۷ : ۳۵۸ ، التہذیب ۱۰ : ۱۷۸، تفسیر العیاشی ۱ : ۷۵۔

وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾

۱۷۹۔ اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، امید ہے تم (اس قانون کے سبب) بچتے رہو گے۔

تفسیر آیات

اس مختصر اور فصیح کلام میں فلسفہ قصاص بیان فرمایا گیا کہ کسی کا قتل نہایت ویانہ جرم ہے۔ انسانی زندگی کا ضیاع انسانی معاشرے کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ لہٰذا قصاص ہی ایک ایسا قانون ہے جو اسے لگام دے سکتا ہے۔ قصاص سے ایک اور جان ضرور جاتی ہے لیکن نتیجتاً بہت سی جانیں بچ جاتی ہیں۔ جب آدمی کو یقین ہوگا کہ اگر قتل کیا تو اس کے بدلے میں اپنی جان بھی دینی پڑے گی تو وہ قتل کا

عمل انجام دینے سے گریز کرے گا۔ بنابریں قانون قصاص قتل کی روک تھام کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر قصاص کا قانون نہ ہوتا تو مقتول کے ورثاء اپنے قتل کا انتقام خود لیتے اور ایک کے بدلے کئی افراد کو مارتے اور جواباً ان کے بھی کئی افراد قتل ہو جاتے اور اس طرح بہت سی جانیں ضائع ہوتیں۔ چنانچہ اسلامی تعزیرات نافذ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے قبائل میں آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

قانون قصاص کے نفاذ سے اسلامی معاشرے کے افراد کو حیات نو مل جاتی ہے، کیونکہ اس میں قانون اور حکومت کے ذریعے صرف قاتل سے قصاص لیا جاتا ہے، دوسرے لوگوں کو تحفظ مل جاتا ہے۔ اس طرح قصاص سے مقتول کے ورثاء کی تشفی ہو جاتی ہے اور جذبۂ انتقام و کدورت کم ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ معاشرے کی سلامتی اور امن عامہ کے لیے قصاص ایک اہم قانون ہے۔

۲۔ اسلام میں اجتماعی اور معاشرتی سلامتی کا تحفظ، انفرادی حیات پر مقدم ہے۔

تحقیق مزید

الوسائل ۲۹ : ۵۳، امالی الطّوسی ص ۴۹۴

کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَکَ خَیۡرَا ۚۖ الۡوَصِیَّۃُ لِلۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَی الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۸۰﴾

۱۸۰۔ تمہارے لیے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ کچھ مال چھوڑے جا رہا ہو تو اسے چاہیے کہ والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے مناسب طور پر وصیت کرے، متقی لوگوں پر یہ ایک حق ہے۔

تشریح کلمات

وَصِیَّت: (و ص ی) واقعہ پیش آنے سے پیشتر نصیحت اور ہدایت کرنا۔

المعروف: (ع ر ف) وہ عدل و انصاف جس میں کوئی نامعقول بات یا کوئی زیادتی نہ ہو۔

تفسیر آیات

کُتِبَ سے مراد قانون شریعت کا ثبت و تدوین ہے، حکم خواہ واجب ہو یا مستحب۔ البتہ اس بات کے لیے الگ علامت اور دلیل کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ قانون وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے۔

تَرَکَ خَیۡرًا سے مراد مال ہے۔ قرآن مجید میں مال کو یہاں خیر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

مال اگرچہ خود مقصد تو نہیں، لیکن اگر کسی نیک مقصد کا ذریعہ بنتا ہو تو اس میں خیر ہی خیر ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ [1]	صالح افراد کے لیے پاکیزہ مال کتنا بہتر ہے۔

اس سے یہ رہبانی تصور ختم ہو جاتا ہے کہ مال بذات خود ایک ناپاک چیز ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (ع) نے خیر سے مال کثیر مراد لیا ہے چنانچہ ایک ایسے آدمی کو جس کے پاس صرف سات سو درہم تھے، آپ (ع) نے وصیت کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَ سُبْحَانَهٗ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا وَ لَيْسَ لَكَ كَثِيْرُ مَالٍ۔ [2]	اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے کہ خیر چھوڑ جائے اور تیرے پاس کثیر مال نہیں ہے۔

اگر کسی کے پاس کثیر مال ہے تو وہ اس مال کے بارے میں آثار موت ظاہر ہونے پر وصیت کرے۔

وَصِیَّت مرنے کے بعد پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہونے والے نصائح و ہدایات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس آیت میں وصیت کو ایک پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھنے کی تاکید فرمائی ہے نیز وصیت کو متقین کی علامت کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے: حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی انسان چونکہ زندگی میں اور موت کے بعد بھی مال کے ذریعے قرب الٰہی حاصل کرتا ہے لہٰذا مال اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔

۲۔ وصیت مال و دولت اور رشتہ داروں کے معاملے میں احساس ذمہ داری کا نام ہے۔

۳۔ وصیت وراثت سے محروم رشتہ داروں کو محرومی سے بچانے کا ذریعہ ہے۔

۴۔ وصیت کے لیے معروف یعنی مناسب اور نیکی پر مبنی ہونا شرط ہے

تحقیق مزید

الکافی ۷ : ۱۰، الفقیہ ۴ : ۲۳۵، تفسیر العیاشی ۱ : ۷۷

فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۸۱﴾

۱۸۱۔ جو وصیت کو سن لینے کے بعد اسے بدل ڈالے تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہو گا، اللہ یقیناً ہر بات کا خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

---

[1] مجموعۃ ورام ۱ : ۱۵۸	[2] فقہ القرآن ۲ : ۳۰۱

تفسیر آیات

اس میں ہر قسم کی تبدیلی شامل ہے۔ مثلاً وصیت کا انکار اور اسے پوشیدہ رکھنا وغیرہ۔ اگر کوئی شخص کسی کی وصیت کو تبدیل کر دے تو وصیت کرنے والے کو تو اجر و ثواب ملے گا، لیکن تبدیل کرنے والا گنہگار ہو گا۔ اللہ تعالیٰ وصیت کرنے والے کی وصیت کو خوب سمجھنے والا اور تبدیل کرنے والوں کی تبدیلی کا خوب علم رکھنے والا ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلْوَصِیَّۃُ حَقٌّ وَ قَدْ اَوْصٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلیه و اٰله وسلم فَیَنْبَغِیْ لِلْمُسْلِمِ اَنْ یُّوْصِیَ ۔[1]

وصیت ایک حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے تو ہر مسلمان کو بھی وصیت کرنی چاہیے۔

تحقیق مزید

الکافی ۷ : ۴، الفقیہ ۴ : ۲۳۵، تفسیر العیاشی ۱ : ۷۷۔

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۸۲﴾

۱۸۲۔ البتہ جو شخص یہ خوف محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے جانبداری یا گناہ کا ارتکاب کیا ہے، پھر وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

جَنَفًا: (ج ن ف) راہ راست سے منحرف ہونا۔

تفسیر آیات

وصیت میں بالمعروف یعنی نیکی اور مناسبت پر مبنی ہونا شرط ہے۔ لٰہذا اگر وصیت کرنے والا اپنی وصیت میں عدل و انصاف سے انحراف کرتا ہے اور کسی ایک سے جانبداری برتتا ہے یا کسی ناجائز چیز کے لیے وصیت کرتا ہے۔ یعنی راہ عصیان میں وصیت کرتا ہے تو اس صورت میں آپس میں ہونے والے فسادات کو ختم کرنے اور صلح و صفائی پیدا کرنے کے لیے وصیت کو بدل دیتا ہے تو اس تبدیلی میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جَنَف یہ ہے کہ وارثین میں سے کچھ کو سارا ترکہ وصیت کر کے دے دے اور باقی کو محروم رکھے۔

---

[1] الفقیہ ۴: ۱۸۱

یہاں فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ کا مقام ہے۔

اِثم یعنی گناہ کے موارد کے لیے وصیت کرے۔ مثلاً یہ وصیت کرے کہ میرے مال کا ایک حصہ شراب کشید کرنے کے کارخانے پر صرف کیا جائے۔

چند وضاحتیں

۱۔ بعض مفسرین وصیت کو ایک وقتی حکم قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ آیۂ میراث سے پہلے وصیت کا حکم نافذ تھا جو بعد میں آیۂ میراث کے ذریعے منسوخ ہو گیا۔ دیگر مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ احکام وصیت اب بھی اسلامی شریعت کا حصہ ہیں اور یہی مؤقف درست ہے۔

۲۔ مرنے والے کی کل جائیداد کے ایک تہائی حصے میں وصیت کارگر اور نافذ ہو گی۔ دو تہائی حصہ ورثاء کا حق ہوگا۔

۳۔ احکام میراث اور احکام وصیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نہایت جامع اور حکیمانہ قانون سامنے آتا ہے کہ مرنے والے کے رشتہ داروں میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو وراثت کے حقدار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو وراثت کے حقدار نہیں بن سکتے۔ مثلاً وہ پوتے اور نواسے جن کے ماں باپ، دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔ ان کے لیے وصیت ایک جائز اور معقول ذریعہ ہے نیز اگر انسان مال کثیر چھوڑ کر جا رہا ہو تو مال کا ایک حصہ کار خیر وصدقہ جاریہ کے لیے وصیت کر سکتا ہے۔ غرض مرنے والے کے اموال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے دو تہائی قانون وراثت کے تحت وارث لے جائیں گے، مرنے والا چاہے یا نہ چاہے اور ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعے اپنی مرضی سے کسی کو دیا جا سکتا ہے۔

احادیث

اسلامی تعلیمات میں وصیت کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنۡ لَمۡ یُوۡصِ عِنۡدَ مَوۡتِہٖ لِذَوِی قَرَابَتِہٖ مِمَّنۡ لَا یَرِثُہُ فَقَدۡ خَتَمَ عَمَلَہُ بِمَعۡصِیَۃٍ۔[1]

جو شخص اپنی موت کے وقت اپنے ان رشتہ داروں کے لیے جو اس کے وارث نہیں بن سکتے، وصیت نہیں کرتا تو اس نے اپنے اعمال کا خاتمہ معصیت پر کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی تعلیمات میں عدل و انصاف کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔

۲۔ قانون وصیت میں موصی اور ورثاء دونوں کی مصلحت اور حقوق کو جمع کیا گیا ہے۔

۳۔ خرابیوں کی اصلاح مداخلت بے جا نہیں، بلکہ مغفرت اور رحمت کا باعث ہے۔

---

[1] الوسائل ۱۹: ۲۶۳

تحقیق مزید

الکافی ۷ : ۲۱، الوسائل ۱۹ : ۲۷۵ اذا زاد علی الثلث وص ۳۵۰۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾

۱۸۳۔ اے ایمان والو! تم پر روزے کا حکم لکھ دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر لکھ دیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

تشریح کلمات

الصِّیَامُ: (ص و م) صوم کی جمع ہے۔ یعنی کسی چیز سے رک جانا اور اسے ترک کر دینا۔

تفسیر آیات

روزے کا حکم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی ذکر فرمایا کہ یہ صرف تم پر نہیں بلکہ گزشتہ امتوں پر بھی واجب کیا گیا تھا۔ اس میں دو نکتے پوشیدہ ہیں۔

۱۔ روزے کا وجوب انسانی فطرت کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ اگرچہ مختلف ادیان میں تقاضوں کے بدلنے سے شریعتیں بدلتی رہی ہیں، لیکن جو بات انسانی فطرت کے تقاضوں سے مربوط ہو وہ نہیں بدلتی۔ اسی وجہ سے روزہ تمام شریعتوں میں نافذ رہا۔

۲۔ مسلمانوں کی دل جوئی کے لیے کہ روزہ ان پر بار گراں نہ گزرے، کہا گیا کہ یہ صرف تم پر ہی نہیں، بلکہ سابقہ امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

تقویٰ اور روزہ: اس آیۂ شریفہ کا آخری جملہ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ بتاتا ہے کہ روزے کا ایک طبعی اور لازمی نتیجہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ کا مطلب پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بچنا اور انسان کو سب سے زیادہ خطرات اپنی ذاتی خواہشات کی طرف سے لاحق ہوتے ہیں۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ...[1] لوگوں کے لیے خواہشات نفس کی رغبت زیب و زینت بنا دی گئی ہے...۔

حدیث نبوی (ص) میں آیا ہے:

----

[1] ۳ آل عمران: ۱۴

اَعۡدَی عَدُوِّكَ نَفۡسَكَ الَّتِیۡ بَیۡنَ جَنۡبَیۡكَ.[۱] تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

روزہ ان داخلی خطرات سے بچنے کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ کیونکہ روزہ حلال اور مباح چیزوں سے اجتناب کی اہم تربیت ہے۔ انسان جب حلال اور مباح چیزوں سے اجتناب کرنے کا عادی بن جائے تو حرام چیزوں سے اجتناب کرنا اس کے لیے مزید آسان ہوجاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ روزہ انسانی تکامل اور تربیت کا ایک اہم رکن ہے جو تمام شریعتوں میں نافذ رہا ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۶۳، الفقیہ ۲ : ۷۵، الکافی ۴ : ۹۰۔

اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ ؕ وَ اَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾

۱۸۴۔ (یہ روزے) گنتی کے چند دن ہیں، پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں مقدار پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے میں مشقت محسوس کرتے ہیں وہ فدیہ دیں جو ایک مسکین کا کھانا ہے، پس جو اپنی خوشی سے نیکی کرے تو اس کے لیے بہتر ہے اور اگر تم سمجھو تو روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔

تشریح کلمات

یطیقون: اَلۡاِطَاقَۃ پوری طاقت صرف کرنا۔

فِدۡیَۃٌ: وہ مال جو کسی مشقت کے بدلے ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسیری اور روزے کا عوض۔

تفسیر آیات

اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ: گنتی کے چند دن، یعنی ماہ رمضان۔ کیونکہ بارہ مہینوں میں سے ایک ماہ گنتی کے

۱۔ بحار الانوار ۶۷: ۶۴

چند دن ہی ہوتے ہیں۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سال میں چند دن یعنی ایک ماہ کے روزے رکھنا کوئی پرمشقت کام نہیں ہے۔

نسخ کے شوقین بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد ہر ماہ کے تین ایام اور روز عاشور کا روزہ ہے جو بعد میں منسوخ ہو گیا۔ یہ قول ان روایات پر مبنی ہے جو بنی امیہ کے دور میں فضائل عاشور کے بارے میں گھڑی گئیں اور جن میں روز عاشور کو عید المسلمین قرار دیا گیا ہے۔

مسافر اور مریض کا روزہ: روزے کا حکم بیان فرمانے کے بعد مسافر اور مریض کے لیے فرمایا کہ اگر وہ ان معدود ایام میں روزہ نہ رکھ سکیں تو اس مقدار کو دوسرے دنوں میں پورا کر سکتے ہیں کیونکہ مقررہ دنوں میں نہ سہی لیکن اصل روزہ تو ہر حال میں بجا لانا ہوگا۔

رخصت یا عزیمت؟: اکثر اہل سنت فقہا کے نزدیک مسافر اور مریض کو صرف اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں قضا بجا لائیں۔ فقہ اہل بیت علیہم السلام کے مطابق مسافر اور مریض کا روزہ باطل ہے۔ انہیں بعد میں اپنے روزوں کو بجالانا ہوگا۔ چنانچہ ظاہر آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے: فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ کہ قضا ضروری ہے اور اگر قضا ضروری ہے تو افطار بھی ضروری ہے: وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ. جو روزہ رکھنے میں مشقت محسوس کرتے ہیں وہ فدیہ دیں، جو ایک مسکین کا کھانا ہے۔ یہ حکم

معمر لوگوں اور دائمی مریضوں، بوڑھے، مریض، زیادہ پیاس والے، وہ ماں جو اپنے بچے کے لیے خائف ہو، کے لیے ہے کہ انہیں روزہ رکھنے میں معمول سے زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ عطاء نے ابن عباس سے روایت کی ہے: یُطِیۡقُوۡنَہٗ یعنی یکلفونہ۔ اس کا معنی مشقت ہے۔ یہاں نسخ کے شائقین کی دو تفسیریں ہیں: ایک یہ کہ یُطِیۡقُوۡنَہٗ کا مطلب یہ ہے کہ جو طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دیں۔ یعنی شروع میں لوگوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ روزہ رکھیں یا فدیہ دیں۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور روزہ رکھنا ضروری قرار پایا۔

دوسری تفسیر اس سے بھی بعید از قیاس ہے اور وہ یہ ہے کہ یُطِیۡقُوۡنَہٗ کی ضمیر روزے کی طرف نہیں طعام کی طرف جاتی ہے اور مطلب یہ نکلتا ہے کہ مسافر اور مریض دوسرے دنوں میں روزہ رکھیں اور اگر وہ طعام دینے کی طاقت رکھتے ہیں تو قضا کی جگہ فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعد کی آیت سے یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔[1]

تعجب کا مقام ہے کہ انہوں نے طاقت کو استطاعت کے معنوں میں لیا ہے جو سراسر خلاف ظاہر ہے اور استعمالات عرب کے بھی خلاف ہے چونکہ طاقت بدنی قوت کو کہتے ہیں جیسے: قَالُوۡا لَا طَاقَۃَ لَنَا الۡیَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَ جُنُوۡدِہٖ.[2] اور فدیہ دینا مالی استطاعت پر موقوف ہے۔ اس کے لیے لفظ طاقت استعمال ہو ہی نہیں

---

[1] تدبر قرآن ۱: ۴۴۸　[2] ۲ بقرہ: ۲۴۹۔ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

سکتا۔ بدنی قوت سے مربوط ہونے کی وجہ سے روزے میں لفظ طاقت کا استعمال درست ہے جب کہ مالی استطاعت کے معنوں میں یہ استعمال کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے: یُطِیۡقُوۡنَہٗ سے مراد سن رسیدہ مرد اور عورت ہیں۔ (تفسیر طبری در ذیل آیت)۔

روزے کے فوائد: روزے کے احکام بیان فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ روزہ رکھنے میں خود تمہاری بہتری ہے اور اس بہتری کو انسان کی معلومات کے ساتھ مربوط فرمایا اور ارشاد ہوا: وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۔ ''اگر تم علم رکھتے تو روزہ رکھنے میں خود تمہاری بہتری ہے۔'' جوں جوں انسان کا اپنے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، روزے کے فوائد ان پر زیادہ سے زیادہ عیاں ہوتے جائیں گے۔ جیسا کہ پہلے کی نسبت آج کا انسان روزے کے طبی، نفسیاتی اور دیگر فوائد کو بہتر سمجھ سکتا ہے کہ روزے میں قوت ارادی کی تربیت، صبر و تحمل کی مشق، ایثار و قربانی کا درس ہے اور روزہ خلوص و محبت کا نمونہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی احکام انسان کی مختلف جسمانی و نفسیاتی مصلحتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

۲۔ جوں جوں علمی ترقی ہوگی، اسلام کی حقانیت اسی قدر زیادہ واضح ہوگی۔

تحقیق مزید

الکافی ۴: ۸۶۔ برائے تحقیق آیہ وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ ملاحظہ فرمائیں تفسیر عیاشی ۱: ۷۸۔ ۸۹

شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَ

۱۸۵۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ایسے دلائل پر مشتمل ہے جو ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والے ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے وہ روزہ رکھے اور جو بیمار اور مسافر ہو وہ دوسرے دنوں میں مقدار پوری کرے، اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا اور وہ چاہتا ہے کہ تم مقدار

لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾	پوری کرو اور اللہ نے تمہیں جس ہدایت سے نوازا ہے اس پر اللہ کی عظمت و کبریائی کا اظہار کرو، شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔

تشریح کلمات

شَھْرُ: (ش ہ ر) ظاہر اور آشکار ہونا۔ گردش آفتاب کے بارہ حصوں میں سے ایک حصے کو شَھْر (ماہ) کہتے ہیں۔ یہ شہرت وظہور کے معنوں سے لیا گیا ہے۔

رَمَضَانَ: رَمَض سے مشتق ہے، جو سورج کی سخت تپش کے معنوں میں ہے ۔ اس سے روزوں کا مہینہ مقصود ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رمضان کو اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی یہ ماہ گناہوں کے خلاف اتنی سخت تپش ہے، جس میں تمام گناہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

رمضان وہ واحد مہینہ ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، کیونکہ یہ وہ مبارک ماہ ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسری آیت میں نزول کا وقت بھی بتا دیا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ ...[1]　ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا ہے۔

تیسری آیت میں اس رات کو بھی متعین فرمایا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۔[2]　ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔

نزول کے متعدد معانی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ علم خدا کا مرحلہ نفاذ میں داخل ہونا۔

۲۔ قلب رسول (ص) پر حکم خدا کا ظاہر ہونا۔

۳۔ تدریجی طور پر حکم خدا کا بیان وغیرہ۔

اِنْزَال اور تَنْزِیْل میں یہ فرق بیان کیا جاتا ہے کہ اِنْزَال دفعۃً نازل کرنے اور تَنْزِیْل تدریجاً نازل کرنے کو کہتے ہیں۔

یہ آیت درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ قرآن کا نزول: اس آیت میں ارشاد ہوا کہ قرآن ماہ رمضان المبارک میں نازل کیا گیا ہے

---

[1] ۴۴ دخان: ۳　[2] ۹۷ القدر: ۱

ہے اور اس کے لیے لفظ اَنۡزَل استعمال فرمایا جو دفعۃً نازل کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ قرآن دفعۃً رمضان میں نازل ہوا۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ قُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰہُ لِتَقۡرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکۡثٍ وَّ نَزَّلۡنٰہُ تَنۡزِیۡلًا [1]　اور قرآن کو ہم نے جدا جدا رکھا ہے تاکہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔

واقعاتی اور عملی طور پر یہ بات ثابت اور واضح ہے کہ قرآن ۲۳ سالوں میں تدریجاً نازل ہوا ہے۔ بنابریں ان دو باتوں (اِنۡزَال اور تَنۡزِیۡل) میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے۔ علماء نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں:

۱۔ ماہ رمضان المبارک میں قرآن کے نزول سے مراد یہ ہے کہ اس مہینے میں قرآن کا نزول شروع ہوا۔

۲۔ قرآن کا نزول آسمانی دنیا میں اسی ماہ میں ہوا۔ وہاں سے بتدریج قلب رسول (ص) پر نازل ہوتا رہا۔

۳۔ رمضان میں قرآن کے نزول سے مراد ایک ایسے سورے کا نزول ہے جو خلاصۂ قرآن ہے۔ مثلاً سورۂ حمد۔

۴۔ قرآن کی حقیقت قلب رسول (ص) پر شب قدر کو ایک ساتھ نازل ہوگئی تھی۔ بعد میں حالات اور واقعات کے مطابق دوبارہ رسول خدا (ص) پر نازل ہوتا رہا۔ علماء اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول خدا (ص) کو یہ حکم ہوا کہ وحی مکمل ہونے سے قبل قرآن کی تلاوت نہ کریں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ... [2]　اور آپ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور (ص) کو بیان احکام کے لیے وحی کا انتظار فرمانے کا حکم دیا جا رہا ہے، ورنہ قرآن کا علم آپ (ص) کو پہلے سے حاصل تھا۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ: "اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا" سے معلوم ہوا کہ سفر اور مرض کی حالت میں مشقت اٹھا کر روزہ رکھنا ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ ... [3] یعنی اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنے کا

---

[1] ۱۷ اسراء: ۱۰۶　[2] ۲۰ طہ: ۱۱۴　[3] ۵ مائدہ: ۶

کا ارادہ نہیں رکھتا۔

اس ارادہ نہ رکھنے کا واضح فیصلہ اس آیت میں بیان فرمایا:

وَ مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ [1]　　اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا۔

اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ارادے کے خلاف ارتکاب کرتا ہے تو اس کا عمل باطل ہو گا۔ فقہ جعفری میں سفر اور مرض کی حالت میں روزہ صحیح نہیں ہے۔ اگر روزہ صحیح ہو جائے تو نفی حَرَج کی نفی ہو جاتی ہے۔ یعنی دین میں حَرَج کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، جو صریح قرآن کے خلاف ہے۔

احادیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے:

اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ مِنَ النَّارِ۔ [2]　　روزہ آتش جہنم سے بچنے کی ڈھال ہے.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللّٰہ تبارك و تعالی یَقُوْلُ اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ [3]　　اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا۔

اس میں اس بات کا اظہار ہے کہ روزے کے ثواب کو کسی شمار میں نہیں لایا جا سکتا اور نہ کوئی اس کے ثواب کی عظمت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ صرف یہ فرما کر روزے کے اجر و ثواب کی عظمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ میں بذات خود اس کا ثواب دوں گا۔ ثواب دینے والے کی عظمت سے ثواب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور (ص) کو بیان احکام کے لیے وحی کا انتظار فرمانے کا حکم دیا جا رہا ہے ورنہ قرآن کا علم آپ (ص) کو پہلے سے حاصل تھا۔

۲۔ قرآن پوری انسانیت کے لیے ایک ہدایت اور دستور حیات ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ ....

۳۔ یہ قرآن رہنمائی کے ساتھ حق و باطل کی کسوٹی بھی پیش کرتا ہے تاکہ ان دونوں میں اشتباہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور حجت خدا پوری ہو جائے۔

۴۔ جو اس مہینے میں مریض یا مسافر نہ ہو اور روزہ رکھ سکتا ہو، وہ روزہ رکھے اور جو مریض اور مسافر ہے، وہ ان روزوں کو دوسرے دنوں میں پورا کرے۔

---

[1] ۲۲ حج: ۷۸　　[2] اصول الکافی ۲: ۱۸　　[3] حوالہ سابق ۴: ۶۳

۵۔ اللہ بندوں کے لیے آسانی چاہتا ہے اور اسے یہ بات ہرگز پسند نہیں ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ناقابل تحمل مشقت میں ڈالے۔ اسی کلی حکم کے تحت مرض اور سفر کی حالت میں روزہ رکھنا امامیہ فقہ کے مطابق درست نہیں ہے۔ اگر بیماری اور سفر میں روزے کو درست قرار دیا جائے تو عسر و حرج لازم آتا ہے، جس کی اللہ نے نفی فرمائی ہے: یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ ....۔

۶۔ اللہ تعالی نے رمضان کے مبارک مہینے میں ہدایت کا سامان فراہم کرنے کے بعد روزے کا حکم دیا، کیونکہ تزکیے کے بغیر قرآنی معارف اور مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۲: ۶۲۸، معنی الفرقان، الکافی ۲: ۶۳۰، تفسیر العیاشی ۱: ۱۶۲۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾

۱۸۶۔ اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو (کہدیں کہ) میں (ان سے) قریب ہوں، دعا کرنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، پس انہیں بھی چاہیے کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ راست پر رہیں۔

تفسیر آیات

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالی کی رحمانیت کا نہایت مشفقانہ انداز میں اظہار ہو رہا ہے، توجہ کیجیے:

عِبَادِیۡ "میرے بندے" کی دلنواز تعبیر میں کس قدر انس و محبت نہفتہ ہے اور مؤمن کے دل میں اس وقت سکون و اطمینان آجاتا ہے، جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس رب کو وہ پکارتا ہے اور مشکلات میں جس ذات کی طرف وہ رجوع کرتا ہے، وہ نہایت قریب ہے: فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ اور اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب، بلکہ خود انسان سے بھی زیادہ قریب ہے: وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡکُمۡ وَ لٰکِنۡ لَّا تُبۡصِرُوۡنَ ۔[1] اور وہ ہر وقت حاضر و ناظر ہے: اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ ۔[2] اس تک اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے وقت صرف نہیں ہوتا اور اس کی بارگاہ میں اپنی درخواست پہنچانے کے لیے مادی وسائل و ذرائع کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ امیر و فقیر یکساں طور پر اپنے رب کریم کی بارگاہ میں اپنی آواز بآسانی پہنچا سکتے ہیں تو وہ اطمینان اور سکون کے بحر بیکراں میں

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۸۵۔ اور (اس وقت) تمہاری نسبت ہم اس شخص کے زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔
[2] ۱۱ ہود: ۶۱۔ بے شک میرا رب بہت قریب ہے، (دعاؤں کو) قبول کرنے والا ہے۔

ڈوب جاتا ہے۔

کس قدر شیریں ہے رب کریم کا ارشاد: میں پکارنے والوں کی پکار پر لبیک کہتا ہوں اور ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

یہ وہ واحد آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے سات مرتبہ واحد متکلم کی ضمیر استعمال کی ہے۔

ملاحظہ ہو: جب آپ سے

۱۔ میرے بندے: عِبَادِیۡ

۲۔ میرے متعلق سوال کریں: عَنِّیۡ

۳۔ تو میں ان سے قریب ہی ہوں: فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ

۴۔ دعا کرنے والا جب مجھے پکارتا ہے: دَعَانِ

۵۔ میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں: اُجِیۡبُ

۶۔ پس انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں: فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ

۷۔ اور مجھ پر ایمان رکھیں: وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ۔

کس مہر و محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو اپنے بندوں کے سامنے پیش فرما رہا ہے۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کبریائی کا اظہار جمع کی ضمیر کے ساتھ فرمایا ہے: اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ[1] وغیرہ۔ لیکن اپنی مہربانی اور رحمت و شفقت کا اظہار واحد متکلم کی ضمیر کے ساتھ فرماتا ہے: فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ۔

اس آیت میں پوشیدہ نکات:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب ہے: اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ "جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں"۔ کیونکہ رسالت مآب (ص) ہی وہ وسیلہ ہیں جن کے ذریعے رب کو پہچانا جاتا ہے اور انہی کے ذریعے فیوضات الٰہی بندوں پر نازل ہوتی ہیں اور وہی عالمین کے لیے رحمت ہیں۔

۲۔ حضور (ص) سے رب کے بارے میں سوال کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ اے رسول! کہہ دیجیے کہ میں قریب ہوں، بلکہ بلا واسطہ اور براہ راست اللہ خود اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے: فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ "میں تو ان سے نزدیک ہوں"۔ اس طرح خود طرز کلام سے بھی اللہ کے قرب

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۳۴۔ بے شک ہم اس بستی میں رہنے والوں پر ان کی بدعملی کی وجہ سے آسمان سے آفت نازل کرنے والے ہیں۔

اور اس کے لطف و کرم کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ دعا کی قبولیت کا وعدہ۔ اس کی شرط یہ ہے کہ دعا حقیقتاً دعا ہو۔ اِذَا دَعَانِ یعنی جب وہ مجھے (حقیقی معنوں میں) پکارے۔ اپنے دل و جان بلکہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کروں گا، لیکن اگر صرف زبان ہلائے تو یہ دعا نہیں ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ پوری کائنات پر ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اس کائنات کی ہر شے میں تصرف کرتا ہے۔ یہودیوں کا باطل نظریہ ہے کہ خدا مخلوقات کو خلق کرنے اور قضا و قدر بنانے کے بعد بے بس ہے اور کوئی جدید تصرف نہیں کر سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر وقت کائنات میں اپنا تصرف اور عمل جاری رکھتا ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۔ [۱] یہاں مسئلہ بدا کے سمجھنے کا مقام ہے، یعنی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اور اللہ کے پاس لوح محو و اثبات ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح تشریعی دنیا میں نسخ ہوتا ہے اور اللہ کے تشریعی اور قانونی فیصلے بدل جاتے ہیں، اسی طرح ''تکوینی دنیا''میں بدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے تکوینی فیصلے بدل جاتے ہیں۔ یعنی حالات کے تقاضوں کی بنا پر ایک حکم بدل جاتا ہے، اسے نسخ کہتے ہیں اور استحقاق و اہلیت آنے پر انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے، اسے بدا کہتے ہیں۔

دعا سے انسان رحمت الٰہی کا مستحق اور اللہ کے ارادے کے لیے اہل بن جاتا ہے، یہاں سے اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت امام صادق (ع) سے مروی ہے:

اَلدُّعَاءُ يَرُدُّ الْقَضَاءَ الْمُبْرَمَ بَعْدَ مَا اُبْرِمَ اِبْرَامًا ۔ [۲]　دعا تقدیر کو اس وقت بھی بدل دیتی ہے جب وہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہو۔

رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

لَا يُرَدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَ لَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ الا البِرُّ ۔ [۳]　تقدیر کو صرف دعا بدل سکتی ہے اور نیکی سے ہی عمر بڑھ سکتی ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو دعوت دیتا ہے کہ میں قریب ہوں، بندوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔ آؤ مجھے پکارو اور میری اس دعوت پر لبیک کہو: فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ اس ایمان کے ساتھ مجھے پکارو کہ میں تمہاری درخواست کو قبول کرنے اور تمہاری حاجت روائی پر قادر ہوں۔ اس ایمان و سکون اور پورے اعتماد کے ساتھ مجھے پکارو گے تو دعا سنی جائے گی: وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ پھر تم رشد حاصل

---

[۱] ۵۵ رحمٰن: ۲۹۔ ترجمہ: وہ ہر روز ایک (نئی) کرشمہ سازی میں ہے۔

[۲] المستدرک ۵: ۱۶۶　[۳] کنز العمال جلد دوم حدیث ۳۱۴۸۔ مطبوعہ الرسالۃ ۱۹۸۹ء

کرو گے۔ اس میں تمہاری ارتقا نہفتہ ہے، تمہارا تکامل پوشیدہ ہے۔ نتیجتاً صحیح ہدایت بھی اسی میں ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

احادیث

۱۔ رسول اکرم (ص) سے روایت ہے:

اَلدُّعَاءُ سَلَاحُ الْمُؤْمِنِ وَعَمُوْدُ الدِّيْنِ وَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ.[۱]

دعا مؤمن کا اسلحہ ہے، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کے لیے روشنی ہے۔

۲۔ ایک اور جگہ رسول اکرم (ص) سے مروی ہے:

اِفْزَعُوْا اِلَى اللّٰهِ فِیْ حَوَائِجِكُمْ وَ الْجَأُوْا اِلَيْهِ فِیْ مُلِمَّاتِكُمْ وَ تَضَرَّعُوْا اِلَيْهِ وَ ادْعُوْهُ فَاِنَّ الدُّعَاءَ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔[۲]

اپنی حاجات اللہ کی بارگاہ میں لے جاؤ اور حوادث کی صورت میں اللہ کی پناہ میں جاؤ، اسی کی طرف گریہ وزاری کرو اور اسی کو پکارو، کیونکہ دعا عبادت کی روح ہے۔

۳۔ رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ.[۳]

تم اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کے یقین کیساتھ دعا کرو.

۴۔ رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الدُّعَاءُ وَ اِذَا اَذِنَ اللّٰهُ لِعَبْدٍ فِی الدُّعَاءِ فَتَحَ لَهٗ اَبْوَابَ الرَّحْمَةِ اِنَّهٗ لَنْ يَّهْلِكَ مَعَ الدُّعَاءِ اَحَدٌ ۔[۴]

بہترین عبادت دعا ہے۔ جب اللہ کسی بندے کو دعا کی اجازت دیتا ہے تو اس کے لیے رحمت کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔ یاد رکھو! جو دعا کا سہارا لے وہ ہلاکت میں ہرگز مبتلا نہ ہوگا۔

۵۔ امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

اَلدُّعَاءُ كَهْفُ الْاِجَابَةِ كَمَا اَنَّ السَّحَابَ كَهْفُ الْمَطَرِ ۔[۵]

دعا قبولیت کا خزانہ ہے جس طرح بادل بارش کا خزانہ ہے۔

۶۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلدُّعَاءُ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَ مَتَى تُكْثِرْ قَرْعَ الْبَابِ يُفْتَحُ لَكَ ۔[۶]

دعا مؤمن کی ڈھال ہے۔ جب دیر تک دروازے پر دستک دو گے تو آخر تمہارے لیے کھل جائے گا۔

۱۔ اصول الکافی ۲: ۴۶۸۔ کنز العمال جلد دوم حدیث: ۳۱۱۷
۲۔ المستدرک ۵: ۱۷۴
۳۔ حوالہ سابق ۵: ۱۹۰
۴۔ الوسائل ۷: ۳۱۔ کنز العمال جلد دوم حدیث ۳۱۴۷
۵۔ اصول الکافی ۲: ۴۷۱
۶۔ الوسائل ۷: ۳۹

۷۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلدُّعَاءُ مَفَاتِيْحُ النَّجَاحِ وَ مَقَالِيْدُ الْفَلَاحِ وَ خَيْرُ الدُّعَاءِ مَا صَدَرَ عَنْ صَدْرٍ نَقِيٍّ وَ قَلْبٍ تَقِيٍّ۔[1]

دعا کامیابی کی کنجی اور فتحیابی کا تمغہ ہے۔ بہترین دعا وہ ہے جو پاکیزہ سینے اور متقی دل سے نکلے۔

۸۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ ۔[2]

دعا عبادت کی روح ہے۔

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ۔[3]

دعا نفس عبادت ہے۔

آداب دعا

۱۔ دعا کی ابتدا بسم اللّٰہ سے ہو۔ رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

لَا يُرَدُّ دُعَاءٌ اَوَّلُهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔[4]

وہ دعا رد نہ ہوگی جس کی ابتدا بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم سے ہو۔

۲۔ محمد و آل محمد (ص) پر درود بھیجا جائے۔ پیغمبر اکرم (ص) سے روایت ہے:

صَلَاتُكُمْ عَلَيَّ اِجَابَةٌ لِدُعَائِكُمْ وَ زَكٰوةٌ لِاَعْمَالِكُمْ ۔[5]

مجھ پر تمہارا درود تمہاری دعاؤں کی قبولیت کا ضامن اور تمہارے اعمال کی تطہیر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

كُلُّ دُعَاءٍ مَحْجُوْبٌ عَنِ السَّمَآءِ تَعَالٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ۔[6]

محمد و آل محمد (ص) پر درود بھیجنے تک دعا اور آسمان کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے۔

۳۔ اعتراف گناہ کے بعد دعا کرنی چاہیے۔ حضرت صادق آل محمد (ص) سے منقول ہے:

اِنَّمَا هِيَ الْمِدْحَةُ ثُمَّ الثَّنَاءُ ثُمَّ الْاِقْرَارُ بِالذَّنْبِ ثُمَّ الْمَسْئَلَةُ ۔[7]

دعا فقط یہ ہے کہ پہلے خدا کی حمد و ثنا ہو، پھر گناہوں کا اعتراف اور آخر میں طلب حاجت۔

۴۔ خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگنی چاہیے۔ پیغمبر اکرم (ص) سے روایت ہے:

لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ دُعَآءَ قَلْبٍ سَاهٍ۔[8]

اللّٰہ غافل دلوں کی دعا قبول نہیں کرتا۔

اِغْتَنِمُوا الدُّعَاءَ عِنْدَ الرِّقَّةِ فَاِنَّهَا رَحْمَةٌ۔[9]

جب رقت طاری ہو جائے اس وقت دعا کرو کیونکہ رقت ایک رحمت ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۲ : ۴۶۸ [2] الوسائل ۷ : ۲۷ [3] کنز العمال جلد دوم حدیث: ۳۱۱۳
[4] مستدرك الوسائل ۵ : ۳۰۴ [5] الامالی للطوسی: ۲۱۵
[6] الوسائل ۷ : ۹۶۔ کنز العمال جلد دوم حدیث ۳۲۱۵۔ آل محمد کی جگہ اهل بیته ہے۔ [7] اصول الکافی ۲ : ۴۸۴
[8] الوسائل ۷ : ۵۳۔ کنز العمال جلد دوم حدیث ۳۱۷۶ [9] بحار الانوار ۹۰ : ۳۱۳۔ کنز العمال حدیث ۳۳۴۱

۵۔ دعا سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنی چاہیے۔
۶۔ اصرار کے ساتھ دعا کرنی چاہیے:
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُلَحِّیْنَ فِی الدُّعَاءِ.[1]　　اللہ تعالیٰ دعا میں اصرار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
۷۔ مناسب اوقات میں دعا کرنی چاہیے۔ مثلاً نماز وتر، فجر، ظہر اور مغرب کی نماز کے بعد۔
۸۔ اجتماعی دعا ہو تو بہتر ہے۔ حضرت امام جعفر صادق (ع) سے منقول ہے:
مَا مِنْ رَھْطٍ اَرْبَعِیْنَ رَجُلًا اِجْتَمَعُوْا فَدَعَوُا اللّٰہَ فِیْ اَمْرٍ اِلَّا اِسْتَجَابَ اللّٰہُ لَھُمْ ۔[2]　　چالیس افراد پر مشتمل اجتماع اگر دعا کرے تو ان کی دعا قبول ہوگی۔
۹۔ رازداری میں ہونی چاہیے۔
۱۰۔ چالیس مؤمنین کے لیے دعا: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:
مَنْ قَدَّمَ فِیْ دُعَائِہٖ اَرْبَعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ثُمَّ دَعٰی لِنَفْسِہٖ اُسْتُجِیْبَ لَہٗ ۔[3]　　اگر کوئی شخص پہلے چالیس مؤمنین کے لیے دعا کرے اور بعد میں اپنے لیے دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوگی۔
۱۱۔ دعا کثرت سے مانگنی چاہیے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:
اِذَا اُلْھِمَ اَحَدُکُمْ اَلدُّعَاءَ عِنْدَ الْبَلَاءِ فَاعْلَمُوْا اَنَّ الْبَلَاءَ قَصِیْرٌ۔[4]　　کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں بھی اگر دعا کرنے کو جی چاہے تو سمجھ لو کہ یہ بلا تھوڑی دیر کے لیے ہے۔
۱۲۔ نزول رحمت کے موقع پر دعا کرنی چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:
اِغْتَنِمُوْا الدُّعَاءَ عِنْدَ اَرْبَعٍ عِنْدَ قِرَائَۃِ الْقُرْاٰنِ وَ عِنْدَ الْاَذَانِ وَ عِنْدَ نُزُوْلِ الْغَیْثِ وَ عِنْدَ الْتِقَاءِ الصَّفَّیْنِ لِلشَّھَادَۃِ۔[5]　　چار موقعوں پر دعا کو غنیمت جانو: تلاوت قرآن کے موقع پر، اذان اور بارش کے موقع پر اور جب دو صفیں شہادت کے لیے آمنے سامنے ہوں۔
۱۳۔ رات کی تاریکی میں دعا کرنی چاہیے رسول اللہ (ص) سے مروی ہے:
اِذَا کَانَ آخِرَ اللَّیْلِ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ ھَلْ مِنْ دَاعٍ فَاُجِیْبَہٗ وَ ھَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِیْہِ سُؤْلَہٗ وَ ھَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَہٗ وَ ھَلْ مِنْ تَائِبٍ فَاَتُوْبُ عَلَیْہِ۔[6]　　جب رات کا آخری پہر آ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ہے کوئی جو دعا کرے کہ میں اس کی دعا قبول کروں۔ ہے کوئی سائل کہ میں سوال پورا کروں۔ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ اسے معاف کروں۔ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۵: ۱۹۳　[2] اصول الکافی ۲: ۴۸۷　[3] الوسائل ۷: ۱۱۷　[4] اصول الکافی ۲: ۴۷۱
[5] حوالہ سابق ۲: ۴۷۷　[6] الوسائل ۷: ۶۹

۱۴۔ توسل: داؤد رقی راوی ہے:

اِنِّی کُنْتُ اَسْمَعُ اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ اَکْثَرَ مَا یُلِحُّ بِہٖ فِی الدُّعَاءِ عَلَی اللّٰہِ بِحَقِّ الْخَمْسَۃِ یَعْنِیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ فَاطِمَۃَ وَ الْحَسَنَ وَ الْحُسَیْنَ عَلَیْھِمُ السَّلَام۔[1]

میں نے حضرت ابو عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام کو دعا کرتے ہوئے اکثر سنا کہ آپ پنجتن (ع) سے بہت زیادہ متوسل ہوتے تھے۔ یعنی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، امیرالمؤمنین، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن وحضرت امام حسین علیہم السلام سے متوسل ہوتے تھے۔

۱۵۔ اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا کی جائے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے

مَنْ قَالَ یَا اللّٰہُ یَا اللّٰہُ عَشَرَ مَرَّاتٍ قِیْلَ لَہٗ لَبَّیْکَ مَا حَاجَتُکَ۔[2]

اگر کوئی دس مرتبہ یا اللہ یا اللہ کہے تو اس سے کہا جاتا ہے: لبیک تیری حاجت کیا ہے؟

دعا اور عمل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

یَا اَبَاذَرْ مَثَلُ الَّذِیْ یَدْعُوْ بِغَیْرِ عَمَلٍ کَمَثَلِ الَّذِیْ یَرْمِیْ بِغَیْرِ وَتَرٍ۔[3]

جو شخص عمل کے بغیر صرف دعا پر اکتفا کرتا ہے وہ ایسا ہے جو بغیر کمان کے تیر چلائے۔

دعا کی عدم قبولیت کی حکمت: روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت امام حسن علیہ السلام سے فرمایا۔

وَ رُبَّمَا سَأَلْتَ الشَّیْءَ فَلَا تُؤْتَاہُ وَ اُوْتِیْتَ خَیْراً مِنْہُ عَاجِلاً اَوْ آجِلاً اَوْ صُرِفَ عَنْکَ لِمَا ھُوَ خَیْرٌ لَکَ فَلَرُبَّ اَمْرٍ قَدْ طَلَبْتَہٗ فِیْہِ ھَلَاکُ دِیْنِکَ لَوْ اُوْتِیْتَہٗ۔۔۔۔[4]

اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ تم ایک چیز مانگتے ہو اور وہ حاصل نہیں ہوتی مگر دنیا یا آخرت میں اس سے بہتر چیز تمہیں مل جاتی ہے یا تمہارے کسی بہتر مفاد کے پیش نظر تمہیں اس سے محروم کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ تم کبھی ایسی چیزیں بھی طلب کر لیتے ہو کہ اگر تمہیں دے دی جائیں تو تمہارا دین تباہ ہو جائے۔

دعا اور تقدیر: دعا کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے خالق اور اس کے مدبر کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے اور کائنات کے سرچشمۂ قوت اور منبع فیض سے فیض حاصل کیا جائے نیز اس خدا کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلایا جائے جو تمام علتوں کی علت اور پوری کائنات کا حقیقی مالک ہے۔

دعا کا مقصد اس قادر مطلق کی مشیت سے درخواست کرنا ہے کہ وہ اپنی لوح محو و اثبات میں سائل کی تقدیر بدل دے:

---

[1] اصول الکافی ۲: ۵۸۰　[2] حوالہ سابق ۲: ۵۱۹　[3] الوسائل ۷: ۸۴
[4] نہج البلاغۃ ۔ ۳۱ وصیت نامہ برائے امام حسن (ع) ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ ص ۶۷۳ ۔ طبع امامیہ کتب خانہ لاہور

یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ۝ [1]

اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام کی احادیث میں یہ بات کثرت سے ملتی ہے کہ دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلدُّعَاءُ یَرُدُّ الْقَضَاءَ الْمُبْرَمَ بَعْدَ مَا اُبْرِمَ اِبْرَامًا۔ [2]

دعا تقدیر کو اس وقت بھی بدل دیتی ہے جب وہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی ہو۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے:

عَلَیْکُمْ بِالدُّعَاءِ فَاِنَّ الدُّعَاءَ لِلّٰہِ وَ الطَّلَبَ اِلَی اللّٰہِ یَرُدُّ الْبَلَاءَ وَ قَدْ قُدِّرَ وَ قُضِیَ وَ لَمْ یَبْقَ اِلَّا اِمْضَائُہٗ فَاِذَا دُعِیَ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ سُئِلَ صُرِفَ الْبَلاءُ صَرْفَۃً۔ [3]

تم ہمیشہ دعا کیا کرو کیونکہ دعا اور اللہ کی بارگاہ سے کچھ مانگنے سے بلا دفع ہو جاتی ہے، اگرچہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہو اور صرف نافذ ہونا باقی رہ گیا ہو۔ پس جب اللہ سے دعا کی جاتی ہے اور سوال کیا جاتا ہے تو یہ بلا رفع دفع ہو جاتی ہے۔

دعا اللہ کا پسندیدہ عمل

ارشاد خداوندی ہے:

قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ ۔۔۔۔ [4]

کہدیجیے: اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی نہ کرتا۔

رسول اللہ (ص) سے منقول ہے:

اِنَّ اللّٰہَ تَبارک و تَعالٰی اَحَبَّ شَیْئًا لِنَفْسِہٖ وَ اَبْغَضَہٗ لِخَلْقِہٖ اَبْغَضَ لِخَلْقِہٖ اَلْمَسْئَلَۃَ وَ اَحَبَّ لِنَفْسِہٖ اَنْ یُّسْاَلَ وَ لَیْسَ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْ اَنْ یُّسْاَلَ۔۔۔۔ [5]

ایک چیز ایسی ہے جسے اللہ نے اپنے لیے پسند فرمایا اور خلق کے لیے پسند نہیں فرمایا۔ خلق سے سوال کرنے کو ناپسند فرمایا اور خود اپنی ذات سے سوال کرنے کو پسند فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سوال (دعا) سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ فِی الْاَرْضِ الدُّعَاءُ۔ [6]

روئے زمین میں اللہ کا سب سے زیادہ پسندیدہ عمل دعا ہے۔

---

[1] ۱۳ رعد: ۳۹ [2] المستدرک ۵: ۱۱۶۔ کنز العمال ج ۲ حدیث: ۳۱۲۰ [3] اصول الکافی ۲: ۴۷۰
[4] ۲۵ فرقان: ۷۷ [5] اصول الکافی ۴: ۲۰ [6] حوالہ سابق ۲: ۴۶۷

اللہ اپنے بندوں سے اس لیے محبت رکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہیں اور اپنی حاجت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کا فرق دیکھیے کہ مخلوق دوسروں کے سوال سے تنگ آ جاتی ہے، لیکن خالق مخلوق کے سوال سے خوش ہوتا ہے، بلکہ اس کے سوال نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا نہ کرنا بدبختی کا موجب ہے اور اس سے مانگنا اس کے ہاں عزیز ہونے کا طریقہ ہے۔

قبولیت دعا کی شرائط

۱۔ **معرفت الٰہی:** مروی ہے کہ امام جعفر صادق (ع) سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم دعائیں کرتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ تو آپ (ع) نے فرمایا:

لِاَنَّکُمْ تَدْعُوْنَ مَنْ لَا تَعْرِفُوْنَہٗ۔[۱] تم ایسی ذات کو پکارتے ہو، جس کی تم معرفت نہیں رکھتے۔

۲۔ **معرفت کے مطابق عمل:** ارشاد خداوندی ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ...[۲] اور میرے عہد کو پورا کرو کہ میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔

۳۔ **رزق حلال:** رسول اکرم (ص) نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُسْتَجَابَ دُعَاؤہ فَلْیُطَیِّبْ مَطْعَمَہ وَ مَکْسَبَہٗ۔[۳] جو یہ پسند کرتا ہو کہ اس کی دعا قبول ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی روزی اور کمائی کو پاکیزہ رکھے۔

۴۔ **حضور قلب:** رسول کریم (ص) سے منقول ہے:

لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ دُعَاءَ قَلْبٍ ساہٍ۔[۴] اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔

۵۔ **دوسرے مؤمنین کے لیے دعا:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے

مَنْ دَعَا لِمُؤْمِنٍ بِظَھْرِ الْغَیْبِ قَالَ الْمَلَکُ وَ لَکَ مِثْلُ ذٰلِکَ۔[۵] جو کسی مؤمن کے حق میں اس کی غیبت میں دعا کرے تو فرشتہ ندا دے گا: اس جیسی تیری حاجت بھی پوری ہو گی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

دُعَاءُ الْمَرْءِ لِاَخِیْہِ بِظَھْرِ الْغَیْبِ یُدِرُّ الرِّزْقَ وَ یَدْفَعُ الْمَکْرُوْہَ۔[۶] اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں دعا کی جائے تو اس سے رزق میں فراوانی آتی ہے اور بلا دفع ہوجاتی ہے۔

---

[۱] مستدرک الوسائل ۵: ۱۹۱ [۲] ۲ بقرہ: ۴۰ [۳] بحار الانوار ۹۰: ۳۷۲ عدۃ الداعی: ۱۳۹
[۴] الوسائل ۷: ۵۳ [۵] حوالہ سابق ۷: ۱۰۹ [۶] اصول الکافی ۲: ۵۰۷

۶۔خوشحالی کے دنوں میں دعا: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُسْتَجَابَ لَہٗ فِی الشِّدَّۃِ فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ۔[1]

جس کو یہ پسند ہو کہ مصیبت کے دنوں میں اس کی دعا قبول ہو تو وہ خوشحالی کے ایام میں کثرت سے دعا کیا کرے۔

۷۔گریہ و زاری: امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

وَ لَوْ اَنَّ بَاکِیًا بَکیٰ فِیْ اُمَّۃٍ لَرُحِمُوْا۔[2]

اگر امت میں ایک آدمی گریہ کرے تو سب پر رحم کیا جائے گا۔

دعا کی طاقت: جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ دعا کائنات کے مصدر طاقت کی طرف رجوع کرنے سے عبارت ہے۔ اگر دعا کرنے والا اس شعور و ادراک اور یقین و معرفت کے ساتھ دعا کرتا ہے کہ کائنات کا حاکم اعلیٰ اور صاحب اختیار و اقتدار فقط اللہ ہے تو اس کی دعا مؤثر ثابت ہو گی۔

رسالتمآب (ص) سے منقول ہے:

لَوْ عَرَفْتُمُ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ لَزَالَتِ الْجِبَالُ بِدُعَائِکُمْ۔[3]

اگر تم اللہ کی اس طرح معرفت حاصل کرو جس طرح اس کا حق ہے تو تمہاری دعا سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دعا کائنات کے خالق، حاکم اعلیٰ اور سرچشمۂ طاقت سے ارتباط کا نام ہے۔

۲۔ مطلوبہ شرائط کی حامل دعا تقدیر ساز اور مؤثر تربیتی عامل بن سکتی ہے۔

۳۔ دعا سے عدم دلچسپی راندۂ درگاہ الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۴۔ جامع الشرائط دعا کا قبول نہ ہونا ممکن ہی نہیں: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ؕ ہُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّہُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ

۱۸۷۔ اور روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو، اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، پس اللہ نے تم پر عنایت کی اور تم

---

[1] حوالہ سابق ۲: ۴۷۲　[2] اصول الکافی ۲: ۴۸۱　[3] مستدرک الوسائل ۱۷: ۳۰۱

فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ وَ عَفَا عَنۡکُمۡ ۚ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡہُنَّ وَ ابۡتَغُوۡا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ ۪ وَ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوۡہُنَّ وَ اَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ ۙ فِی الۡمَسٰجِدِ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَقۡرَبُوۡہَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾	سے درگزر فرمایا، پس اب تم اپنی بیویوں سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے اسے تلاش کرو اور (راتوں کو) خورد و نوش کرو یہاں تک کہ تم پر فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے، پھر رات تک روزے کو پورا کرو اور جب تم مساجد میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ، اس طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

تشریح کلمات

الرَّفَثُ: (ر ف ث) ہم بستری یا شہوانی فعل یعنی مطلق جنسی عمل سے مربوط ہر قول و فعل جس کا ذکر نامناسب ہو۔

تَخۡتَانُوۡنَ: (خ و ن) تم سب خیانت کرتے ہو۔

عٰکِفُوۡنَ: (ع ك ف) ایک جگہ عبادت کے لیے بیٹھنے والے۔

تفسیر آیات

شان نزول: ابتدائے اسلام میں ماہ مبارک رمضان کے دنوں میں رات کو سونے سے پہلے کھانا کھا سکتے تھے۔ اگر کوئی شخص سو جاتا پھر بیدار ہو جاتا تو اس کے لیے کھانا پینا حرام تھا نیز رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے مباشرت کرنا بھی حرام تھا، لیکن لوگ اس حکم میں خیانت کرتے تھے۔

اس آیت میں نیا حکم صادر فرمایا:

۱۔ روزوں کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کرنا جائز ہے: فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ ...۔
۲۔ فجر کی سفید دھاری نمایاں ہونے تک رات کو کھانا پینا حلال ہے: وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا ...۔
۳۔ روزے کی مدت فجر سے رات تک مقرر کر دی گئی: اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ ...۔

مرد و زن: عورتیں مردوں کے لیے لباس ہیں، اسی طرح مرد بھی عورتوں کے لیے لباس ہیں۔ جس طرح دونوں کا مقام، اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے یکساں ہے، اسی طرح دونوں کے لیے تعبیر بھی یکساں ہے۔ اس ارشاد میں لطافت ملاحظہ فرمائیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں اور لباس کی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ لباس جسم کے لیے زیب و زینت کا باعث ہے۔
۲۔ لباس انسان کے لیے ساتر اور بدن کو چھپانے کا سامان ہے۔
۳۔ لباس سے انسان کا جسم محفوظ رہتا ہے۔
۴۔ لباس اور جسم میں نہایت قریبی ربط ہے اور ان کے درمیان کسی شے کا فاصلہ نہیں۔
۵۔ لباس انسان کے لیے باعث سکون ہے۔

اور یہی خصوصیات میاں بیوی کے درمیان بھی موجود ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے زیب و زینت اور عزت کا باعث ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ستر پوشی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو منحرف اور سرکش ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ دونوں میں ارتباط بھی اس قدر نزدیک ہے کہ اور کوئی شے ان کے درمیان حائل نہیں ہوسکتی نیز میاں بیوی کو ایک دوسرے سے سکون بھی میسر آتا ہے۔

طلوع فجر: فجر کے معنی "شگاف" کے ہیں۔ صبح کی سفیدی رات کے سیاہ پردے کو چاک کر دیتی ہے، اس لیے اسے فجر کہتے ہیں۔ اسی طرح غروب کے وقت تاریکی دن کی روشنی پر غالب آ جائے تو اسے شفق کہتے ہیں۔

رات کے آخری حصے میں پہلے نسبتاً ہلکی سفیدی ظاہر ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ سفیدی ختم ہو جاتی ہے۔ اسے صبح کاذب کہتے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک روشنی عمودی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، پھر یہی روشنی افق پر مستطیل شکل میں ایک سفید دھاری کی طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ فجر یا صبح صادق ہے۔ چونکہ اب یہ روشنی سورج کی روشنی سے متصل ہونے کی وجہ سے سورج کے آنے کی سچی خبر دیتی ہے، اس لیے اسے فجر صادق کہتے ہیں۔

اعتکاف: جامع مسجد میں عبادت کے لیے بیٹھنا اعتکاف کہلاتا ہے۔ اعتکاف ایک بڑی بافضیلت عبادت ہے، خصوصاً رمضان کے آخری عشرے میں زیادہ فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے۔ یہ کم از کم تین دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اعتکاف میں دن کو

روزہ رکھنا شرط ہے اور صرف ضرورت کے لیے مسجد سے باہر جا سکتے ہیں۔

روزے کی راتوں میں عورتوں سے مباشرت کے جواز کے اعلان سے اس خیال کا ذہن میں آنا ایک طبعی امر تھا کہ اعتکاف کی راتوں میں بھی عورتوں سے مباشرت جائز ہو گی۔ اس خیال کو ختم کرنے کے لیے فرمایا: اعتکاف کی حالت میں اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

اہم نکات

۱۔ روزے کی راتوں میں ترک مباشرت کا حکم اٹھالیا جانا احکام کے سہل ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کی رعایت تقویٰ کا نقطہ آغاز ہے: فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ۔

تحقیق مزید

تفسیر القمی ۱: ۶۶، الکافی ۴ : ۹۸، العیاشی ۱: ۸۳

وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَى الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾

۱۸۸۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ ہی اسے حکام کے پاس پیش کرو تاکہ تمہیں دوسروں کے مال کا کچھ حصہ دانستہ طور پر ناجائز طریقے سے کھانے کا موقع میسر آئے۔

تشریح کلمات

مال: (م ی ل) میل سے مراد قلبی رجحان اور رغبت ہے۔ چنانچہ مال اس چیز سے عبارت ہے جس سے رغبت ہو جائے۔

بَاطِل: (ب ط ل) حق کی ضد۔ جلد زائل ہونے والی چیز۔

لَا تَاۡكُلُوۡۤا: (أ ك ل) یہاں کھانے سے مراد ہر قسم کا تصرف ہے۔ چنانچہ ہر زبان میں یہ محاورہ مستعمل ہے کہ لباس مکان وغیرہ پر مال خرچ ہوا ہو تو کہتے ہیں: اس نے اتنا مال کھایا۔

تُدۡلُوۡا: (د ل و) ادلاء یعنی کنویں سے پانی نکالنے کے لیے ڈول کو روانہ کرنا۔ یہاں پر یہ لفظ حکام کے پاس مال روانہ کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت سے درج ذیل احکام سامنے آتے ہیں:

۱۔ حکام کو رشوت دے کر مال کھانے کی کوشش نہ کرو۔
۲۔ حکام کی عدالت کے ذریعے ناحق دوسروں کا مال نہ کھاؤ۔ یعنی اگر تمہیں علم ہے کہ یہ مال حرام ہے تو خواہ عدالت تمہارے حق میں فیصلہ دے، پھر بھی تمہارے لیے وہ مال حرام ہے کیونکہ عدالت ظاہری شواہد پر عمل کرتی ہے اور تم حقیقت حال کے ذمہ دار ہو، خصوصاً جب تمہیں اس چیز کا علم بھی ہو۔
۳۔ اس آیت اور دیگر متعدد آیات سے انفرادی ملکیت ثابت ہوتی ہے کہ لوگ اپنے اموال کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسروں کے لیے ان پر ناحق قبضہ کرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں مذکور ہے:
حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ کَحُرْمَةِ دَمِهِ.[۱] مال مسلم کی وہی حرمت ہے جو اس کے خون کی ہے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:
فَاَمَّا الرِّشَا فِی الْحُکْمِ فَهُوَ الْکُفْرُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ۔[۲] (عدالتی) فیصلوں میں رشوت لینا خدائے عظیم سے کفر برتنے کے مترادف ہے۔

اہم نکات

۱۔ مال مسلم کا احترام واجب ہے: وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ ...
۲۔ اخلاقی اقدار مادی اقدار پر مقدم ہیں: وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَى الۡحُكَّامِ ...

تحقیق مزید

الکافی ۵: ۱۲۲، ۷: ۴۱۱

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَهِلَّةِ ؕ قُلۡ هِىَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ وَالۡحَجِّ ؕ وَلَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ

۱۸۹۔ لوگ آپ سے چاند کے (گھٹنے بڑھنے کے) بارے میں پوچھتے ہیں، کہد یجیے: یہ لوگوں کے لیے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہے اور (ساتھ یہ بھی کہد یجیے کہ حج کے احرام باندھو تو) پشت خانہ سے داخل ہونا کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور تم (اپنے) گھروں میں دروازوں

۱۔ بحار الانوار ۲۹: ۴۰۷　　۲۔ اصول الکافی ۵: ۱۲۷

اَبۡوَابِہَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ	سے ہی داخل ہوا کرو اور اللہ (کی ناراضگی)
تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۸۹﴾	سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

تشریح کلمات

اَلۡاَہِلَّۃِ: (ہ ل ل) ہلال کی جمع ہے اور ہلال ابتدائے ماہ کے چاند کو کہتے ہیں۔

مَوَاقِیۡتُ: (و ق ت) یہ میقات (مقررہ وقت) کی جمع ہے۔

تفسیر آیات

لوگ رسول اکرم (ص) سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے بارے میں سوال کرتے تھے کہ یہ کیا ہے؟ سوال کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ایک یہ کہ چاند کیوں خلق کیا گیا؟ دوسرا یہ کہ چاند کیوں گھٹتا اور بڑھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں ایسے سوالات کے جواب میں یہ بات مدنظر رکھتا ہے کہ سوال کرنے والے کی دنیاوی و اخروی زندگی سے مربوط نکتہ کیا ہے۔ پھر اسی نکتے کو بیان فرماتا ہے اور سوال کرنے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کے لیے کس چیز کے بارے میں سوال کرنا زیادہ بہتر ہے۔

چنانچہ ایک جگہ سوال ہوا کہ ہم کیا خرچ کریں؟ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ...[1] ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟'' جواب میں مطلوبہ سوال کا جواب دینے کی بجائے فرمایا: ''والدین، عزیزوں، یتیموں، مساکین اور مسافروں پر خرچ کرو''۔ اس جواب میں یہ تنبیہ ہے کہ سوال یوں ہونا چاہیے تھا کہ ہم کس پر خرچ کریں؟

یہاں بھی چاند کی فلکیاتی خصوصیات کو سمجھنے کی نہ تو سائل کو ضرورت ہے اور نہ ہی وہ اسے سمجھنے کا اہل ہے، البتہ یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے میں کیا مصلحت ہے؟ خالق نے اس چیز کو بیان فرمایا: یہ اوقات کے تعین کا ایک ذریعہ ہے۔

یہ ایک ایسی قدرتی تقویم ہے جسے ہر شخص بآسانی دیکھ سکتا ہے، ایک ایسی جنتری ہے جو آسمان پر آویزاں ہے، اسے تعلیم یافتہ بھی پڑھ سکتے ہیں اور ان پڑھ بھی، شہری بھی سمجھ سکتے ہیں اور دیہاتی بھی۔

اسی وجہ سے قمری تقویم قدیم زمانوں سے قابل عمل چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ مصری، سومری، یونانی اور دوسری قومیں قمری تقویم پر عمل پیرا تھیں۔ شمسی جنتری ہر شخص کے لیے قابل فہم نہیں ہے۔ چنانچہ یہ تقویم بہت سے مفکرین کی مسلسل کوششوں سے موجودہ شکل میں آ گئی ہے۔

عربوں کی توہم پرستانہ رسوم میں سے ایک یہ تھی کہ حج کے لیے احرام باندھنے کے بعد وہ اپنے

----

[1] ۲ بقرہ: ۲۱۵

گھروں میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار پھلانگ کر یا گھر کی عقبی کھڑکی سے داخل ہوتے تھے۔ ان اوہام کو ختم کرتے ہوئے قرآن کریم نے نیکی کا حقیقی معیار، تقویٰ بیان فرمایا ہے۔

احادیث

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلْاَوْصِیَاءُ هُمْ اَبْوَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ الَّتِیْ یُؤْتٰی مِنْهَا وَ لَوْ لَا هُمْ مَا عُرِفَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ بِهِمْ اِحْتَجَّ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی عَلٰی خَلْقِهِ۔[1]

(رسول (ص) کے) اوصیاء ہی اللہ کے دروازے ہیں جن سے داخل ہونا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو اللہ کی پہچان نہ ہوتی۔ انہی کے ذریعے سے اللہ نے اپنی مخلوق پر حجت قائم کی ہے۔

اگرچہ یہ آیت شان نزول کے لحاظ سے گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہونے والوں اور احرام باندھنے والوں سے مربوط ہے لیکن لفظ اور تعبیر میں عمومیت ہے اور درج بالا روایت اس عمومیت کی تطبیق کا ایک نمونہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ نیکی اور اچھائی کا معیار رسم پرستی نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔
۲۔ بے مقصد اور غیر مربوط سوال کرنا جاہلانہ عمل ہے۔
۳۔ غیر عاقلانہ سوالات کا جواب دینے کی بجائے ضروری نکات کی نشاندہی کرنی چاہیے۔

تحقیق مزید

المحاسن ۱: ۲۲۴، فقہ القرآن ۱: ۱۸۷

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾

۱۹۰۔ اور تم راہ خدا میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ تجاوز کرنے والوں کو یقیناً دوست نہیں رکھتا۔

تشریح کلمات

قتال: (ق ت ل) اس شخص کو قتل کرنے کی کوشش، جو اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔

شان نزول: یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی جب رسول خدا (ص) اپنے ایک ہزار چار سو

---

[1] اصول الکافی ۱: ۱۹۳

(۱۴۰۰) اصحاب کے ساتھ عمرہ کرنے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ جب حدیبیہ پہنچے تو مشرکین مکہ نے انہیں روک لیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے حدیبیہ میں ہی اپنی قربانیوں کو نحر (ذبح) کیا اور اس بات پر صلح ہوئی کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال رسول اللہ (ص) عمرہ ادا کرنے آئیں گے تو مشرکین مکہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے تاکہ حضور (ص) خانہ کعبہ کا طواف کر سکیں۔ چنانچہ آپ (ص) مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

آئندہ سال عمرہ بجا لانے کے لیے آپ (ص) اپنے اصحاب کے ساتھ تیار ہوئے تو ڈر تھا کہ قریش وعدوں پر شاید عمل نہ کریں اور راستہ روک لیں اور جنگ چھڑ جائے، جب کہ آپ (ص) ماہ حرام میں جنگ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

روایات کے مطابق مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ دعوت اسلام کی راہ میں مسلح مزاحمت کرتے ہیں، ان کے خلاف مسلح جہاد کرو۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو مخالفین کے ظلم وستم پر صبر اور مناسب وقت تک انتظار کی ہدایت کی جاتی تھی مثلاً:

كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ... [1]　　اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ... [2]　　پس آپ درگزر کریں اور نظرانداز کر دیں یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے۔

اس آیت میں تین قسم کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں:

۱۔ جہاد کا حکم: اور یہ ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو مسلمانوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ راہ خدا میں جہاد کا حکم: فتح و نصرت، غلبہ واقتدار اور مال غنیمت کا حصول ذاتی عناد کی تسکین اور کشور کشائی کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کی زمین پر خدا ہی کی حکومت کے قیام، مؤمنین کی حمایت اور ظلم وستم کے خاتمے کی خاطر جہاد کا مقدس فریضہ انجام دیا جائے۔

۳۔ حکم جہاد کے ساتھ حد سے تجاوز نہ کرنے کا حکم: اس حکم میں دفاع کی خاطر لڑی جانے والی جنگ کے لیے حدود اور قوانین بیان فرمائے۔ یہ حدود انسانی حقوق کا ابدی دستور ہیں۔ آج تک کی مہذب قوموں میں نہ ایسا جامع دستور موجود ہے، نہ کبھی انہوں نے اپنی جنگوں میں ان انسانی حقوق کا لحاظ رکھا ہے۔

احادیث کی روشنی میں جنگی حدود وقیود اور حربی اخلاق کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

۱۔ صرف ان سے لڑائی کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور دعوت اسلام کی راہ میں مسلح مزاحمت کرتے ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۷۷　[2] ۲ بقرہ: ۱۰۹

۲۔ دعوت الی الحق سے پہلے، جنگ میں پہل نہ کرو۔
۳۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں کو قتل نہ کرو۔
۴۔ دشمن کے مقتولوں کا مثلہ نہ کرو۔
۵۔ مویشیوں، کھیتوں اور درختوں کو بلاوجہ تباہ نہ کرو۔

اہم نکات

۱۔ اسلام ان لوگوں کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے جو مسلمانوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔

وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ وَ اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوۡہُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹۱﴾

۱۹۱۔ اور انہیں جہاں کہیں بھی پاؤ قتل کرو اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔ ہاں مسجد الحرام کے پاس ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک وہ وہاں تم سے نہ لڑیں، لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انہیں مار ڈالو، کافروں کی ایسی ہی سزا ہے۔

فَاِنِ انۡتَہَوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۹۲﴾

۱۹۲۔ البتہ اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

کلام کا رخ مشرکین مکہ کے ساتھ قتال کی طرف ہے۔ آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے دو نکات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مسلمان اس وقت کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دے چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ کعبہ اس وقت تک مشرکین کے قبضے میں تھا۔ ان حالات میں مسلمان حج کے لیے جاتے تو لڑائی کا چھڑ جانا ایک طبعی بات نظر آرہی تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ مشرکین کے ساتھ جہاں مقابلہ پیش آئے، ان سے لڑا جائے اور ان پر سختی کی جائے تاکہ وہ مکہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ جس طرح ان لوگوں نے ہجرت سے قبل اور بعد از ہجرت مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور صرف اسلامی نظریات و عقائد اپنانے کے جرم میں مسلمانوں کو تشدد کا

نشانہ بنایا تھا۔

فتنہ: لفظ فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد آزمائش و امتحان ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾[1]

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ کہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

اس کے برخلاف جب یہ لفظ انسان کی طرف منسوب ہو تو اس سے فساد مراد لیا جائے گا۔

فتنہ قتل سے بدتر ہے: وہ فتنہ جو انسان سے صادر ہوتا ہے، وہ قتل سے بھی برا ہے۔ اس آیہ شریفہ کی ترکیب سے معلوم ہوتا ہے کہ جس فتنے کے مشرکین مکہ مرتکب ہوئے تھے اور جو قتل سے بھی برا عمل تھا، وہ صرف عقائد و نظریات کی وجہ سے پرامن لوگوں کو گھروں سے نکالنا اور ان کا امن و سکون چھیننا تھا۔ لہٰذا اب ایسے لوگوں کے ساتھ قتال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جنہوں نے قتل سے بھی بدتر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ قتل سے دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جب کہ فتنہ و فساد کے نتیجے میں دو جرم واقع ہوتے ہیں:

۱۔ قتل اور کشت و خون بکثرت واقع ہوتے ہیں۔

۲۔ فتنہ و فساد پھیلانے والے، دوسرے لوگوں کو حق کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں تک حق کا پیغام نہیں پہنچنے دیتے۔ وہ حق پرستوں کے مقابلے میں عقل و منطق کی جگہ طاقت اور تشدد سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا فتنہ دنیاوی اور اخروی زندگی دونوں کے منافی جرائم کے ارتکاب کا موجب ہے۔

آیت میں بیان شدہ احکام کا خلاصہ

حکم ہوا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ جہاں کہیں بھی مقابلہ پیش آئے جنگ کرو۔ انہیں مکہ سے نکال دو، جس طرح انہوں نے تمہیں نکالا تھا، کیونکہ مشرکین مکہ نے فتنے کا ارتکاب کیا ہے جو قتل سے بھی برا عمل ہے۔ اس کے باوجود مسجد الحرام کے پاس ان سے قتال نہ کرو کیونکہ مسجد الحرام کی حرمت بہرحال ان تمام باتوں پر مقدم ہے۔ البتہ اگر مشرکین مسجد الحرام کے پاس لڑائی میں پہل کریں تو جواباً تم بھی ان کے ساتھ لڑو۔

ان تمام انسانیت سوز جرائم کے ارتکاب کے باوجود اللہ کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ۔[2] پس وہ اگر باز آجاتے ہیں تو اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ صرف عقائد و نظریات کی بنا پر، پرامن لوگوں کو ہراساں کرنا اور انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا مشرکین کا شیوہ ہے۔

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۱۔۲	[2] مصباح الکفعمی ص ۱۰۵

۲۔ اسلام کے اصلاحی اور تربیتی اصولوں کے مطابق فتنہ گر کو قتل کرنے میں ہی انسانیت کی بھلائی ہے۔

۳۔ مومن کی حرمت کعبہ سے بالاتر ہے۔[1]

۴۔ دشمن کی جنگی صلاحیت کو مفلوج کرنا چاہیے: وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ ....۔

وَ قٰتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ لِلّٰہِ ؕ فَاِنِ انۡتَہَوۡا فَلَا عُدۡوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹۳﴾	۱۹۳۔ اور تم ان سے اس وقت تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے، ہاں اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کا اصلی سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ فتنے کے مرتکب ہوئے ہیں جو قتل سے زیادہ سنگین گناہ ہے۔ بنابریں جنگ کا ہدف دفع فتنہ ہے کہ کوئی حق کے خلاف طاقت استعمال نہ کر سکے اور انسان امن و آشتی کی فضا میں حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دین صرف اللہ کا رہ جائے گا اور باطل ادیان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

غیر مسلم اقلیت: غیر مسلم اگر فتنہ پرور نہ ہو اور اپنے باطل نظریات کو لوگوں میں رائج کرنے اور حق کا راستہ روکنے میں کوئی کردار ادا نہ کرے تو اس آیت میں اس کے لیے پیغام امن ہے کہ اگر وہ فتنے سے باز آ جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی۔

چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۝[2]	جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، اللہ یقیناً انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے کفار کو ایمان کی دعوت دی جائے، نصیحت کی جائے اور ان کی ہدایت کے لیے کوشش ضرور کی جائے مگر ان کے خلاف طاقت استعمال نہ کی جائے، بلکہ ان کے مال و جان محفوظ ہونے

---

[1] حرمۃ المؤمن اعظم من حرمۃ ہذہ البنیۃ۔ بحار الانوار ۴۷: ۸۹
[2] ۶۰ ممتحنۃ: ۸

چاہئیں۔

البتہ اس عمومی حکم سے ظالموں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یعنی اگر انہوں نے حق کا راستہ روکنے کے لیے اہل حق پر ظلم و ستم ڈھایا ہو تو اس صورت میں مسلمان ان کو سزا دینے میں حق بجانب ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ اعلائے کلمہ حق ہی اسلامی جہاد کا مقصد ہے۔

۲۔ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے فتنے کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہے۔

۳۔ اسلام طاقت کے ذریعے اپنا عقیدہ مسلط نہیں کرتا۔

تحقیق مزید

آیات ۱۹۰ تا ۱۹۳: مجمع البیان ۱: ۵۹۰۔ ۵۱۱، الوسائل ۱۳: ۲۲۵

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾

۱۹۴۔ حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت کا مہینہ ہی ہے اور حرمتوں کا بھی قصاص ہے، لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی طرح زیادتی کرو جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ذی القعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب کے مہینے حج اور عمرہ کے لیے مختص تھے۔ ان مہینوں میں آپس میں جنگ کرنا حرام تھا۔ جاہلیت کے دور میں بھی اہل عرب اس بات کی پابندی کرتے تھے اور ان چار مہینوں میں لڑائیاں بند رکھتے تھے تاکہ لوگ امن و سکون کے ساتھ حج اور عمرہ بجا لائیں۔

کفار کا خیال یہ تھا کہ حرمت والے مہینوں میں مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان

پر حملہ کیا جائے تو مسلمان ان مہینوں کے احترام کی خاطر جوابی کارروائی نہیں کریں گے۔

اس آیہ شریفہ میں حکم ہوا کہ اگر کفار نے ان مہینوں کی حرمت کا خیال نہ رکھا تو مسلمان بھی ان حرمت والے مہینوں میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں کیونکہ حرمتوں کا بھی قصاص اور بدلہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی اگر وہ کسی مہینے کی حرمت کی خلاف ورزی کریں تو انہیں فوراً دندان شکن جواب دیا جائے۔ چنانچہ جب مشرکین مکہ نے واقعہ حدیبیہ والے سال میں رسول اکرم (ص) اور آپ (ص) کے اصحاب کو حج کرنے سے روکا اور ان پر تیروں اور پتھروں سے حملہ کیا تو رسول اکرم (ص) نے بھی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اصحاب سے بیعت لی۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

اسی طرح اگر وہ مسجد الحرام اور حرم کی حرمت کا پاس نہ رکھیں تو ان کے ساتھ انہی مقامات پر مقابلہ ہوگا اور وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ایک عمومی قانون ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی حرمت کو پامال کیا گیا، اسی مقام پر اس کا جواب دیا جائے گا۔ مثلاً اگر کسی پر مسجد میں حملہ ہوتا ہے تو مسجد ہی میں اسے جواب دینے کا حق رکھتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے طاقت کا بھرپور استعمال ضروری ہے۔
۲۔ دشمن کو کسی بہانے سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔
۳۔ دشمن کی شر انگیزیوں کی روک تھام، زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔
۴۔ جنگ میں اللہ کی نصرت صرف انہی مردان خدا کو حاصل ہوگی جو میدان کارزار میں بھی احکام الٰہی کے پابند ہوں گے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۲۲۷، التہذیب ۵ : ۴۱۹۔

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖ وَ اَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

۱۹۵۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کیا کرو، اللہ احسان کرنے والوں کو یقیناً پسند کرتا ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین کے ساتھ جنگ اور راہ خدا میں جہاد کا ایک حصہ مالی جہاد ہے۔ آیہ شریفہ میں اس بات کا حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر چہ مسلمان حق پر ہیں اور رب کی نصرت ان کے ساتھ ہے، لیکن پھر بھی چونکہ اس عالم میں علل و اسباب کا نظام کارفرما ہے، اس لیے جنگ میں کامیابی کے لیے عام علل و اسباب پر بھی تکیہ کرنا ہو گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنے کے مترادف ہو گا۔ اللہ کے وضع کردہ نظام کے مطابق عمل کرنا ہی احسان ہے۔ جنگ کے موقع پر جنگ کرنا، خرچ کی جگہ مال و دولت کو خرچ کرنا اور اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا احسان کے مواقع ہیں۔

انفاق اور ہلاکت کے باہمی ربط کا ذکر نہایت قابل توجہ ہے کہ انفاق کو وہی اہمیت حاصل ہے جو زندگی کو ہے اور انفاق سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔ انفاق ہی کے ذریعے قوم کی رگوں میں زندگی کی رمق باقی رہتی ہے۔

اس آیت سے خودکشی کی حرمت پر بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظاہری اور مادی علل و اسباب کو نظرانداز کرنا، جنگ میں شکست اور ہلاکت کا باعث ہے۔

۲۔ ترک انفاق، خود کو اور اسلامی معاشرے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴: ۵۳، الدر المنثور ۱: ۳۷۵، امالی الصدوق ص ۳۳۷۔

وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡہَدۡیِ ۚ وَ لَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَکُمۡ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡہَدۡیُ مَحِلَّہٗ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ بِہٖۤ اَذًی مِّنۡ رَّاۡسِہٖ فَفِدۡیَۃٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ

۱۹۶۔ اور تم لوگ اللہ کے لیے حج اور عمرہ مکمل کرو پھر اگر تم لوگ (راستے میں) گھر جاؤ تو جیسی قربانی میسر آئے کر دو اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے اپنا سر نہ مونڈھو، لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ روزوں سے یا صدقے سے یا

صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾	قربانی سے فدیہ دے دے، پھر جب تمہیں امن مل جائے تو جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرے سے بہرہ مند رہا ہو وہ حسب مقدور قربانی دے اور جسے قربانی میسر نہ آئے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات واپسی پر، اس طرح یہ پورے دس (روزے) ہوئے، یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے اہل وعیال مسجد الحرام کے نزدیک نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

تشریح کلمات

الْهَدْيِ: (ہ د ی) قربانی یا جو ہدیہ حرم یا اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے۔

نُسُكٍ: (ن س ك) عبادت ہو یا قربانی۔ جو بھی کام اللہ کی بارگاہ میں انجام دیا جائے۔

تفسیر آیات

حج ان مناسک سے عبارت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے مکہ میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اہل عرب بھی یہی عمل یعنی حج بجا لاتے تھے۔ اسلام نے اہل عرب کی بعض خرافات کی تطہیر کے بعد حقیقی حج کو برقرار رکھا۔ حج اسلامی شعائر میں سے ہے، بلکہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔

حج کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ حج افراد

۲۔ حج قران

۳۔ حج تمتع

مکہ کے باشندے حج افراد یا قران بجا لانے کے پابند ہیں جب کہ دور سے آنے والے حج تمتع بجا لاتے ہیں۔ فقہ جعفری کے مطابق باہر سے آنے والوں کے لیے حج تمتع کے علاوہ دوسرے حج بجا لانا درست

نہیں ۔

حج تمتع: حج تمتع کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں بجا لائے جاتے ہیں۔ یہ دور سے آنے والوں کے لیےایک رعایت ہے۔ جب کہ حرم کے نزدیک رہنے والوں کے لیے عمرے کی خاطر الگ سفر کرنا دشوار نہیں ہوتا۔

اس کی صورت یہ ہو گی: حج کے مہینوں شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجۃ کے ابتدائی دنوں میں ایک میقات سے عمرہ کے لیے احرام باندھا جائے۔ مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے اور نماز بجا لائی جائے۔ پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کی جائے۔ پھر تقصیر کر کے احرام کھول دیا جائے تا کہ ان پابندیوں سے نکل آئیں جو احرام کی وجہ سے عائد ہوگئی تھیں۔ پھر حج کے ایام آنے پر مکہ سے حج کے لیے احرام باندھا جائے۔

وجہ تسمیہ: عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کے لیے دوبارہ احرام باندھنے تک کے عرصے میں حاجی احرام کی پابندیوں سے آزاد رہتا ہے، اس لیے اسے حج تمتع (بہرہ مندی والا حج) کہا گیا ہے۔

پھر جب حج کے ایام آئیں تو نئے سرے سے حج کے لیے مسجد الحرام سے احرام باندھے، وقوف عرفات بجا لائے، مشعر الحرام کی طرف روانہ ہو، پھر منیٰ کی طرف جائے اور اعمال منیٰ بجا لائے، پھر مکہ آئے اور طواف و نماز بجا لائے، پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، طواف نساء بجالائے، پھر منیٰ واپس جائے وہاں چند شب بسر کرے اور شیطانوں کو پتھر مارے۔ مزید تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

یہ آیت درج ذیل احکام حج پر مشتمل ہے۔

۱۔ وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ: حج اور عمرہ محض اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لیے ہو، غیر خدا کے مقاصد اس میں شامل نہ ہوں ۔

۲۔ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ : احرام باندھنے کے بعد اگر تمہیں راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ پیش آئے جس کی وجہ سے آگے جانا ممکن نہ ہو تو اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو میسر آئے اللہ کے لیے قربان کر دو ۔

۳۔ وَلَا تَحۡلِقُوۡا: یعنی مذکورہ قربانی جب تک اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے، سر نہ مونڈھو۔ مقام سے مراد حجاج کے لیے منیٰ اور عمرہ کرنے والوں کے لیے مکہ ہے۔ واضح رہے کہ یہ رکاوٹ اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے ہو تو قربانی کو اس کے مقام پر روانہ کرنا چاہیے اور اگر یہ رکاوٹ دشمن کی طرف سے ہو تو جہاں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے، وہیں قربانی دے دے جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول کریم (ص) نے انجام دیا۔

۴۔ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا: اگر کسی بیماری یا سر میں تکلیف کی وجہ سے حاجی کے لیے اتنی دیر

سر نہ منڈوانا باعث زحمت ہو کہ قربانی منیٰ یا مکہ تک پہنچ جائے تو پہلے سر منڈوائے، لیکن وہ اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی سے دے۔ احادیث کے مطابق تین دن روزہ رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ایک دنبے کی قربانی دے۔

۵۔ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ ٝ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَۃِ اِلَی الۡحَجِّ: حالت امن میں عمرہ اور حج تمتع بجا لانا چاہے تو اسے بھی اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو قربانی میسر آئے، اسے اللہ کی بارگاہ میں پیش کرکے منیٰ کے مقام پر ذبح کرنا ہوگا۔

۶۔ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ: اگر وہ قربانی نہ دے سکے تو حج کے ایام میں تین دن اور واپس جانے کے بعد سات دن روزے رکھے۔

۷۔ ذٰلِکَ لِمَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ اَہۡلُہٗ حَاضِرِی الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ: حج تمتع کی یہ سہولت اور رعایت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ کے باشندے نہیں ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک باشندہ ہونے کی حد بندی اس طرح ہے کہ جو شخص مکہ سے ۸۸ کلومیٹر سے کم فاصلے پر رہتا ہو تو وہ مسجد الحرام کے نزدیک رہنے والوں میں شمار ہوگا۔ اس کے لیے حج تمتع درست نہیں ہے اور اگر ۸۸ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر رہتا ہو تو وہ دور شمار ہوگا اور حج تمتع بجا لائے گا۔ اس مسئلے میں اپنے مجتہد کا فتویٰ معلوم کریں۔

۸۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ: عرب جاہلیت میں یہ خیال عام تھا کہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کو بجا لانا بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرسودہ خیال کو رد کر دیا اور دور سے آنے والوں کے لیے یہ رعایت عطا فرمائی کہ وہ حج تمتع کی صورت میں عمرہ اور حج دونوں کو ایک ہی سفر میں بجا لائیں۔ جاہلیت کی فرسودہ رسوم کو توڑنا کچھ لوگوں پر گراں گزرنے کا احتمال تھا، اس لیے خبردار کیا گیا کہ حکم خداوندی کی مخالفت کر کے اللہ کے عقاب کے مستحق نہ بنیں، کیونکہ اللہ کا عقاب شدید ہے۔

حج تمتع کی مختلف صورتیں ہیں:

۱۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ حج کے مہینوں میں میقات سے عمرے کا احرام باندھے اور عمرے کے اعمال بجا لائے۔ پھر احرام کھول لے۔ پھر حج کے ایام آنے پر مکہ سے از سر نو حج کا احرام باندھے۔

شیخ طوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: بلخی نے کہا ہے کہ حضرت عمر نے اس سے منع کیا تھا۔ ان کا یہ قول مشہور ہے:

مُتْعَتَان کَانَتَا عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ (وَ آلِہٖ) وَ سَلَّمْ وَ اَنَا اَنْھٰی عَنْھُمَا وَ اُعَاقِبُ عَلَیْھِمَا: مُتْعَۃُ النِّسَاءِ وَ مُتْعَۃِ الْحَجِّ۔[1]

عہد رسالت میں دو متعہ موجود تھے لیکن میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں اور ان کے ارتکاب پر سزا دوں گا: ایک عورتوں کے ساتھ متعہ اور دوسرا حج کا متعہ۔

۲۔ حج تمتع کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان حج کے لیے احرام باندھے بعد میں اسے عمرے میں بدل دے، پھر حج کے ایام آنے تک احرام کھول لے۔ شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک یہ عمل جائز ہے اور روایت میں مذکور ہے کہ یہ عمل اصحاب رسول (ص) کے لیے جائز قرار دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے اسی حج تمتع سے منع کیا تھا۔

حضرت عمر نے ان الفاظ میں حج تمتع کو ممنوع قرار دیا:

فصلوا بین حجکم و عمرتکم فانہ اتم الحج احدکم و اتم بعمرتہ ان یعتمرفی غیر اشھر الحج۔[2]

اپنے حج اور عمرہ کے درمیان فاصلہ ڈالو۔ اس میں تمہارے حج کی تکمیل ہے اور عمرہ کی تکمیل اس میں ہے کہ یہ حج کے مہینوں میں نہ ہو۔

۱۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عمران بن حصین کی یہ روایت مشہور ہے۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

نزلت آیۃ المتعۃ فی کتاب اللہ و فعلنا ھامع رسول اللہ صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم ثم لم ینزل قرآن یحرمھا و لم ینہ عنھا حتی مات ، قال رجل برأیہ ما شاء۔[3]

کتاب خدا میں تمتع کی آیت نازل ہوئی۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم کی معیت میں اس پر عمل کیا۔ پھر نہ کوئی قرآن ایسا نازل ہوا جو اسے حرام کرے، نہ ہی رسول (ص) نے اس سے منع فرمایا یہاں تک کہ آپ (ص) کا وصال ہو گیا۔ ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہدیا۔

۲۔ عمران بن حصین اپنی موت کے نزدیک مطرف سے کہتے ہیں:

میں تجھ سے ایک حدیث بیان کروں، میرے بعد تیرے لیے مفید ہو گی۔ اگر میں زندہ رہا تو اسے پوشیدہ رکھو۔ میرے مرنے کے بعد چاہو تو بیان کرو۔ یاد رکھو رسول اللہ (ص) حج اور عمرہ ایک ساتھ بجا لائے۔ پھر اس بارے میں نہ اللہ کی کتاب میں کوئی بات نازل ہوئی، نہ اللہ کے نبی (ص) نے منع فرمایا۔

۱۔ تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد اول صفحہ ۱۶۷ ۲۔ موطا ۱: ۲۵۲۔ سنن بیھقی ۵: ۵

۳۔ صحیح مسلم ۱: ۴۷۴۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر ۷: ۲۴ مطبوعہ سنہ ۱۲۷۷۔ السنن الکبری ۵: ۳۰

ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہدیا۔[1]

۳۔ محمد بن عبد اللہ بن نوفل راوی ہیں:

جس سال معاویہ نے حج کیا، سعد بن مالک سے سوال ہوا: حج تمتع کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: بہت بہتر اور خوبصورت ہے۔ کہا گیا: عمر نے منع کیا تھا۔ کیا آپ عمر سے بہتر ہیں؟ کہا: عمر مجھ سے بہتر ہیں، لیکن یہ عمل رسول اللہ (ص)۔نے انجام دیا ہے جو عمر سے بہتر ہیں۔[2]

۴۔ محمد بن عبد اللہ، سعد بن ابی وقاص اور ضحاک کا مکالمہ سن رہے ہیں۔ یہ اس سال کا ذکر ہے جس میں معاویہ نے حج کیا تھا۔ موضوع مکالمہ عمرہ کے ساتھ حج تمتع کرنا تھا:

ضحاک: یہ عمل وہ کرسکتا ہے جو اللہ کے حکم کا جاہل ہو۔

سعد: بری بات کر دی میرے بھائی کے لال!

ضحاک: عمر بن خطاب نے اس سے منع کیا ہے۔

سعد: رسول اللہ (ص) نے اسے انجام دیا اور ہم نے بھی۔[3]

۵۔ سالم راوی ہے:

حضرت عمر کے فرزند عبد اللہ سے حج تمتع کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا: ہوسکتا ہے۔ کہا گیا: آپ اپنے والد کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ کہا: میرے والد نے وہ بات نہیں کہی جو تم کہتے ہو۔ انہوں نے تو کہا تھا عمرہ کو حج سے جدا کرو اور حج کے دنوں میں قربانی کے بغیر عمرہ نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے تھے حج کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی لوگ کعبہ جائیں۔ اب تم تمتع کو حرام قرار دیتے ہو اور اس پر لوگوں کو سزا دیتے ہو حالانکہ اللہ نے اسے حلال کیا ہے اور رسول اللہ (ص) نے اس پر عمل کیا ہے۔[4]

۶۔ سعید بن جبیر راوی ہے:

ابن عباس نے کہا: رسول اللہ (ص) نے تمتع کیا ہے۔

عروہ نے کہا: ابوبکر و عمر نے منع کیا ہے۔

ابن عباس: عریّہ آپ کیا کہتے ہیں؟

عریّہ: ابوبکر و عمر نے منع کیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم ۱: ۴۷۴۔ مسند احمد ۴: ۴۲۸۔ سنن نسائی ۵: ۱۴۹　[2] سنن الدارمی ۲: ۳۵

[3] صحیح الترمذی ۱: ۱۵۷۔ سنن النسائی ۵: ۵۲۔ سنن بیہقی ۵: ۱۷۔ الموطأ ۱: ۴۸　[4] السنن الکبری ۵: ۲۱

ابن عباس:

اراھم سیھلکون اقول قال رسول اللّٰہ و یقولون قال ابوبکر و عمر۔ [1]

میں دیکھتا ہوں یہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں رسول اللہ (ص) نے فرمایا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں ابو بکر و عمر نے کہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی احکام کی بجا آوری میں غفلت اور سستی باعث عذاب ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی احکام میں جہاں چھوٹ نہیں دی، وہاں آسان سے آسان راستوں کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۲۴۸، تفسیر العیاشی ۱ : ۸۸، التہذیب ۵ : ۳۳۳۔

اَلۡحَجُّ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِیۡہِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوۡقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ ؕ وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یَّعۡلَمۡہُ اللّٰہُ ؕ وَ تَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰی ۫ وَ اتَّقُوۡنِ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾

۱۹۷۔ حج کے مقررہ مہینے ہیں، پس جو ان میں حج بجا لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر حج کے دوران ہم بستری نہ ہو اور نہ فسق و فجور اور نہ لڑائی جھگڑا ہو اور جو کار خیر تم کرو گے اللہ اسے خوب جان لے گا اور زاد راہ لے لیا کرو کہ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے اور اے عقل والو! (میری نافرمانی سے) پرہیز کرو۔

تفسیر آیات

یہاں مناسک حج کی مزید تفصیل بیان ہو رہی ہے:

۱۔ حج کے مہینے معین ہیں اور یہ شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی ایام ہیں۔ ان مہینوں میں حج اور عمرہ تمتع بجا لانے کے لیے احرام باندھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں

---

[1] مسند احمد ۱ : ۳۳۷

صرف عمرہ مفردہ کے لیے احرام باندھا جاتا ہے۔

۲۔ حج کے لیے احرام باندھنے کے بعد عائد ہونے والی پابندیوں کا ذکر ہے، جن میں سرفہرست جنسی ملاپ ہے۔ یعنی احرام کی حالت میں نہ فقط ہمبستری ممنوع ہے، بلکہ ہر شہوانی قول وفعل حرام ہے۔

۳۔ فُسُوق حرام ہے۔ ہر قسم کی حرام چیزوں کا ارتکاب فُسُوق ہے۔ اگرچہ یہ حج کے علاوہ بھی حرام ہے، لیکن حج کے دنوں میں اس کی حرمت میں زیادہ شدت آجاتی ہے۔

۴۔ جِدَال: نزاع اور جھگڑا۔ فقہی ابواب میں اس سے مراد قسم کھانا ہے، خواہ وہ سچی قسم ہی کیوں نہ ہو۔ جاہلیت میں لوگ حج بیت اللہ کے لیے آتے تو بڑے بازار لگاتے، ان میں بیٹھ کر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے اور ایک دوسرے کو برے القاب کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ اس طرح حج کی عبادت لڑائی جھگڑے میں بدل جاتی تھی۔ اس قسم کی ممکنہ باتوں کے سدباب کے لیے اسلامی حج میں ان سب امور پر پابندی عائد کر دی گئی۔

۵۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر بات کا علم رکھتا ہے، لیکن خصوصی طور پر فرمانا کہ جو کار خیر تم بجا لاتے ہو اللہ کو اس کا علم ہے، عمل خیر کی ترغیب اور یہ بتانے کے لیے ہے کہ جب بھی کوئی عمل خیر انجام دو تو یہ عقیدہ ذہن میں زندہ رکھو کہ یہ عمل اللہ کے حضور انجام پا رہا ہے، کیونکہ اس کی ذات ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہ عقیدہ عمل صالح کی ترغیب اور عمل بد سے اجتناب کے لیے بے حد مؤثر ہے۔

۶۔ وَتَزَوَّدُوۡا: زاد راہ مہیا کرو کہ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔ یعنی اگر حج کے مختصر سفر کے لیے زاد راہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو آخرت کے طویل اور لامحدود سفر کے لیے زاد راہ کتنا ضروری ہوگا اور اس کے لیے بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔

احادیث

مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام نے وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ میں حج کو مکمل کرنے کے سلسلے میں فرمایا:

فَاِنَّ تَمَامَ الۡحَجِّ و العُمۡرَۃِ اَن لَّا یَرۡفُثَ وَ لَا یَفۡسُقَ وَ لَا یُجَادِلَ [۱]

حج و عمرہ کو مکمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان جنسی عمل انجام نہ دے، فسق و فجور کا ارتکاب اور جھگڑا نہ کرے۔

امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

---

[۱] الوسائل ۱۴: ۳۱۶

قَالَ مَادُوْنَ الْمَوَاقِیْتِ اِلٰی مَکَّۃَ فَھُوَ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ لَیْسَ لَھُمْ مُتْعَۃٌ۔[1]

میقاتوں کے اندر مکہ تک مسجد الحرام کے نزدیک والے ہیں اور ان کے لیے حج تمتع صحیح نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ حج خواہشات پر قابو پانے اور اخلاقیات کی رعایت کرنے کی تربیت گاہ ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴: ۲۸۹ ۔ ۳۳۷، الفقیہ ۲: ۳۲۸، التہذیب ۵: ۲۹۶، الوسائل ۱۱: ۲۸۔

لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۪ وَ اذۡکُرُوۡہُ کَمَا ہَدٰىکُمۡ ۚ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ ﴿۱۹۸﴾

۱۹۸۔ تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے چلو تو مشعر الحرام (مزدلفہ) کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہاری رہنمائی کی ہے، حالانکہ اس سے پہلے تم راہ گم کیے ہوئے تھے۔

تشریح کلمات

اَفَضۡتُمۡ: (ف ی ض) چلنا، روانہ ہونا، بہنا۔

عَرَفٰتٍ: (ع ر ف) اس مقام کا نام ہے جہاں نو (۹) ذی الحجہ کو حجاج ٹھہرتے ہیں۔ عَرَفات کی وجہ تسمیہ میں کئی احتمالات ہیں۔ اول یہ کہ حضرت ابراہیم (ع) کو یہاں اپنے خواب کی صداقت کی معرفت حاصل ہوئی۔ دوم یہ کہ جبرئیل نے اس مقدس مقام کا تعارف کرایا۔ سوم یہ کہ یہاں آ کر انسان، اللہ کی جلالت و عظمت کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ایام جاہلیت میں عربوں نے حج کو ایک تاجرانہ عمل بنا رکھا تھا۔ وہ ان دنوں بڑے بڑے بازار

---

[1] التہذیب ۵: ۳۳

لگاتے تھے۔ چنانچہ جب اللہ کا یہ فرمان نازل ہوا: فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰی تو مسلمانوں کے ذہن میں اس خیال کا آنا قرین قیاس تھا کہ دنیاوی و مادی امور کے لیے جدوجہد کرنا اعمال حج کے منافی ہے۔ یہ خیال دور کرنے کے لیے ارشاد ہوا کہ اللہ کا فضل تلاش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور یہ حج کے منافی بھی نہیں ہے۔

اس اعتبار سے ایام حج میں کسب حلال کا عمل حج کے منافی نہیں بلکہ حج کی طرح روزی کمانا بھی عبادت ہے۔ واضح رہے کہ احادیث کے مطابق فضل سے مراد کسب حلال ہے۔

۲۔ عرفات سے روانہ ہونے کے حکم سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ حج کا ایک اہم جزو عرفات میں ٹھہرنا ہے کیونکہ روانگی قیام کے بعد ہی متحقق ہوتی ہے۔

۳۔ مشعرالحرام کے پاس اللہ کو یاد کرنے کے حکم سے بھی مزدلفہ میں ٹھہرنے کا حکم واضح ہو جاتا ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۴۶۷، ۸ : ۱۴۴، التھذیب ۵ : ۴۵۶، الوسائل ۱۳: ۵۳

ثُمَّ اَفِیۡضُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۹۹﴾

۱۹۹۔ پھر جہاں سے لوگ روانہ ہوتے ہیں تم بھی روانہ ہو جاؤ اور اللہ سے معافی مانگو، یقیناً اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

قریش کا یہ زعم عام ہو گیا تھا کہ وہ اولاد اسماعیل (ع) ہونے کی بنا پر اہل حرم ہیں اور ان کا مرتبہ دوسروں سے کہیں بلند ہے۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ عرفات تک جانے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چونکہ عرفات حدود حرم سے باہر ہے، لہٰذا وہ مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے، جب کہ دوسرے لوگ عرفات تک جاتے تھے۔ اس امتیازی گھمنڈ کو مٹانے کے لیے یہ حکم آیا کہ سب ایک ہی انداز میں حج کریں اور سب پر عرفات تک جانا ضروری ہے اور گزشتہ غلطیوں کے لیے استغفار کرنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ حج درس مساوات ہے۔

۲۔ اسلام کی فدا کار اور معصوم ہستیوں، ان کی جدوجہد او ریادگار مقامات کے احترام کا عملی درس حج سے ملتا ہے۔

فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

۲۰۰۔ پھر جب تم حج کے اعمال بجا لا چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے آبا و اجداد کو یاد کیا کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ، پس لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے: ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں (سب کچھ) دے دے اور ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

تشریح کلمات

خَلَاقٍ: نصیب، حصہ۔

تفسیر آیات

۱۔ دور جاہلیت میں عرب اعمال حج سے فراغت کے بعد جلسے منعقد کرتے، ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے اور آباء و اجداد کے کارنامے بیان کرتے تھے۔ اس آیت میں جاہلانہ رسوم ختم کرکے اپنے آباء و اجداد کے ذکر کی طرح ذکر خدا کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ ذکر خدا اور اللہ کی بارگاہ میں دعا کے آداب یہ نہیں کہ انسان اللہ سے صرف دنیا طلب کرے جو وقتی اور زائل ہونے والی چیز ہے۔ ایسی دعا سے دنیا تو شاید مل جائے، لیکن آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا حج جیسی عظیم عبادت کے دوران اور اس کے بعد اللہ سے فقط دنیاوی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ اپنی اخروی زندگی کے لیے بھی کچھ مانگنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ حج سے حاصل شدہ معنویت کو برقرار رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ صرف دنیاوی آرزوؤں کی تکمیل کی خواہش ابدی زندگی میں محرومیت کا باعث ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴: ۵۱۶، الوسائل ۱۴: ۲۷۲۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً

۲۰۱۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: پالنے والے! ہمیں دنیا میں نعمت سے اور

وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾	آخرت میں بھی نعمت سے نواز نیز ہمیں آتش جہنم سے بچا۔

تفسیر آیات

اس آیۂ شریفہ سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ دنیا و آخرت کے معاملے میں متوازن مؤقف اختیار کرنا چاہیے۔ انسان نہ تو صرف دنیا کا طلبگار ہو اور نہ ہی ترک دنیا کر کے فقط آخرت کا طالب رہے:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔[۱] اسلام میں ترک دنیا کا تصور نہیں ہے۔

دنیاوی زندگی کے بارے میں اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ دنیا کو اگر صرف برائے دنیا اختیار کیا جائے اور اس حیات فانی کو ہی اپنا مقصد حیات بنا لیا جائے تو یہ دنیا داری ہے اور دنیا داروں کو آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔ دنیاوی زندگی حقیقی مقصد حیات نہیں، بلکہ یہ تو آخرت کی ابدی سعادت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے:

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ۔[۲] دنیا آخرت کے لیے کھیتی ہے۔

اس صورت میں یہ دنیاوی زندگی نہایت مقدس ہوگی اور اس زندگی کے لیے کی جانے والی ہر محنت اور کوشش عبادت شمار ہوگی۔ گزشتہ دونوں آیات کے لب و لہجے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ جہاں پر لوگ صرف دنیا کے طالب ہیں، وہاں ان کے عمل کے لیے لفظ حَسَنَةً استعمال نہیں فرمایا، لیکن جہاں پر لوگ دنیا کے ساتھ آخرت کے بھی طالب ہیں، وہاں دنیاوی عمل کے لیے بھی لفظ حَسَنَةً استعمال فرمایا، جس طرح آخرت کے لیے حَسَنَةً کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ دنیا میں الٰہی نعمات سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں گے، وہی لوگ اخروی نعمتوں کے امیدوار رہنے کے حقدار ہیں۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۴۰۶ ۔ ۵۲۱، الفقیہ ۳ : ۱۵۶۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ	۲۰۲۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾	اللہ بلا تاخیر حساب چکا دینے والا ہے۔

---

۱ مستدرک الوسائل ۱۴ : ۱۵۵ ۲ حدیث نبوی ۔ عوالی اللآلی ۱ : ۲۶۷

تفسیر آیات

۱۔ دنیا پرستوں کے لیے فرمایا: وَمَالَهٗ فِي الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور دنیا و آخرت دونوں میں توازن برقرار رکھنے والوں کے لیے فرمایا: لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا "انہیں اپنی کمائی کا حصہ ملے گا۔" ان کی کوئی کمائی، چاہے وہ دنیاوی ہو یا اخروی رایگاں نہیں جائے گی۔

۲۔ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ: یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنٰی میں سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بڑی سرعت سے حساب چکانے والا ہے، کیونکہ اس کے لیے اسے کسی زمانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ چشم زدن میں کائنات کا حساب لے سکتا ہے۔ وہ زمان اور زمانیت سے ماوراء ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ صرف دنیا مانگتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ صرف آخرت مانگتے ہیں، اللہ انہیں دنیا بھی دیتا ہے: لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا۔

وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِيۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

۲۰۳۔ اور گنتی کے (ان چند) دنوں میں اللہ کو یاد کرو، پھر کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں چلا گیا تو کوئی حرج نہیں اور کچھ دیر زیادہ ٹھہرے تو بھی کوئی گناہ نہیں، یہ اس شخص کے لیے ہے جس نے پرہیز ہے اور اللہ کا خوف کرو اور جان لو کہ (ایک دن) اس کے حضور پیش کیے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ: چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں۔ یعنی ذی الحجۃ کی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ تاریخ۔ ان ایام میں حاجی کو منیٰ میں ٹھہرنا ہوتا ہے اور احادیث کے مطابق پندرہ نمازوں کے بعد درج ذیل اذکار کا ورد کیا جاتا ہے:

اَللّٰهُ اَكۡبَرُ اللّٰهُ اَكۡبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكۡبَرُ اللّٰهُ اَكۡبَرُ وَ لِلّٰهِ الۡحَمۡدُ اَللّٰهُ اَكۡبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا اَللّٰهُ اَكۡبَرُ عَلٰى مَا رَزَقَنَا مِنۡ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ۔[1]

---

[1] اصول الکافی ۴: ۵۱۶

اگر کوئی حاجی تین دن کی بجائے دو دن ٹھہرے تو کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر تین دن پورے کرے تب بھی بہتر ہے۔ احادیث کی رو سے منیٰ میں صرف دو دن ٹھہرنا اس شخص کے لیے کافی ہے جس نے حج میں کوئی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ لیکن اگر وہ کسی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے تو اسے پورے تین دن منیٰ میں ٹھہرنا ہوگا چنانچہ لِمَنِ اتَّقٰی کا یہی مفہوم لیا گیا ہے۔

احادیث

مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ کی تفسیر میں فرمایا:

قَالَ یَعْنِیْ الرِّزْقَ اِذَا اَحَلَّ الرَّجُلُ مِنْ اِحْرَامِهٖ وَ قَضَی نُسُکَهٗ فَلْیَشْتَرِ وَ لْیَبِعْ فِی الْمَوْسِمِ.[1]

یہاں فَضۡلًا سے مراد روزی ہے۔ بنابریں حج کا احرام کھولنے کے بعد موسم حج میں خرید و فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً کے بارے میں فرمایا:

رِضْوَانُ اللّٰهِ وَ الْجَنَّةُ فِی الْاٰخِرَةِ وَ الْمَعَاشُ وَ حُسْنُ الْخُلْقِ فِی الدُّنْیَا.[2]

لفظ حَسَنَۃً سے آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور جنت، جبکہ دنیا میں اچھی معیشت اور اچھا اخلاق مراد ہے۔

وَاللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

مَعْنَاهُ اَنَّهٗ یُحَاسِبُ الْخَلْقَ دَفْعَةً کَمَا یَرْزُقُهُمْ دَفْعَةً.[3]

وہ مخلوق کا حساب ایک ساتھ چکائے گا، جس طرح سب کو ایک ساتھ روزی عطا فرماتا ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۵۱۶، التھذیب ۵ : ۲۶۹۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُهٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

۲۰۴۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں آپ کو پسند آئے گی اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بنائے گا حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡهَا وَ یُهۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَ النَّسۡلَ ؕ وَ

۲۰۵۔ اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو یہ سرتوڑ کوشش کرتا پھرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دے اور اللہ

---

[1] الوسائل ۱۱ : ۶۰　[2] اصول الکافی ۵ : ۷۱　[3] بحار الانوار ۷ : ۲۵۳

اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

فساد کو پسند نہیں کرتا۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُہٗ جَہَنَّمُ ؕ وَ لَبِئۡسَ الۡمِہَادُ ﴿۲۰۶﴾

۲۰۶۔ اور پھر جب اس سے کہا جائے: خوف خدا کرو تو نخوت اسے گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے، پس اس کے لیے جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

اَلَدّ: (ل د د) دشمنی رکھنے والا۔ جھگڑالو۔

اَلۡعِزَّۃُ: (ع ز ز) غرور اور نخوت کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اگرچہ یہ آیات ایک منافق اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئیں اور اس شخص کے اندر وہی مذموم اوصاف موجود تھے جو آیت میں مذکور ہیں۔ لیکن تفسیری اصول میں ایک کلیہ ہے: فَانّ الاعتبارَ بِعُمُوْمِ الْلَفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَبَبِ۔[1] لفظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے، سبب کے خاص ہونے کا نہیں۔ بنابریں اگرچہ ممکن ہے کہ آیت کے نزول کا سبب کوئی خاص بات ہو، لیکن تعبیر اور الفاظ عام ہیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت ہر اس شخص سے متعلق ہے جس میں درج ذیل اوصاف پائے جاتے ہوں:

۱۔ جو اپنے آپ کو بہت زیادہ خیر خواہ ظاہر کرتا ہو۔ جیسا کہ استعمار اور اکثر حکمران اپنے آپ کو عوام کا خیر خواہ اور سچا خادم ظاہر کرتے ہیں۔

۲۔ جھوٹی قسمیں زیادہ کھاتا ہو۔

۳۔ جب بھی کوئی اقتدار یا موقع میسر ہو تو فتنہ و فساد برپا کرے۔

۴۔ جس پر نصیحتوں کا منفی اثر پڑتا ہو اور جو حق کے سامنے جھک جانے کو عار و ننگ سمجھے۔

یہ ایک ایسے انسان کا نمونہ ہے جو پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا ہوا ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۰۴: مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۰۱، شرح نہج البلاغۃ ابن الحدید ۴: ۷۲۔

آیت ۲۰۶: بحار الانوار ۷۱: ۱۸۴، تفسیر الامام ص ۶۱۷

---

[1] بحار الانوار ۶۳: ۱۲۱

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

۲۰۷۔ اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضاجوئی میں اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔

تفسیر آیات

یہ ایک ایسی ہستی کا نمونہ ہے جو اس رفیع مقام پر فائز ہے جہاں تک رسائی حاصل کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ مقام رضائے رب کا مقام ہے اور اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا انسانی معراج کا آخری درجہ ہے۔ کیونکہ جب وہ رضائے خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو گویا اپنی خودی کو مرضات خدا میں فنا کر دیتا ہے، لہٰذا اس کا پورا وجود رضائے الٰہی میں ڈھل جاتا ہے:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[1]		اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے۔

بنابریں وہ جان بھی بڑی باعظمت ہے جو اس عظیم چیز پر قربان ہو جاتی ہے۔

اس آیت کی شان نزول کے حوالے سے لکھتے ہیں: یہ ایک صحابی رسول (ص) صہیب رومی کی شان میں نازل ہوئی، جس نے اپنا سارا مال دے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ جب کہ آیت کا مضمون جانی قربانی کے بارے میں ہے، مالی قربانی کے بارے میں نہیں۔ آیت کے مضمون اور شان نزول کے درمیان اس تضاد کے باوجود مفسرین کے ایک معتدبہ گروہ نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے اور ان روایات کو یکسر نظرانداز کیا ہے جو مضمون آیت کے عین مطابق ہیں، یعنی یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔ جب آپ (ع) ہجرت کی رات رسول اکرم (ص) کے بستر پر سوئے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔

حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے والی اس آیت کے راوی درج ذیل شخصیات ہیں:

۱۔ ابن عباس		ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۱: ۱۲۷۔ امالی طوسی ص ۴۴۶
۲۔ انس بن مالک		ملاحظہ ہو امالی طوسی ص ۴۴۶
۳۔ ابوسعید خدری		ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۱: ۱۲۳۔ الارشاد ۲: ۲۲۴
۴۔ الامام علی بن الحسین علیہما السلام ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۱: ۱۳۰
۵۔ خدیجۃ الکبری		ملاحظہ ہو ینابیع المودۃ ص ۹۲
۶۔ سدی		ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۱: ۱۲۹

---

[1] ۹ توبہ: ۷۲

۷۔ الامام الحسن علیہ السلام۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ السبط ص ۱۱۵۔ شرح نہج البلاغۃ ۲ : ۱۰۳

ابوجعفر اسکافی راوی ہے کہ معاویہ نے سمرۃ بن جندب کو ایک لاکھ کی پیشکش کی کہ آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ ...، علی (ع) کی مذمت میں اور آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ...، ابن ملجم کی شان میں نازل ہونے کی روایت جعل کی جائے۔ سمرۃ نے انکار کیا۔ دو لاکھ کیا گیا۔ انکار کیا۔ تین لاکھ پر بھی انکار کیا۔ آخر میں چار لاکھ کرنے پر راضی ہو گیا اور روایت جعل کی۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغۃ ۴ : ۷۲۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۰۸﴾

۲۰۸۔ اے ایمان لانے والو! تم سب کے سب (دائرہ) امن و آشتی میں آ جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡکُمُ الۡبَیِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۰۹﴾

۲۰۹۔ اور اگر ان صریح نشانیوں کے تمہارے پاس آنے کے بعد بھی اگر تم لڑکھڑا جاؤ تو جان رکھو کہ اللہ بڑا غالب آنے والا، باحکمت ہے۔

تشریح کلمات

السِّلۡمِ: (س ل م) امن، صلح اور آشتی۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ ۔[1] "اور اگر وہ صلح و آشتی کی طرف مائل ہو جائیں"۔

کَآفَّۃً: (ك ف ف) پوری جماعت۔ سب کے سب۔

تفسیر آیات

خدا اور رسول (ص) پر ایمان لانے کے بعد مؤمنین کے لیے ایک دعوت عام ہے کہ وہ بلا استثنا سب کے سب امن و سکون و صلح و آشتی کے دائرے میں داخل ہو جائیں: السِّلۡمِ اور کَآفَّۃً سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تمام مؤمنین کو ایک ہی جماعت کے اندر امن و سکون سے رہنے اور آپس میں ہر قسم کی جنگ و جدال سے اجتناب کرنے کی دعوت دے رہا ہے:

----

[1] ۸ انفال: ۶۱

۱۔ خدا پر ایمان کے بعد ظلم اور زیادتی جیسے گناہوں سے بچیں اور اپنے ضمیر اور وجدان کے مطابق عمل کر کے نفسیاتی طور پر امن وسکون حاصل کریں:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ...[۱] جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا، یہی لوگ امن میں ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کر کے اس کی شریعت کے ساتھ عملی مخاصمت سے اجتناب کرو:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ...[۲] اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں، ان کی اطاعت کرو۔

بعض مفسرین نے السِلۡم سے مراد اطاعت لی ہے۔ اور بعض روایات میں ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہے کہ ہماری ولایت ومحبت ہی السِّلۡمِ ہے۔ بنابریں یہ لفظ اطاعت کے مفہوم کے تحت آ جاتا ہے۔

۳۔ بعض مفسرین کے نزدیک السِّلۡمِ سے مراد اسلام ہے۔ لیکن یہ معنی قرآن کی مجموعی تعلیمات کے مطابق درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اسلام کے بعد ایمان کا مرحلہ آتا ہے:

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا...[۳] بدوی لوگ کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں، کہد یجیے: تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یوں کہو: ہم اسلام لائے ہیں۔

جب کہ اس آیت میں اہل ایمان سے خطاب ہے۔ لہٰذا مؤمنین سے یہ کہنا کہ تم اسلام میں داخل ہوجاؤ بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا، مگر یہ کہ اسلام سے مراد زبانی اقرار نہ ہو، بلکہ قلباً ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کرنا مراد ہو۔ یعنی اللہ و رسول(ص) کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔ اس میں اپنا فیصلہ شامل نہ کرو۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ...[۴] اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے۔

ہاں اس اسلام اور تسلیم میں داخل ہونے کے بعد ہر طرح سے امن وسلامتی ہو گی۔ جیسا کہ مروی ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) نے ارشاد فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَ یَدِهِ ۔[۵] مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔

---

[۱] ۶ انعام: ۸۲ [۲] ۴ نساء: ۵۹ [۳] ۴۹ حجرات: ۱۴ [۴] ۳۳ احزاب: ۳۶ [۵] اصول الکافی ۲: ۲۳۳ ۔ الفقیہ ۴: ۳۶۲

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ”شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو“۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے کی صورت میں انسان کو امن و سلامتی میسر نہیں آتی، نہ تو اپنے ضمیر کی طرف سے اور نہ ہی معاشرے کی طرف سے۔ شیطان کا پیروکار دنیا میں بھی ہمیشہ بدامنی کا شکار رہتا ہے اور آخرت میں بھی اسے سکون میسر نہ ہوگا۔

احادیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً کی تفسیر میں مروی ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا:

فِی وِلَایَتِنَا[1]　ہم اہل بیت (ع) کی محبت میں داخل ہو جاؤ۔

دوسری روایت میں فرمایا:

اُمِرُوۡا بِمَعۡرِفَتِنَا۔[2]　انہیں ہماری معرفت کا حکم دیا گیا ہے۔

دیگر متعدد احادیث میں وارد ہے کہ اہل بیت علیہم السلام اہل ارض کے لیے امان اور سفینۂ نجات ہیں.

اہم نکات

۱۔ ایمان کے بعد سب سے اہم انسانی ضرورت ہمہ گیر اور مکمل امن و امان ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۔

۲۔ شریعت پر مکمل عمل، جملہ امور کو اللہ کے حوالے کرنے اور اللہ کی طرف سے معین اولی الامر کی معرفت و اطاعت کے ذریعے ہی امن و امان حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ خدا کے احکام اور اس کی طرف سے مقرر شدہ حاکم کی مخالفت ظلم اور بدامنی کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۰۸ : الکافی ۱ : ۴۱۷، تفسیر العیاشی ۱ : ۱۰۲، تفسیر فرات ص ۶۶۔

هَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ قُضِیَ الۡاَمۡرُ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۲۱۰﴾

۲۱۰۔ کیا یہ لوگ منتظر ہیں کہ خود اللہ بادلوں کے سائبان میں ان کے پاس آئے اور فرشتے بھی اتر آئیں اور فیصلہ کر دیا جائے!؟ جب کہ سارے معاملات کو اللہ ہی کے حضور پیش ہونا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۱ : ۴۱۷　[2] بصائر الدرجات ص ۵۲۵

تشریح کلمات

ظُلَلٍ: (ظ ل ل) ظلۃ کی جمع ہے۔ سایہ کے معنوں میں ہے۔

الْغَمَامِ: (غ م م) بادل کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن مجید میں بعض تعبیرات ایسی ہیں جن میں بظاہر اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ایک ناممکن شے کی نسبت دی جاتی ہے۔ مثلاً:

وَّ جَآءَ رَبُّکَ وَ الۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا...[1]　　اور آپ کے پروردگار (کا حکم) اور فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے۔

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے لیے آنا جانا اس معنی میں ممکن نہیں جس معنی میں جسم رکھنے والی چیزوں کے لیے ممکن ہے۔ اسی لیے مفسرین یہاں تاویل کرتے ہیں اور اس تعبیر کو عذاب یا امر خدا کے آنے وغیرہ کے معنوں میں لیتے ہیں۔

لیکن یہاں کسی تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس آیت میں تو یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے صریح نشانیوں کے بعد بھی تمہیں یقین نہیں آتا اور تردد کا شکار رہتے ہو اور اس انتظار میں ہو کہ خدا خود اپنے فرشتوں سمیت تمہارے سامنے آجائے، تو یہ انتظار نامعقول ہے کیونکہ تمہارے ایمان کے لیے ہماری صریح نشانیاں کافی ہیں اور ان کے باوجود ایک محال امر کا مطالبہ ان کے ایمان کے لیے عذر نہیں بنتا۔

محسوس پرستوں کا یہ نامعقول مطالبہ ہمیشہ رہا ہے۔ چنانچہ رسول کریم (ص) سے ایک مقام پر ان لوگوں نے مطالبہ کیا:

اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا [2]　　یا خود اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔

اہم نکات

۱۔ رویت خدا کا مطالبہ نامعقول اور محسوس پرستی کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ہٹ دھرمی اور انتہا پسندی محسوس پرستوں کا خاصہ رہی ہے۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۹ : ۲۸۲، عیون اخبار ۱ : ۱۲۵

سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ　　۲۱۱۔ آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے

---

[1] ۸۹ فجر: ۲۲　　[2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹۲

اٰيٰتٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنۡ يُّبَدِّلۡ نِعۡمَةَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

انہیں کتنی واضح نشانیاں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت پانے کے بعد اسے بدل ڈالے تو اللہ یقیناً سخت عذاب والا ہے۔

تفسیر آیات

خطاب اگرچہ رسول (ص) سے ہے، لیکن ان لوگوں کو سمجھانا مقصود ہے جو اللہ کی واضح اور صریح نشانیوں کے باوجود اس پر ایمان نہیں لاتے۔ بنی اسرائیل ہی کو دیکھ لیں کہ اللہ نے انہیں کس قدر صریح نشانیاں اور واضح معجزے دکھائے، اس کے باوجود وہ اللہ کی رویئت کے منتظر رہے اور طرح طرح کے نامعقول عذر تراشتے رہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرما رہا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے، دنیا میں دوسروں پر برتری دیتا ہے، ہدایت و رہنمائی کے لیے ان کے پاس انبیاء بھیجتا ہے اور انہیں واضح اور صریح معجزے دکھا دیتا ہے، اس کے باوجود بھی وہ ان نعمتوں کو بدل ڈالیں اور ان کے ذریعے دارین کی سعادت حاصل کرنے کی بجائے شقاوت پر ڈٹے رہیں تو پھر اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دلائل، معجزے، ہدایت اور رہنمائی اللہ کی عظیم نعمتیں ہیں۔

۲۔ آیات بینات یعنی واضح دلائل کی مخالفت کرنا کفران نعمت اور عذاب الٰہی کا موجب ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَيَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۘ وَالَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

۲۱۲۔ جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی خوش نما بنا دی گئی ہے اور وہ دنیا میں مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں مگر اہل تقویٰ قیامت کے دن ان سے مافوق ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تفسیر آیات

یہاں کافر اور مؤمن کا کائناتی موقف نیز مادی اور الٰہی انسان کا تصور حیات بیان ہو رہا ہے۔ کافر کے تصور حیات میں دنیاوی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ وہ اس زندگی کی حقیقی اقدار کو نہیں جانتا:

یَعۡلَمُوۡنَ ظَاہِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا [1] لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کے بارے میں جانتے ہیں.

کافر کی نظر میں یہ زندگی بذات خود مقصد حیات ہے۔ لہٰذا وہ صرف کھانے پینے اور اس کی لذتوں سے بہرہ مند ہونے کو ہی مقصد قرار دیتا ہے:

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ ... [2] اور جو لوگ کافر ہو گئے وہ لطف اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں تو جانوروں کی طرح کھاتے ہیں۔

ایسے لوگ انسانی اقدار کو نہیں جانتے اور نہ کسی معیار و میزان سے آشنا ہیں۔ وہ خواہشات کے غلام اور لذتوں کے بندے ہیں۔ اسی مادی، پست اور حقیر کسوٹی کے مطابق وہ ہر چیز کو پرکھنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اسی معیار کے مطابق وہ مؤمنین کو حقیر سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ زندگی کی ان مادی اور ظاہری قدروں کے مطابق وہ اپنے آپ کو مافوق اور بالاتر خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں انسانی اعلیٰ اقدار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور آخرت کی ابدی اور دائمی زندگی میں بھی اپنے آپ کو بالا اور والا تصور کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ معنوی اقدار پر مادی اقدار کو ترجیح دینا کافرانہ سوچ کا شاخسانہ ہے۔

۲۔ اہل ایمان دنیا کی رنگینیوں سے دھوکہ نہیں کھاتے۔

۳۔ ایسا نادان اور پست شخص ہی دنیا کی حقیر زندگی پر فریفتہ ہوسکتا ہے جسے آخرت کی عظیم نعمتوں کا ادراک نہ ہو۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۟ فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۪ وَ اَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا

۲۱۳۔ لوگ ایک ہی دین (فطرت) پر تھے (ان میں اختلاف رونما ہوا) تو اللہ نے بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان امور کا فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے اور ان میں

---

[1] ۳۰ روم: ۷ [2] ۴۷ محمد: ۱۲

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾	اختلاف بھی ان لوگوں نے کیا جنہیں کتاب دی گئی تھی حالانکہ ان کے پاس صریح نشانیاں آ چکی تھیں یہ صرف اس لیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے، پس اللہ نے اپنے اذن سے ایمان لانے والوں کو اس امر حق کا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

تفسیر آیات

تاریخ مذہب کے سلسلے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان نے زندگی کا آغاز شرک سے کیا۔ بعد میں تدریجاً ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے وہ توحید تک پہنچ گیا۔

قرآن کریم کے نزدیک انسان نے دین فطرت پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور جس فطرت و جبلت پر لوگ خلق ہوئے ہیں، وہی دین ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ ...[1]	اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے ....

جس وقت تک انسان نے فطری تقاضوں سے سرکشی نہیں کی، سب لوگ امت واحدہ کے دائرے میں داخل تھے۔ کیونکہ ابتدائی انسان وسائل زندگی محدود ہونے کی وجہ سے سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ اسرار طبیعت سے آگاہ نہ تھا، اس لیے اسے مسخر نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو صرف جنگل، شکار، غار اور پتھر کے چند اوزاروں سے ہی واسطہ پڑتا تھا۔ بلا تشبیہ وہ جانوروں کی طرح تھا جو دن بھر قدرتی غذائیں چرتے اور رات کو کسی اصطبل میں ایک ساتھ بغیر اختلاف کے رہتے ہیں۔ بعد میں جب انسان نے زراعت کے ذریعے طبیعت کو مسخر کرنا شروع کیا تو اس کی صلاحیتیں اور قابلیت مختلف ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے اور مفادات کے حصول کے لیے اختلاف کا میدان وجود میں آیا نیز طبیعتاً اجتماعی ہونے کی وجہ سے اکیلا زندگی

---

[1] ۳۰ روم: ۳۰

نہیں گزار سکتا تھا، لہٰذا سے اپنے ہم نوعوں کی ضرورت پیش آئی اور ساتھ یہ کہ زندگی کے لوازم کفایت کی حد تک فراواں نہیں تھے، جس طرح ہوا کی فراوانی ہے۔ لہٰذا اختلاف رونما ہونا ایک لازمی امر تھا۔ کیونکہ ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جو لوازم اور وسائل فراہم ہیں، انہیں وہ خود ہی حاصل کر لے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخۡتَلَفُوۡا ... [1] — اور سب انسان ایک ہی امت تھے پھر اختلاف رونما ہوا۔

اس فطری اختلاف کی صورت میں اجتماعی عدالت کا قیام ایک ضروری امر ہے اور اجتماعی عدالت صرف قانون کے زیر سایہ ہی میسر آ سکتی ہے۔ لہٰذا یہاں قانون سازی کا مرحلہ پیش آتا ہے اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ سب سے پہلے دین کی طرف سے قانون سازی ہوئی۔ دینی قوانین کی تقلید کرتے ہوئے دوسروں نے قوانین بنانا شروع کیے۔

دین کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں پہلی قانون سازی عمل میں آئی:

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا ... [2] — اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔

چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول حدیث میں آیا:

كَانُوْا قَبْلَ نُوْحٍ اُمَّةً وَاحِدَةً عَلٰى فِطْرَةَ اللّٰہِ۔ [3] — لوگ حضرت نوحؑ سے قبل فطرت الٰہی کے مطابق ایک ہی امت تھے۔

جب لوگوں کو انبیاء کے ذریعے قانون دیا گیا تو خدائی قانون سے بغاوت کرنے والوں نے اختلاف کی بنیاد ڈالی۔ انسانی تمدن میں رونما ہونے والا پہلا اختلاف اجتماعی زندگی کا ایک طبیعی امر تھا۔ لیکن بعد کا اختلاف قانون سے بغاوت تھا، جسے کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انسان کو جب قانون دے دیا گیا، اس کے بعد سے کفر و ایمان کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بالفاظ دیگر پہلا اختلاف فطری تقاضوں اور دوسرا اختلاف قانون و شریعت سے انحراف کی وجہ سے پیش آیا۔

اہم نکات

۱۔ ابتدائی دور میں انسان خالص فطری زندگی کی بدولت اختلافات سے محفوظ تھے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ...۔

۲۔ مادی ترقی کی وجہ سے لوگ فطری طور طریقوں کو ترک کرتے گئے اور مفادات کی خاطر اختلافات

---

[1] ۱۰ یونس: ۱۹ [2] ۴۲ شوریٰ: ۱۳ [3] بحار الانوار ۱۱: ۱۰

کا شکار ہو گئے۔

۳۔ الٰہی قانون، صالح افراد کی قیادت اور جزا و سزا پر ایمان کے ذریعے ہی اختلافات کی بیخ کنی اور اجتماعی عدالت کا قیام ممکن ہے۔

۴۔ قانون آنے کے بعد اختلاف کرنے کی وجہ صرف سرکشی ہے: ... وَ مَا اخۡتَلَفَ فِیۡہِ اِلَّا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡہُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ....

۵۔ قوانین شریعت لوگوں کو فطرت کی طرف لوٹاتے ہیں، لہٰذا شریعت کا باغی فطرت کا باغی کہلائے گا: کَانَ النَّاسُ ... بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ۔

تحقیق مزید

الکافی ۸ : ۸۲، تفسیر العیاشی ۱ : ۱۰۴۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

۲۱۴۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس قسم کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلوں کو پیش آئے تھے؟ انہیں سختیاں اور تکالیف پہنچیں اور وہ اس حد تک جھنجھوڑے گئے کہ (وقت کا) رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اٹھے کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ (انہیں بشارت دے دی گئی کہ) دیکھو اللہ کی نصرت عنقریب آنے والی ہے۔

تفسیر آیات

یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ خدا اپنے برگزیدہ بندوں کو جن تربیتی مراحل سے گزارتا ہے، ان کی نشاندہی فرما رہا ہے نیز یہاں ایک غلط تصور کا ازالہ بھی مقصود ہے۔

غلط تصور: عام تصور یہ ہے کہ لوگ صرف ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کو ہر چیز کے لیے کافی سمجھتے ہیں حتیٰ کہ طبیعی علل و اسباب کے لیے بھی اپنے ایمان و اسلام سے توقع رکھتے ہیں کہ بغیر کوشش کیے مفت میں کامیابی مل جائے گی۔

الٰہی سنت یہ رہی ہے کہ مفت میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر مفت میں ملے تو سب کو ملنی چاہیے اور سب کو ملے تو بغیر استحقاق اور اہلیت کے بھی ملنی چاہیے اور یہ ایک عبث کام بن جاتا ہے۔ اس لیے حکمت الٰہی کے تحت ضروری ہوا کہ کامیابی کے راستوں کو دشوار بنا دیا جائے اور تمام کامیابیوں کے لیے جدوجہد کرنا ضروری ہو۔ پھر جنت اور ابدی زندگی کے حصول کے لیے آزمائش اور امتحان کے کٹھن مراحل سے گزرنا اور ایسی مشکلات اور تکالیف کا مقابلہ ضروری ہو جہاں کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور سچے اہل ایمان دوسروں سے جدا ہوجاتے ہیں اور صرف صبر و تحمل کرنے والے ہی اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بھی اتنی تکلیف دہ اور طاقت فرسا مشکلات کے بعد کہ رسول جیسی ہستی اور مؤمنین اللہ کی نصرت کے لیے چیخنے پر مجبور ہوجاتے ہیں: ''اللہ کی نصرت کب آئے گی؟'' تاکہ استحقاق اور اہلیت کے حامل افراد ہی مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ سے آگے کامیابی کی حقیقی منزل کو پا سکیں۔ آیت سے ان مصائب اور مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے جن سے مؤمنین کو آزمایا جاتا ہے۔ فلسفہ امتحان پر ہم اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ راہ خدا میں مشکلات اور کٹھن آزمائش سے گزرے بغیر جنت کی خواہش خام خیالی ہے: اَمۡ حَسِبۡتُمۡ ....۔

۲۔ آزمائش خدا کا ایک دائمی قانون ہے جس سے ہر شخص کو گزرنا ہوگا۔

۳۔ نصرت خداوندی، آزمائش میں آخر دم تک ثابت قدمی کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے: مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ۔

تحقیق مزید

غیبۃ الطوسی ص ۴۵۸، مکارم الاخلاق ۴۴۶، منتخب الانوار ص ۳۲۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۱۵﴾

۲۱۵۔ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ کہدیجیے: جو مال بھی خرچ کرو اپنے والدین، قریب ترین رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو کار خیر تم بجا لاؤ گے یقیناً اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

سوال یہ ہوا تھا کہ ہم کیا خرچ کریں؟ لیکن جواب میں معاشرے کے ان اہم افراد کا ذکر ہو رہا ہے جن پر مال خرچ ہونا چاہیے۔ اندازِ جواب سے ظاہر ہے کہ اصل میں سوال یوں ہونا چاہیے تھا کہ ہم کن لوگوں پر خرچ کریں؟ پھر انفاق میں مال کی کمیت اور جنس کے مقابلے میں مستحقین کے تعین اور ترجیحات کا ذکر فرمایا کہ وہ بالترتیب والدین، رشتہ دار، یتیموں، فقراء و مساکین اور زاد راہ سے تہی دامن مسافر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مستحقین کے تعین کے بعد ان کی ضرورت کے مطابق مال خرچ کرنا چاہیے: مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ ....۔

کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ وَ ہُوَ کُرۡہٌ لَّکُمۡ ۚ وَ عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَ عَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾

۲۱۶۔ تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے جب کہ وہ تمہیں ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار گزرے مگر وہی تمہارے لیے بہتر ہو جیسا کہ ممکن ہے ایک چیز تمہیں پسند ہو مگر وہ تمہارے لیے بری ہو اور (ان باتوں کو) خدا بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

صدر اسلام میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو جہاد فی سبیل اللہ کو سعادت سمجھتے تھے اور انہیں جہاد کا عشق تھا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ضرور تھے جنہیں جہاد ناگوار گزرتا تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت اتری ہے، لیکن خطاب سب سے ہے۔ قوموں میں اگر اس قبیل کے کچھ لوگ موجود ہوں تو پوری قوم کو مخاطب کر کے بات کی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی پسند اور ناپسند کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کی دلیل نہیں: وَ عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا ....۔

۲۔ احکام خداوندی ناگوار گزرنا ایمان کی کمزوری اور جہالت کی علامت ہے۔

۳۔ شرعی احکام، لوگوں کی پسند و ناپسند کے تابع نہیں ہوا کرتے: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ ....۔

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۴، دعائم الاسلام ۱: ۳۳۹ ـ ۳۴۱، الکافی ۲: ۱۶۰، ۵: ۲ تا ۲۲، التہذیب ۶: ۱۲۱، الاستبصار ۳: ۲

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّہۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡہِ ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ کُفۡرٌۢ بِہٖ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ٭ وَ اِخۡرَاجُ اَہۡلِہٖ مِنۡہُ اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ وَ لَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ حَتّٰی یَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِکُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾

۲۱۷۔لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہد یجیے: اس میں لڑنا سنگین برائی ہے لیکن راہ خدا سے روکنا، اللہ سے کفر کرنا، مسجد الحرام کا راستہ روکنا اور حرم کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک زیادہ سنگین جرم ہے اور فتنہ انگیزی، خونریزی سے بھی بڑا گناہ ہے اور وہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہوں گے اور ایسے لوگ اہل جہنم ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

شان نزول

رسول خدا (ص) نے قریش کی نقل و حرکت اور ان کے ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے عبد اللہ بن جحش کی سربراہی میں ایک دستہ نخلہ کی طرف بھیجا، جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ

ہے۔ یہاں پہنچ کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ان کا سامنا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس پر حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کیا اور دو کو اسیر بنا لیا۔ پھر انہیں مال سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ رجب کے آخری دن پیش آیا تھا اور رجب ماہ حرام ہے، اس میں جنگ کرنا حرام ہے، لیکن یہ شبہ بھی موجود رہا کہ ہوسکتا ہے کہ قتل اول شعبان میں واقع ہوا ہو اور چونکہ شعبان ماہ حرام نہیں، اس لیے جنگ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے باوجود مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کہ محمد (ص) حرمت والے مہینوں میں بھی خونریزی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں مشرکین مکہ کی ان خلاف ورزیوں کا ذکر ہے جو وہ مسلمانوں کے خلاف کرتے رہے ہیں اور جن کی برائی ماہ حرام میں لڑائی سے بھی زیادہ سنگین ہے:

۱۔ راہ خدا سے روکنا، یعنی لوگوں کو اپنی پسند کا برحق مذہب قبول کرنے کی اجازت نہ دینا اور اس امر میں ان کی آزادی، جو ایک انسانی حق ہے، سلب کرنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا جو نہایت سنگین جرم ہے۔

۳۔ مسجد الحرام کی حرمت کو پامال کرنا۔

۴۔ مکہ کے باشندوں کو صرف عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر وہاں سے نکال دینا جو ایک عظیم جرم ہے۔ جیسا کہ کفار نے رسول خدا (ص) اور مؤمنین کو مکہ سے نکالا تھا۔

۵۔ ان کا فتنہ جو قتل و خونریزی سے بھی بدتر ہے۔

۶۔ مذہبی اور نظریاتی بنیادوں پر اپنے جرائم کا سلسلہ جاری رکھنا اور مسلمانوں کو دوبارہ کافر بنانے کی سرتوڑ کوشش کرنا۔

۷۔ آخر میں تنبیہ کی گئی کہ خبردار اگر کسی نے اپنا مذہب بدل دیا اور وہ کفر کی حالت میں مر گیا تو اس کے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ فتنہ انگیزی قتل سے بھی سنگین جرم ہے: وَالۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ....۔

۲۔ انسانی حقوق کی پامالی، ماہ حرام کی ہتک حرمت سے زیادہ سخت ہے: قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَکُفۡرٌۢ بِہٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ٭ وَاِخۡرَاجُ اَہۡلِہٖ مِنۡہُ اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰہِ ....۔

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۱۱: ۴۸۔ بحار الانوار ۵۶: ۱۶۔ قصص الراوندی ص ۳۳۹

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾

۲۱۸۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے نیز جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

هجرت: (ہ ج ر) جدائی اور مفارقت کے معنوں میں ہے۔ ہجرت کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ درجہ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف جانا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) سے سوال ہوا کہ کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا:

مَنْ هَجَرَ السَّيِّئَاتِ ... ۔[1]	مہاجر وہ ہے جو گناہوں سے دور رہے....

چنانچہ حضرت لوط (ع) نے فرمایا:

اِنِّیۡ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۔[2]	میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں یقیناً وہی بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

کفار کے خوف سے مرتد ہونے والوں کے اعمال برباد ہونے اور عذاب جہنم میں ان کے ہمیشہ رہنے کی تنبیہ کے بعد اہل ایمان کا مقام بیان ہو رہا ہے کہ جو لوگ ایمان پر ثابت قدم رہنے کے بعد اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ہجرت اور جہاد کرتے ہیں، ایسے لوگ رحمت خدا کی امید رکھنے والے ہیں۔

رجاء :یعنی امید۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مومن خوف و رجاء اور امید و بیم کے درمیان رہتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِنًا حَتّٰى يَكُوْنَ خَائِفاً رَاجِياً وَ لَا يَكُوْنُ خَائِفاً رَاجِياً حَتّٰى يَكُوْنَ عَامِلًا لِمَا يَخَافُ وَ يَرْجُوْ ۔[3]	کوئی مومن اس وقت تک حقیقی مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ خوف و امید رکھنے والا نہ ہو اور خوف و امید نہیں رکھ سکتا جب تک خوف و امید کے مطابق عمل نہ کرے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۷۷ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲۶ [3] اصول الکافی ۲: ۷۱

کافی میں منقول ہے کہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا: آپ (ع) کے چاہنے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم امید رکھتے ہیں تو آپ (ع) نے فرمایا:

كَذَبُوْا لَيْسُوْا لَنَا بِمَوَالٍ أُوْلٰئِكَ قَوْمٌ تَرَجَّحَتْ بِهِمُ الْاَمَانِيُّ مَنْ رَجَا شَيْئاً عَمِلَ لَهُ وَ مَنْ خَافَ مِنْ شَيْءٍ هَرَبَ مِنْهُ۔[1]

وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ ہمارے چاہنے والے نہیں ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں آرزوؤں نے آ لیا۔ جو شخص کسی چیز کی امید رکھتا ہے تو اس کے لیے محنت کرتا ہے اور جس چیز سے خوف کھاتا ہے، اس سے فرار کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان، جہاد اور ہجرت، رحمت خداوندی کے طلب گار ہونے کی دلیل ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۔

۲۔ عمل کے بغیر اللہ کی رحمت کی امید رکھنا قرآنی تعلیمات اور مکتب اہل بیت (ع) کے منافی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

۲۱۹۔ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجیے: ان دونوں کے اندر عظیم گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی، مگر ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ ہے اور یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہدیجیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لیے کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو،

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۭ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ

۲۲۰۔ دنیا اور آخرت کے بارے میں اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجیے: ان کی اصلاح بہت اچھا کام ہے

---

[1] حوالہ سابق ۲: ۶۸

لَّهُمۡ خَيۡرٌ ؕ وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۰﴾	اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو (اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تکلیف میں ڈال دیتا، یقیناً اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡخَمۡرِ: (خ م ر) کسی چیز کے چھپانے کے معنوں میں ہے، کیونکہ شراب عقل کو پس پردہ ڈال کر اسے زائل کر دیتی ہے اور اس کی وجہ سے اچھی اور بری چیز میں تمیز نہیں ہو سکتی۔

الۡمَيۡسِرِ: (ی س ر) جوئے کو مَیۡسِر (آسان) کہتے ہیں، کیونکہ جوئے کے ذریعے آسانی سے پیسہ ہتھیا لیا جاتا ہے۔

اِثۡمٌ: (ا ث م) پیچھے رہنا اور تاخیر کے معنوں میں آتا ہے۔ لہٰذا کار خیر سے پیچھے رکھنے والی ہر چیز کو اثم یعنی گناہ کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

شراب نوشی ایام جاہلیت میں ایک عام بیماری تھی، جس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسے معاشرے سے دور کرنے کے لیے حکمت عملی اختیار کی گئی۔ چنانچہ شراب کی حرمت کو تدریجاً چار مرحلوں میں بیان اور نافذ کیا گیا:

۱۔ سب سے پہلے مکہ میں یہ آیت اتری، جس میں شراب جیسی ناپاک چیزوں کی حرمت کی طرف اشارہ فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَ مَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَ الۡبَغۡيَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ...[1]	کہدیجیے: میرے رب نے علانیہ اور پوشیدہ بے حیائی (کے ارتکاب)، گناہ، ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام کیا ہے۔

۲۔ شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا:

---

[1] ۷ اعراف: ۳۳

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی ...[1]	اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو۔

۳۔ اس کے بعد زیر بحث آیت نازل ہوئی۔ اس میں شراب اور جوئے کے نقصانات کی طرف اشارہ فرمایا گیا اور اس بات کو بھی قبول کیا گیا کہ اس میں کچھ فوائد بھی ہیں جو گناہ کے مقابلے میں کم ہیں۔ اس میں حرمت کی تصریح ہے۔ کیونکہ شراب کو اثم یعنی گناہ کہا گیا ہے۔

۴۔ آخر میں شراب اور چند دیگر چیزوں کی حرمت کے بارے میں فیصلہ کن حکم آ گیا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَیۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾[2]	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں، پس اس سے پرہیز کرو تاکہ تم نجات حاصل کر سکو۔

وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا: جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اثم کے معنی میں سستی اور پسماندگی کا مفہوم مضمر ہے اور آیہ شریفہ کے مطابق شراب اور جوئے میں یہ اثرات بہت بڑے پیمانے پر موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ:

۱۔ طبی لحاظ سے بادہ خواری سے معدہ، آنتوں، جگر، اعصاب، شریانوں، قلب اور حواس مثلاً بصارت وغیرہ پر برے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور شرابی معاشروں میں ان برے اثرات کے بے پناہ اعداد و شمار سامنے آتے رہتے ہیں۔

۲۔ اخلاقی لحاظ سے شراب انسان کو درندہ بنا دیتی ہے جسے جرائم کے ارتکاب، قتل و غارت اور عصمت دری وغیرہ میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔

۳۔ عقلی نقطۂ نظر سے شراب انسان سے اس کی انسانیت کو سلب کر لیتی ہے۔ عام طور پر آدمی غیر انسانی حرکتوں سے اس لیے باز رہتا ہے کہ اس میں ضمیر، غیرت و حمیت، مہر و محبت، شرم و حیا، ایثار و احسان، ہمدردی اور رحم جیسے پاک جذبات موجود ہوتے ہیں۔ شراب انسان سے ان تمام اقدار کو سلب کر لیتی ہے اور انسان کو احساس جرم و گناہ سے محروم کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا میں بہت سے انفرادی و اجتماعی جرائم شراب نوشی کے بالواسطہ یا بلا واسطہ اثرات ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۴۳　[2] ۵ مائدہ: ۹۰

جوئے اور دیگر شیطانی اعمال کے بارے میں ہم سورۂ مائدہ میں تفصیل بیان کریں گے۔

رسول اکرم (ص) سے ایک سوال یہ ہوا تھا کہ ہم کیا خرچ کریں؟ حکم ملا کہ انہیں کہد یجیے: اپنی ضروریات سے زائد مال کو راہ خدا میں خرچ کریں۔ یعنی زکوٰۃ اور خمس دینے کے بعد بھی اگر مال ان کی ضروریات سے زائد ہو تو اسے راہ خدا میں خرچ کر دیں اور معاشرے میں اقتصادی اور طبقاتی توازن برقرار رکھیں۔

یتیم کے مال کے بارے میں پہلے نہایت شدید احکام آئے اور قرآن نے یتیم کا مال کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنے سے تشبیہ دی۔ اس پر مسلمانوں نے یتیموں سے میل جول ترک کر دیا تو سوال پیدا ہوا کہ ان کی دیکھ بھال کس طرح کی جائے؟ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر ان سے مل جل کر ان کی دیکھ بھال ہو سکتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یعنی یتیم کے مال سے پرہیز کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ اس سے ہر قسم کی دوری اختیار کر لی جائے، بلکہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس کے اموال و حقوق کا تحفظ ممکن ہے۔ یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملا کر انصاف سے خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اصلاح اور خرابی کا تعلق ارادے اور عمل سے ہے، دکھاوے سے نہیں۔ جو لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور اسی طرح جو فسادی ہیں، اللہ ان کی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔

احادیث

حدیث نبوی ہے:

اِنَّ الْخَمْرَ رَاْسُ کُلِّ اِثْمٍ۔[1]　　شراب تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام حضرت رسول خدا (ص) سے روایت فرماتے ہیں:

لَعِنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فِی الْخَمْرِ عَشَرَۃً: غَارِسَھَا وَ حَارِسَھَا وَ عَاصِرَھَا وَ شَارِبَھَا وَ سَاقِیْھَا وَ حَامِلَھَا وَ الْمَحْمُوْلَۃَ اِلَیْہِ وَ بَایِعَھَا وَ مُشْتَرِیْھَا وَ آکِلَ ثَمَنِھَا۔[2]

رسول خدا (ص) نے شراب کے بارے میں دس افراد پر لعنت بھیجی ہے: پودا لگانے والے، اس کی نگہداری کرنے والے، کشید کرنے والے، پینے والے، پلانے والے، اٹھانے والے، جس کے لیے اٹھائی جائے اس پر، فروخت کرنے والے، خریدنے والے اور اس کی کمائی صرف کرنے والے پر۔

مروی ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْعَفْوُ ھَاھُنَا مَا فَضُلَ عَنْ قُوْتِ السَّنَۃِ۔[3]　　آیت میں العفو سے مراد سالانہ اخراجات سے زائد مال ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۶: ۴۰۲　[2] ۶: ۴۲۹　[3] فقہ القرآن ۱: ۲۴۰

تفسیر قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

جب یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۝ [1]	جو لوگ ناحق یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد ہی جہنم کی بھڑکتی آگ میں تپائے جائیں گے۔

تو جس جس کے پاس یتیم موجود تھے سب نے انہیں اپنے ہاں سے نکال دیا۔ لوگ رسول خدا (ص) سے یتیموں کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

اہم نکات

۱۔ احکام شریعت انسانی مصالح و مفاسد کی بنیاد پر استوار ہیں: وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا ؕ

۲۔ شراب نوشی اور جوا گناہان کبیرہ میں سے ہیں: فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ۔

۳۔ جزوی فوائد حرمت کو جواز میں بدل نہیں سکتے: وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا ؕ

۴۔ ضرورت سے زائد مال کو راہ خدا میں زاد آخرت کے طور پر خرچ کرنا چاہیے: مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ

۵۔ احکام شریعت اللہ کی واضح نشانیاں ہیں جن میں غور و فکر کرنا ضروری ہے: کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ۔

۶۔ ہر ممکن طریقے سے یتیموں کے مفادات کا تحفظ اور ان کی اصلاح حال مسلمانوں کی معاشرتی ذمہ داری ہے۔

۷۔ یتیموں کے ساتھ غیروں جیسا نہیں، بلکہ بھائیوں جیسا سلوک روا رکھنا چاہیے: وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡہُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ ؕ

۸۔ یتیموں کے ساتھ ناروا سلوک رکھنے والے خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۱۹: الکافی ۴ : ۵۲، ۶ : ۴۰۶، الفقیہ ۲ : ۶۴، الوسائل ۱۷ : ۳۲۵، ۲۱ : ۵۵۴، ۲۵ : ۳۰۱، مستدرک الوسائل ۱۷ : ۸۳۔

آیت ۲۲۰: الکافی ۵ : ۱۲۹ ـ ۱۳۰، التہذیب ۶ : ۳۳۹ تا ۳۴۱

---

[1] ۴ نساء : ۱۰　　[2] تفسیر القمی ۱ : ۷۲

وَلَا تَنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ ؕ وَلَاَمَۃٌ مُّؤۡمِنَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکَۃٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ ۚ وَلَا تُنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَتّٰی یُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَکُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚۖ وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الۡجَنَّۃِ وَالۡمَغۡفِرَۃِ بِاِذۡنِہٖ ۚ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾

۲۲۱۔اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، کیونکہ مومنہ لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو نیز (مومنہ عورتوں کو) مشرک مردوں کے عقد میں نہ دینا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، کیونکہ ایک مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے خواہ وہ (مشرک) تمہیں پسند ہو کیونکہ وہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تشریح کلمات

نکاح: (ن ک ح) عقد ازدواج کو نکاح کہتے ہیں۔ نکاح بطور استعارہ ہمبستری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

کسی معاشرے یا امت کی ایک اہم اکائی گھرانہ یا کنبہ ہوتا ہے۔ بنابریں کنبے کی تشکیل نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ امت مسلمہ کی تشکیل ایک بلند نظریے، ایک انقلابی و انسانی مؤقف اور فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔ اس لیے کنبے کی تشکیل کے وقت ان اقدار کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اسلام کنبے کی تشکیل کے لیے وہ شرائط عائد کرتا ہے جن کے تحت ایک نظریاتی امت کی تشکیل ممکن ہو سکے۔

سب جانتے ہیں کہ شخصیت کی تشکیل کے لیے وراثت اور تربیت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر بچے کی نشو ونما اور تربیت ایک غیر مومنہ اور مشرک ماں کی آغوش میں ہو تو اس بچے کی شخصیت اسلامی اقدار کی بنیاد پر تشکیل نہیں پا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ امت مسلمہ کے جسم کے اندر ایک قسم کا ناسور ثابت ہوگا جس کی موجودگی میں امت کی شکل وصورت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ جیسا کہ بہت سی عظیم قوموں کی تہذیب وتمدن کی تباہی میں ازدواجی بے قاعدگیوں کو بڑا دخل رہا ہے۔

فطری تقاضوں اور اسلامی اقدار کی رو سے ازدواجی زندگی کی تشکیل کی ایک بنیادی شرط ''کفو'' ہونا یعنی منزلت و مرتبے میں ہم پلہ ہونا ہے۔ اسلامی اقدار کے مطابق مقام و منزلت اور مرتبے کے معاملے میں رنگ، نسل، علاقہ اور مال و دولت وغیرہ کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے، بلکہ کفو (ہم پلہ) ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک ہی امت کے فعال اور ایک ہی مشن کے متحرک کارکن ہوں تا کہ ایک متوازن اور پرسکون ماحول میں ایک نظریاتی کنبہ تشکیل پا سکے۔ نظریاتی مؤقف میں اختلاف نہ ہونے کی صورت میں ایک پرسکون فضا میسر آتی ہے جس میں ایک مطمئن گھرانہ تشکیل پاتا ہے اور بچوں کی تربیت اطمینان وسکون اور مہر و محبت کی آغوش میں ہوسکتی ہے، ورنہ ایک مضطرب اور بے سکون فضا میں پرورش پانے والا بچہ نفسیاتی طور پر مریض ہوتا ہے اور آگے چل کر اس کی بیماری پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

بنابریں ایک مومن کے لیے کوئی مشرک عورت کفو (ہم پلہ) نہیں بن سکتی، خواہ مومن، غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایک مومنہ عورت کے لیے کوئی مشرک مرد کفو (ہم پلہ) نہیں ہوسکتا خواہ وہ مومنہ لونڈی اور وہ مشرک آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ دونوں کفو نہیں ہیں، کیونکہ ان کا مقصد حیات اور منزل ایک نہیں ہے۔ شرک انسانوں کو ہلاکت اور جہنم کی طرف بلاتا ہے، جب کہ مومن کا خدا جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ ان دونوں میں نور وظلمت اور حق و باطل کا تضاد پایا جاتا ہے۔

اکثر مفسرین کے نزدیک مشرک سے مراد بت پرست ہیں اس لیے مشرکین میں اہل کتاب شامل نہیں۔ اہل کتاب کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا درست ہے یا نہیں؟ یہ ایک الگ بحث طلب مسئلہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشرک زن و مرد سے نکاح کی ممانعت کا سبب مسلمانوں کی نسل بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کو غیر اسلامی تربیت کے مضر جراثیم سے محفوظ رکھنا ہے: اُولٰٓئِکَ یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ....

۲۔ کامیاب اور بابرکت ازدواجی زندگی ظاہری حسن اور مال و مقام کے ذریعے نہیں، بلکہ ایمان کے سائے میں ہی ممکن ہے: وَلَاَمَۃٌ مُّؤۡمِنَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکَۃٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ ....

تحقیق مزید

الکافی ۵ : ۳۵۷، الوسائل ۲۰ : ۵۳۵، فقہ القرآن ۲ : ۷۶، متشابہ القرآن ۲ : ۱۹۱

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ ؕ قُلۡ ہُوَ اَذًی ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی

۲۲۲۔ اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہد یجیے: یہ ایک گندگی ہے، پس حیض کے دنوں میں عورتوں سے کنارہ کش رہو

الۡمَحِیۡضِ ۙ وَ لَا تَقۡرَبُوۡہُنَّ حَتّٰی یَطۡہُرۡنَ ۚ فَاِذَا تَطَہَّرۡنَ فَاۡتُوۡہُنَّ مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَ یُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ ﴿۲۲۲﴾

اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ، پس جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس اس طرح جاؤ جس طریقے سے اللہ نے تمہیں حکم دے رکھا ہے، بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

یہودی حیض کے دنوں میں عورتوں کو اچھوت سمجھ کر ان سے مکمل پرہیز کرتے ہیں، جب کہ عیسائی ان دنوں میں عورتوں سے ہر قسم کا ملاپ رکھتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ اس مسئلے میں اسلام کا کیا موقف ہے؟ آیت اس کی وضاحت کر رہی ہے کہ اسلام کے نزدیک حیض کے ایام میں عورت اچھوت نہیں بن جاتی بلکہ اس کو کھانا پکانے، اسے پیش کرنے اور دیگر گھریلو امور انجام دینے کی اجازت ہے۔ البتہ جنسی ملاپ اور ہمبستری کے لیے یہ ایام مناسب نہیں ہیں، اس لیے ہمبستری سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا حکم ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ حیض ایک قسم کی گندگی ہے: قُلۡ ہُوَ اَذًی ۔ اس حالت میں عورت کا رحم اور تناسلی نظام شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہے، لہٰذا ان ایام میں صرف جنسی آمیزش سے اجتناب کرو اور یہود و ہنود کی طرح عورتوں کو ان دنوں میں اچھوت تصور نہ کرو۔

جدید تجربات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ عورت کا رحم ایام حیض میں طبیعی اور فطری تقاضوں کے مطابق نطفہ قبول کرنے کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ عورت کا رحم ہر ماہ میں ایک بار نطفہ قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے رحم کے اس پار عموماً ایک تخم، مرد کی طرف سے آنے والے نطفے کے جرثوموں کو قبول کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب عورت کے تخم اور مرد کے جرثومے کا ملاپ ہو جاتا ہے تو نطفہ ٹھہر جاتا ہے اور رحم کی رگوں میں موجود خون اس نئے مہمان کی غذا بنتا ہے۔ بصورت دیگر یہی خون ایک فاسد مواد کے طور پر حیض کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں جنسی آمیزش نہایت غیر فطری اور غیر طبیعی ہے، اس لیے شریعت اسلامیہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ماہواری کے ایام میں جنسی ملاپ پر پابندی زوجین کی جسمانی اور معنوی سلامتی کے لیے ہے۔

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۲ : ۱۷ـ۲۱

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

۲۲۳۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جا سکتے ہو اور اپنے لیے (نیک اعمال) آگے بھیجو اور اللہ کے عذاب سے بچو اور یاد رکھو تمہیں ایک دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور (اے رسول) ایمانداروں کو بشارت سنا دو۔

تفسیر آیات

زن و شوہر کی ازدواجی زندگی کے بارے میں اسلامی اصولوں کے متعدد پہلو قرآن مجید کی مختلف آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک جگہ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ...۔[۱]　　وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

یعنی ایک دوسرے کے لیے لباس کی طرح حجاب اور وقار ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ ۔[۲]　　اور اس نے تمہارے مابین محبت اور مہربانی پیدا کی۔

مذکورہ آیت میں بیوی کو کھیتی کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ یہاں عورت کو انسانی نسل کی افزائش اور نشو و نما کا منبع قرار دیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو یہ تربیت دی جا رہی ہے کہ وہ عورت کو محض اپنی ہوس پرستی کا ہدف قرار نہ دیں، کیونکہ عورت انسانی نسل جیسی عظیم فصل کی کاشت کا مقدس ذریعہ ہے۔ اس ذریعے کے پاس یہی عظیم فصل کاشت کرنے کے لیے جایا کرو اور یہی تمہارا اولین مقصد ہونا چاہیے۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ کاشت کی کیفیت کیا ہے: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۔ ”اپنی کھیتی میں جس وقت چاہو جا سکتے ہو“۔ یہاں پر لفظ اَنّٰى زمانی ہو سکتا ہے۔ یعنی جب چاہو، جس وقت چاہو، اپنے کھیتوں میں جاؤ، سوائے ایام حیض کے نیز ممکن ہے کہ اَنّٰى ”جس طرح“ کے معنی میں ہو۔ جیسے قرآن مجید میں یہ لفظ كَيْف کے معنوں میں آیا ہے: اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ... ۔[۳] بنابریں آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا: ”تم اپنی کھیتی میں جس

۱؎ بقرہ: ۱۸۷　۲؎ ۳۰ روم: ۲۱

۳؎ ۲ بقرہ: ۲۵۹۔ اللہ اس (اجڑی ہوئی آبادی) کو مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔

طرح چاہو جا سکتے ہو"۔ چنانچہ ہم نے یہی ترجمہ اختیار کیا ہے۔ یعنی جب ہمبستری کا مقصد انسانی نسل کی افزائش ہو تو اس میں کوئی پابندی اور طریقہ متعین نہیں ہے، بلکہ جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں تخم ریزی کر سکتے ہو۔

اہم نکات

۱۔ عورت ہوس پرستی کا وسیلہ نہیں بلکہ انسانی نسل کی تولید کا سرچشمہ اور تربیت کا گہوارہ ہے: نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّكُمۡ ....۔

۲۔ اس مقدس فصل کی کاشت کے لیے کوئی زمانہ یا طریقہ معین نہیں، البتہ زمین کا جراثیم سے پاک ہونا شرط ہے: وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ....۔

۳۔ عائلی زندگی میں الٰہی حدود پامال ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا قیامت اور حساب و کتاب کو نہ بھولو: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ مُّلٰقُوۡهُ ...۔

تحقیق مزید

الوسائل ۲۰: ۱۴۳ و ۱۴۴ فی موضع الولد۔ تفسیر القمی ۱: ۷۲۔ ۷۳ متی شئتم فی الفرج۔

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾

۲۲۴۔ اور اللہ کو اپنی ان قسموں کا نشانہ مت بناؤ جن سے نیکی کرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں میں صلح و آشتی کرانے سے باز رہنا مقصود ہو اور اللہ سب کچھ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِيۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾

۲۲۵۔ اللہ ان قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرتا جو تم بے توجہی میں کھاتے ہو، ہاں جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کا مؤاخذہ ہو گا اور اللہ خوب درگزر کرنے والا، بردبار ہے۔

تشریح کلمات

اَيۡمَان: (ی م ن) یمین کی جمع ہے یعنی قسم۔

عُرۡضَۃً: (ع ر ض) پیش کرنا۔ اسی لیے تیر اندازی کے نشانے اور ہدف کو بھی عرضہ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں کارہائے خیر انجام نہ دینے کے سلسلے میں قسم کھانے سے منع فرمایا ہے۔ مثلاً کوئی کہہ دے: قسم بخدا میں نیکی نہیں کروں گا، میں تقویٰ اختیار نہیں کروں گا وغیرہ۔ ایسی قسمیں درست نہیں، یعنی باطل ہیں، جن کے توڑنے میں نہ تو کوئی حرج ہے اور نہ کوئی کفارہ۔

اسی طرح تکیہ کلام کے طور پر بلا قصد و ارادہ کھائی جانے والی قسموں پر بھی کوئی کفارہ نہیں ہے۔

قرآن اور سنت معصومین (ع) کی روشنی میں قسموں کی تین اقسام بنتی ہیں:

۱۔ تاکیدی قسم: مثلاً کہدے: و اللّٰہ آج جمعہ کا دن ہے۔ ایسی قسموں پر کوئی کفارہ مترتب نہیں ہوتا۔ اگر ایسی قسمیں جھوٹی ہوں تو گناہ کبیرہ ہیں اور ایسی قسم کو اَلۡیَمِیۡنُ الۡغُمُوس کہتے ہیں، کیونکہ ایسی جھوٹی قسمیں کھانے والا آتش جہنم میں ڈوب جاتا ہے۔

۲۔ التجائی قسم: مثلاً کہدے: اللہ کی قسم دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری حاجت پوری کر۔ چنانچہ دعاؤں میں اس قسم کی قسمیں کثرت سے موجود ہیں۔ اگر سوال پورا نہ ہو تو ایسی قسموں پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

۳۔ التزامی قسم۔ یہ کہے: و اللّٰہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ فقہی کتب میں ایسی قسموں کے تفصیلی احکام موجود ہیں اور ان کے توڑنے پر کفارہ بھی مترتب ہوتا ہے اور گناہ بھی۔

احادیث

مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا:

یَعۡنِیۡ اَلرَّجُلُ یَحۡلِفُ اَنۡ لَّا یُکَلِّمَ اَخَاہُ وَ مَا اَشۡبَہَ ذٰلِکَ اَوۡلَا یُکَلِّمَ اُمَّہٗ۔[۱]

(ممنوع قسموں سے) مراد یہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھائے کہ اپنے بھائی وغیرہ سے یا اپنی ماں سے بات نہیں کرے گا۔

اہم نکات

۱۔ اچھے کاموں کے ترک اور برے کاموں کی انجام دہی کے لیے کھائی گئی قسم کی کوئی شرعی حیثیت نہیں: وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰہَ عُرۡضَۃً لِّاَیۡمَانِکُمۡ ....

۲۔ آتش جہنم سے بچنے کے لیے اَلۡیَمِیۡنُ الۡغُمُوس اور التزامی قسم سے اجتناب ضروری ہے: وَلٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا کَسَبَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ .... ۔

---

[۱] الوسائل ۲۳: ۲۲۳

تحقیق مزید

آیت ۲۲۴: الکافی ۷ : ۴۳۴ ۔ الفقیہ ۳ : ۳۶۲ ۔ الوسائل ۲۳ : ۲۲۳ ۔

آیت ۲۲۵: الکافی ۷ : ۴۴۳ ۔ مستدرک الوسائل ۱۱ : ۱۴۳ ۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

۲۲۶۔ جو لوگ اپنی عورتوں سے الگ رہنے کی قسم کھاتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے، اگر (اس دوران) رجوع کریں تو اللہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

۲۲۷۔ اور اگر طلاق کا فیصلہ کرلیں تو اللہ یقیناً خوب سننے والا، علم والا ہے۔

تشریح کلمات

ایلاء : (ا ل و) میاں بیوی کا مباشرت ترک کرنے کی قسم کھانا۔

تَرَبُّص: (ر ب ص) انتظار کرنا۔

الفیئ: (ف ی ء) اچھی حالت کی طرف رجوع کرنا۔

تفسیر آیات

زن و شوہر میں اگر کبھی بگاڑ پیدا ہو جائے اور ان دونوں کے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہو جائیں کہ شوہر قسم کھا لے کہ وہ اپنی عورت سے ہمبستری نہیں کرے گا تو حاکم شرع اسے چار ماہ کی مہلت دے گا، اگر وہ اس اثناء میں رجوع کر لے اور اپنی عورت سے ہمبستری کر لے اور کفارہ بھی ادا کر دے تو اس پر کوئی عقاب نہ ہوگا اور اگر وہ طلاق دینا چاہے تو یہ بات بھی خلاصی کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن طلاق شریعت کی نظر میں پھر بھی ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اسی لیے اس حکم کے بعد سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ فرمایا، جب کہ رجوع کے حکم کے بعد غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ فرمایا تھا۔ اس حکم کے تحت عورتوں سے مباشرت اور ہمبستری چار ماہ سے زیادہ ترک کرنے سے منع فرمایا ہے، جو زوجہ کے حقوق میں سے ہے۔

ایلا کی یہ قسم دو خاصیتیں رکھتی ہے: اول یہ کہ اس قسم کا توڑنا جائز ہے، بلکہ کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ قسم نامرغوب ہونے کے باوجود منعقد ہو جاتی ہے، جب کہ باقی قسموں کے لیے شرط ہے کہ قسم پسندیدہ اور مرغوب چیز پر کھائی گئی ہو اور اگر کسی ایسی چیز پر قسم کھائی جائے جو شرعاً ناپسندیدہ اور نامرغوب

ہے تو ایسی قسم منعقد ہی نہیں ہوتی۔

اہم نکات

۱۔ ازدواجی زندگی کے استحکام کے لیے جذباتی فیصلوں سے اجتناب ضروری ہے۔

۲۔ عورت کو جنسی حقوق سے چار ماہ سے زیادہ محروم نہیں رکھا جاسکتا: تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ ....۔

۳۔ عفو و درگزر اور وصل مکرر مغفرت خداوندی کا سبب ہے۔

۴۔ ایلاء کی صورت میں چار ماہ کے بعد دوبارہ ازدواجی زندگی یا جدائی میں سے ایک کا فیصلہ لازمی ہے: فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ○ وَ اِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ ....۔

تحقیق مزید

آیت ۲۲۶: الوسائل ۲۲ : ۲۳۵۔ الکافی ۶ : ۱۱۳۔

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡۤ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۸﴾

۲۲۸۔ اور طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ (ماہواری سے) پاک ہونے تک انتظار کریں اور اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق کیا ہے اسے چھپائیں اور ان کے شوہر اگر اصلاح و سازگاری کے خواہاں ہیں تو عدت کے دنوں میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لینے کے پورے حقدار ہیں اور عورتوں کو دستور کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

قُرُوۡٓءٍ: (ق ر ء) حیض کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پاکی کے معنی میں بھی۔ مروی ہے کہ امام

جعفر صادق علیہ السلام قُرُوْٓءٍ کے بارے میں فرماتے ہیں : اَلْاَقْرَاءُ هِيَ الْاَطْهَارُ.[1] یعنی قُرُوْٓءٍ سے مراد طُهْرٌ ہے۔

اَرحَام: (ر ح م) رحم کی جمع ہے۔ عورت کا رحم۔ رشتہ داروں کو بھی رحم اس لیے کہتے ہیں کہ سب ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔

مَعْرُوف: (ع ر ف) وہ دستور جو عقل سلیم، فطری تقاضوں اور اخلاقی اقدار کے مطابق ہو۔ یہ دستور خواہ تدوین شدہ ہو یا غیر مدون ہو۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں مندرجہ ذیل احکام بیان فرمائے گئے ہیں:

۱۔ عدت: یعنی طلاق کی صورت میں عورتوں کو عدت پوری کرنا ہوگی۔ پس اگر طلاق رجعی ہے تو عدت کے دوران شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ یعنی بیوی کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لا سکتا ہے، ورنہ عدت پوری ہونے کے بعد عورت دوسری شادی کر سکتی ہے۔ فقہ جعفری کے مطابق یہ عدت اس وقت پوری ہوگی جب عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر پاک ہو جائے گی، جب کہ شافعی اور مالکی کے نزدیک تیسرا حیض آتے ہی عدت پوری ہو جاتی ہے۔

۲۔ انتہائے عدت: چونکہ عدت کی انتہا کا فیصلہ خون حیض اور حمل ٹھہرنے سے مربوط ہے اور یہ نسوانی امور صرف عورتوں کے ذریعے ہی معلوم کیے جا سکتے ہیں، اس لیے ایسے امور میں عورتوں کی بات کو مستند قرار دیا گیا۔ ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

قَدْ فَوَّضَ اللّٰهُ اِلَى النِّسَآءِ ثَلَاثَةَ اَشْيَاءَ اَلْحَيْضُ وَ الطُّهْرُ وَ الْحَمْلُ.[2]

اللہ تعالٰی نے تین باتیں عورتوں پر چھوڑ دی ہیں: حیض، پاکیزگی اور حمل۔

اسی بنا پر عورتوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ان نسوانی امور کو نہ چھپائیں۔ چنانچہ ان مسائل میں دیانتداری اور راستگوئی کو ان کے ایمان باللہ سے مربوط قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ حق رجوع: عدت کے دنوں میں شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو دوبارہ زوجیت میں واپس لینے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ طلاق رجعی ہو (جس کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے)، نیز وہ اصلاح اور سازگاری کی نیت سے دوبارہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتا ہو اور اس کا مقصد عورت کو ناروا تکالیف پہنچانا نہ ہو:

وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ...[3]

اور صرف ستانے کی خاطر زیادتی کرنے کے لیے انہیں روکے نہ رکھو۔

---

[1] اصول الکافی ۶ : ۸۹　[2] الوسائل ۲۲ : ۲۲۲　[3] ۲ بقرہ : ۲۳۱

یہ احکام ان عورتوں کے بارے میں ہیں جن کے ساتھ ہمبستری ہوئی ہو، حیض کے قابل ہوں اور حاملہ نہ ہوں۔ اگر طلاق یافتہ عورتیں بانجھ، نابالغہ، یا حاملہ ہوں تو ان کا حکم دوسری آیات میں بیان ہوا ہے۔

۴۔ مساویانہ حقوق: زن و شوہر کے حقوق کے بارے میں قرآن مجید ایک الٰہی قانون بیان فرما رہا ہے۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ نے نہایت شیریں پیرائے میں اسلام کے عائلی قوانین کی اہم ترین شق بیان فرمائی ہے۔ عدل و انصاف پر مبنی اس الٰہی دستور کو سن کر سکون و اطمینان میسر آتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں حق و انصاف کا وہ میزان اور معیار بیان فرمایا گیا ہے جس کو دنیا والے صدیاں گزرنے کے باوجود بھی اپنا نہ سکے۔ اسلام کے اس زرین اصول کے زیر سایہ ازدواجی زندگی میں ہم آہنگی، سکون، توازن اور باہمی تعاون کی پرکیف فضا وجود میں آتی ہے۔ جہاں ہر طرف سے مرد اور عورت کو انسانی اقدار کے مطابق عزت و وقار بخشنے والی یہ آواز گونج رہی ہوتی ہے: ''عورتوں کو بھی دستور کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں''۔ البتہ ان میں سے ہر ایک کو اس کے اجتماعی مقام کے مطابق حقوق ملتے ہیں۔ جیسے ضعیف و طاقتور، عالم و جاہل اور صغیر و کبیر میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا حق ملتا ہے اور ہر ایک پر اس کے اجتماعی مقام کے مطابق ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عدت پوری کریں اور اپنے حمل وغیرہ کو نہ چھپائیں اور شوہروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ رجوع کرتے وقت ان کے ارادے پاک ہوں اور عدت کے دنوں میں خرچ اور نفقہ وغیرہ ادا کریں۔

۵۔ مرد کی برتری: مرد کو عورت پر ایک لحاظ سے برتری حاصل ہے اور یہ برتری مساویانہ حقوق کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ آیت کے سابقہ جملے میں ارشاد فرمایا: '' عورتوں کو دستور کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں''۔

قرآن نے نوع بشر کو دو حصوں (مرد و عورت) میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے اللہ کے نزدیک افضل اور زیادہ صاحب عزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّ اُنۡثٰى وَ جَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ۝[1]	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

---
[1] ۴۹ حجرات: ۱۳

مرد اورعورت انسانی معاشرے کے رکن ہونے کے لحاظ سے اپنے ارادوں کے مالک اور اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ البتہ عائلی نظام میں گاہے بعض باتوں میں ایک دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً ارث میں مرد کو اور خرچ میں عورت کو برتری حاصل ہے۔ ان تمام باتوں کی بنیاد فطری تقاضے ہیں۔ خوشحال زندگی وہ ہے جو فطری تقاضوں کے مطابق ہو: فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۔[1] اس فطری انسان کو برائیوں اور ان سے بچنے کے طور طریقوں کی سمجھ عطا کر دی گئی ہے۔ بنابریں حقوق میں برابری ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمام افراد کے حقوق یکساں ہوتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد و زن، پیر وجوان، دیوانہ و عاقل، جاہل و عالم اور تجربہ کار و ناداں میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا مناسب مقام اور حق دیا جائے اور یہ عین مساوات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق کے حوالے سے آیت مرد اور عورت کو مساویانہ حیثیت دے رہی ہے، جب کہ وہ معاشرتی لحاظ سے مرد کو برتری عطا کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی حقوق، تقویٰ وثواب اور اخروی درجات میں یہ زن وشوہر مساوی ہیں، لیکن عائلی نظام میں مرد کو درجہ دیا گیا ہے۔ کیونکہ عائلی نظام میں عورت ایک ایسی رکن ہے جس پر احساسات اور جذبات غالب ہوتے ہیں اور مرد ایک ایسا رکن ہے جس پر عقل وفکر زیادہ غالب ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ان کی ذمہ داریاں بھی جدا ہیں۔ مرد حاکم، قاضی اور محاذ جنگ کے مجاہد ہیں، جب کہ عورتیں تربیت اولاد اور تدبیر خانہ کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ خرچ اور نفقہ چونکہ مرد کے ذمے ہوتا ہے، اس لیے ارث میں اسے دو حصے دے کر اس کا تدارک کر دیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدت سے جہاں تحفظ نسل مقصود ہے، وہاں ازدواجی زندگی کو انتشار سے بچانے اور زن وشوہر میں صلح و صفا برقرار رکھنے کے لیے غور وفکر کا موقع بھی مل جاتا ہے: وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ یَّکۡتُمۡنَ ... اِصۡلَاحًا

۲۔ عورتوں کو ان کے فرائض کے مطابق حقوق حاصل ہیں: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ....۔

۳۔ عائلی زندگی میں مرد کو کنبے کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے عورت پر برتری حاصل ہے: وَ لِلرِّجَالِ عَلَیۡهِنَّ دَرَجَةٌ ....۔

تحقیق مزید

التہذیب ۸ : ۱۲۲۔ الوسائل ۲۲ : ۲۲۲۔ متشابہ القرآن ۲ ۱۹۹۔

---

[1] ۹۱ شمس : ۸۔ پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

۲۲۹۔ طلاق دو بار ہے پھر یا تو شائستہ طور پر عورتوں کو اپنی زوجیت میں رکھ لیا جائے یا اچھے پیرائے میں انہیں رخصت کیا جائے اور یہ جائز نہیں کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو مگر یہ کہ زن و شوہر کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، پس اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ زوجین اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو زوجین کے لیے (اس مال میں) کوئی مضائقہ نہیں جو عورت بطور معاوضہ دے دے، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ الٰہی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَاۤ اَنۡ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

۲۳۰۔ اگر (تیسری بار) پھر طلاق دے دی تو وہ عورت اس کے لیے اس وقت تک حلال نہ ہو گی جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے، ہاں اگر دوسرا خاوند طلاق دے اور عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ انہیں امید ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم رکھ سکیں گے اور یہ ہیں اللہ کی مقرر کردہ حدود جنہیں اللہ دانشمندوں کے لیے بیان فرماتا ہے۔

تشریح کلمات

تَسۡرِیۡحٌ: (س ر ح) آزاد کرنا۔ چھوڑنا۔ اصل میں یہ لفظ جانور چرانے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ شوہر اپنی منکوحہ بیوی کو دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر سکتا ہے۔ اگر دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر چکا ہو تو اس کے بعد جب کبھی وہ اسے تیسری بار طلاق دے گا تو عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔ تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد شوہر بہتر طریقے سے رجوع کرتے ہوئے بیوی کو اپنی زوجیت میں رکھ لے یا تیسری طلاق دے کر اسے مستقل طور پر فارغ کر دے۔

۲۔ وہ مہر جو شوہر اپنی بیوی کے عقد نکاح میں معین کرے، اس میں سے کوئی چیز نہ دینے یا واپس مانگنے کا اسے حق حاصل نہیں ہے۔ ایسا کرنا تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ کے منافی ہے۔

۳۔ اگر میاں بیوی اسلامی احکام کی حدود میں رہ کر اپنی زوجیت کا نظام برقرار نہ رکھ سکیں اور عورت مرد سے اس حد تک متنفر ہو جائے کہ وہ اس کے ساتھ زندگی نہ گزار سکتی ہو تو اس صورت میں عورت کچھ معاوضہ دے کر شوہر سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اسے اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔ خلع طلاق بائن ہے جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر عورت عدت کے دوران معاوضہ واپس لے لے تو شوہر بھی رجوع کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر عورت شوہر سے متنفر نہ ہو اور شوہر از خود طلاق دے تو اس صورت میں عورت سے کچھ لینا حرام ہے اور اگر عورت متنفر ہے اور معاوضہ دے کر طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس صورت میں عورت سے معاوضہ لینا جائز ہے۔

۴۔ تیسری بار طلاق دینے کی صورت میں یہ عورت مستقل طور پر جدا ہو جاتی ہے۔ اب سابقہ شوہر نہ اس سے دوبارہ عقد کر سکتا ہے اور نہ رجوع، جب تک وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کر کے مطلقہ نہ ہو جائے۔ پس اگر وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لیتی ہے تو صرف عقد کافی نہیں ہے، بلکہ ہمبستری بھی شرط ہے۔ پھر اگر وہ اسے طلاق دے تو پہلے شوہر کے لیے جائز ہے کہ وہ اس عورت سے تیسری بار عقد کر لے۔

ایک مجلس میں تین طلاقوں کا حکم

امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس قسم کی طلاق حرام ہے، لیکن اس کے باجود طلاق مؤثر اور نافذ ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ طلاق حرام نہیں ہے اور مؤثر بھی ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس قسم کی طلاق کو قرآن کریم کی صریح مخالفت قرار دیا ہے اور جو عمل قرآن کا مخالف ہو وہ مؤثر واقع نہیں

ہوتا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ....۔ [1]	اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دے دیا کرو۔

ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کی صورت میں عدت پہلی طلاق کے لیے متصور ہو گی۔ دوسری اور تیسری طلاق کی عدت ہی نہیں بنتی۔ لہٰذا دوسری اور تیسری طلاق لِعِدَّتِهِنَّ نہ ہونے کی وجہ سے غیر مؤثر واقع ہو گی۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ رَجُلاً قَالَ لَهُ اِنِّیْ طَلَّقْتُ اِمْرأَتِیْ ثَلَاثاً فِیْ مَجْلِسٍ قَالَ : لَیْسَ بِشَیْءٍ ثُمَّ قَالَ: اَمَا تَقْرَأُ کِتَابَ اللّٰهِ: " یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ " اِلٰی قَوْلِهِ " لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا " ثُمَّ قَالَ کُلُّ مَا خَالَفَ کِتَابَ اللّٰهِ وَ السُّنَّةَ فَهُوَ یُرَدُّ اِلٰی کِتَابِ اللّٰهِ وَ السُّنَّةِ ۔ [2]	ایک شخص نے آپ (ع) سے پوچھا: میں نے اپنی عورت کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں؟ فرمایا: اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا تو اللہ کی کتاب میں نہیں پڑھتا: اے نبی جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو۔ پھر فرمایا: جو کتاب و سنت کے خلاف ہو گا، اسے قرآن و سنت کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

چنانچہ اس مطلب پر قرآن کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا صریح حکم بھی موجود ہے۔ نسائی نے اپنی سنن میں یہ حدیث نقل کی ہے:

اَخبَرَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ (وَ آلِهِ) وَ سَلَّمْ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِیْقَاتٍ جَمِیْعاً فَقَامَ غَضْبَانَ، ثُمَّ قَالَ: اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ حَتّٰی قَامَ رَجُلٌ وَ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا اَقْتُلُهٗ۔ [3]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ و (آلہ) وسلم کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہیں تو آپ (ص) غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے؟ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ یہاں تک کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہا: یا رسول اللہ (ص) میں اسے قتل نہ کر دوں؟

فی حدیث ابن عباس:

اِنَّ عَبْدِ یَزِیْدَ طَلَّقَ زَوْجَتَهٗ وَ تَزَوَّجَ بِاُخْرٰی فَاَتَتْ اَلنَّبِیَّ شَکَتْ اِلَیْهِ،	عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور دوسری سے شادی کر لی۔ پس اس نے رسول اللہ (ص) کے

---

[1] ٦٥ طلاق: ١　[2] الوسائل ٢٢: ٦٩　[3] سنن نسائی ٦: ١١٦

فَقَالَ النَّبِیُّ لَعَبْدِ یَزِیْدَ رَاجِعْهَا فَقَالَ: اِنِّیْ طَلَّقْتُهَا ثَلَاثاً یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: قَدْ عَلِمْتُ رَاجِعْهَا وَ تَلَا هٰذِهِ الْآیَةَ: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔[1]

پاس آ کر شکایت کی۔ نبی اکرم نے عبد یزید کو حکم دیا کہ رجوع کرے، تو کہا: یا رسول اللہ بیشک میں نے اسے تین طلاقیں دی ہیں۔ فرمایا: مجھے معلوم ہے۔ رجوع کرو اور اس آیت کی تلاوت فرمائی: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے یہ روایت منقول ہے:

قَالَ کَانَ الطَّلَاقُ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ (وَ آلِه) وَ سَلَّمْ وَ اَبِی بَکْرٍ وَ سَنَتَیْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً فَقَالَ عُمَرُ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ النَّاسَ قَدْ اِسْتَعْجَلُوْا فِی اَمْرٍ قَدْ کَانَتْ لَهُمْ فِیْهِ اَنَاةٌ فلو اَمْضَیْنَاهُ عَلَیْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَیْهِمْ۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم اور ابوبکر کے عہد میں اور خلافت عمر کے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوا کرتی تھیں۔ پھر عمر بن خطاب نے کہا: لوگوں نے اس امر میں عجلت سے کام لیا جس میں ان کے لیے مہلت موجود تھی، تو کیوں نہ ہم ان کی اس عجلت کو نافذ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے نافذ کر دیا۔

نیز اس سلسلے میں ابو الصہباء کے حضرت ابن عباس سے مکرر سوال اور ابن عباس کی تصدیق کہ عہد رسالتؐ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی امارت کے ابتدائی ایام میں تین طلاقیں، ایک طلاق شمار ہوتی تھیں، کی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: صحیح مسلم ۱: ۵۷۴۔ سنن ابی داؤد صفحہ ۳۴۴۔

اس سلسلے میں علامہ جزیری رقمطراز ہیں:

> تمام علماء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عہد رسالت میں طلاق کی یہی حالت تھی اور مسلم کی حدیث پر بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ان کی دلیل صرف حضرت عمر کا عمل اور پھر اکثریت کا ان کے ساتھ اتفاق کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم موقت تھا۔ اس لیے حضرت عمر نے اسے ایسی حدیث کے ذریعے نسخ کیا جسے انہوں نے ہمارے لیے بیان نہیں کیا اور اجماع اس پر دلیل ہے۔[3]

تعجب کا مقام ہے کہ حضرت عمر کو وہ حکم نسخ کرنے کا حق کیسے مل گیا جو رسول اللہ کے زمانے میں نافذ العمل تھا جب کہ خود حضرت عمر نے تو کسی حدیث کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ کیا اس موہوم حدیث سے بھی حکم قرآن نسخ ہو سکتا ہے، جسے نہ کسی نے روایت کیا اور نہ کوئی اس کا مدعی ہے؟ اصول میں یہ امر طے

---

[1] سنن بیهقی ۷: ۳۳۹ [2] صحیح مسلم کتاب الطلاق ۷: ۳۳۶۔ مسند احمد ۱: ۳۱۴
[3] الفقه علی المذاهب الاربعة ۴: ۳۴۱۔ کتاب الطلاق

شدہ ہے کہ صرف متواتر سنت سے قرآن کا نسخ ممکن ہے۔ یہاں تو ایک موہوم حدیث سے قرآن کا حکم منسوخ ہو رہا ہے جو خبر واحد بھی نہیں ہے۔

قرآن مجید میں اس بات کی صراحت موجود ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ یعنی طلاق دو بار ہے، پھر یا شائستہ طور پر عورتوں کو اپنی زوجیت میں رکھ لیا جائے یا اچھے پیرائے میں انہیں رخصت کیا جائے۔ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ۔ یعنی اگر تیسری بار اسے طلاق دے تو عورت اس کے لیے اس وقت تک حلال نہ ہوگی جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے۔ آیت کی رو سے خود طلاق کا تین مرتبہ وقوع پذیر ہونا ضروری ہے۔ ''تین'' کہنے سے تین طلاقیں متحقق نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ یہ بات ہر اس حکم میں ضروری ہے جس میں تعدد شرط ہے۔ لعان میں چار مرتبہ شہادت شرط ہے، لہٰذا چار کہنا کافی نہیں ہے۔ اذان میں چار تکبیریں کہنا ضروری ہیں، صرف چار کہنا کافی نہیں ہے۔ جمرات کو سات کنکریاں مارنا ضروری ہے، سات کہنا کافی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب ایک مجلس میں پہلی طلاق ہوگی، اگر یہ طلاق مؤثر ہے تو اس سے زوجیت ختم ہوگئی، دوسری طلاق عبث اور بے معنی ہے۔ کیونکہ مطلقہ کو طلاق نہیں دی جاتی، منکوحہ کو طلاق دی جاتی ہے۔ پیغمبر اکرم (ص) سے مروی ہے:

لَا طَلَاقَ اِلَّا بَعْدَ نِكَاحٍ۔[1]　　نکاح کے بغیر طلاق نہیں ہوتی۔

جو نکاح پہلے ہوا تھا وہ پہلی طلاق سے ختم ہوگیا۔ دوسری طلاق بغیر نکاح کی طلاق ہے، جو بے معنی ہے۔ فقہ جعفریہ کی اس معقولیت کی بنا پر مصر میں جامعة الازهر نے اس مسئلے میں فقہ جعفریہ کے موقف کو اختیار کیا اور ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ازدواجی زندگی میں اختلاف رونما ہونے کی صورت میں دوسری طلاق کے بعد یا باعزت زندگی یا باعزت طلاق: فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ[1]۔

۲۔ اسلام کے عائلی قوانین بھی حدود اللہ ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت ظلم ہے۔ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ۔

تحقیق مزید

آیت ۲۲۹: الكافی ۶: ۶۴۔ الفقیه ۳: ۵۰۲۔ التهذیب ۸: ۲۵۔ الاستبصار ۳: ۲۶۹۔ الوسائل ۲۲: ۱۲۲۔ مستدرك الوسائل ۱۵: ۳۰۴۔ متشابه القرآن ۲: ۱۹۵۔ المسائل الصاغانیة ص ۸۵۔

آیت ۲۳۰: الاستبصار ۳: ۲۷۵۔ الوسائل ۲۲: ۱۳۲۔ ۱۳۳

وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِکُوۡہُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰہِ ہُزُوًا ۫ وَّاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَۃِ یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾

۲۳۱۔اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں یا تو شائستہ طریقے سے نکاح میں رکھو یا شائستہ طور پر رخصت کر دو اور صرف ستانے کی خاطر زیادتی کرنے کے لیے انہیں روکے نہ رکھو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا اور تم اللہ کی آیات کا مذاق نہ اڑاؤ اور اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا کی ہے اسے یاد رکھو اور یہ (بھی یاد رکھو) کہ تمہاری نصیحت کے لیے اس نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

تشریح کلمات

بَلَغۡ:　(ب ل غ) بلوغ۔کسی مدت کی انتہا تک یا انتہا کے قریب پہنچنا۔

ہُزُوًا:　(ہ ز ء) تمسخر کرنا۔مزاح اڑانا۔

تفسیر آیات

۱۔جب طلاق کے بعد عدت کا عرصہ ختم ہونے کے قریب آئے تو شوہر کو چاہیے کہ یا تو رجوع کر کے دستور کے مطابق عورت کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لے آئے یا دستور کے مطابق بغیر کسی زیادتی کے اسے رخصت کر دے۔

۲۔محض اذیت دینے کے لیے رجوع نہ کرے۔یعنی طلاق دینے کے بعد عدت گزرنے سے پہلے اگر شوہر محض اس لیے رجوع کرے کہ عورت کسی اور سے شادی بھی نہ کر سکے اور سکون سے اس کے پاس بھی

---

[۱] فقیہ ۳: ۴۹۶۔ وسائل الشیعۃ ۲۲: ۳۱

نہ رہ سکے تو شوہر کا یہ عمل عورت کے حق میں ظلم متصور ہوگا، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔
۳۔ مندرجہ بالا احکام سے بے اعتنائی برتنا آیات الٰہی کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف ہے۔

اہم نکات

۱۔ ستانے کی خاطر رجوع کرنا، طلاق دیے بغیر رکھنا، آیات خداوندی سے مذاق اور ظلم ہے: وَ لَا تُمۡسِکُوۡہُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ....۔

تحقیق مزید

الفقیہ ۳ : ۵۰۱۔ مستدرک الوسائل ۱۵ : ۳۴۲۔

وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ اَنۡ یَّنۡکِحۡنَ اَزۡوَاجَہُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَیۡنَہُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِکَ یُوۡعَظُ بِہٖ مَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَ اَطۡہَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۲﴾

۲۳۲۔ اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اپنے (مجوزہ) شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ جائز طور پر ازدواج پر باہم راضی ہوں۔ یہ نصیحت اس شخص کے لیے ہے جو تم میں سے خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے، تمہارے لیے نہایت شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے اور (ان باتوں کو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

تعضلوا : (ع ض ل) منع کرنا، محبوس کرنا اور تشدد کرنا۔

شان نزول

معقل بن یسار سے مروی ہے کہ اس نے عہد رسالت میں اپنی بہن کی شادی ایک مسلمان سے کی۔ اس شخص نے اسے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی۔ بعد میں دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا اور دوبارہ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو معقل نے اس شادی سے روکا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

یہاں خطاب ان تمام اشخاص سے ہے جو طلاق کے بعد عورتوں کے نئے عقد نکاح میں مداخلت کریں خواہ ولی ہوں یا غیر ولی۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر طلاق یافتہ عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کے بعد اپنے سابقہ یا مجوزہ شوہروں سے عقد کرنا چاہیں اور طرفین جائز طریقے سے عقد ثانی پر راضی ہوں تو کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ انہیں روکے۔ یہ معاملہ ان دونوں کی زندگی سے مربوط ہے۔ جب یہ دونوں راضی ہوں تو کسی غیر کو ان کے آزادانہ فیصلے میں دخل دینے کا حق نہیں، خواہ اس کا مقام کچھ بھی ہو۔ جب طرفین عاقل، بالغ اور تجربہ کار ہوں تو ان کی ازدواجی زندگی کے فیصلے انہی پر چھوڑ دینا ہی شائستہ و پاکیزہ طریقہ ہے۔ اس حکم سے فردی آزادی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اگر طلاق کے بعد طرفین شائستہ طریقے سے نکاح کے لیے راضی ہوں تو بیرونی مداخلت کے ذریعے انہیں روکنا ایمان کے منافی ہے۔

۲۔ باہمی رضا و رغبت اور شائستہ و آزادانہ فیصلوں کا احترام پاکیزہ روابط کے لیے ضروری ہے۔

وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَہُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ ؕ وَعَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَہٗ رِزۡقُہُنَّ وَکِسۡوَتُہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ لَا تُکَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَہَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌۢ بِوَلَدِہَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ ٭ وَعَلَی الۡوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِکَ ۚ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ

۲۳۳۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، (یہ حکم) ان لوگوں کے لیے ہے جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہیں اور بچے والے کے ذمے دودھ پلانے والی ماؤں کا روٹی کپڑا معمول کے مطابق ہو گا۔ کسی پر اس کی گنجائش سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جاتا، بچے کی وجہ سے نہ ماں کو تکلیف میں ڈالا جائے اور نہ باپ کو اس بچے کی وجہ سے کوئی ضرر پہنچایا جائے اور اسی طرح کی ذمے داری وارث پر بھی ہے، پھر اگر طرفین باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہتے ہیں تو

مِّنۡهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا ؕ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

اس میں ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے نیز اگر تم اپنی اولاد کو (کسی سے) دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ تم عورتوں کو معمول کے مطابق طے شدہ معاوضہ ادا کرو اور اللہ کا خوف کرو اور جان لو کہ تمہارے اعمال پر اللہ کی خوب نظر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ''مائیں پورے دو سال یعنی چوبیس ماہ دودھ پلائیں''۔ اس جملے میں دو اہم نکتے ہیں۔ایک یہ کہ مائیں دودھ پلائیں۔ دوم یہ کہ دو سال تک دودھ پلائیں۔ صدیوں کے تجربات کے بعد آج انسان کو دو باتوں کا پتہ چلا ہے:

الف: بچے کے لیے ماں کا دودھ بہترین غذا ہے اور ماں کے دودھ سے مثبت اخلاقی، نفسیاتی، عقلی اور جسمانی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ب: طبی تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ دو سال کے دوران بچے کو فراہم کی جانے والی غذا سے بچے پر اخلاقی، نفسیاتی اور جسمانی و عقلی لحاظ سے ٹھوس اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

۲۔ رضاعت یعنی دودھ پلانا اور تربیت کرنا ماں کا ایک حق ہے جسے ''حق حضانت'' کہتے ہیں۔ اگر ماں اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے تو دو سال سے کم دودھ پلانے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ بچے کی صحت اس بات کی متحمل ہو سکے۔

۳۔ باپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے والی کا خرچ برداشت کرے۔ یہاں نہ ماں زیادہ مطالبہ کر سکتی ہے اور نہ باپ معمول سے کم پر اکتفا کر سکتا ہے، بلکہ عام دستور کے مطابق اسے کھانا کپڑا وغیرہ فراہم کرنا ہوگا۔

۴۔ بچے کی تربیت اور رضاعت کے سلسلے میں ماں اور باپ ایک دوسرے کو نقصان اور ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ میاں اور بیوی میں اختلاف اور نزاع ہو جائے تو اس کے برے اثرات بچے کی تربیت پر مترتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا باپ ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ماں کو نقصان اور ضرر نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی ماں کو یہ حق حاصل ہے کہ باپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کوئی نقصان پہنچائے۔

۵۔باپ کی وفات کی صورت میں وارث پر بھی وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو باپ پر عائد تھیں۔

۶۔ والدین باہمی رضامندی اور باہمی مشورے سے دو سال سے پہلے بچے کا دودھ چھڑا سکتے ہیں۔ رضامندی اور مشورے کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ اگر بچے کی صحت اس بات کی متحمل ہے تو یہ کام جائز ہے۔ دو سال کی حد انتہائی حد ہے۔ دو سال پورے کرنا ہر صورت میں ضروری نہیں، بلکہ اگر بچے کی صحت اس بات کی اجازت دے تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۷۔ماں کی جگہ غیر عورت سے دودھ پلوانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اسے طے شدہ معاوضہ ادا کیا جائے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

لَا رِضَاعَ بَعْدَ فِطَامٍ ۔[1]	دو سال پورے ہونے کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں ہے.

اہم نکات

۱۔ ماں کی مامتا اور باپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں نقصان پہنچانا تقویٰ کے منافی ہے: لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌ ...۔

۲۔ رضاعت اور اجرت والدین کی جسمانی اور مالی توانائی کے مطابق ہونی چاہیے: لَا تُکَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَہَا ...۔

۳۔ ماں کا دودھ بچے کی جسمانی، نفسیاتی اور عقلی نشو و نما میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

۴۔ ازدواجی روابط انتہائی نازک ہیں، لہٰذا اللہ کو حاضر و ناظر جان کر ایک دوسرے کی حق تلفی سے اجتناب کرنا چاہیے: وَ اعۡلَمُوۡۤا ....۔

وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا

۲۳۴۔ اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں، پھر جب ان کی عدت پوری ہوجائے تو دستور کے مطابق اپنے بارے میں جو فیصلہ کریں اس کا

---

[1] اصول الکافی ۵: ۴۴۳

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ تمہارے اعمال سے
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾ خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

بعض دیگر قبائل اور ادیان میں شوہر کے مرنے کی صورت میں عورت کے ساتھ انسانیت سوز مظالم روا رکھے جاتے تھے جن میں سے کچھ مظالم تو بعض قبائل و اقوام میں اب بھی رائج ہیں۔ مثلاً شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو جلا دینا یا ساتھ زندہ دفن کرنا اور نئی شادی سے محروم رکھنا وغیرہ۔

اسلام سے پہلے جاہلیت عرب میں یہ رواج تھا کہ بیوہ عورت کو ایک بوسیدہ جگہ پر رکھتے تھے اور اسے پھٹا پرانا اور کثیف ترین لباس پہناتے تھے۔ اسلام نے عورت کو ایسے غیر انسانی اور ذلت آمیز سلوک سے نجات دلاتے ہوئے احترام آدمیت پر مبنی ایک قانون وضع فرمایا جو درج ذیل ہے۔

١۔ اگر عورت حاملہ نہ ہو تو وہ صرف چار ماہ اور دس دن عدت گزارے۔

٢۔ اس دوران وہ غیر ضروری کام کے لیے گھر سے نہ نکلے اور ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے اجتناب کرے۔

٣۔ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وفات سے وضع حمل تک ہے، خواہ چار ماہ سے قبل ہو جائے یا کئی ماہ لگ جائیں۔

٤۔ عدت وفات میں مرنے والے شوہر کے احترام کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر کے مرنے کے ایک عرصے بعد عورت کو اس کا علم ہو تو اسی روز سے عدت وفات شروع ہو گی جس روز اسے علم ہوا تھا۔

غیر اسلامی، باطل اور غیر انسانی مراسم پر خط بطلان کھینچتے ہوئے قرآن اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ عدت پوری ہونے کے بعد عورتیں نئی ازدواجی زندگی کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ کریں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح زیبائش اور گھر سے نکلنا وغیرہ بھی جائز ہے۔

اسلامی قوانین کی رو سے جنسی مسائل میں عورتوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مدت چار ماہ رکھی گئی ہے اور یہ قانون گزاری عورتوں کی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ مثلاً ایلاء یعنی شوہر کے بیوی سے ہمبستری نہ کرنے کی قسم کھانے کی صورت میں چار ماہ کی مدت معین ہے نیز عدت وفات میں بھی چار ماہ کا عرصہ معین فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ بعض روایات بھی اس مطلب کو بیان کرتی ہیں نیز معلوم ہوتا ہے کہ تین ماہ کی

عدت تو ہر قسم کی جدائی کے لیے ہے اور چالیس دن کا اضافہ وفات کی صورت میں سوگ منانے کے لیے ہے۔ عام حالات میں شوہر پر لازم ہے کہ کم از کم چار ماہ میں ایک بار ہمبستری کرے۔ ان احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی شدہ عورت کو چار ماہ سے زیادہ جنسی عمل سے محروم رکھنا اس کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدت وفات کے بارے میں اسلامی قانون، احترام آدمیت کی دلیل ہے۔

۲۔ عدت کا چار ماہ دس دن سے زیادہ نہ ہونا عورت کے فطری و طبعی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

۳۔ عدت کے بعد عورت کو ازدواجی زندگی سے روکنا جاہلانہ طرز عمل ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ ....۔

تحقیق مزید

التہذیب ۸ : ۱۴۲۔ الوسائل ۲۲: ۲۳۵ ۔ ۲۳۸

وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِہٖ مِنۡ خِطۡبَۃِ النِّسَآءِ اَوۡ اَکۡنَنۡتُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ سَتَذۡکُرُوۡنَہُنَّ وَ لٰکِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡہُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۬ؕ وَ لَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُ ۚ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۲۳۵﴾

۲۳۵۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ان عورتوں کے ساتھ نکاح کا اظہار اشارے کنائے میں کرو یا اسے تم اپنے دل میں پوشیدہ رکھو، اللہ کو تو علم ہے کہ تم ان سے ذکر کرو گے، مگر ان سے خفیہ قول و قرار نہ کرو، ہاں اگر کوئی بات کرنا ہے تو دستور کے مطابق کرو، البتہ عقد کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک عدت پوری نہ ہو جائے اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے، لہٰذا اس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے۔

تشریح کلمات

عَرَض و تَعریض: (ع ر ض) اشارہ، کنایہ۔ کسی مطلب کے اظہار کرنے کے تین طریقے ہوتے ہیں۔

اول تصریح: مثلاً یہ کہنا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔

دوم بظاہر مطلب کا سمجھ میں آ جانا: جیسے میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

سوم کنایہ: جیسے یہ کہے: کون ہے جو تجھے پسند نہ کرے۔

خِطۡبَۃِ: (خ ط ب) قبلہ کے وزن پر اس کا معنی منگنی کرنا ہے۔

اَکۡنَنۡتُمۡ: (ك ن ن) تم پوشیدہ رکھتے ہو۔

تفسیر آیات

اس آیت میں عدت وفات کے دوران منگنی کے آداب و احکام بیان ہو رہے ہیں:

۱۔ عدت کے دوران عورت سے اشاروں اور کنایوں میں منگنی کا اظہار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح دل میں یہ ارادہ رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ عدت ختم ہونے کے بعد اس کا اظہار کرے گا۔

۳۔ منگنی کا ذکر ایک فطری امر ہے۔ دین اسلام بھی چونکہ فطری ہے، اس لیے وہ فطری تقاضوں کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کرتا۔ البتہ اسلام ان فطری تقاضوں کو قانون اور دستور کے ذریعے منظم بناتا ہے تاکہ انسان اپنے فطری تقاضے مہذب طریقوں سے پورے کریں۔ لہٰذا عدت کے دنوں میں اشاروں اور کنایوں کے ذریعے اظہار ہو سکتا ہے۔

۴۔ دوران عدت خفیہ قول و قرار جائز نہیں ہے۔ یعنی خفیہ طور پر صریح لفظوں میں عہد و پیمان کرنا۔

۵۔ عدت وفات کے دنوں میں فیصلہ کر کے نکاح پڑھ لینا جائز نہیں ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو عورت مرد پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی۔

اہم نکات

۱۔ فطری تقاضوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز، معقول اور مہذب طریقہ اپنانا چاہیے: لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ....

تحقیق مزید

الکافی ۵: ۴۳۴۔ الوسائل ۲۰: ۴۹۸۔ مستدرک الوسائل ۱۴: ۴۱۵۔

لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ　۲۳۶۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم عورتوں کو

النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡہُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ۚۖ وَّ مَتِّعُوۡہُنَّ ۚ عَلَی الۡمُوۡسِعِ قَدَرُہٗ وَ عَلَی الۡمُقۡتِرِ قَدَرُہٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۲۳۶﴾	ہاتھ لگانے اور مہر معین کرنے سے قبل طلاق دے دو، اس صورت میں انہیں کچھ دے کر رخصت کرو، مالدار اپنی وسعت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی وسعت کے مطابق یہ خرچ دستور کے مطابق دے، یہ نیکی کرنے والوں پر ایک حق ہے۔
وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡہُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡہُنَّ وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَہُنَّ فَرِیۡضَۃً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ ؕ وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ وَ لَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۷﴾	۲۳۷۔اور اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے قبل اور ان کے لیے مہر معین کر چکنے کے بعد طلاق دو تو اس صورت میں تمہیں اپنے مقرر کردہ مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا، مگر یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا جس کے ہاتھ میں عقد کی گرہ ہے وہ حق چھوڑ دے اور تمہارا چھوڑ دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور تم آپس کی احسان کوشی نہ بھولو، یقیناً تمہارے اعمال پر اللہ کی خوب نگاہ ہے۔

تشریح کلمات

مَس: (م س س) چھونا۔ ہاتھ لگانا۔ یہاں ہمبستری کی طرف اشارہ ہے۔

فَرِیۡضَۃً: (ف ر ض) فرض، معین شدہ۔

الۡمُقۡتِرِ: (ق ت ر) تنگ دست، فقیر۔

عُقۡدَۃُ: (ع ق د) گرہ۔

تفسیر آیات

ان دو آیات اور سنت کی روشنی میں مسئلے کی چار صورتیں بنتی ہیں۔

۱۔ مہر معین ہو اور ہمبستری سے پہلے طلاق ہو جائے تو عورت کو نصف مہر ملے گا۔

۲۔ مہر معین نہ ہو اور ہمبستری سے پہلے طلاق ہو جائے تو مالدار شوہر اپنی وسعت کے مطابق اور غریب شوہر اپنی وسعت کے مطابق عورت کو کچھ مال دے گا۔

۳۔ مہر معین ہو اور ہمبستری کے بعد طلاق دے تو پورا مہر دینا ہوگا۔

۴۔ مہر معین نہ ہو اور ہمبستری کے بعد طلاق ہو جائے تو اس جیسی عورتوں کو عرف میں جو مہر ملا کرتا ہے وہ دینا ہوگا، جسے مہر مثل کہتے ہیں۔

ذیل کی دو صورتوں میں باقی نصف بھی معاف ہو سکتا ہے:

۱۔ عورت خود معاف کر دے۔

۲۔ باپ یا دادا جن کے ہاتھ میں نابالغ بچی کے نکاح کا اختیار ہوتا ہے، باقی مہر معاف کر دیں۔

طلاق: نکاح اسلام کے نزدیک نہایت ہی مقدس عمل ہے، جب کہ طلاق اسلام کی نظر میں جائز کاموں میں سب سے مکروہ اور مبغوض کام ہے۔ اسی لیے طلاق کی حدود و شرائط سخت ہیں، جب کہ نکاح کی شرائط آسان ہیں۔

زن و شوہر کے درمیان اختلافات اور ناہم آہنگی کی صورت میں آخری علاج طلاق ہے۔ قرآن نے طلاق کی نوبت آنے سے پہلے اختلافات کو ختم کرنے کے متعدد حل بتائے ہیں۔ مثلاً عرف کی طرف رجوع کرنا، حَکَم اور منصف کی طرف رجوع کرنا، میاں بیوی کے خاندان کے افراد کی طرف رجوع کرنا اور آخر میں ہمبستری ترک کرنا وغیرہ۔ ان تمام تدابیر میں ناکامی کی صورت میں طلاق کی نوبت آتی ہے۔

طلاق مرد کے اختیار میں ہے، جب کہ ہمبستری دونوں کے اختیار میں ہوتی ہے۔ مرد کے ہاتھ میں طلاق کا ہونا عائلی نظام زندگی کی حفاظت کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ مرد عائلی نظام میں ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے جہاں اس پر نان و نفقہ واجب ہے، وہاں اس نظام کو قائم رکھنے یا اسے ختم کرنے کا اختیار بھی اس کے پاس ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عورت مرد کے ہاتھوں میں بے بس ہے۔

اگر شوہر کی طرف سے عورت پر ظلم نہیں ہو رہا اور ازدواجی زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے تو اس صورت میں طلاق کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لیکن اگر شوہر کی طرف سے عورت پر ظلم ہو رہا ہے تو عورت خلع کے ذریعے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس صورت میں اگر مرد طلاق نہیں دیتا اور ظلم بھی بند نہیں کرتا تو عورت شرعی حاکم اور عدالت کی طرف رجوع کر کے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے اور شرعی عدالت شوہر سے طلاق کا حق

سلب کر کے خود طلاق جاری کرے گی۔

یہ سب کچھ قانون و دستور کی بات ہے۔ واضح رہے کہ قانون انسانی معاشروں کے لیے ہوتا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ یہ کلی قانون کبھی کسی فرد کے حق میں نہ ہو۔ اس صورت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا: ”آپس میں احسان و اکرام کو نہ بھولو۔

اہم نکات

۱۔ طلاق کے وقت اپنی مالی حیثیت کے مطابق عورت کو کچھ دینا شوہر کا اخلاقی فریضہ ہے۔ مَتِّعُوۡھُنَّ ....۔

۲۔ ازدواجی زندگی کا سربراہ اور حقیقت پسند ہونے کی بنا پر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر آخری راہ حل کے طور پر دیانتداری کے ساتھ اس حق کو استعمال کرے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۳۶: الکافی ۶ : ۱۰۵۔ الوسائل ۲۱: ۳۰۸۔ مستدرک الوسائل ۱۵ : ۹۰۔

آیت ۲۳۷: الکافی ۶: ۱۰۶۔ الفقیہ ۳ : ۵۰۶۔ التہذیب ۶ : ۲۵۔

حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی ٭ وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾

۲۳۸۔ نمازوں کی محافظت کرو اور خصوصاً درمیانی نماز کی اور اللہ کے حضور خضوع کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔

تشریح کلمات

قَانِت : (ق ن ت) قنوت یعنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ساتھ خضوع کرنا۔

تفسیر آیات

نماز کی محافظت کا مطلب یہ ہے:

۱۔ نماز کو وقت پر ادا کیا جائے کیونکہ نماز کی ادائیگی میں تاخیر سہل انگاری شمار ہوتی ہے۔ نماز کو اس کے وقت فضیلت میں پڑھنے کی بڑی تاکید ہوئی ہے۔

۲۔ نماز کو پوری شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے۔ وضو اور غسل، اسی طرح قرائت اور اذکار درست ہوں نیز مسائل نماز سے آگاہی ہو۔

۳۔ نماز پورے خضوع و خشوع اور حضور قلب کے ساتھ پڑھی جائے۔

۴۔ نماز کو جبری تصور کے تحت نہ پڑھے بلکہ نماز کو دین کا ستون، مومن کی معراج، قبول اعمال کی اساس اور مقصد تخلیق سمجھ کر پڑھے۔

صلوٰۃ وسطیٰ: آیت سے یہ بات واضح نہیں ہو رہی کہ کون سی نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ لیکن ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہے اور اس کو اہمیت دینے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں پڑھی گئی نیز یہ نماز دن کے وسط میں واقع ہوئی ہے اور مزید یہ کہ نماز جمعہ بھی نماز ظہر کی جگہ پڑھی جاتی ہے۔

احادیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ صلوٰۃ وسطی نماز ظہر ہے۔

قَالَ صَلٰوۃُ الظُّھْرِ وَ فِیْھَا فَرَضَ اللّٰہُ الْجُمْعَۃَ وَ فِیْھَا السَّاعَۃُ الَّتِیْ لَا یُوَافِقُھَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ فَیَسْاَلُ خَیْراً اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ اِیَّاہُ ۔[1]

صلوٰۃ وسطیٰ نماز ظہر ہے اور اسی وقت میں نماز جمعہ فرض ہے اور اسی میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جس مسلمان کو یہ وقت میسر آ جائے اور وہ کسی بھلائی کی دعا کرے تو اللہ اس کی یہ دعا ضرور قبول کرے گا۔

حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ کی تفسیر اس طرح مروی ہے:

ھو اَلدُّعَاءُ فِی الصَّلٰوۃِ حَالَ الْقِیَامِ.[2]　نماز میں قیام کی حالت میں دعا کرنا۔

اہم نکات

۱۔ نماز کی حفاظت یہ ہے کہ اس کی ظاہری و باطنی شرائط اور اس کے آداب کو صحیح طور پر انجام دیا جائے۔

تحقیق مزید

الکافی ۳ : ۲۷۱۔ الوسائل ۴ : ۲۲، ۷ : ۳۱۲۔ مستدرک الوسائل ۳ : ۲۱۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُکۡبَانًا ۚ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَمَا

۲۳۹۔ پھر اگر تم حالت خوف میں ہو تو خواہ پیدل ہو یا سوار (جس حال میں ہو نماز پڑھ لو) پھر جب تمہیں امن مل جائے تو اللہ کو اسی طرح

---

[1] مستدرک الوسائل ۶: ۹
[2] بحار الانوار ۸۲ : ۱۹۵

عَلَّمَکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۹﴾ یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں وہ (کچھ) سکھایا ہے جسے تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

تفسیر آیات

نماز کی محافظت کے سلسلے میں حکم دیا جا رہا ہے کہ کسی حالت میں بھی نماز نہ چھوڑی جائے یہاں تک کہ حالت خوف میں بھی، جہاں ایک جگہ اطمینان سے نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

خوف کی وجہ سے، چلتے ہوئے اور سواری کی حالت میں پڑھی جانے والی نمازوں میں عام نمازوں کی طرح تمام شرائط کی پابندی ضروری نہیں۔ مثلاً قبلہ رخ ہونا، رکوع اور سجود میں جانا وغیرہ، بلکہ راہ چلتے ہوئے رکوع اور سجود کے لیے سر کے اشاروں پر اکتفا کی جائے گی۔ نماز خوف کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

احادیث

کافی میں منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نماز خوف کے بارے میں سوال کیا گیا:

کَیْفَ یُصَلِّی وَ مَا یَقُوْلُ اِذَا خَافَ مِنْ سَبُعٍ اَوْ لِصٍّ کَیْفَ یُصَلِّی؟ قَالَ: یُکَبِّرُ وَ یُوْمِیءُ اِیْمَاءً بِرَأْسِہٖ۔[1]

جب کسی درندے یا چور کا خوف لاحق ہو تو آدمی کس طرح نماز پڑھے اور کیا کہے؟ آپ نے فرمایا: تکبیر کہنے کے بعد اپنے سر کے اشاروں سے نماز پڑھے۔

حضرت رسالتمآب (ص) سے مروی ہے:

بَیْنَ الْعَبْدِ وَ بَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ.[2]

انسان اور کفر کے درمیان ترک نماز کا فاصلہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ نماز مومن کی شناخت ہے، لہٰذا ہر حالت میں نماز پڑھنی چاہیے۔

۲۔ مختلف حالتوں میں نماز کی مختلف صورتیں ہیں: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ ... فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ ....۔

تحقیق مزید

الکافی ۳ : ۴۵۷۔ التہذیب ۳ : ۲۹۹۔ الوسائل ۵ : ۴۸۷۔

---

[1] اصول الکافی ۳ : ۴۵۷ [2] مستدرک الوسائل ۳ : ۴۵

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

۲۴۰۔ اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں (نان و نفقہ سے) بہرہ مند رکھا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں، پس اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں تو دستور کے دائرے میں رہ کر وہ اپنے لیے جو فیصلہ کرتی ہیں تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

۲۴۱۔ اور مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق کچھ خرچہ دینا، یہ متقی لوگوں کی ذمے داری ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

۲۴۲۔ اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لیے اس طرح کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

تفسیر آیات

بیوہ کو ایک سال تک خرچ دینے اور گھر میں رکھنے کے بارے میں دو احتمال ہیں:

۱۔ یہ ایک لازمی اور واجب حکم تھا۔ بعد میں عدت وفات والی آیت کے ذریعے ایک سال کی مدت کو منسوخ کر کے چار ماہ دس دن کی مدت مقرر کی گئی اور آیہ میراث کے ذریعے عورت کے نان و نفقہ کو شوہر کی طرف سے ملنے والی وراثت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔

۲۔ یہ اسلامی آداب کا حصہ اور مرنے والے کے احترام کی بنا پر ہے تو یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔

احادیث معصومین (ع) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم عدت وفات کی آیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔
دوسری آیت میں ذکر ہے کہ مطلقہ عورتوں کو خرچ دینا چاہیے۔ یعنی عدت کے زمانے کا خرچ طلاق دہندہ کو دینا چاہیے۔

احادیث

ابو بصیر راوی ہے کہ میں نے اس آیت کے بارے میں امام علیہ السلام سے پوچھا تو فرمایا:

كَانَ الرَّجُلُ اِذْ مَاتَ اُنْفِقَ عَلَى امْرَاَتِهٖ　کوئی شخص جب مر جاتا تو اس کے اصل ترکے سے ایک

مِنْ صُلْبِ الْمَالِ حَوْلاً ثُمَّ اُخْرِجَتْ بِلَا مِيْرَاثٍ ثُمَّ نَسَخَتْهَا آيَةُ الرُّبْعِ وَ الثُّمْنِ فَالْمَرْاَةُ يُنْفَقُ عَلَيْهَا مِنْ نَصِيْبِهَا۔[1]	سال تک اس کی بیوہ کو خرچ دیا جاتا، اس کے بعد بغیر ارث کے اسے گھر سے نکال دیا جاتا۔ بعد میں آیۂ میراث (ربع اور ثمن) کے ذریعے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب عورت پر اس کا اپنا حصہ خرچ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بعض شرعی احکام کو تدریجاً منسوخ کیا گیا تاکہ مدتوں کے عادی افراد پر اچانک تبدیلی شاق نہ گزرے۔

۲۔ نئے حکم کے مطابق بیوہ عورت زیادہ خود اعتمادی، عزت اور وقار کے ساتھ عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ اس کی کفالت احسان کے طور پر نہیں بلکہ فریضہ سمجھ کر کی جا رہی ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۴۰: الوسائل ۲۲: ۲۳۷۔ مستدرک الوسائل ۱۵: ۳۶۲

آیت ۲۴۱: الکافی ۶: ۱۰۵۔ الوسائل ۲۱: ۳۱۱۔ مستدرک الوسائل ۱۵: ۲۲۰۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾	۲۴۳۔ کیا آپ نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تھے؟ اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کر دیا، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تفسیر میں غیر امامیہ مفسرین میں بے تحاشا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ ایک تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے یا صرف ایک مثل ہے یا کسی قوم کی شکست کو موت اور اس کے بعد فتح کو

---

[1] الوسائل ۲۲: ۲۳۹

حیات کہا گیا ہے یا کسی قوم کی ایک نسل کی ناکامی کو موت اور دوسری نسل کی کامیابی کو حیات کہا گیا ہے وغیرہ۔

یہاں وہ روایت قابل اعتماد ہے جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اللہ نے اس قوم کو زندہ فرمایا تھا جو طاعون کی بیماری سے بچنے کے لیے بھاگ نکلی تھی۔ یہ لوگ بے شمار تھے۔ پھر اللہ نے ایک طویل عرصے کے لیے انہیں موت کی نیند سلا دیا یہاں تک کہ ان کی ہڈیاں تک گل سڑ کر بکھر گئیں اور وہ خاک ہو گئے۔ پھر جب اللہ نے چاہا کہ اپنی مخلوق کو زندہ دیکھے تو ایک نبی کو مبعوث فرمایا جنہیں حزقیل (ع) کہتے تھے۔ حضرت حزقیل (ع) نے دعا کی تو ان کے جسم یکجا ہو گئے، ان میں روح پلٹ آئی اور جس حالت میں وہ مرے تھے، اسی حالت میں کھڑے ہو گئے اور ایک آدمی بھی کم نہیں نکلا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک لمبی مدت تک زندگی پائی۔[1]

اہم نکات

۱۔ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہے زندگی دے۔ موت سے فرار ممکن نہیں: فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡیَاهُمۡ ...۔

۲۔ یہ آیت رجعت کے عقیدے پر بھی مؤید ثابت ہو سکتی ہے کہ خدا قیامت سے پہلے اگر کسی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو اس کے لیے ممکن ہے۔

۳۔ اکثریت، معیار فضیلت نہیں، کیونکہ اکثریت ناشکروں کی ہوتی ہے: وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ۔

تحقیق مزید

الکافی ۸ : ۱۷۳۔ بحار الانوار ۶ : ۱۲۲، ۵۳ : ۷۳۔

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۴﴾

۲۴۴۔ اور راہ خدا میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا

۲۴۵۔ کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا زیادہ دے؟ اللہ ہی گھٹاتا اور

---

[1] اصول الکافی ۸ : ۱۹۸ میں یہ واقعہ مختلف لفظوں میں نقل ہوا ہے۔ اس میں اس طرح ہے: یہ لوگ شام کی کسی بستی سے نکلے تھے اور ان کی تعداد ستر ہزار (۷۰۰۰۰) تھی۔

كَثِيۡرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقۡبِضُ وَيَبۡصُۜطُ　　بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر

وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۴۵﴾　　جانا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ جہاں بھی جہاد کا حکم دیتا ہے، وہاں اس کے ساتھ فی سبیل اللّٰہ کی قید ضرور لگاتا ہے تا کہ جہاد کا حدود اربعہ متعین ہوجائے کہ کن حالات میں، کن لوگوں کے ساتھ اور کن مقاصد کے لیے جہاد کیا جاتا ہے۔ اسلامی جہاد کشور کشائی اور حکومت و غلبے کے لیے نہیں ہوتا، جیسا کہ دشمنان اسلام نے مشہور کر رکھا ہے۔

دوسری آیت رحمت و فیض الٰہی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک بے نیاز ہستی محتاج بندوں سے قرض مانگ رہی ہے اور وہ بھی اس مال سے جو خود اس نے عطا فرمایا ہے تا کہ بندوں کو یہ آواز بھلی لگے، یہ ندا پرکشش لگے، وہ اس دعوت میں لذت محسوس کریں اور اس پر لبیک کہنے میں فخر و مباہات کریں۔ اس خطاب کی شیرینی کے بعد قرض حسنہ دینے کی راہ میں آنے والی ساری تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں، پھر قرض حسنہ لینے والا یعنی اللہ، مالک حقیقی ہونے کے باوجود کئی گنا زیادہ دینے کا مشفقانہ وعدہ فرماتا ہے۔ سبحان الکریم الجواد ۔کس قدر منافع بخش ہے یہ سودا۔ کئی گنا زیادہ دینے کا وعدہ اس خدا کی طرف سے ہے جو قابض ہے، یعنی گھٹانے والا اور باسط ہے، یعنی بڑھانے والا اور مرجع کل بھی ہے کہ آخر میں پلٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

جب یہ آیت نازل ہوئی : مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۔[1] جو نیکی کرے گا اسے اس سے بہتر ثواب ملے گا'' تو رسول خدا (ص) نے عرض کی: پالنے والے! مزید اضافہ فرما۔ تو یہ آیت نازل ہوئی : مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ....۔ [2] یعنی'' جو ایک نیکی بجا لائے اس کو دس گنا زیادہ ثواب ملے گا''۔ پھر رسول خدا (ص) نے عرض کیا : پالنے والے مزید اضافہ فرما، تب یہ آیت نازل ہوئی: مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً ....۔ فرمایا: اللہ کا کثیر نا قابل شمار ہے ۔[3]

---

[1] ۲۷ نمل : ۸۹　[2] ۶ انعام : ۱۶۰　[3] تفسیر عیاشی ۱ : ۱۳۱

اہم نکات

۱۔ غیر مسلموں سے لڑی جانے والی جنگ اس وقت جہاد کہلائے گی، جب اس کا مقصد صرف اعلائے کلمہ حق ہو، کشور کشائی یا مال غنیمت کا حصول نہ ہو: فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ....

۲۔ سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، جسے اللہ نے قرض حسنہ کا نام دیا ہے۔

۳۔ مال و رزق میں کمی بیشی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا حصول رزق کے لیے قوانین خدا کی مخالفت، سعی لاحاصل ہے: وَ اللّٰہُ یَقۡبِضُ وَ یَبۡصُۜطُ ....

۴۔ انسان ہر کام میں اللہ کے حضور جوابدہ ہے۔ لہٰذا دشمنوں کے ساتھ روابط اور مالی معاملات میں انتہائی احتیاط ضروری ہے۔

تحقیق مزید

آیت ۲۴۵: الکافی ۱: ۵۳۷۔ مستدرک الوسائل ۷: ۲۶۲۔ تفسیر عیاشی ۱: ۱۳۱

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ قَالَ ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ قَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَ اَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۴۶﴾

۲۴۶۔ کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت (کو پیش آنے والے حالات) پر نظر نہیں کی جس نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کریں تاکہ ہم راہ خدا میں جنگ کریں، (نبی نے) کہا: ایسا نہ ہو کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے اور پھر تم جنگ نہ کرو، کہنے لگے: ہم راہ خدا میں جنگ کیوں نہ کریں جب کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کیے گئے ہیں؟ لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے چند اشخاص کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَ قَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۷﴾

۲۴۷۔ اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، کہنے لگے: اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا حق کیسے مل گیا؟ جب کہ ہم خود بادشاہی کے اس سے زیادہ حقدار ہیں اور وہ کوئی دولتمند آدمی تو نہیں ہے، پیغمبر نے فرمایا: اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے اور اللہ اپنی بادشاہی جسے چاہے عنایت کرے اور اللہ بڑی وسعت والا، دانا ہے۔

وَ قَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اٰیَۃَ مُلۡکِہٖۤ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ التَّابُوۡتُ فِیۡہِ سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ بَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوۡسٰی وَ اٰلُ ہٰرُوۡنَ تَحۡمِلُہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۴۸﴾

۲۴۸۔ اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا: اس کی بادشاہی کی علامت یہ ہے کہ وہ صندوق تمہارے پاس آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے سکون و اطمینان کا سامان ہے اور جس میں آل موسیٰ و ہارون کی چھوڑی ہوئی چیزیں ہیں جسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے، اگر تم ایمان والے ہو تو یقیناً اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡہُ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ ۚ وَ مَنۡ لَّمۡ یَطۡعَمۡہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡۤ اِلَّا مَنِ

۲۴۹۔ جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا: اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے، پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہو گا مگر یہ کہ کوئی صرف ایک چلو اپنے

اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

ہاتھ سے بھر لے (تو کوئی مضائقہ نہیں) پس تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس (نہر) میں سے پانی پی لیا۔ پس جب طالوت اور اس کے ایمان والے ساتھی نہر پار ہو گئے تو انہوں نے (طالوت سے) کہا: آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، مگر جو لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ انہیں خدا کے روبرو ہونا ہے وہ کہنے لگے: بسااوقات ایک قلیل جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

۲۵۰۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر نکلے تو کہنے لگے: پروردگارا! ہمیں صبر سے لبریز فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور قوم کفار پر ہمیں فتحیاب کر۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

۲۵۱۔ چنانچہ اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے انہیں سلطنت و حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ چاہا انہیں سکھا دیا اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کا بعض کے ذریعے دفاع نہ فرماتا رہتا تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا، لیکن اہل عالم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾	۲۵۲۔ یہ ہیں اللہ کی آیات جنہیں ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کرتے ہیں اور آپ یقیناً مرسلین میں سے ہیں۔

تشریح کلمات

مَلَأ: (م ل ء) کسی امر پر مجتمع ہونے والی جماعت۔ یعنی اہل حل و عقد۔

سَکِیۡنَۃٌ: (س ك ن) سکون سے۔ فعیل کے وزن پر ہے۔ بہت زیادہ سکون و اطمینان۔

تابوت: (ت و ب) صندوق۔ اصل میں توب کا معنی رجوع کرنا ہے اور چونکہ انسان بار بار صندوق کی طرف رجوع کرتا ہے، اس لیے صندوق کو تابوت کہا جاتا ہے۔

فِئَۃٍ: (ف ی ء) گروہ۔ جماعت

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین صدی بعد اور کوئی ہزار گیارہ سو سال قبل از مسیح کا واقعہ ہے۔ سموئیل نبی (ع) کا زمانہ تھا اور وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی کوئی لائق اولاد نہ تھی۔ فلسطین کا اکثر علاقہ عمالقہ کے زیر تسلط تھا۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل کا متبرک تابوت بھی دشمن کے قبضے میں تھا۔

توریت میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے:

چنانچہ فلسطینی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی۔ ہر ایک اپنے اپنے خیمے کو بھاگا اور وہاں بڑی خونریزی ہوئی۔ تیس ہزار اسرائیلی مارے گئے اور خدا کا صندوق لوٹا گیا۔[1]

لہٰذا اپنے وطن اور اپنے مقدسات کو دشمن سے آزاد کرانے کے لیے ایک جنگ ناگزیر تھی۔ اس زمانے میں بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی سپہ سالاری کرے۔ چنانچہ توریت میں آیا ہے:

ہم تو ایک بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تاکہ ہم بھی دیگر گروہوں کی مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ عدل کرے اور ہمارے آگے چلے اور ہمارے لیے لڑائی لڑے۔[2]

نیز دیگر قوموں میں چونکہ بادشاہت کا نظام ہی رائج تھا، اس لیے بنی اسرائیل ان سے متاثر ہو کر اپنے نبی سے شہنشاہی نظام حکومت کا مطالبہ کرنے لگے۔ لوگوں کے اس مطالبے کو توریت کے مطابق حضرت سموئیل (ع) نے سخت ناپسند کیا، لیکن اللہ کے حکم پر یہ مطالبہ منظور کیا گیا اور طالوت بادشاہ مقرر ہوئے۔

طالوت ابن کش بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تھے۔ توریت کے مطابق وہ طویل القامت تھے۔ شاید طویل القامت ہونے کی بنا پر انہیں طالوت کہا گیا ہو، کیونکہ عبرانی اور عربی زبانیں قریب ہیں۔ یہ بھی

---

[1] توریت ۴: ۱۰ [2] حوالہ سابق ۸: ۱۹۔۲۰

ممکن ہے کہ طالوت ان کا لقب ہو۔ کیونکہ توریت میں ان کا نام ساول Saul آیا ہے۔ ان کا زمانۂ حکومت ۱۰۱۲ قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے۔ ان کا تعلق قبیلے بنیامین سے تھا جو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا اور اتفاقاً اس قبیلے کے سب سے چھوٹے گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ چنانچہ حضرت سموئیل (ع) کی پیشکش کے جواب میں طالوت نے کہا:

کیا میں بنیامین یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلے سے نہیں؟ اور کیا میرا گھرانہ بنیامین کے قبیلے کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں؟[1]

اولاد یعقوب (ع) یعنی بنی اسرائیل بارہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں نسل اور خاندان کی حیثیت کا مسئلہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے ایک عقیدے کی شکل اختیار کر چکا تھا کہ نبوت بنی لاوہ کا حق ہے اور حکومت آل یہودا کا۔ ادھر مالی اعتبار سے بھی طالوت کا تعلق غریب خاندان سے تھا، اس لیے دوسرے قبائل کے افراد نے ان کی بادشاہت پر دو اعتراض کیے:

۱۔ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ ۔ ''بادشاہی کے اس سے زیادہ حقدار ہم خود ہیں۔'' شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ خاندانی اور نسلی طور پر ان کا قبیلہ اس سے زیادہ حقدار ہے۔

۲۔ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ۔ ''وہ تو کوئی دولتمند آدمی نہیں ہے۔''

اس نسلی اور اقتصادی تفریق پر مبنی اعتراض کے جواب میں اللہ کے نبی نے تین معیار بیان کیے:

الف۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ ۔ ''اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا ہے''۔ اس انتخاب کا خدا کی طرف سے ہونا ناقابل تردید حقیقت ہے۔ بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کرنا بذات خود بتاتا ہے کہ امر حکومت ان کے نزدیک حکم خدا پر موقوف ہے۔

ب۔ وَ زَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ ۔ ''اللہ نے اسے علم کی فراوانی سے نوازا ہے۔'' اگر حکمران عالم نہ ہو تو جاہل ہوگا اور حضرت علی (ع) کے فرمان کے مطابق:

لَا تَرَی الۡجَاھِلَ اِلَّا مُفۡرِطاً اَوۡ مُفَرِّطاً ۔[2]　جاہل کو نہ پاؤ گے مگر حد سے آگے بڑھا ہوا یا اس سے بہت پیچھے۔

لہٰذا حکمرانوں کے لیے زندگی کے مصالح و مفاسد کا علم رکھنا لازم ہے۔

ج۔ وَالۡجِسۡمِ ۔ ان کو جسمانی قوت کی فراوانی سے بھی نوازا ہے۔ یعنی علمی صلاحیت اور فکری لیاقت کے ساتھ عملی نفاذ اور دشمن سے ٹکرانے کے لیے طالوت میں مادی اور جسمانی طاقت و شجاعت بھی موجود ہے۔ کیونکہ بزدل اپنے علم پر عمل کرنے اور اسے نافذ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

---

[1] حوالہ سابق ۹: ۱۹　[2] نہج البلاغۃ۔ کلمات قصار حکمت: ۷۰ ص ۸۳۳۔ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ

اللہ کی حاکمیت: آخر میں ایک ضابطہ بیان فرمایا: وَاللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ۔ ” اللہ اپنی بادشاہت جسے چاہے عطا کرتا ہے۔“ کیونکہ کائنات کا حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ... مٰلِکَ الۡمُلۡکِ [1] ہے۔ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ... [2] امر اور خلق اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی وہ تشریع اور قانون سازی کا اسی طرح مالک ہے جس طرح خلق و ایجاد کا مالک ہے۔ لہٰذا وہ اپنی مشیت کے مطابق جسے چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کی مشیت معاذ اللہ عبث اور بلا حکمت و مصلحت ہوتی ہے۔ جس طرح نظام تخلیق میں اللہ کی مشیت بلا حکمت و مصلحت نہیں ہوتی اور وہ کوئی چیز عبث خلق نہیں فرماتا۔ اسی طرح جسے بھی منتخب فرمائے اسے عبث نہیں، بلکہ ایک مصلحت وحکمت کے تحت منتخب فرماتا ہے۔

تابوت: بنی اسرائیل اسے ”عہد کا صندوق“ کہتے تھے۔ ایک جنگ میں فلسطینی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ اس صندوق کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ تبرکات رکھے ہوئے تھے۔ تواریخ و احادیث سے اس صندوق کی درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ حضرت موسیٰ (ع) کی والدہ نے حضرت موسیٰ (ع) کو اسی صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دیا تھا۔

۲۔ اس میں وہ الواح (تختیاں) تھیں جو طور سینا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (ع) کو عنایت فرمائی تھیں۔

۳۔ توریت کا اصل نسخہ بھی اسی میں تھا جسے حضرت موسیٰ (ع) نے خود لکھ کر بنی لاوا کے سپرد کیا تھا۔

۴۔ مَن کی ایک بوتل اس صندوق میں تھی جو صحرا میں بنی اسرائیل کو اللہ کی طرف سے عنایت ہوتا رہا۔

۵۔ حضرت موسیٰ (ع) کا عصا اس صندوق میں تھا۔

۶۔ حضرت موسیٰ (ع) کی زرہ اس صندوق میں تھی۔

چنانچہ یہ صندوق بنی اسرائیل کے لیے نہایت متبرک تھا اور وہ اسے فتح و نصرت کی علامت سمجھتے تھے۔ جب یہ ان کے ہاتھ سے چھن گیا تو وہ ہمت ہار بیٹھے۔

فرشتوں کی حفاظت میں: مشرکین اس صندوق کو جس شہر میں رکھتے، وہاں وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ خوف کی وجہ سے انہوں نے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر اسے ہانک دیا۔ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ ان بیلوں کو شموئیل کے شہر کی طرف ہانک کر لے جائیں۔ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔ صندوق کے واپس آنے سے بنی اسرائیل کو تقویت حاصل ہوئی۔ ان کے پست حوصلے بلند ہو گئے۔

آزمائش: سموئیل بنی اسرائیل کے اخلاقی انحطاط اور بے ہمتی کا مشاہدہ کرتے تھے۔ جنگجو اور

---

[1] ۳ آل عمران: ۲۶ [2] ۷ اعراف: ۵۴

بیکار افراد میں امتیاز کے لیے ایک آزمائش تجویز ہوئی۔ چنانچہ خشک صحراؤں میں سفر کے بعد جب وہ ایک نہر کے پاس پہنچے تو لشکر سے کہا گیا کہ اس نہر سے سیراب ہوکر پانی نہ پیا جائے۔ جو لوگ کچھ دیر کے لیے اپنی پیاس پر صبر نہ کر سکے وہ میدان جنگ میں اپنی جان پر کیسے کھیل سکتے تھے؟

جالوت: یہ شخص فلسطینی لشکر کا سردار اور نہایت ہی قدآور شخص تھا۔ توریت میں اس کے قد و قامت کے بارے میں ہے کہ اس کا قد ۱۰ فٹ اور اس کا وزن تین من کے قریب تھا۔

داؤد (ع): حضرت داؤد بن یسی بن حوبید لشکر طالوت میں عین اس وقت پہنچے جب جالوت بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت مبارزہ دے رہا تھا اور اسرائیلی فوج میں سے کسی کو اس کے مقابلے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت داؤد (ع) میدان میں کود پڑے اور جالوت کو قتل کر دیا۔ اس کارنامے کے بعد حضرت داؤد (ع) ہر دلعزیز شخصیت بن گئے اور طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی۔ بعد میں وہی اسرائیلیوں کے پیشوا مقرر ہوئے۔

اہم نکات

۱۔ قوموں کی ترقی اور پیشرفت میں جہاد بالمال کو تقدیر ساز اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ پچھلی قوموں کو بھی شکست و ریخت اور نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی کامیابی اور سرخروئی کا واحد ذریعہ جہاد رہا ہے۔

۳۔ کسی فرد یا قوم کے لیے فرار باعث نجات نہیں، بلکہ اسے مصائب کا مقابلہ کرنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔

۴۔ بنی اسرائیل کا وطن اور ان کے مقدسات اس لیے لٹ گئے، کیونکہ وہ اپنے انبیاء (ع) کی تعلیمات سے منحرف ہوگئے تھے۔

۵۔ قوم پر فوری طور پر اعتماد کرنے سے پہلے انہیں تجرباتی مراحل سے گزارنا ضروری ہے۔

۶۔ جنگی قیادت کو چاہیے کہ وہ قوم کو مزید امتحانی مراحل سے گزار کر صرف قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ میدان جنگ میں اترے۔ چنانچہ طالوت نے ظاہری جوش و جذبے پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ انہیں نہر کے پانی سے آزمایا تو کامیاب ہونے والے تھوڑے رہ گئے: فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا۔

۷۔ جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کا امتحان لیا گیا۔ جہاد بالنفس میں ناکام ہونے والے جنگ سے بھی ہمت ہار بیٹھے: لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ ...۔

۸۔ اللہ کے مخلص بندوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے: فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا ....۔

۹۔ طاقت کا توازن کفار کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی

طرف رجوع کیا جاتا ہے: رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا ...۔

۱۰۔ ایمان و توکل سے لیس قلیل جماعت بحکم خدا کثیر دشمن پر غالب آ سکتی ہے: كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ...۔

۱۱۔ سابقہ ادیان میں دینی قیادت کی ذمہ داری صرف دعوت و ارشاد، تعلیم و تربیت اور سیاسی قیادت پر نظر رکھنا تھی، جب کہ بادشاہ کے ذمے جنگ کی قیادت کرنا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے خود جنگ کی قیادت کا مطالبہ نہ کیا، بلکہ بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا، تاکہ اس کی زیر قیادت جنگ کر سکیں۔ لیکن اسلام میں نبی اور امام امور مملکت کے علاوہ جنگی امور میں بھی قیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

تحقیق مزید

آیت ۲۴۶: بحار الانوار ۱۳: ۴۴۹۔ ۴۵۴۔ القصص للجزائری ص ۳۳۰۔ تفسیر القمی ۱: ۸۱

آیت ۲۴۸: الکافی ۸: ۳۱۷۔ تفسیر العیاشی ۱: ۱۳۳۔ الفقیہ للطوسی ۲: ۴۷۲

آیت ۲۵۱: الکافی ۲: ۴۵۱۔ الوسائل ۱: ۲۸

تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۘ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ

۲۵۳۔ ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض ایسے ہیں جن سے اللہ ہمکلام ہوا اور اس نے ان میں سے بعض کے درجات بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور ہم نے روح القدس سے ان کی تائید کی اور اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے آنے اور روشن نشانیاں دیکھ لینے کے بعد یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے، مگر انہوں نے اختلاف کیا، پس ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض

كَفَرَ ۭ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا	نے کفر اختیار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ
اقۡتَتَلُوۡا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا	باہم نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
يُرِيۡدُ ﴿۲۵۳﴾	

تفسیر آیات

تمام انبیاء علیہم السلام میں اللہ کی طرف سے حجت ہونے کے ناطے کوئی فرق نہیں۔ سب ایک ہی مشن کے امین ہیں:

لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ... [1]　　ہم رسولوں میں تفریق کے قائل نہیں ہیں ۔

لیکن ان کے درجات ہر لحاظ سے یکساں بھی نہیں۔ ان میں سے بعض اولو العزم اور صاحب شریعت ہیں، بعض سے اللہ ہمکلام ہوا جو ایک خاص فضیلت ہے اور بعض کو روح القدس کی خصوصی تائید سے نوازا جو ایک منفرد درجہ ہے ۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کے آنے کا مقصد تو یہ تھا کہ اختلافات ختم ہوجائیں نیز لوگوں میں خونریزیاں اور لڑائیاں بند ہوجائیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ انبیاء کے آنے اور آیات بینات کے دکھانے کے باوجود جنگ و قتال اور اختلافات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اس سوال کا جواب دیتا ہے: ''اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم نہ لڑتے''۔ اللہ کی طاقت کے سامنے کسی کی کیا مجال۔ ان لڑائیوں اور اختلافات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کے پاس معاذاللہ ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کی طاقت نہیں، بلکہ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے ارادوں میں آزاد چھوڑ دیا جائے، کسی خاص روش پر چلنے کے لیے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ تمام معاملات اسباب و علل کے تابع ہوں تاکہ لوگوں سے امتحان لیا جا سکے۔ اگر اللہ چاہتا تو اپنی طاقت کے ذریعے اختلاف رونما ہونے ہی نہ دیتا۔ مگر اس صورت میں نہ تو آزمائش ہوتی اور نہ ہی ثواب و عقاب، نہ ارتقا، نہ کمال و نقص، بلکہ جبر و اکراہ کی ایک ساکت فضا ہوتی، جس میں کسی کو کسی پر سبقت لے جانے کی آزادی نہ ہوتی اور نہ ہی چہل پہل کا عالم ہوتا۔ ایک ہی رنگ کی دنیا ہوتی، جس کے وجود کی کوئی معقول وجہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔ اس لیے ضروری تھا کہ لوگوں کو ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کا راستہ دکھایا جائے۔ پھر ان کی آزمائش کی جائے کہ بندہ کس طرف جاتا ہے:

----

[1] ۲ بقرہ: ۲۸۵

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ○ [1] — ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی، خواہ شکرگزار بنے اور خواہ ناشکرا۔

اس آزادی کے تحت کوئی تو شاکر ہوگا اور کوئی کافر ہوگا، نتیجتاً اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اللہ نے اسلام کی صورت میں اختلافات ختم کرنے اور اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا معقول ترین اور مفید ترین راستہ دکھا دیا۔ اب اگر لوگ اسے قبول نہ کریں تو اس میں اللہ یا اللہ کے نظام (دین) کا کوئی قصور نہیں، قصور ان مخالفت کرنے والوں کا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسانوں کی مختلف خصوصیات اور متنوع کردار کی بنا پر ایک دوسرے پر برتری ایک فطری قانون ہے جس سے انبیاء بھی مستثنیٰ نہیں: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ...۔

۲۔ انسانی معاشرے میں موجود اختلاف آزادئ عمل کی دلیل اور نظریہ جبر کی نفی ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ...۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

۲۵۴۔ اے ایمان والو! جو مال ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس دن کے جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی کا فائدہ ہوگا اور نہ سفارش چلے گی اور ظالم وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن تجارت، دوستی اور سفارش کی جگہ وہ مال کام آئے گا جو دنیا میں راہ خدا میں خرچ کیا گیا ہو۔ نجات کا بہترین ذریعہ مال ہے۔ اسی لیے مال کے بارے میں اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ مال اگر رضائے الٰہی کا ذریعہ بن جائے تو بہترین خزانہ اور توشہ آخرت ہے اور اگر مال خود ایک مقصد بن جائے تو اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے۔

۲۔ خرچ یا انفاق فی سبیل اللہ میں واجب و مستحب دونوں شامل ہیں۔ خرچ سے مراد مال کا خرچ، علم کا خرچ اور دیگر ہر قسم کے مخارج ہیں۔ اگر کسی کو جاہ و جلالت دی گئی ہو تو یہ بھی اللہ کی طرف سے عطا شدہ

----

[1] ۷۶ انسان: ۳

رزق ہے۔ اس کا انفاق یہ ہے کہ صاحبان جاہ و منصب اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے بندگان خدا کی خدمت کریں۔ کافر یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نتیجتاً رزق خدا سے انفاق بھی نہیں کرتے۔ ان کے لیے آخرت میں کوئی مددگار نہ ہو گا۔ تجارت، دوستی اور شفاعت میں سے کوئی ایک چیز بھی ان کے کام نہ آئے گی۔ اس طرح سب سے بڑے ظالم یہی لوگ ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی تمام اندرونی صلاحیتیں اور بیرونی وسائل اللہ کی طرف سے عطا شدہ رزق ہیں۔ انہیں ابدی زندگی کی بہتری کے لیے خرچ کرنا چاہیے: اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ ....۔

۲۔ انفاق اس وقت مفید ہے جب وہ ایمان کے ساتھ ملا ہوا ہو: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا ....

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

۲۵۵۔ اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ اور سب کا نگہبان ہے، اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟ جو کچھ لوگوں کے روبرو اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ ان سب سے واقف ہے اور وہ علم خدا میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ خود چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان دونوں کی نگہداری اس کے لیے کوئی کارگراں نہیں ہے اور وہ بلند و بالا اور عظیم ذات ہے۔

تشریح کلمات

یَـُٔوۡدُ: (ا و د) بوجھ اور گرانباری کی وجہ سے اصل گزرگاہ سے ٹیڑھا کرنا۔

الۡقَیُّوۡمُ: (ق و م) نگہداری کرنے والا۔ جس پر نظام قائم ہو۔

سِنَۃٌ:　(و س ن) اونگھنا۔ بے ہوش ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡحَیُّ : اللہ کی ذات دیگر زندہ موجودات کی طرح کسی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں، بلکہ خود اپنی حیات سے زندہ ہے۔ کائنات کی تمام زندہ موجودات کی زندگی اللہ کی دی ہوئی ہے، لیکن اللہ کی زندگی کے بارے میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اسے کس نے زندگی بخشی ہے؟ کیونکہ وہ سرچشمہ زندگی اور منبع حیات ہے۔ اس کا وجود حیات سے عبارت ہے اور خود حیات کے بارے میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اسے کس نے حیات بخشی ہے؟ مثلاً چار کے بارے میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اسے کس نے جفت بنایا؟ کیونکہ چار کہتے ہی اسے ہیں جو بذات خود جفت ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے چار وجود میں آئے اور بعد میں کوئی اسے جفت ہونے کی خصوصیت بخشے۔

۲۔ الۡقَیُّوۡمُ : کائنات کا قیوم وہی ہے اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی کائنات کی نگہداری سے غافل نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی ذات تمام کائنات کی محافظ اور نگہداری کرنے والی ہے اور ہر چیز کو ہمہ وقت فیض پہنچاتی رہتی ہے، جس سے وہ چیز قائم رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک لمحے کے لیے بھی کائنات کی قیومیت اور نگہبانی سے غافل نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ کائنات ایک لمحے کے لیے اللہ کی قیومیت سے محروم ہوجائے تو نیست و نابود ہوجائے گی۔ لہٰذا قیومیت ایک ایسا جامع لفظ ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات بھی موجود ہیں۔ مثلاً خلق، رزق، حیات، ہدایت، رحمت اور تربیت وغیرہ۔ پس اللہ کے قیوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے خلق اور بقا کا واحد منبع وہی ذات اقدس ہے۔

۳۔ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ : نہ تو اسے اونگھ آتی ہے اور نہ اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ انسانی اور بشری فہم و ادراک کے مطابق یہ تعبیر اختیار کی جاتی ہے کہ فلاں پر نیند اور اونگھ کا غلبہ نہیں ہوتا، ورنہ نیند تو اس حالت کا نام ہے جس کے باعث حواس کام نہیں کرتے اور یہ بات اللہ کے لیے ایک ناقابل تصور چیز ہے، بلکہ اس تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ کا فیض ایک لمحے کے لیے بھی منقطع نہیں ہوتا۔ ورنہ دیگر جاہلی مذاہب کے عقائد کی رو سے ان کے خدا سو جاتے ہیں اور غفلت کی وجہ سے ان سے مختلف کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ بائیبل کا خدا چھ دن میں زمین اور آسمان کو پیدا کرنے کے بعد تھک جاتا ہے اور کائنات کو اپنی حالت پر چھوڑ کر ساتویں دن آرام کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا خدا اس قسم کی خرافات سے پاک و منزہ ہے۔ وہ نہ تھکتا ہے اور نہ اسے کسی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ : آسمانوں اور زمین کا حقیقی مالک بھی وہی ہے۔ اس کائنات میں اس کے علاوہ کسی اور کی دخل اندازی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کائنات کا مالک صرف وہی ہے اور

کائنات میں صرف اسی کا تصرف نافذ ہے۔ دوسری مخلوقات کے تصرفات اللہ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔ مثلاً انسان کو بھی حق حاصل ہے کہ کچھ چیزوں پر اپنی ملکیت قائم رکھے۔ مگر یہ اللہ کی طرف سے عطا شدہ ہے اور انسان اللہ کی طرف سے اس تصرف کا حق رکھتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡهِ ....[1]　اور اس مال سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے۔

دیگر علل و اسباب کے اثرات اور تصرفات بھی خود خداوند عالم کی ذات پر منتہی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگرچہ زمین، پانی اور دھوپ ایک پودے کے بڑھنے میں اپنے اثرات و تصرفات رکھتے ہیں، لیکن چونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں، اس لیے ہر طرح کے علل و اسباب آخرکار اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔

۵۔ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ : اس کے اذن کے بغیر اس کے حضور کون شفاعت کر سکتا ہے؟ ہاں اگر کسی کی شفاعت ہوگی بھی تو اللہ کے اذن سے ہوگی:

قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیۡعًا ....[2]　کہدیجیے: ساری شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔

۶۔ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ : کوئی کسی کی شفاعت کس طرح کر سکتا ہے جب کہ وہ اس کے بارے میں احاطۂ علمی نہ رکھتا ہو؟ جسے کائنات کی موجودات میں پنہاں مصالح و مفاسد کا اور نہ سامنے کی باتوں کا علم ہے کہ یہ کیوں ہیں اور نہ آنے والی باتوں کا علم ہے کہ وہ کیا ہیں، تو وہ کس بنا پر شفاعت کرے گا؟ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان باتوں کا علم رکھتا ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اور علم کا گہرا ربط ہے۔ لہٰذا عالم ہی شفاعت کر سکے گا۔ خدا جسے شفاعت کے لیے اذن مرحمت فرمائے گا، اس کے پاس اس کا دیا ہوا احاطۂ علمی بھی ہوگا۔ ارشاد ہے:

لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ۝[3]　کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے عہد لیا ہو۔

اس آیت میں ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو ایسے افراد کی شفاعت کے منتظر ہیں جو علمی اعتبار سے بے مایہ ہیں۔

۷۔ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ : کُرسِی، اساس اور محکم بنیاد کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جس جگہ پوری تمکنت کے ساتھ بیٹھا جاتا ہے اسے کُرسِی کہتے ہیں۔ اللہ کی کُرسِی سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ لفظ کُرسِی سے مراد حکومت اور اقتدار ہے۔ چنانچہ یہ ایک محاورہ بھی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کُرسِی سے مراد علم ہے۔ چونکہ معلم و استاد کرسی پر بیٹھ کر تعلیم دیتے ہیں، لہٰذا علم

---

[1] ۵۷ حدید: ۷　[2] ۳۹ زمر: ۴۴　[3] ۱۹ مریم: ۸۷

کے لیے کرسی کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت علم و ارادۂ خدا اور حکومت و اقتدار خدا دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ جہاں اس کی حکومت زمین اور آسمانوں پر محیط ہے، وہاں اس کا علم بھی ہر چیز کو محیط ہے، کیونکہ اقتدار بلاعلم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ سیاق آیت: یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی کرسی کا زمین و آسمانوں پر محیط ہونا اس کے احاطۂ علمی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ شفاعت کو بھی علم کا لازمہ بتایا گیا ہے۔ دیگر آیات سے بھی علم، شفاعت، کرسی اور عرش کے باہمی ارتباط کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ۔۔۔[1]

یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے.

نیز فرمایا:

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ﴿﴾ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا ﴿﴾[2]

اس روز شفاعت کسی کو فائدہ نہ دے گی سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے اور وہ لوگوں کے سامنے اور پیچھے کی سب باتیں جانتا ہے اور وہ کسی کے احاطہ علم میں نہیں آ سکتا۔

لہٰذا لفظ کُرسِی سے مراد اس کی ربوبیت کا وہ مقام و منزلت ہے جس کے باعث زمین و آسمان قائم ہیں اور اسی مقام ربوبیت سے کائنات کی تدبیر عمل میں آتی ہے۔ مادی ذہن رکھنے والے انسانوں کو سمجھانے کے لیے کُرسِی کی تعبیر اختیار فرمائی:

۸۔ وَ لَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا: آسمانوں اور زمین کی نگہداری اس کے لیے گراں نہیں ہے۔ ابتدا میں فرمایا کہ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ یہ سب اس کائنات پر اس کی حکومت و قدرت اور گرفت کا بیان ہے۔ یہ اسلامی توحید ہے جس میں اللہ کو تمام مادی اوصاف سے پاک گردانا جاتا ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ٭ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ﴿﴾[3]

اور بتحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکان محسوس نہیں ہوئی۔

احادیث

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

---

[1] ۱۰ یونس: ۳　[2] ۲۰ طٰہٰ: ۱۰۹۔۱۱۰　[3] ۵۰ ق: ۳۸

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: اُعْطِیْتُ آیَۃَ الْکُرْسِیِّ مِنْ کَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ وَ لَمْ یُؤْتَھَا نَبِیٌّ کَانَ قَبْلِیْ قَالَ عَلِیٌّ: فَمَا بِتُّ لَیْلَۃً قَطُّ مُنْذُ سَمِعْتُھَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی اَقْرَأُھَا۔[1]

رسول خدا (ص) نے فرمایا: مجھے آیۃ الکرسی عرش کے خزانوں سے عنایت کی گئی ہے اور مجھ سے پہلے کسی نبی کو یہ آیت نہیں دی گئی۔ حضرت علی (ع) فرماتے ہیں: پس جب سے میں نے رسول اللہ (ص) سے یہ بات سنی ہے، کسی رات میں نے اس آیت کی تلاوت ترک نہیں کی۔

تفسیر عیاشی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ اَبُوْذَرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا اَفْضَلُ مَا اُنْزِلَ عَلَیْکَ؟ قَالَ:آیَۃُ الْکُرْسِیِّ، مَا السَّمٰوٰاتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُوْنَ السَّبْعُ فِی الْکُرْسِیِّ اِلَّا کَحَلْقَۃٍ مُلْقَاۃً بِاَرْضٍ بلاقعٍ وَ اِنَّ فضلہ علی العرش کَفَضْلِ الْفُلَاۃِ عَلَی الْحَلْقَۃِ۔[2]

ابوذر نے عرض کی یا رسول اللہ (ص)! آپ (ص) پر نازل ہونے والی آیات میں سب سے افضل آیت کون سی ہے؟ فرمایا: آیۃ الکرسی۔ فرمایا: سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی مانند ہیں پھر فرمایا: اور کرسی کے مقابلے میں عرش کو وہی مقام حاصل ہے جو بیابان کو انگشتری کے حلقے پر ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ ذِرْوَۃً وَ ذِرْوَۃُ الْقُرْآنِ آیَۃُ الْکُرْسِیِّ۔[3]

ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی آیۃ الکرسی ہے۔

آیۃ الکرسی کی حد: بعض احادیث میں آیا ہے کہ آیۃ الکرسی وَھُوَالۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ تک ہے۔ لیکن بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیۃ الکرسی ھُمۡ فِیۡھَاخٰلِدُوۡنَ تک ہے۔

اہم نکات

۱۔ تمام موجودات کا منبع حیات اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے: اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی نگہبانی، قیومیت اور فیض رسانی میں تغافل ممکن نہیں: لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوۡمٌ ۔

۳۔ شفاعت کرنے کے لیے اذن خداوندی کی ضرورت ہوتی ہے: مَنۡ ذَاالَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ.

۴۔ کرسی سے مراد علم و قدرت اور نفوذ و حاکمیت کا احاطہ ہے۔ کرسی رب و مربوب کے تعلق کو ظاہر کرنے کی ایک محسوس مثال ہے: وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ....۔

۵۔ تخلیق کائنات کی طرح تدبیر کائنات میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا تفویض

۱؎ الامالی للطوسی ص ۵۰۸　۲؎ تفسیر عیاشی ۱ : ۱۳۷　۳؎ الوسائل ۱۱ : ۳۹۶

کا نظریہ باطل ہے: وَلَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا ....

تحقیق مزید

الکافی ۱ : ۱۲۹، ۸ : ۲۹۰۔ مستدرک الوسائل ۴ : ۳۳۷۔ التوحید ص ۳۲۷۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۵۶﴾

۲۵۶۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں، بتحقیق ہدایت اور ضلالت میں فرق نمایاں ہو چکا ہے، پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو بتحقیق اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا اور اللہ سب کچھ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ: سے مراد یہ ہے کہ دین کے قبول کرنے یا اسے رد کرنے میں جبر جائز نہیں ہے۔ اسلام جہاں کسی دین کی قبولیت میں جبر و اکراہ کو جائز نہیں سمجھتا، وہاں اسے رد کرنے کے لیے بھی جبر کو ناجائز سمجھتا ہے۔ اسلام احترام آدمیت کے تحت عقیدے کی آزادی کا حامی ہے۔

اسلام دین فطرت اور دین عقل و منطق ہے۔ اس فطری دعوت کا خطاب فکر و ادراک اور عقل و فہم سے ہے۔ دعوت اسلام جسم کو نہیں، عقل و ادراک کو جھنجوڑتی ہے۔ اسلام طاقت کی زبان سے نہیں بلکہ منطق اور فکر و تعقل کی زبان سے بات کرتا ہے۔ اس کا مدعی ایمان ہے اور ایمان امر قلبی ہے۔ دل جبر و اکراہ کے آگے نہیں جھکتا۔ دل طاقت کی زبان نہیں سمجھتا۔ جبر کے آگے گردنیں کٹ جاتی ہیں، مگر دل خم نہیں ہوتا۔ طاقت اور جبر سے افعال و حرکات کو قابو میں لایا جا سکتا ہے، لیکن اعتقادات و نظریات کو نہیں۔ اعتقاد و ایمان کو قابو میں لانے کے اسباب اور وسائل دوسرے ہیں۔ طاقت کے ذریعے ایمان و عقیدے کی توقع بالکل اسی طرح ہے جیسے جہالت کے ذریعے علم اور تاریکی سے روشنی کی توقع رکھی جائے۔

اسلامی جہاد کا مطلب وہ نہیں جو اسلام دشمن عناصر نے لیا ہے۔ ان کے بقول اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اسلامی دعوت میں جبر و اکراہ شامل رہا ہے۔ حالانکہ اسلام نے جب ایک ضابطہ قائم کر دیا: لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ تو اپنی دعوت کو قبول کرانے کے لیے وہ طاقت اور جبر کو استعمال نہیں کرتا اور نہ ہی اس

دعوت کے مدمقابل کھڑی ہونے والی طاقت اور جبر کو قبول کرتا ہے۔

اسلام کا جہاد ان لوگوں کے خلاف ہے جو اس آزادی کو سلب کرنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا اسلام کا جہاد فکر و عقیدے کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں ہے (جیسا کہ اسلام دشمن عناصر نے مشہور کر رکھا ہے)، بلکہ اس کا جہاد سلب شدہ آزادی کے حصول کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے اپنے عقیدے کو مسلط کرنے کے لیے طاقت استعمال نہیں کی، بلکہ عقیدے کے سامنے آنے والی طاقت کے خلاف طاقت استعمال کی ہے۔ تیسرے لفظوں میں: اسلام خود جبر نہیں کرتا، جبر کے خلاف جہاد کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے ہر قسم کے مذاہب و ادیان کو برداشت کیا ہے اور انہیں مکمل آزادی دی ہے۔

عالمی ادیان و مذاہب میں صرف اسلام ہے جو احترام آدمیت کی بنیاد پر عقیدے و مذہب کی آزادی جیسے انسانی کا حقوق کا حامی ہے۔ادیان عالم کی فضا میں پہلی بار اسلام کی طرف سے لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ کی آواز گونجی ہے۔ اسلام نے عقیدے کی بنیاد پر جبر و تشدد کو ناجائز قرار دیا ہے۔

اسلام کی دعوت کا رخ چونکہ عقل و منطق اور فہم و ادراک کی طرف ہے، لہٰذا قرآن فرماتا ہے کہ یہ کام انجام پا گیا یعنی قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ہدایت اور ضلالت میں امتیاز نمایاں ہو چکا۔ عقل و ادارک کے سامنے حق و باطل میں امتیاز ہو چکا۔ جس چیز سے ایمان و عقیدہ وجود میں آ سکتا ہے، وہ فراہم کر دی گئی:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ	اس میں ہر صاحب دل کے لیے یقیناً عبرت ہے
اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿۱﴾	جو کان لگا کر توجہ سے سنے اور (اس کا دل) حاضر ہو۔

زندہ اور آگاہ دلوں کو بتایا گیا کہ رشد و ہدایت کیا ہے اور کفر و ضلالت کیا ہے۔ اب اگر کوئی ضلالت یعنی طاغوت کا انکار کرتا ہے اور عقل و فطرت کے راستے سے منحرف ہونے والوں سے برائت کر کے ایمان باللہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تو گویا اس نے ایک ایسے وسیلے کو تھام لیا جو نجات کا ضامن ہے: لَا انۡفِصَامَ لَہَا یہ نہ ٹوٹنے والا وسیلہ ہے۔

احادیث

کافی میں عبد اللہ بن سنان حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (ع) نے فرمایا:

فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی	سے مراد خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان ہے۔
ہِیَ اَلۡاِیۡمَانُ بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ۔[2]	

---

[1] ۵۰ ق: ۳۷ [2] اصول الکافی ۲: ۱۴

عبد اللہ بن عباس راوی ہیں کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَتَمَسَّکَ بَالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی الَّتِیْ لَا انْفِصَامَ لَھَا فَلْیَتَمَسَّکَ بِوَلَایَۃِ اَخِیْ وَ وَصِیِّی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِب فَاِنَّہٗ لَا یَھْلِکُ مَنْ اَحَبَّہٗ وَ تَوَلَّاہُ وَ لَا یَنْجُوْ مَنْ اَبْغَضَہٗ وَ عَادَاہُ۔[1]

جو نہ ٹوٹنے والی مضبوط رسی کو تھامنا چاہتا ہے وہ میرے بھائی اور وصی علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت و محبت کو اختیار کرے۔ کیونکہ جو علی (ع) سے محبت کرتا ہے وہ ہلاکت میں نہیں پڑتا اور جو اس سے بغض رکھتا ہے وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

اہم نکات

۱۔ دین کو عقل و منطق کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ اسلام دین کو قبول یا رد کرنے میں جبر کا قائل نہیں: لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ...۔

۲۔ جن لوگوں نے دین کو رد کرنے کے لیے طاقت استعمال کی، اسلام نے اس طاقت کے خلاف طاقت استعمال کی ہے۔ لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ...۔

۳۔ نظریاتی آزادی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے اور جہاد کا مقصد اسی آزادی کا تحفظ ہے۔

۴۔ ایمان باللہ اور طاغوت کا انکار مذہبی آزادی کا ثمرہ اور انسانی فلاح کا مضبوط ترین وسیلہ ہے: فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ ...۔

۵۔ طاغوت کی نفی کیے بغیر ایمان باللہ ممکن ہی نہیں ہے: فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ ۔

تحقیق مزید

الکافی ۲: ۱۴۔ بحار الانوار ۸: ۷۰، ۲۴: ۸۳۔ ۸۴ بصائر الدرجات بحوالہ بحار الانوار ۲۵: ۱۴۶

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ

۲۵۷۔ اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے، وہ انہیں تاریکی سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور کفر اختیار کرنے والوں کے سرپرست طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں، یہی جہنم والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ

---

[1] معانی الاخبار ص ۳۶۸۔ بحار الانوار ۳۸: ۱۲۱

هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵۷﴾	رہیں گے۔

تشریح کلمات

وَلِیُّ: (و ل ی) دو یا اس سے زائد چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کسی اجنبی چیز کا فاصلہ نہ ہو۔

الطَّاغُوۡتُ: (ط غ و) (ط غ ی) سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والا۔ طَغی اور طُغیان بھی مذکورہ معنی رکھتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں طاغوت اسے کہتے ہیں جو اللہ کے احکام کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔

تفسیر آیات

قرآنی استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی وہ ہے جو کسی کے عقائد و نظریات اور گفتار و کردار پر اثر انداز ہو اور ان کے درمیان کسی اجنبی کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔

لہٰذا جن ایمان والوں کا ولی، اللہ ہے، ان پر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا اثر ہوتا ہے۔ یہاں کسی غیر اللہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جن کفار کے ولی طَاغُوت ہوں گے۔ ان پر صرف طَاغُوت ہی اثر انداز ہوں گے، ہدایت و ایمان کا ان پر کوئی اثر نہ ہو گا۔

اللہ کی ولایت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مومن کو کفر و ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور ایمان سے منور فرماتا ہے۔ کفار پر چونکہ طَاغُوت کی ولایت اور حاکمیت قائم ہوتی ہے، لہٰذا ان پر طَاغُوت ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ نتیجتاً وہ ان کفار کو نور ایمان سے دور کر کے کفر کی تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمنین کے افکار و نظریات، رفتار و کردار اور ترجیحات پر صرف اللہ ہی کو اثر انداز ہونا چاہیے: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ....۔

۲۔ خدائے واحد پر ایمان اتحاد و وحدت کا باعث ہے اور طاغوت کی اطاعت افتراق و جدائی کا سبب بنتی ہے: یُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ....۔

تحقیق مزید

الکافی ۱: ۳۷۵ تاویل الآیات ۱۰۲

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ	۲۵۸۔ کیا آپ نے اس شخص کا حال نہیں دیکھا

فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۵۸﴾	جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس بنا پر جھگڑا کیا کہ اللہ نے اسے اقتدار دے رکھا تھا؟ جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس نے کہا: زندگی اور موت دینا میرے اختیار میں (بھی) ہے، ابراہیم نے کہا: اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا، یہ سن کر وہ کافر مبہوت رہ گیا اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بحث و مناظرہ کرنے والا ان کا معاصر سرکش بادشاہ تھا۔ قرآن نے اس بادشاہ کا نام تو نہیں لیا، البتہ تلمود میں اس بادشاہ اور اس مناظرے کا ذکر آیا ہے۔ روایات میں اس بادشاہ کا نام نمرود بن کنعان کلدانی مذکور ہے، جو عراق پر حکومت کرتا تھا اور ایک جابر بادشاہ تھا۔ توریت میں واقعہ اس طرح ہے:

> اور کوش سے نمرود پیدا ہوا، زمین پر جبار ہونے لگا۔ خداوند کے سامنے وہ جبار و صیاد تھا۔[1]

> کتاب المحبر صفحہ ۴۶۶ میں نمرود کا نسب اس طرح بیان ہوا ہے:

> نمرود بن کنعان بن سنحاریب بن نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح۔

نمرود اللہ کے وجود کا منکر نہ تھا، بلکہ وہ توحید کا منکر تھا۔ تدبیر کائنات میں غیر اللہ کی شرکت کا قائل تھا۔ کیونکہ اس کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، ان میں سورج سب سے بڑا دیوتا شمار ہوتا تھا۔ نمرود سورج دیوتا کا مظہر مانا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم (ع) کی طرف سے توحید کی دعوت نمرود کے اس دیوتائی منصب پر براہ راست ضرب تھی۔ اس لیے نمرود نے اس مناظرے میں کہا: "میرا رب وہ ہے جس نے مجھے حکومت و سلطنت بخشی ہے۔" چنانچہ قرآن نے اس بات کی طرف لطیف اشارہ فرمایا: اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ یعنی اس نے

---

[1] پیدائش ۱۰: ۹۸

نزاع اس لیے برپا کیا کہ اللہ نے اسے اقتدار دے رکھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت ہے۔ نمرود نے ایک بے گناہ راہ گیر کو قتل اور ایک سزائے موت یافتہ قیدی کو آزاد کرتے ہوئے کہا: یہ دیکھو زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا، جس پر وہ ششدر رہ گیا۔

حضرت ابراہیم (ع) نمرود کے ساتھ مناظرے میں راز حیات جیسے پیچیدہ مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ نمرود اور اس کے حواری عقلی و فکری پختگی کے لحاظ سے اس قابل نہ تھے کہ ان سے ایسے عقلی مسائل پر گفتگو کی جائے۔ وہ لوگ صرف مشاہدات اور حسیات کو سمجھنے کے قابل تھے۔ اسی لیے وہ سورج پرستی اور نجوم پرستی کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشاہداتی اور حسیاتی دلیل پیش فرمائی جو خود ان کی فکری سطح کے مطابق تھی اور فرمایا: نمرود! اگر تو ربوبیت کے مقام پر فائز ہے اور کائنات میں تیرا بھی کوئی عمل دخل ہے تو ذرا یہ اختیار سورج پر آزما کر دکھا۔ یہ دلیل ان مادہ پرستوں اور محسوس پرستوں کے ذوق کے عین مطابق تھی۔ اس لیے وہ مبہوت اور ششدر ہوکر رہ گئے۔ نمرود کے ساتھ اس تاریخی مناظرے میں یہ امر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فہم و فراست کا کمال ہے:

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ رُشۡدَہٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا بِہٖ عٰلِمِیۡنَ ۞[1]

اور تحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے کامل عقل عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے باخبر تھے۔

تلمود کے مطابق یہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کے فیصلے سے پہلے انجام پایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام قید کر دیے گئے۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے۔ پھر بادشاہ کی مشاورتی کونسل نے انہیں زندہ جلانے کا فیصلہ کیا۔

بظاہر یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے پر قادر نہ ہونے کی صورت میں وہ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مقاتل کی روایت بھی یہی ہے کہ یہ واقعہ آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مخالفین کی فکری سطح اور نفسیاتی تقاضوں کے مطابق تبلیغ کرنی چاہیے۔

۲۔ ظلم گمراہی کا سبب ہے: وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۞

تحقیق مزید

الکافی ۸ : ۳۶۸

----

[1] ۲۱ انبیاء: ۵۱

اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَۃٍ وَّ ہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۚ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ قَالَ کَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانۡظُرۡ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمۡ یَتَسَنَّہۡ ۚ وَ انۡظُرۡ اِلٰی حِمَارِکَ وَ لِنَجۡعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ انۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُہَا ثُمَّ نَکۡسُوۡہَا لَحۡمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ ۙ قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۵۹﴾

۲۵۹۔ یا اس شخص کی طرح جس کا ایک ایسی بستی سے گزر ہوا جو اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی، تو اس نے کہا: اللہ اس (اجڑی ہوئی آبادی) کو مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ پس اللہ نے سو (۱۰۰) برس تک اسے مردہ رکھا پھر اسے دوبارہ زندگی دی، اس سے پوچھا: بتاؤ کتنی مدت (مردہ) رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا اس سے کم، اللہ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ سو (۱۰۰) برس (مردہ) پڑے رہے ہو، لہٰذا ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو جو سڑی نہیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور ہم نے یہ اس لیے کیا ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، یوں جب اس پر حقیقت عیاں ہوگئی تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

خَاوِیَۃٌ: (خ و ی) خالی ہونا۔ ویران ہو کر گر پڑنا۔

عُرُوش: (ع ر ش) عرش کی جمع۔ چھت والی چیز کو عرش کہتے ہیں۔ اس میں بلندی بھی ملحوظ رہتی ہے۔ بادشاہ کے تخت کو اسی بلندی ہی کی وجہ سے عرش کہا جاتا ہے۔

سَنَّہ: (س ن ی) سَن سے مراد ہے وہ کھلا راستہ جو متغیر نہ ہو۔ اسی لیے ناقابل تغیر روش کو سُنَّت کہا جاتا ہے: وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۔[1] اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اس آیت میں لَمۡ یَتَسَنَّہۡ متغیر شدہ کے معنوں میں آیا ہے۔

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶۲

نُنْشِزُ:　　(ن ش ز) بلند ہونے اور ابھرنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

قرآن مجید نے نہ اس نبی کا نام لیا ہے اور نہ اس بستی کا۔ البتہ روایات میں اختلاف کے ساتھ اس نبی کا ذکر آیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ نبی حضرت عزیر (ع) تھے۔ عزیر (ع) سلسلہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر ہیں جو پانچویں صدی قبل مسیح میں مبعوث ہوئے۔ آپ (ع) کو کاتب توریت ہونے کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ یہی قول حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابن عباس سے بھی منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ارمیا نبی تھے جو ساتویں صدی قبل مسیح میں مبعوث ہوئے۔ یہ قول حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

اس بستی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر کے نزدیک یہ یروشلم (بیت المقدس) ہے، جسے بخت نصر بابلی نے ۵۸۶ قبل مسیح میں تباہ کیا تھا۔

سابقہ آیت میں توحید کا ذکر تھا۔ اس آیت میں معاد سے متعلق ایک اہم واقعہ مذکور ہے کہ نبی نے جب مردوں کی بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھا تو از راہ تعجب کہا: ان بوسیدہ ہڈیوں کو اللہ کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ نے ان کی روح قبض کی اور سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر انہیں دوبارہ زندگی دے کر سوال کیا: کتنی مدت مردہ رہے ہو؟ جواب دیا: ایک دن یا اس سے کم۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ قبض روح اور دوبارہ زندہ کرنے کا وقت مختلف تھا۔ مثلاً صبح کو روح قبض کی گئی اور جب دوبارہ زندہ کیا گیا تو شام کا وقت تھا، اسی وجہ سے نبی کو شک پیدا ہوا کہ دوبارہ زندگی اسی روز ملی ہے یا ایک دن بعد۔ البتہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نبی کو اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ مرنے کے بعد زندہ ہوا ہوں۔

دوبارہ زندگی ملنے کے بعد تین باتوں کا جواب مل گیا۔ ایک تو یہ کہ مدت گزرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینا ممکن ہے۔ ثانیاً یہ کہ اللہ بوسیدہ ہڈیوں کو کس طرح دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ ثالثاً یہ کہ کھانے پینے کی چیزوں کا محفوظ رہنا اور نہ سڑنا بتاتا ہے کہ ایک لمبی مدت تک کسی چیز کو محفوظ رکھنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ یعنی ایک طرح کے ماحول میں گدھے کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو جاتی ہیں، جب کہ کھانے پینے کی چیزیں جو جلدی سڑ جایا کرتی ہیں، سو سال تک تازہ حالت میں باقی رہتی ہیں۔

تفسیر المنار میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ اس نبی کی روح قبض نہیں کی گئی تھی، بلکہ انہیں اصحاب کہف کی طرح ایک قسم کی نیند میں رکھا گیا تھا اور سو سال بعد ہوش میں لایا گیا۔

تعجب کا مقام ہے کہ یہ حضرات بلاضرورت ایسی تاویلات کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں۔ کیا اللہ مردے کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ یا کوئی اور مجبوری لاحق ہو گئی تھی جس کی وجہ سے یہ تاویل کرنا پڑی؟ نیز یہ تاویل آیت کے سیاق و سباق کے بھی صریحاً خلاف ہے:

۱۔ درحقیقت اس نبی کے ذہن میں یہ خیال یا یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اللہ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اللہ نے خود انہی کی روح قبض کی، پھر انہیں عملاً دوبارہ زندہ کر کے فرمایا: ''اس طرح زندہ کرتا ہوں''۔ لیکن اگر انہیں خواب میں رکھا گیا ہوتا تو یہ اس سوال کا جواب نہیں بنتا تھا۔ کیونکہ طویل خواب سے بیدار کرنے سے مردوں اور بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندگی دینا ثابت نہیں ہوتا نیز سو کر اٹھنا تو روز کا معمول ہوتا ہے۔ یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔

۲۔ نبی کی زبان سے لفظ موت (بَعۡدَ مَوۡتِهَا) جس معنی میں استعمال ہوا ہے، اللہ کی زبان سے فَاَمَاتَهُ ''اسے مردہ کر دیا'' بھی اسی معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

۳۔ وَانۡظُرۡ اِلٰی حِمَارِكَ ''اپنے گدھے کو دیکھو''۔ معلوم ہوتا ہے کہ گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں کو اس بات کی دلیل کے طور پر دکھایا جا رہا ہے کہ سائل کو اسی قسم کی حالت سے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔

۴۔ وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ كَيۡفَ نُنۡشِزُهَا ثُمَّ نَكۡسُوۡهَا لَحۡمًا۔ ''پھر ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں'' حیات بعد الموت کی دلیل ہے۔ لیکن تاویل کے شیدائیوں کو یہاں بھی تاویل بعید کا ارتکاب کرنا پڑا ہے۔

۵۔ وَلِنَجۡعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ یعنی یہ سب ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔ ظاہر ہے حیات بعد الموت کی صورت میں ہی یہ نبی اللہ کی نشانی بن سکتا ہے۔ طویل خواب کی صورت میں نشانی بننا ممکن نہیں، کیونکہ یہ بات بہت سے جانوروں میں ہر سال دیکھنے میں آتی ہے۔

احادیث

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے:

اِنَّ عُزَيۡرًا خَرَجَ من اَهۡلِهِ وَ اَمۡرَأتُه حَامِلة وَ لَهُ خَمۡسُوۡنَ سَنَةً فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِاَةَ عام ثُمَّ بَعَثَهُ فَرَجَعَ اِلٰی اَهۡلِهِ هو اِبۡنُ خَمۡسِيۡنَ سَنَةٍ فَكَانَ اِبۡنُهُ اَكۡبَرَ منه وَ ذَلِكَ مِنۡ آيَاتِ اللّٰهِ ۔[1]

حضرت عزیر (ع) اپنے اہل خانہ کو چھوڑ کر سفر پر نکلے۔ ان کی اہلیہ حاملہ تھیں اور خود ان کی عمر پچاس سال تھی۔ اللہ نے انہیں سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر زندہ کیا۔ وہ گھر لوٹے تو ان کی عمر پچاس سال ہی تھی، جب کہ ان کے بیٹے کی عمر سو سال ہو گئی تھی۔ اس طرح اس بیٹے کی عمر اپنے باپ کی عمر سے زیادہ ہو گئی۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

---

[1] روضة الواعظین ۱: ۱۴۰

اہم نکات

۱۔ حضرت عزیر (ع) کا سوال خود معاد سے نہیں بلکہ کیفیت معاد سے مربوط تھا: اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ....۔

۲۔ واقعۂ عزیر (ع) معاد کی عملی دلیل ہے۔ اللہ نے عملاً دکھا دیا کہ اللہ کس طرح مردوں کو زندہ فرماتا ہے: وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُہَا ...۔

۳۔ حضرت عزیر (ع) کے دور تک لوگوں کی عقل اور فکری سطح بہت پست تھی اور وہ حسی دلائل سے ہی قانع ہوتے تھے: وَلِنَجۡعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ ۔

۴۔ معجزات کی تاویل کرنا اللہ کی قدرت کاملہ میں شک کرنے کے مترادف ہے۔

تحقیق مزید

الوسائل ۱۶: ۱۴۲۔ سعد السعود ۱۱۷۔ القصص ۴۲۸۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَۃً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡہُنَّ اِلَیۡکَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡہُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُہُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا ؕ وَ اعۡلَمۡ

اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

۲۶۰۔ اور (وہ واقعہ یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا: میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے، فرمایا: کیا آپ ایمان نہیں رکھتے؟ کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان مل جائے، فرمایا: پس چار پرندوں کو پکڑ لو، پھر ان کے ٹکڑے کرو، پھر ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر انہیں بلاؤ، وہ تیزی سے آپ کے پاس چلے آئیں گے اور جان رکھو اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

صُرۡہُنَّ : (ص و ر) مائل ہونا یا اپنی طرف مائل کرنا۔ بعض اہل لغت کے بقول اس سے مراد پارہ پارہ کرنا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ صریر سے مشتق ہے ۔یعنی آواز دے کر بلاؤ۔ آیت میں الی

کے ساتھ متعدی ہونے کی وجہ سے اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دوسرے معنی (پارہ پارہ کرنا) کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ دوسرے دلائل کے علاوہ روایت معصوم (ع) میں بھی مذکور ہے کہ صُرْهُنَّ سے مراد ٹکڑے کرنا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا جملہ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا میں جُزۡءًا بھی قرینہ ہے کہ صُرْهُنَّ کا معنی ٹکڑے کرنا ہے۔

تفسیر آیات

تفسیر قمی میں ابن ابی عمیر نے ابو ایوب سے، انہوں نے ابو بصیر سے اور انہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ نَظَرَ اِلٰى جِيْفَةٍ عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ تأكلها سباع البر و سباع البحر ثُمَّ يَثِبُ السُّبَاعُ بَعْضُهَا عَلٰى بَعْضٍ فَيَأْكُلُ بَعْضُهَا بَعْضاً فَتَعَجَّبَ اِبْرَاهِيْمُ فَقَالَ: رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى.[1]

حضرت ابراہیم (ع) کی نظر ایک ایسے مردار پر پڑی جو دریا کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ دریائی اور خشکی کے درندے اسے کھا رہے تھے۔ پھر یہ درندے بھی ایک دوسرے کو کھانے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم (ع) کو تعجب ہوا اور کہا: پالنے والے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟

۱۔ حضرت ابراہیم (ع) کی درخواست دراصل معاد اور حیات بعد الموت سے متعلق نہ تھی، نہ معاد پر ان کے ایمان و ایقان میں کوئی کمزوری تھی۔ بلکہ درخواست کا تعلق کیفیت اور طریق عمل سے تھا۔ دوسرے الفاظ میں حضرت ابراہیم (ع) کا اللہ سے سوال یہ نہیں تھا کہ کیا تو مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو خود معاد (دوبارہ زندہ کرنے) پر شک لازم آتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوبارہ زندہ کرنا ابراہیم (ع) کے ہاں مسلمہ بات تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ عمل کس طرح انجام پاتا ہے؟ اسی وجہ سے کَیۡفَ کے ساتھ سوال ہوا ہے جو کیفیت معلوم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل (ع) سے فرمایا: اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" یعنی کیا تو باور نہیں کرتا اور تجھے یقین نہیں آتا کہ میں مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں؟ حضرت خلیل (ع) نے عرض کی: بَلٰی مجھے باور ہے، یقین ہے، تیری قدرت پر ایمان رکھتا ہوں، مگر میں اس راز کی کیفیت سے آگاہی چاہتا ہوں۔ اس غیب کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری عقل و فکر نے مان لیا ہے کہ تو ہر شے پر قادر ہے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس ایمان و ایقان میں میرے حواس بھی شامل ہوں تاکہ غیب و شہود، ہر دو اعتبار سے میں یقین و اطمینان کی اس منزل پر فائز ہو جاؤں جو مقام خلیلی کے لائق ہے، تاکہ میں

---

[1] بحار الانوار ۷: ۳۶

تیرے دست قدرت کی تخلیق کا تماشا کروں۔

۳۔ انبیاء کو عام طور پر اور اولو العزم پیغمبروں کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے ایمان بالغیب کے ساتھ ساتھ ایمان بالشہود سے بھی نوازا ہے تا کہ وہ یقین و اطمینان کے اس مقام پر فائز رہیں، جس کے بعد کسی بھی مشکل مرحلے میں تردد کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ چنانچہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَ کَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ○ [۱]	اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کیا (نظام) حکومت دکھاتے تھے تا کہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم (ع) کی طرح اللہ تعالیٰ نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی آفاق کا مشاہدہ کرایا: لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی○ [۲] بتحقیق انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ دیگر آیات میں فرمایا کہ انہوں نے افق مبین اور افق اعلیٰ میں بھی عالم شہود کی سیر کی۔

حضور اکرم (ص) کے لیے عقل اور مشاہدے سے بالاتر ایقان کی جامعیت کا بیان اس آیت میں ہو رہا ہے: مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی○ [۳] جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

۴۔ خلیلؑ کا شوق تماشا پورا کرنے کے لیے خالق نے فرمایا: چار پرندے لو، انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت باہم مخلوط کر دو، پھر اس کے کئی حصے کرو اور ہر حصہ کسی پہاڑ پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان پرندوں کو بلاؤ، وہ انتہائی سرعت کے ساتھ آپ (ع) کے پاس آ جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیل (ع) نے قدرت کا مشاہدہ کیا۔ ان مختلف پرندوں کے اجزا جو باہم مخلوط ہو گئے تھے، اپنی اصلی حالت میں لوٹ آئے اور وہ حیات جو ان اجسام سے جدا ہو گئی تھی پھر لوٹ آئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل (ع) کو دو کام سرانجام دینے کا حکم دیا:

۱۔ مختلف پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر انہیں باہم مخلوط کرنے کا حکم۔ بعض احادیث کے مطابق یہ پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوے پر مشتمل تھے۔ خلیل (ع) نے ان کا گوشت اس طرح ملا دیا کہ تمیز باقی نہ رہی۔

۲۔ ان اجزا کو ایک دوسرے سے دور مختلف پہاڑوں پر رکھنے کا حکم۔

اس مقام پر دو باتوں کا سمجھانا مقصود ہے:

۱۔ مرنے کے بعد مردے کے جسم کے اجزا دوسری مخلوقات کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ (مثلاً

---

[۱] ۶ انعام: ۷۵ [۲] ۵۳ نجم: ۱۸ [۳] ۵۳ نجم: ۱۱

انسان مرنے کے بعد مٹی بن جاتا ہے، پھر وہ درختوں اور پودوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ ان درختوں پر پھل لگتے ہیں۔ ان پھلوں کو دوسرے جاندار کھاتے ہیں۔ اس طرح یہ پھل ان کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں) انہیں دوبارہ جمع کر کے زندہ کرنا ایک راز قدرت ہے۔ خلیل (ع) کو اس کا مشاہدہ کرانا مقصود تھا۔

۲۔ مردے کے جسم کے اجزا دریا، ہوا و دیگر تغیرات کے ذریعے دور دراز مقامات تک منتشر ہو جاتے ہیں، انہیں یکجا کرنے کا مشاہدہ کرانا بھی مقصود تھا۔

اہم نکات

۱۔ تبدیلی اور تحول کے متعدد مراحل سے گزرنے کے بعد بھی جسم کے بنیادی اجزا محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے زندہ کرنے پر قادر ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۲ : ۳۹۹، ۸ : ۳۰۵، مستدرک الوسائل ۱۱ : ۱۹۵ باب وجوب الیقین۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

۲۶۱۔ جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس کی سات بالیاں اگ آئیں جن میں سے ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے عمل) کو چاہتا ہے دگنا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا، دانا ہے۔

تفسیر آیات

انفاق اور فیاضی ایک کائناتی اصول ہے، جس پر نظام کائنات استوار ہے۔ سورج اپنے حیات بخش نور کا فیض پہنچاتا ہے۔ پانی اپنی طراوت سے نوازتا ہے۔ ہوا اپنی تازگی سے فرحت بخشتی ہے اور زمین بھی جب اپنی آغوش میں مہر و محبت سے لبریز ماحول فراہم کرتی ہے تو دانہ بھی فیاضانہ جذبے کے تحت اپنا سینہ چاک کر دیتا ہے۔

اس مقام پر مسلسل اور متعدد آیات کے ذریعے امت قرآن کو انفاق فی سبیل اللہ کی ہدایات

دی جا رہی ہیں تا کہ ایک ایسی امت تشکیل دی جائے جو خدا کی پسندیدہ انسانی و اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ اقتصادی و باہمی تعاون کی اقدار پر بھی قائم ہو۔ اسلام سے پہلے غریب طبقہ سود اور استحصالی نظام میں پس رہا تھا۔ اسلام نے اس طبقے کو اقتصادی غلامی سے نجات دلا کر اس کے انسانی احترام کو بحال کرنے کے لیے انفاق پر زور دیا۔ ایسا انفاق جو محبت و اخوت کی فضا میں ہو نیز جو انفاق کرنے والے کے لیے تہذیب نفس اور لینے والے کے لیے باوقار ذریعہ زندگی ہو۔ ان آیات میں انفاق کی افادیت، آداب اور اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر مشتمل ایک دائمی دستور موجود ہے، جس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں امت مسلمہ ایک ہی خاندان کی مانند ہو جاتی ہے، جس کے تمام افراد ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی ذہنیت کی تخلیق اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسلام نے ربا اور سود کا دروازہ بند کر کے انفاق کا دروازہ کھولا اور انفاق کے بہت سے شعبے قائم کیے۔ مثلاً زکوۃ، خمس، مالی کفارے، مستحب صدقات و خیرات وقف، ہبہ، قرض حسنہ اور فدیہ وغیرہ۔

ذاتی ضروریات، اہل و عیال کی جائز ضروریات، حاجتمندوں کی امداد، رفاہ عامہ کے امور اور دین کی اشاعت پر خرچ کرنا وغیرہ، انفاق فی سبیل اللہ کے زمرے میں شامل ہیں۔

اس آیت میں حاکمانہ انداز میں نہیں، بلکہ تشویق و ترغیب کی صورت میں انفاق کا درس دیا جا رہا ہے۔ قرآن ایک نہایت ہی منافع بخش مادی ومحسوس مثال پیش فرماتا ہے کہ دانے کا زمین میں ڈالنا اس دانے کا اتلاف نہیں، بلکہ ایک منافع بخش عمل ہے۔ جس طرح مادی دنیا میں بیج کا ایک دانہ سات سو دانے دے سکتا ہے، بالکل اسی طرح راہ خدا میں خرچ کرنے سے بھی مال ضائع نہیں ہوتا، بلکہ خرچ کرنے والا سات سو گنا ثواب کی شکل میں اسے دوبارہ وصول کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ کے تحت ایک ہزار چار سو گنا ہوسکتا ہے۔ مال کے انفاق کا یہ خاصہ ہے کہ ایک ہزار چار سو گنا ثواب مل سکتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، جتنا خدا چاہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کے وجود میں آنے کا سبب اللہ تعالٰی کی فیاضی ہے۔ پس بقائے کائنات بھی فیاضی پر موقوف ہے۔

۲۔ الٰہی اقدار کے مطابق انفاق سات سو (۷۰۰) گنا سے زیادہ پیداواری صلاحیت رکھتا ہے: سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ‌ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ....

۳۔ انفاق معاشرے کو اقتصادی بدحالی اور غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۹۳: ۱۴۱ باب ۱۵ اداب الصدقۃ - سعد السعود ۱۹۵۔

اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾

۲۶۲۔ جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ ایذا دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس ہے اور انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

تفسیر آیات

انفاق کے ذریعے اسلام فقط مادی ضروریات پوری کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ساتھ ہی درج ذیل مقاصد بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی: اس مقصد کے لیے انفاق کا فی سبیل اللّٰہ ہونا شرط ہے۔

۲۔ امیر وغریب میں ہمدردی اور محبت کی فضا قائم کر کے آپس کی کدورتوں اور نفرتوں کو ختم کرنا۔

۳۔ حاجتمندوں کا وقار اور ان کی عزت نفس محفوظ رکھنا۔

بنابریں اگر انفاق کے ذریعے کسی شکم کو سیر تو کر دیا جائے اور اس کی حاجت بھی پوری کر دی جائے لیکن ساتھ ہی احسان جتا کر اس کی عزت نفس کو مجروح اور اس کے وقار کو ٹھیس پہنچائی جائے تو ایسا انفاق مفید اور باعث اجر وثواب نہیں ہوگا۔

تحقیق مزید

بحار الانوار ۹۳: ۱۴۱ باب ۱۵ آداب الصدقہ۔ سعد السعود ۱۹۵۔ المناقب ۲: ۱۷ فصل المسابقة۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيۡمٌ ﴿۲۶۳﴾

۲۶۳۔ نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (خیرات لینے والے کو) ایذا دی جائے، اللہ بڑا بے نیاز، بڑا بردبار ہے۔

تفسیر آیات

کسی حاجت مند کے سوال کا اچھے پیرائے میں جواب دینا، یا اس کے لیے دعا کرنا، نیز غیر مؤدبانہ

انداز میں سوال کرنے والے شخص سے درگزر کرنا اس بات سے بہتر ہے کہ اسے کچھ دے کر بعد میں طعنے وغیرہ کے ذریعے اسے ایذا پہنچائی جائے اور اس کی عزت نفس مجروح کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص کسی حاجت مند کی مادی مدد نہ کر سکے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن سائل کی معنوی اور نفسیاتی حوصلہ افزائی تو ایک ضروری امر ہے اور یہ غیر مادی کمک اس مادی تعاون سے بہتر ہے جس میں سائل کی عزت نفس مجروح ہو جائے۔

اہم نکات

۱۔ ناشائستہ انفاق سے شائستہ معذرت بہتر ہے: قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ ....

۲۔ اللہ کے حضور اپنی نیازمندیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت مندوں سے مناسب سلوک کرنا چاہیے: وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰی ۙ کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَیۡهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلۡدًا ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۶۴﴾

۲۶۴۔ اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح برباد نہ کرو جو اپنا مال صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، پس اس کے خرچ کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے صاف کر ڈالے، (اس طرح) یہ لوگ اپنے اعمال سے کچھ بھی اجر حاصل نہ کر سکیں گے اور اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

صَفۡوَانٍ: (ص ف و) صاف اور چکنا پتھر یا چٹان۔

وَابِلٌ: (و ب ل) زور کی بارش۔

صَلۡدًا: (ص ل د) وہ چکنا پتھر یا چٹان جس پر کچھ پیدا نہ ہو سکے۔

تفسیر آیات

۱۔ احسان جتانا، بدخصلت، گھٹیا اور کم ظرف ہونے کی علامت ہے۔ احسان جتانے والے کی نیکی درحقیقت احسان نہیں، بلکہ ایک سودے بازی ہے تاکہ کوئی مفاد حاصل کیا جا سکے۔ کم ازکم یہی کہ اپنی بڑائی منوائی جائے۔ اللہ کے ہاں ایسے صدقات کا برباد اور باطل ہونا ایک طبیعی امر ہے۔

۲۔ اسی طرح دکھاوے کے طور پر خرچ کرنا بھی ایک قسم کی سودے بازی ہے، جس کے عوض شہرت کا حصول مطلوب ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقی انفاق نہیں ہے۔ لہٰذا ریاکار کے انفاق کا باطل اور اکارت ہونا بھی ایک طبیعی امر ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ انفاق جذبۂ ایثار اور انسانی اقدار پر مبنی ایک انسانی عمل ہو، جس میں فعلی حسن کے ساتھ ساتھ فاعلی حسن بھی موجود ہو۔ یعنی اس نیک عمل کے پیچھے پاک جذبات کارفرما ہوں، ورنہ اگر اس عمل کے پیچھے ناپاک عزائم کارفرما ہوں تو ایسے عمل کا باطل ہونا ایک لازمی امر ہے۔

۴۔ گزشتہ تینوں آیات میں ایک مشترکہ بات یہ سامنے آئی کہ خیرات و صدقات کے بعد ایذا رسانی اور دل آزاری نہیں ہونی چاہیے۔ پہلی آیت میں انفاق کے موجب اجر و ثواب ہونے کے لیے مذکورہ برے عمل کو چھوڑنا ضروری قرار دیا گیا۔ دوسری آیت میں فقط خوش کلامی کو اس انفاق سے بہتر قرار دیا گیا ہے جس کے بعد احسان جتایا جائے یا تکلیف پہنچائی جائے۔ تیسری آیت میں اسے ریاکاری اور عدم ایمان کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام احترام آدمیت اور انسانی اقدار کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ کسی انسان کا وقار مجروح کرنا اور اس کی شخصیت اور انسانی حیثیت کو ٹھیس پہنچانا اللہ کے نزدیک کتنا مذموم عمل ہے۔

۵۔ اس آیت میں مذکورہ افراد کے غلط اور غیر اخلاقی انفاق کو ایک ایسی سخت چٹان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس پر مٹی کی ایک معمولی سی تہ ہو اور اس میں کسی فصل کی جڑوں کے لیے جائے استقرار نہ ہو اور بارش، رحمت کی جگہ اس کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھانے کا باعث بن جائے۔ بالکل اسی طرح یہ انفاق بھی بظاہر اچھا عمل لگتا ہے لیکن منت جتانے اور ایذا پہنچانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کے پیچھے ایک بدخصلت، ناملائم اور پتھر جیسا انسان چھپا ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ احسان جتانا، دکھاوا اور مبداء و معاد پر عدم ایمان، انفاق کے اجر و ثواب کو مٹا دیتے ہیں: لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ ....۔

۲۔ ایذا رسانی، احسان جتانا اور ریاکاری قساوت قلب کے اسباب ہیں جو کفر کا پیش خیمہ ہے۔ فَمَثَلُہٗ ... الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ۔

۳۔ برے مقاصد کے تحت انجام دیے گئے ظاہری اعمال پر اخروی ثواب نہیں ملتا۔ لَا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّمَّا کَسَبُوۡا ...۔

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۷: ۲۳۴ باب عدم جواز المن ۔ بحار الانوار ۵ : ۳۳۳ باب وعد الوعید۔

وَمَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ وَتَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ کَمَثَلِ جَنَّۃٍۭ بِرَبۡوَۃٍ اَصَابَہَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُکُلَہَا ضِعۡفَیۡنِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یُصِبۡہَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۶۵﴾

۲۶۵۔ اور جو لوگ اپنا مال اللہ کی خوشنودی کی خاطر اور ثبات نفس سے خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو، جس پر زور کا مینہ برسے تو دگنا پھل دے اور اگر تیز بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی کافی ہو جائے اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

تشریح کلمات

رَبۡوَۃ: (ر ب و) بلند جگہ یا ٹیلہ۔ ربا بھی اسی سے مشتق ہے۔ چنانچہ سود خور کی مالی طاقت میں روز بروز اضافے کے پیش نظر سود کو ربا کہتے ہیں۔

طَلّ: (ط ل ل) بہت ہلکی بارش۔ طل الارض زمین پر اوس پڑی۔

تفسیر آیات

انفاق کی مثبت اور نتیجہ خیز صورت پیش کی جا رہی ہے کہ اگر اس نیک عمل کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی جیسے پاک عوامل اور جذبات کارفرما ہوں اور انفاق کے بعد بھی یہی پاک جذبات اور نیک نیتی قائم رہے، پھر نہ احسان جتایا جائے اور نہ ایذا رسانی ہو تو ایسا انفاق معاشرے اور لوگوں کے اذہان و قلوب پر گہرے اور مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔ کیونکہ اس عمل کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں جو اس انفاق کے پیچھے

نہ سخت چٹان سے ملتی ہیں جس سے وہ سوکھ جائے اور نہ اس کے چہرے پر ہلکی مٹی کا نقاب ہے جو مینہ سے ڈھل جائے، بلکہ وہ ایسی زرخیز مٹی اور اونچی جگہ پر واقع ایسے باغ کی طرح ہے کہ بارش اس کی مٹی کو بہا کر نہیں لے جا سکتی بلکہ اسے سرسبز و شاداب بنا دیتی ہے اور اس کی پیداوار کو دوگنا کر دیتی ہے۔ اس پاک اور زرخیز مٹی کے لیے تو ہلکی بوندا باندی بھی کافی ہوتی ہے۔

پاک جذبات کے تحت ہونے والا انفاق زرخیز باغ کی طرح ہے۔ یہ باغ قلب مومن کی سطح مرتفع پر واقع ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی گندگی سے پاک ہوتا ہے۔ فیاض بھی ہے اور حصول فیض کے لیے مناسب بھی اور ذرا سی نمی سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے حسن فعلی کے ساتھ ساتھ حسن فاعلی بھی شرط ہے: ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ وَ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ...۔

تحقیق مزید

تفسیر العیاشی ۱: ۱۴۸ سورہ بقرۃ ۔ تفسیر الفرات ذیل الآیہ۔ تفسیر القمی قصة بخت نصر ص ۸۶۔ شواہد التنزیل ۱: ۱۳۴ و سورۃ البقرۃ ص ۸۶۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ لَہٗ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَہُ الۡکِبَرُ وَ لَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۪ۖ فَاَصَابَہَاۤ اِعۡصَارٌ فِیۡہِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾

۲۶۶۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اور اس کے لیے اس میں ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور جب بڑھاپا آ جائے اور اس کے بچے بھی ناتواں ہوں تو ناگہاں یہ باغ ایک ایسے بگولے کی زد میں آ جائے جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے؟ اللہ یوں تمہارے لیے نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے شاید تم غور و فکر کرو۔

تشریح کلمات

اِعۡصَارٌ: (ع۔ص۔ر) گرد و غبار والی تند و تیز ہوا، آندھی۔

تفسیر آیات

اس آیۂ شریفہ میں ان لوگوں کی مثال دی جا رہی ہے جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر احسان جتا کر نیز ایذا رسانی و دل آزاری کے ذریعے اپنے اس عمل کو برباد کر دیتے ہیں۔ جس طرح کوئی شخص عمر بھر کوشش کر کے ایک باغ لگائے، پھر یہ باغ عمر کے ایک ایسے نازک مرحلے میں تباہ ہو جائے جس میں وہ اس باغ کی زیادہ احتیاج رکھتا ہے۔ پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ تو وہ خود اور نہ ہی اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس تباہ شدہ باغ کی تعمیر نو کر سکتے ہیں۔ کون ہے جو ایسے ناگہانی حادثے کو پسند کرتا ہو اور کون ہے جو اس قسم کی حسرتناک حالت سے اپنے آپ کو بچانا نہ چاہتا ہو؟

ان آیات میں دو مختلف نظریات کے مختلف نتائج کی تقابلی وضاحت ہو رہی ہے۔ ایک طرف ایک ایسا نفع بخش عمل ہے جس کی پیداواری طاقت سات سو فیصد ہے۔ دوسری طرف ایک ابتر عمل ہے جو اس چٹان کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہوئی ہو جو زوردار مینہ سے صاف ہو جائے، اس کی پیداواری صلاحیت ایک فیصد بھی نہیں ہے۔

ایک طرف سطح مرتفع پر واقع وہ باغ ہے جو اچھی یا تھوڑی بارش دونوں حالتوں میں بیمہ شدہ ہے اور اچھی فصل کا ضامن ہے۔ دوسری طرف وہ باغ ہے جس کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور جس پر صرف شدہ عمر بھر کی زحمات کو ایک لحہ کی تند و تیز آندھی اور آگ تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رفاہی اور فلاحی کاموں کی قدر و قیمت ان جذبات کی تابع ہے جن کے تحت یہ امور انجام پاتے ہیں۔

۲۔ دل آزاری آسمانی بجلی ہے جو انفاق کی کھیتی کو اس طرح جلا دیتی ہے کہ دوبارہ آباد نہ ہو سکے۔
فَاَصَابَهَاۤ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ....

تحقیق مزید

مستدرک الوسائل ۷: ۲۳۳ باب عدم جواز المنّ۔ مکارم الاخلاق ص ۳۴۷ فی الدعاء علی الظالم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ

۲۶۷۔ اے ایمان والو! جو مال تم کماتے ہو اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا

اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَ لَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ تُنۡفِقُوۡنَ وَ لَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۲۶۷﴾	ہے ان میں سے عمدہ حصہ (راہ خدا میں) خرچ کرو اور اس میں سے ردی چیز دینے کا قصد ہی نہ کرو اور (اگر کوئی وہی تمہیں دے تو) تم خود اسے لینا گوارا نہ کرو گے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بڑا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

تشریح کلمات

التَیَمَّم: (ی م م) قصد کرنا۔ ارادے اور قصد کے ساتھ کام کرنا۔

تفسیر آیات

گزشتہ متعدد آیات کے سیاق و سباق سے ایک بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انفاق کا ہدف اور اصلی مقصد اس کا اقتصادی اور مادی پہلو ہی نہیں، بلکہ اس کا اخلاقی اور انسانی پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے۔

اس آیت میں انفاق کے بارے میں مادی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس اصول کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ انفاق میں ایثار و قربانی کا عنصر کارفرما ہونا چاہیے جو ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب انسان اپنے مال میں سے عمدہ حصہ راہ خدا میں خرچ کرے۔ چنانچہ دیگر متعدد آیات میں اس انفاق کو فضیلت دی گئی ہے جو مال سے محبت (عَلٰی حُبِّہٖ) کے باوجود کیا جائے۔ جیسے ارشاد ہے:

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ... [1]	جب تک تم اپنی پسند کی چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔

ناکارہ اور ردی چیزوں کے انفاق کے بارے میں انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا: اگر یہ ردی چیزیں خود تمہیں دی جائیں تو تم بھی انہیں قبول نہ کرو گے۔ لہٰذا ایسا انفاق سخاوت اور ایثار و قربانی نہیں کہلاتا۔ اس قسم کا انفاق ان ردی چیزوں سے جان چھڑانے کا ذریعہ ہوسکتا ہے، مگر ایک اعلیٰ انسانی اخلاق و

---

[1] ۳ آل عمران: ۹۲

اقدار کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ قرآن کے نزدیک اس انفاق کو فضیلت حاصل ہے جس کے ذریعے اعلیٰ اقدار کے مالک انسان کا سراغ ملتا ہو۔

اہم نکات

۱۔ انفاق اس وقت بارآور ہو گا جب وہ کسب حلال سے ہو: مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ ...۔

۲۔ انسان اللہ تعالیٰ سے اچھی اور عمدہ چیزوں کا طالب ہوتا ہے۔ اسے چاہیے کہ انفاق کرتے وقت وہ اس نفسیاتی کیفیت کو مدنظر رکھے: وَ لَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ۔

۳۔ انفاق نیک نامی اور وسعت رزق کا سبب ہے: اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ۔

تحقیق مزید

الکافی ۴ : ۴۸ باب النوادر۔ الوسائل ۹: ۴۶۵ باب استحباب الصدقة۔ مستدرک الوسائل ۷ : ۹۵ باب عدم جواز اخراج

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۶۸﴾

۲۶۸۔ شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے، جب کہ اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بڑا صاحب وسعت، دانا ہے۔

تفسیر آیات

جو لوگ اپنے مال کا عمدہ حصہ راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے، ان کے اس بخل کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ فرمایا کہ اس کے پیچھے فقر و تنگدستی کا وہ خوف کارفرما ہے جو شیطان کا پیدا کردہ ہے۔ شیطانی مادی سوچ یہ ہے کہ مال خرچ کرنے سے انسان تنگدست ہو جاتا ہے، جب کہ قرآنی سوچ اور خدائی پیمانے کے مطابق خرچ کرنے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ رضائے الٰہی اور اس کی بخششوں کا سبب بن جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انفاق کو باعث فقر سمجھنا شیطانی سوچ ہے: اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ ...۔

۲۔ انفاق سے معنوی تکامل اور معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمۡ مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ۔

تحقیق مزید

الوسائل ۷ : ۵۶ باب تحریم القنوط ۔ تفسیر العیاشی ۱ : ۱۵۰ ۔ علل الشرائع ۱ : ۹۳ باب علة الغم۔

يُّؤۡتِى الۡحِكۡمَةَ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۲۶۹

۲۶۹۔ وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت دی جائے گویا اسے خیر کثیر دیا گیا ہے اور صاحبان عقل ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

اَلۡبَاب: (ل ب ب) لب کی جمع ہے۔ یعنی عقل خالص۔ چنانچہ کسی چیز کے خالص حصے کو اس کا لب اور لباب کہتے ہیں۔ عقل کو انسان کا لب و لباب کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

حکمت سے مراد حقائق کا صحیح ادراک اور بصیرت ہے۔ چنانچہ یہاں مال، انفاق، حیات انسانی اور اس کے مصالح و مفاسد اور منافع و فوائد کے سلسلے میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں، وہ حکمت ہیں۔ جسے یہ حکمت میسر آئے وہ دنیا و آخرت کی سعادتوں کو حاصل کر لیتا ہے۔ نتیجتاً اسے خیر کثیر میسر آتا ہے۔ یعنی وہ اس کائنات پر حاکم علل و اسباب کے حقائق کا صحیح ادراک رکھتا ہے۔ جسے امر واقع کا ادراک نصیب ہو، وہ وہم، شک و تردد اور غلط فہمی وغیرہ جیسے شیطانی وسواس کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ ہر مقام پر اس کا فیصلہ صائب، اس کا قدم مناسب، اس کا ارادہ درست، اس کے نامۂ اعمال نتیجہ خیز اور اس کے معاملات منافع بخش ہوتے ہیں اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں خیر کثیر حاصل کرتا ہے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ : "صاحبان عقل ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔" یعنی حکمت، تذکر اور نصیحت آموزی پر موقوف ہے اور یہ بات عقل و خرد پر موقوف ہے۔ لہٰذا حکمت عقل و فہم پر موقوف ہے۔

جیسا کہ ہم نے لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ [۱] کی تفسیر میں بتایا ہے کہ اسلام کا خطاب عقل و منطق اور فہم و ادراک سے ہے۔ اسلامی تعلیمات جسم کو نہیں عقل و ادراک کو جھنجھوڑتی ہیں۔ اس لیے قرآن عقل و منطق کو

---

[۱] ۲ بقرة: ۲۵۶

دعوت فکر دیتا ہے اور یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ اسلامی تعلیمات عقل و فطرت پر مبنی ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلۡحِکۡمَۃُ ضِیَاءُ الۡمَعۡرِفَۃِ وَ مِیۡرَاثُ التَّقۡوٰی وَ ثَمَرَۃُ الصِّدۡقِ وَ مَا اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلٰی عَبۡدٍ مِنۡ عِبَادِہٖ نِعۡمَۃً اَنۡعَمُ وَ اَعۡظَمُ وَ اَرۡفَعُ وَ اَجۡزَلُ وَ اَبۡہٰی مِنَ الۡحِکۡمَۃِ۔[1]

حکمت معرفت کی روشنی، تقویٰ کی میراث اور سچائی کا پھل ہے اور اللہ نے کسی بندے پر حکمت سے بڑی، بالاتر، وافر اور خوشنما نعمت عنایت نہیں کی۔

رَأسُ الۡحِکۡمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ۔[2]

حکمت کی روح خوف خدا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حکمت بزور بازو نہیں بلکہ توفیق خداوندی سے حاصل ہوتی ہے: یُّؤۡتِی الۡحِکۡمَۃَ مَنۡ یَّشَآءُ ...

۲۔ حقائق سے بہرہ مند ہونے کے لیے عقل و منطق سے کام لینے کی ضرورت ہے: وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.

وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَۃٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

۲۷۰۔ اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو یا نذر مانتے ہو اللہ کو اس کا علم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کی اطاعت میں کسی امر کو اپنے اوپر لازم قرار دینا نَذۡر کہلاتا ہے۔ نَذۡر کا یہ عمل صرف اسلام میں نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے سابقہ ادیان میں بھی رائج تھا۔ چنانچہ حضرت مریم (ع) کا یہ قول قرآن میں مذکور ہے:

اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُکَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا ۚ[3]

میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔

اس آیت میں انفاق اور نَذۡر کے بارے میں تاکیدی لہجے میں ارشاد فرمایا: تمہارے انفاق اور نَذۡر کے بارے میں اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کس لیے اور کیوں انفاق نہیں کرتے اور کرتے بھی ہو تو کن پاک یا

---

۱ بحار الانوار ۱: ۲۱۵　۲ الفقیہ ۴: ۳۷۶　۳ ۱۹ مریم: ۲۶

ناپاک عزائم کے تحت کرتے ہو اور جو اس سلسلے میں ظلم کرتے ہیں اور غریبوں کا حق مارتے ہیں اور انفاق نہیں کرتے ان کا کوئی مددگار نہیں۔ توبہ ان کے کام آ سکتی ہے اور نہ ہی شفاعت، کیونکہ یہ حقوق العباد سے ہے۔ لہٰذا اس کا واحد حل یہی ہے کہ جن کا حق مارا ہے، ان کا حق ادا کیا جائے۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ہِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡہَا وَ تُؤۡتُوۡہَا الۡفُقَرَآءَ فَہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ یُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

۲۷۱۔ اگر تم علانیہ خیرات دو تو وہ بھی خوب ہے، اور اگر پوشیدہ طور پر اہل حاجت کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور یہ تمہارے کچھ گناہوں کا کفارہ ہو گا اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

صدقات و خیرات علانیہ طور پر دینے کے درج ذیل فوائد ہیں:

الف: اس میں عملی دعوت اور دوسروں کے لیے تشویق ہے۔

ب: غریبوں کو یہ جان کر اطمینان ہوتا ہے کہ معاشرے میں محتاجوں کا درد رکھنے والے اہل دل بستے ہیں۔

ج: خیرات دینے والے بھی لوگوں کی تہمت اور بدگمانی سے بچ جاتے ہیں کہ یہ لوگ انفاق نہیں کرتے۔

خیرات پوشیدہ طور پر دینے کے درج ذیل فوائد ہیں۔

الف۔ اس صورت میں ریاکاری کا شائبہ نہیں رہتا اور خیرات خالصتاً فی سبیل اللہ ہو جاتی ہے۔

ب۔ جب پوشیدہ طور پر خیرات دی جائے تو بعد میں احسان جتانے اور ایذا پہنچانے کی نوبت نہیں آتی۔ اس طرح یہ عمل خیر، حبط اور برباد ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

ج۔ پوشیدہ خیرات دینے سے غریبوں اور محتاجوں کی عزت نفس محفوظ رہتی ہے اور احترام آدمیت کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچتا۔

علامہ طباطبائی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فَصَدَقَۃُ الْعَلَنِ اَکْثَرُ نَتَّاجاً وَ صَدَقَۃُ السِّرِّ اَخْلَصُ طَھَارَۃً ۔[1]	علانیہ خیرات کے اثرات زیادہ ہیں، جب کہ پوشیدہ خیرات میں خلوص اور پاکیزگی زیادہ ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ انفاق گناہوں کے لیے کفارہ اور گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ حکم عام ہے:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ۔[2]	نیکیاں بے شک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

لیکن انفاق سے گناہوں کے دھلنے کا خصوصی طور پر ذکر ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق گناہوں کے کفارے کا ایک اہم سبب ہے۔

اہم نکات

۱۔ وہ صدقہ زیادہ اجر وثواب رکھتا ہے جس میں احترام آدمیت کوملحوظ رکھا جائے: وَاِنۡ تُخۡفُوۡہَا وَ تُؤۡتُوۡہَا الۡفُقَرَآءَ فَہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ....۔

تحقیق مزید

الکافی ۳ : ۴۹۹ باب فرض الزکاۃ ۔ الفقیہ ۲ : ۴۸ باب الحق المعلوم۔ التھذیب ۴ : ۱۰۴ باب من الزیارات۔

لَیۡسَ عَلَیۡکَ ہُدٰىہُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾	۲۷۲۔ آپ کے ذمے نہیں ہے کہ انہیں (جبراً) ہدایت دیں بلکہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تم جو بھی مال خرچ کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو ہے اور تم صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرو گے اور جو مال تم خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا اجر دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔

تفسیر آیات

کچھ لوگوں کی قساوت قلبی اور انفاق سے پہلوتہی کے باعث قلب رسول (ص) آزردہ ہوتا تھا۔ لہٰذا

---

[1] المیزان ذیل آیت ۲ : ۴۲۰ [2] ۱۱ ہود : ۱۱۴

بطور تسلی ارشاد فرمایا کہ ایسے لوگوں کو جبری ہدایت کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچانا آپ (ص) کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ (ص) کی ذمہ داری یہ ہے کہ اللہ کا پیغام ان تک پہنچا دیں اور ان پر حجت پوری کر دیں۔ خدا ہی جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ یعنی اللہ کی ہدایت صرف اہلیت رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

وسط کلام میں رسول (ص) کو تسلی دینے کے بعد دوبارہ مؤمنین سے خطاب ہوتا ہے کہ انفاق کی بار بار دعوت اور اس پر تاکید کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ دعوت دہندہ کا اپنا کوئی مفاد ہے، بلکہ تم جو بھی مال خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود تم ہی کو حاصل ہو گا، بشرطیکہ انفاق صرف رضائے خدا کے لیے ہو۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: تمہیں اس انفاق کا پورا اجر دیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت کسی کی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ملتی ہے: لَیۡسَ عَلَیۡکَ ہُدٰىہُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۔

۲۔ انفاق میں اللہ کا کوئی فائدہ مضمر نہیں ہے بلکہ اس کا فائدہ انفاق کرنے والے ہی کو ملے گا: یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ ۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۷۳﴾

۲۷۳۔ ان فقراء کے لیے (خرچ کرو) جو راہ خدا میں اس طرح گھر گئے ہیں کہ وہ (معیشت کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ناواقف لوگ ان کی حیا و عفت کی بنا پر انہیں مالدار خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان کے قیافے سے تم ان (کی حاجت مندی) کو پہچان سکتے ہو، وہ تکرار کے ساتھ نہیں مانگتے اور جو مال تم خرچ کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

تشریح کلمات

اُحۡصِرُوۡا: (ح ص ر) حصر رکاوٹ سے عبارت ہے، خواہ باطنی ہو، جیسے مرض یا ظاہری ہو، جیسے دشمن کی طرف سے کوئی رکاوٹ۔

التَّعَفُّفِ: (ع ف ف) عفت اور خود داری اختیار کرنا۔

سِیما: علامت۔

اِلۡحاف: (ل ح ف) سوال میں تکرار سے کام لینا، لپٹ جانا۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں انفاق کی اہمیت اور اس کی فضیلت کا بیان ہو رہا تھا۔ اس آیہ شریفہ میں خیرات و صدقات کا ایک اہم مصرف بیان ہو رہا ہے جو انفاق فی سبیل اللّٰہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ فضیلت اور اہمیت کا حامل ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے راہ خدا میں اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ذاتی معیشت کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زمان رسالت میں کچھ لوگ ایسے تھے جو ہمہ وقت رسول اللہ (ص) کے ہمراہ ہوتے تھے اور انہیں حضور (ص) بعض اہم کاموں کے لیے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔ ہمارے زمانے میں دینی طالب علم اور ہمیشہ دینی امور کے لیے کام کرنے والے لوگ اس کے مصداق ہیں۔

ثانیاً وہ لوگ اس مصرف کے مصداق ہیں جو راہ خدا میں خدمات انجام دیتے ہوئے اپنے مال و متاع سے محروم ہوگئے ہوں یا وہ لوگ جو بیماری کی وجہ سے کسب معاش کے قابل نہ رہے ہوں۔

یہ لوگ اس اعتبار سے بھی زیادہ مستحق ہیں کہ ان میں دو اہم باتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ ناواقف لوگ انہیں مالدار اور بے نیاز خیال کرتے ہیں، اس لیے خیرات دینے والے انہیں نظرانداز کرتے ہیں۔ یعنی یہ وہ باعزت اور شریف لوگ ہیں جو بظاہر فقراء اور محتاجوں میں شمار نہیں ہوتے، لیکن حقیقت میں وہ محتاج ہوتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ اصرار اور تکرار کے ساتھ مانگتے بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا مقام اور ان کا رتبہ ایسا نہیں کہ وہ دست سوال دراز کریں۔ یہ خود دار اور باوقار لوگ ہیں۔ ان کے وقار اور عزت نفس کو محفوظ رکھتے ہوئے ان پر پوشیدہ طور پر انفاق کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

حدیث

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَبۡغُضُ الۡمُلۡحِفۡ۔[۱]　　اللہ تعالیٰ تکرار و اصرار کے ساتھ مانگنے والے کو ناپسند کرتا ہے۔

---

۱ الوسائل ۹: ۴۴۴ ۔ تفسیر العیاشی ۱: ۱۵۱

اہم نکات

۱۔ ضرورت مندی اورمحتاجی کے باوجودسوال سے پرہیز اورعزت کا تحفظ خدا کو بہت پسند ہے۔

تحقیق مزید

التہذیب۴ : ۴۹ باب اصناف اهل الزکاۃ۔ شواهد التنزیل ۱: ۱۴۸۔ العمدۃ ص ۳۵۰ فی فنون شتی۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾

۲۷۴۔ جو لوگ اپنا مال شب و روز پوشیدہ اور علانیہ طور پر خرچ کرتے ہیں ان کا اجران کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کوئی خوف لاحق ہو گا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

تفسیر آیات

انسان اسلامی تربیت کے باعث جب اعلیٰ و ارفع اخلاق کا مالک بن جاتا ہے اور انسانی اقدار کو درک کر لیتا ہے تو انسان دوستی کے اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ وہ دن رات اللہ کے بندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہمیشہ مصروف عمل رہتا ہے۔ وہ حاجت مندوں کی ضروریات پوری کر کے کیف و سرور محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے کھلے بندوں انفاق کرنا یا چھپا کر خیرات کرنا مساوی ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ کیف وسرور کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر سکون اور اس کا وجدان وجد کی حلاوت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

انسانیت کا دکھ بانٹنے والے ایسے لوگوں کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ انہیں دنیا و آخرت دونوں میں نہ کوئی خوف ہو گا نہ کوئی غم۔

احادیث انفاق

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

مَنْ اَسْدَی اِلٰی مُؤْمِنٍ مَعْرُوْفاً ثُمَّ آذَاہُ بِالْکَلَامِ اَوْ مَنَّ عَلَیْہِ فَقَدْ اَبْطَلَ اللّٰہُ صَدَقَتَہٗ۔[۱]

جو شخص کسی مومن پر احسان کرے، پھر طعنوں کے ذریعے اس کو ایذا دے یا اس پر احسان جتائے تو اللہ اس کا عمل برباد کر دے گا۔

---

۱ وسائل الشیعۃ ۹: ۴۵۴

فقه الرضا علیہ السلام میں آیا ہے:

وَ اعْلَمْ اَنَّ نَفقَتَكَ عَلَى نَفْسِكَ وَ عِيَالِكَ صَدَقَةٌ وَ الْكَادُّ عَلَى عِيَالِهِ مِنْ حِلٍّ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔[1]

جو تو اپنے اور اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے۔ جو اپنے عیال کے لیے حلال کمائی کی خاطر مشقت اٹھاتا ہے وہ راہ خدا کے مجاہد کی مانند ہے۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

كُلُّ مَا فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلَيْكَ فَاِعْلَانُهٗ اَفْضَلُ مِنْ اِسْرَارِهٖ وَ كُلُّ مَا كَانَ تَطَوُّعاً فَاِسْرَارُهٗ اَفْضَلُ مِنْ اِعْلَانِهٖ وَ لَوْ اَنَّ رَجُلاً يَحْمِلُ زَكَاةَ مَالِهٖ عَلٰى عَاتِقِهٖ فَقَسَّمَهَا عَلَانِيَةً كَانَ ذٰلِكَ حَسَنًا جَمِيْلاً ۔[2]

جو زکوٰۃ اللہ کی طرف سے فرض ہے اسے کھلے عام دینا، چھپا کر دینے سے افضل ہے اور جو زکوٰۃ مستحب ہے اسے چھپا کر دینا کھلے عام دینے سے افضل ہے۔ اگر انسان اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے کاندھوں پر علانیہ طور پر تقسیم کرے تو اس میں بہتری اور خوبی ہے۔

آیت کا نزول شانِ علی علیہ السلام **میں**: یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب آپ (ع) کے پاس صرف چار درہم تھے۔ آپ (ع) نے ان میں سے ایک درہم رات کو، ایک دن کو، ایک علانیہ اور ایک چھپا کر صدقہ دیا۔

اس روایت کے راوی ابن عباس ہیں اور ابن عباس سے درج ذیل راویوں نے روایت کی ہے:

۱۔ضحاک　　۲۔مجاہد　　۳۔ابو صالح

ملاحظہ فرمائیں: شواهد التنزیل ۱: ۱۴۰ تا ۱۴۹ ۔ الکشاف۔ اسباب النزول۔ تفسیر کبیر رازی ۷: ۸۹۔ الدر المنثور ۱: ۶۴۲

انفاق کا نفسیاتی ردعمل: بعض مفسرین کے مطابق کچھ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کسی پر احسان کا نفسیاتی ردعمل دشمنی اور عداوت ہوتا ہے۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ احسان مند اپنے محسن کے سامنے احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔ یہ احساس کمتری اس کو اکساتا رہتا ہے اور وہ احسان کرنے والے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا ہے اور یہ کوشش اس کے ساتھ عداوت پر منتج ہوتی ہے۔

یہ تجزیہ غیر اسلامی مالیاتی تصور کے مطابق یا مال و دولت کے بارے میں اسلامی تربیت سے عاری افراد کے بارے میں شاید درست ثابت ہو اور شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِتَّقِ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَيْهِ۔　　اس شخص کے شر سے بچو جس پر تم نے احسان کیا ہے۔

لیکن گزشتہ آیات و احادیث کی روشنی میں احسان مند اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت یافتہ

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۳: ۵۴　[2] التہذیب ۴: ۱۰۴

شخص ہوتو وہ احسان فراموش اور نمک حرام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ دینے والا (محسن) ہے تو وہ انفاق کر کے احسان مند سے زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لینے والا صرف مادی فائدہ اٹھاتا ہے، جب کہ دینے والا مادی بھی، معنوی بھی نیز دنیاوی بھی اور اخروی بھی تمام جہات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ لہٰذا وہ نہ احسان جتاتا ہے اور نہ ہی ایذا پہنچاتا ہے۔ اس طرح منفی اثر پڑنے کے اسباب کا خاتمہ ہونے کی وجہ سے دشمنی اور عداوت پیدا نہیں ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ انفاق کسی خاص وقت یا حالت سے مختص نہیں: بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً ...۔

۲۔ انفاق طبقاتی نظام اور ارتکاز دولت کا عملی سد باب ہے۔

تحقیق مزید

الوسائل ۹: ۴۷ باب الحقوق۔ ۳۴۹ باب استحباب افتتاح النهار بالصدقة ۴۰۳ باب استحباب الصدقة بالليل۔ بحار الانوار ۴۰: ۲۵ باب سخائه عليه السلام۔ شواهد التنزيل ۱: ۱۴۰۔ ۱۴۹

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

۲۷۵۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ بس اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، پس جس شخص تک اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو پہلے لے چکا وہ اسی کا ہو گا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جس نے اعادہ کیا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

الرِّبٰوا: (ر ب و) زیادتی، اضافہ، سود۔

یَتَخَبَّطُ: (خ ب ط)خبط۔ حواس باختہ، پاگل ، مجنون۔

تفسیر آیات

سود کی تاریخ: عہد فراعنہ میں سود کا رواج تھا۔ البتہ اس کی کچھ حدود و قیود متعین تھیں۔ چنانچہ یوخوریوس نامی فرعون نے قانون بنایا کہ قرض کی ادائیگی میں اگرچہ تاخیر ہو جائے، تب بھی اس کا سود اصل سرمائے سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

افریقی اور رومن حکومتوں میں قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں مقروض خود اپنے قرض دہندہ کی ملکیت میں چلا جاتا تھا، لیکن بعد میں افریقی قانون ساز سولون نے اس غیر انسانی قانون کو ختم کر دیا اور شرح سود بارہ فیصد کر دی۔ بعد میں رومن حکومتوں میں بھی یہی قانون برقرار رہا۔

دینی قوانین: آسمانی ادیان میں سود ہمیشہ حرام رہا ہے۔ چنانچہ عہد قدیم میں مذکور ہے کہ جب کسی کو قرض دو تو اس کے ساتھ قرض خواہ کا سا سلوک نہ کرو اور مال کے لیے کسی فائدے کا مطالبہ نہ کرو۔ ملاحظہ ہو عہد قدیم آیت ۲۵ فصل ۱۲ سفر خروج نیز آیت ۳۵ فصل ۲۵ سفر لاوی اور انجیل لوقا آیات ۳۴۔ ۳۵ فصل ۶۔

مسیحی تعلیمات میں سود کو قطعاً حرام سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مسیحی پوپ حضرات بھی سود کے بارے میں سخت مؤقف اختیار کرتے تھے، جب کہ وہ مذہبی مسائل میں تساہل برتنے کے عادی تھے۔ چنانچہ پوپ سکوبر کہتا ہے: ''جو یہ کہتا ہے کہ سود گناہ نہیں ہے، وہ ملحد اور دین سے خارج ہے۔'' پوپ بونی کہتا ہے: ''سود خور لوگ دنیا میں ہی ہر قسم کی عزت و شرافت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ مرنے کے بعد تکفین کے بھی مستحق نہیں رہتے۔'' ملاحظہ ہو رسالۃ الاسلام طبع قاہرہ اکتوبر ۱۹۵۱ء بحوالہ پاسکل خطاب نمبر ۸ (Pascal lesprovinciales)۔

مسیحی یورپ: یورپ میں فرانسیسی انقلاب تک تو کم و بیش سود کی ممانعت کا حکم نافذ رہا، لیکن انقلاب فرانس کے بعد ۱۲، اکتوبر ۱۷۸۹ء میں ایک قانون کے ذریعے سود کو جائز قرار دے دیا گیا۔

ربا یعنی سود کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ قرض پر سود: جسے ربا النسیۃ بھی کہتے ہیں۔ اس کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ سود وہ زائد رقم ہے جو قرض خواہ اپنے مقروض سے اصل زر کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ علامہ سیوطی نے الجامع الصغیر میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کیا ہے نیز مستدرک الوسائل جلد ۱۳ صفحہ ۴۰۹

پر امام محمد باقر علیہ السلام سے حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان منقول ہے:

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِباً۔ [1] ہر وہ قرض جو کسی منفعت کے حصول کا سبب بنے رِبَا ہے۔

ب۔ معاملاتی سود: جسے ربا الفضل بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ اضافہ ہے جو کچھ مخصوص اور ہم جنس اجناس کے تبادلے پر لیا جائے۔ جیسے ایک کلو گندم ادھار دے کر بعد میں اس کے عوض سوا کلو گندم لینا۔

قرانی تعبیر کے مطابق سود خور حواس باختہ ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر مردہ اور وہ عقل و شعور سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک عقلی اور فطری توازن رکھنے والا شخص خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، اپنے فطری تقاضوں کے مطابق احسان پسند ہوتا ہے، خود بھی احسان کرتا ہے اور دوسرے احسان کرنے والوں کو بھی پسند کرتا ہے۔ اس کے دل میں ناداروں اور محتاجوں کے لیے رحم اور ہمدردی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ وہ مال و دولت کماتا ضرور ہے، مگر اپنی ضرورت سے زائد مال کو دوسروں کے خون پسینے کی کمائی بٹورنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔ جب کہ سود خور دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے خون پسینے کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتا اور اپنی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں دولت کے نشے میں حواس باختہ ہو کر اسے اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ اس کی اس درندگی سے کتنے ضرورت مندوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

قرآن اپنے دستور میں سود کو صدقے کے مقابل ذکر فرماتا ہے۔ صدقے کے پس منظر میں ایک ایثار پسند، انسانی اقدار کا مالک اور پاکیزہ نفس موجود ہوتا ہے۔ جب کہ سود کے پس پردہ ایک مفاد پرست، بدخو اور درندہ صفت انسان موجود ہوتا ہے۔ صدقہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے دوسروں کا دکھ درد بانٹنے کا نام ہے۔ جب کہ سود دوسروں کے خون پسینے میں اپنا لقمہ تر کرنے سے عبارت ہے۔

تمام اسلامی قوانین میں ایک بنیادی اصول مدنظر رکھا جاتا ہے: لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ۔ [2] یعنی اسلامی قوانین میں ضرر کا پہلو نہیں ہوا کرتا۔ اسلام کا کوئی حکم اور قانون، ضرر کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مثلاً اسلام نے فردی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی انسان اپنی محنت سے جو کچھ کماتا ہے، وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس ملکیت میں کسی اور فرد پر ضرر وارد ہوتا ہو تو اس وقت یہ حق واپس لے لیا جاتا ہے۔ انسان اپنی زمین پر درخت لگا سکتا ہے اور اس کے پھلنے پھولنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس درخت کی شاخیں کسی اور شخص کی زمین پر پھیل جائیں اور اسے نقصان پہنچائیں تو ان شاخوں پر اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور دوسری زمین کا مالک انہیں کاٹنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ حرمت ربا بھی اسی اصول کے تحت آتی ہے۔ انسان اپنے سرمائے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اگر یہ استفادہ مقروض کے لیے باعث ضرر

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۳: ۴۰۹۔ عوالی اللآلی ۱: ۳۰۹ [2] وسائل الشیعۃ ۲۶: ۱۴

ثابت ہو تو یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔

سود خوروں کی دلیل: اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا تجارت بھی سود ہی کی طرح ہے۔ جب تجارت میں لگائے گئے سرمائے کا منافع جائز ہے تو قرض پر دیے ہوئے سرمائے کا منافع جائز کیوں نہیں؟ ہمارے معاصر سود خور بھی عیناً یہی دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں: قرض دہندہ جس سرمائے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا، اسے وہ بطور قرض دوسرے شخص کو دیتا ہے۔ دوسرا شخص اس سرمائے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ پس اس فائدے میں سے ایک حصہ قرض دینے والے کے لیے مختص ہو جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اگر تجارت میں خرید و فروخت کر کے منافع لینا جائز ہے تو اسی سرمائے کو قرض دے کر منافع کمانا کیوں جائز نہیں؟

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ تجارت میں خسارے کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ منافع کی شرح میں کمی بیشی مدنظر ہوتی ہے، جب کہ سود میں قرض دینے والا بغیر کسی خطرے کے ایک مقررہ اور لازمی منافع کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر قرض تجارت کی غرض سے ہی لیا جائے تو واضح ہے کہ تجارت میں فائدہ وضرر دونوں کا احتمال ہوتا ہے، جب کہ سود میں قرض دینے والے کا فائدہ ہر صورت میں یقینی ہے، لیکن قرض لینے والے کے لیے خسارے کا احتمال ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اس احتمال کے مقابلے میں یقینی منافع لینا حرام ہے۔

قرض پیداواری مقاصد کے لیے لیا جاتا ہے یا غیر پیداواری مقاصد کے لیے۔ پیداواری مقاصد میں قرض خواہ کو منافع ملتا ہے یا خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح اس مسئلے کی تین صورتیں بنتی ہیں۔ قرض لینے والے کو صرف ایک صورت میں منافع حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے، جب کہ قرض دینے والا ہر صورت میں منافع حاصل کرتا ہے:

قرض	منافع کا حکم سودی نظام میں	منافع کا حکم غیر سودی نظام میں
۱۔ غیر پیداوری	فقط قرض خواہ کو ملے گا۔	قرض خواہ کے لیے منافع لینا حرام ہے۔
۲۔ پیداواری باخسارہ	فقط قرض خواہ کو ملے گا	قرض خواہ کے لیے منافع لینا حرام ہے۔
۳۔ پیداواری بامنافع	قرض لینے اور دینے والے دونوں کو ملے گا	نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر منافع دونوں کو ملے گا۔

سود درج ذیل اقتصادی برائیوں کا حامل ہونے کی وجہ سے بھی ممنوع ہے:

الف۔ غیر سودی نظام میں پہلے منافع جات کو یقینی بنایا جاتا ہے، پھر یہ منافع معاہدے کے تحت سرمائے اور محنت کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب کہ سودی نظام میں سرمایہ منافع دے یا نہ

دے، صاحب سرمایہ کو ہر صورت میں منافع مل جاتا ہے جو کہ عدل و انصاف کے سراسر خلاف اور ایک ظالمانہ قانون ہے۔

ب۔ مندرجہ بالا چارٹ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ سودی نظام کے تحت روئے زمین کے تمام پیداواری منافع جات چند افراد کی جیب میں جمع ہوجاتے ہیں، کیونکہ قرض لینے والوں کو تین صورتوں میں سے ایک صورت میں منافع ملتا ہے۔ جب کہ قرض دینے والے کو ہر صورت میں منافع حاصل ہوتا ہے۔ یہ منافع بھی زیادہ تر قرض دینے والے کو ملتا ہے اور قرض لینے والے کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا۔ مثلاً ایک ملک تیس ارب کا سودی قرض لیتا ہے، جس میں سے چھ ارب (بیس فیصد) روپے بطور سود دینے ہوں گے۔ اس رقم میں سے دس ارب روپے غیر پیداواری امور پر خرچ ہوتے ہیں جن کا کوئی منافع نہیں ہے۔ دوسرے دس ارب سے جو کاروبار کیا جاتا ہے وہ خسارے کا شکار ہوجاتا ہے۔ تیسرے دس ارب سے کاروبار کرنے پر دو ارب روپے منافع ملتا ہے۔ چنانچہ مقروض ملک کو چار ارب روپے کا خسارہ اپنے خزانے سے ادا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ملک کی تمام پیداواری صلاحیت سرمایہ دار ملک کے مفاد میں چلی جائے گی۔

ج۔ ایک ملک کا اپنا سرمایہ دس ارب ڈالر ہے۔ جب کہ بجٹ بیس ارب ڈالر کا ہے۔ لہٰذا وہ دس ارب ڈالر قرض لے گا اور اس پر دو ارب ڈالر سود دے گا۔ یعنی یہ ملک دس کی جگہ بارہ ارب ڈالر واپس کرے گا۔ اس طرح اس ملک کا اپنا سرمایہ گھٹ کر آٹھ ارب ڈالر رہ جاتا ہے۔ بعد میں اسے سود در سود کے طور پر اس دو ارب ڈالر کا بھی سود دینا پڑے گا۔ آخر کار اس ملک کی پوری پیداواری صلاحیتیں اس قرض خواہ ملک کے قبضے میں چلی جائیں گی۔

د۔ صنعت کار سودی قرض لیتے ہیں، پھر سود ادا کرنے اور کچھ منافع کمانے کے لیے وہ اپنی پیداواری اشیاء کی قیمت بڑھاتے ہیں۔ اس طرح اس کا بوجھ صارفین پر پڑتا ہے اور پورا معاشرہ سود کے برے اثرات سے متاثر ہوتا ہے، جب کہ نفع صرف سودخوروں کی جیب میں جاتا ہے۔

ھ۔ حکومتیں سودی قرض لے کر ادائیگی کے لیے ٹیکسوں کا بوجھ عوام پر ڈالتی ہیں۔ اس طرح پورا ملک متاثر ہوتا ہے۔

و۔ دور جاہلیت میں سود کے مفاسد اگرچہ کم نہ تھے، لیکن آج کل اس کے مفاسد اور زیادہ نمایاں ہیں۔ سودی استحصالی نظام ہی کی وجہ سے تیسری دنیا خصوصا اسلامی دنیا پر اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، عسکری، دینی اور ثقافتی میدانوں میں درندہ صفت استعماری طاقتوں کی بالادستی قائم ہے۔

یوں زندگی کا کوئی شعبہ سود کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔

سوال: سود قرض کی رقم کا کرایہ ہے۔ اگر کرایہ لینا جائز ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ رقم کا کرایہ لیا جائے یا گھر کا؟

جواب: کرائے میں گھر کی ملکیت گھر کے مالک کے پاس رہتی ہے، لہٰذا گھر کا نفع نقصان مالک سے مربوط ہوتا ہے، جب کہ قرض میں قرض دینے والا قرض کی عین رقم کا مالک نہیں رہتا۔ لہٰذا اس رقم کے سود و زیاں کے اثرات اس پر مرتب نہیں ہوتے۔ ثانیاً گھر سے استفادہ یقینی ہوتا ہے۔ یہاں کسی خسارے یا کمی بیشی کا خطرہ نہیں ہوتا۔

نیز اجارے میں جب تک استفادہ ہے، کرایہ ہے۔ اگر استفادہ نہیں، کرایہ نہیں ہے۔ مثلاً ایک گھر کرایہ پر ہے تو گھر سے رہائش کا استفادہ ہو تو کرایہ دیا جائے گا۔ اگر ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے یا قابل استفادہ نہ ہونے کی وجہ سے استفادہ نہیں ہو رہا تو کرایہ نہیں دیا جائے گا۔ جب کہ ربا میں خواہ رقم قابل استفادہ ہو یا نہ ہو، رقم کی اب ضرورت ہو یا نہ ہو، اس وقت تک سود دینا پڑے گا جب تک اصل رقم واپس نہیں ہو جاتی۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا: اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کی حلیت کے پیچھے درج ذیل معاشی اور اخلاقی امتیازات کارفرما ہیں:

الف: تجارت میں تاجر اپنے مال کو بازار میں پیش کرتا ہے اور منافع کی شرح بازار کے اتار چڑھاؤ کے مطابق مقرر کرتا ہے اور بازار کا یہ اتار چڑھاؤ کبھی منافع دیتا ہے اور کبھی دیوالیہ کر دیتا ہے۔ اس لیے تاجر اور گاہک دونوں فعال اور ہوشیار رہتے ہیں اور معاشی امور کے لیے مفید واقع ہوتے ہیں۔ جب کہ سودی نظام میں سرمائے کا منافع یقینی ہوتا ہے اور صرف محنت کرنے والا ہی خطرہ مول لیتا ہے۔

ب: تجارت میں بائع اور مشتری دونوں فائدہ لیتے ہیں۔ مشتری خریدی ہوئی چیز کا اور بائع فروخت شدہ مال کا نفع لیتا ہے۔ جب کہ سودی معاملے میں قرض دینے والا یقینی نفع کماتا ہے، حالانکہ قرض لینے والا اگر غیر پیداواری ضرورت کے لیے قرض لیتا ہے تو اس میں اسے کوئی نفع نہیں ہے اور اگر پیداواری امور کے لیے قرض لیتا ہے تو بھی نفع یقینی نہیں ہوتا۔

ج: تجارت میں فروخت کرنے والا مشتری سے ایک بار نفع کماتا ہے، جب کہ سود میں نفع کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، جس کی زد میں مقروض کے تن کے کپڑے اور رہائش کا مکان تک آ جاتے ہیں۔

د: تجارت میں سرمائے کے ساتھ محنت بھی صرف ہوتی ہے، جب کہ سود میں اپنی ضرورت سے زائد

رقم دے کر دوسرے کی محنت اور مشقت پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔

ھ: تجارت میں فریقین کاروبار اور اس کے منصوبے میں شریک ہوتے ہیں۔ دونوں نفع و نقصان میں شریک ہونے کی وجہ سے ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں۔ جب کہ سودی نظام معیشت میں پورا بازار مٹھی بھر سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور ان کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں رسد اور قیمتوں میں توازن مصنوعی ہو جاتا ہے اور دولت کا ارتکاز چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جاتا ہے۔

و: سودی نظام میں خواہ سرمایہ کام دے یا نہ دے، سرمایہ دار ہر صورت میں اپنی اجرت وصول کر لیتا ہے، بلکہ سرمائے میں خسارے کی صورت میں اس کی تلافی کر کے اسے واپس کرنا پڑتا ہے، جب کہ محنت کش کو ہر صورت میں اجرت نہیں ملتی، صرف منفعت حاصل ہونے کی صورت میں اجرت ملتی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودی نظام میں سرمایہ محنت پر مسلط ہوتا ہے۔

ز: سودی نظام میں جو رعایت سرمائے کو حاصل ہے، وہ اگر محنت کو حاصل ہو جائے، یعنی محنت کش خواہ محنت کرے یا نہ کرے، ہر حال میں اسے اجرت دی جائے تو اس صورت میں محنت سرمائے پر مسلط ہو جائے گی۔ اس طرح یہ قانون بھی غیر عادلانہ ہوگا۔

ح۔ قرض کا مال، مالک کی عینی ملکیت سے نکل کر مقروض کی گردن پر ایک ذمہ داری میں بدل جاتا ہے۔ قرض کا وجود عینی یا نفع دیتا ہے یا خسارہ دیتا ہے۔ اب جب کہ قرض کے مقروض کے ذمے پر آنے کے بعد قرض دینے والا عین مال کا مالک نہ رہا، بلکہ اب قرض لینے والا اس کا مالک ہے، لہٰذا مال کے تلف ہونے کی صورت میں یہ مقروض کا مال ہے جو تلف ہو جاتا ہے، نہ کہ قرض دینے والے کا۔ اسی لیے اس مال کے سود و زیاں دونوں کا تعلق قرض لینے والے سے مربوط ہوتا ہے۔

سوال: کچھ حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ غیر پیداواری قرض میں سود حرام ہے، مگر تجارت کی طرح پیداواری قرض میں سود حرام نہیں ہے۔

جواب: جس دلیل سے سود کی حرمت ثابت ہو جاتی ہے، اس دلیل کے سیاق و سباق میں ہر سود حرام ہے۔ اس میں پیداواری اور غیر پیداواری دونوں قسم کے قرضوں کا سود شامل ہے اور ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ زمان رسالت (ص) میں بھی لوگ تجارت کے لیے قرض لیا کرتے تھے۔

ط: قرض دینے والا عین مال کا مالک نہیں رہتا، لہٰذا وہ اس مال کے آثار کا بھی مالک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس مال پر مرتب ہونے والے مثبت اور منفی اثرات سے وہ متاثر نہیں ہوگا، لہٰذا سود لینا قرض کے مزاج کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر قرض مقروض کے قبضے میں آنے کے بعد تلف ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا (مقروض کا) مال تھا جو تلف ہو گیا۔ میرا قرض تمہارے

ذمے ہے۔ جب کہ منافع دینے کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ میرا مال تھا جس نے منافع دیا، لہٰذا مجھے اس میں شریک کرو۔ بنابریں سودی نظام سراسر غیر عادلانہ ہے۔

اسلامی بینکاری: اسلامی بینکاری کا اجمالی خاکہ کچھ اس طرح ہے:

کھاتہ داروں کی رقوم دو اقسام پر مشتمل ہوں گی:

الف۔ عند الطلب قابل ادا قرضے: (کرنٹ اکاؤنٹ) یہاں رقم بینک کو بطور قرض دی جائے گی۔ البتہ کھاتہ دار جب چاہے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ بینک اس رقم کا ایک حصہ محفوظ رکھے گا تا کہ مالکوں کو بوقت ضرورت واپس کر سکے۔ باقی سرمایہ، کاروباری افراد کو مضاربت (جس کی تفصیل آگے آئے گی) کے اصول پر دے گا۔ مضاربت سے جو منافع حاصل ہو گا وہ بینک کا ہو گا، کھاتہ دار کو اس پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا۔ چنانچہ موجودہ بینکاری نظام میں بھی اس مد میں کوئی منافع نہیں دیا جاتا۔ اس سے بینک کو خاصی آمدنی ہو گی۔ کیونکہ موجودہ بینکاری میں یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع ہونے والی رقوم Fixed Deposits کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہیں۔

ب۔ مضاربت: اس مد میں طویل المیعاد امانتوں (فکسڈ ڈیپازٹس مضاربت کے بنیادی سرمائے) کے ساتھ سیونگ اکاونٹ بھی شامل رہے گا۔

اسلامی بینکاری نظام میں سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈیپازٹ دونوں ایک ہی مد میں رکھے جاتے ہیں۔ مضاربت میں مدت کا تعین شرط نہیں ہے، البتہ مدت کا تعین کر لیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لحاظ سے اگر مدت کا تعین کیا جاتا ہے تو فکسڈ ڈیپازٹ ہو گا اور اگر مدت کا تعین نہیں کیا جاتا تو یہ سیونگ اکاؤنٹ ہو گا۔ دونوں صورتوں میں یہ رقوم مضاربت میں شامل ہوں گی۔

ان دونوں صورتوں میں اگر سرمائے کا مالک اس دوران اپنی رقم نکال لے تو اس رقم کی مضاربت ختم ہو جائے گی، کیونکہ مضاربت میں طرفین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں مضاربت کو فسخ کر سکتے ہیں۔ اگر اس رقم کو تجارت پر لگانے اور نفع حاصل ہونے سے پہلے نکالا جائے تو مالک کو بلامنفعت صرف سرمایہ واپس ملے گا اور اگر نفع حاصل ہونے کے بعد نکالا جائے تو جو منفعت حاصل ہو چکی ہو وہ حسب معاہدہ آپس میں تقسیم ہو گی جیسا کہ آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی قدس سرہ فرماتے ہیں:

اِذَا کَانَ الْفَسْخُ اَوِ الْاِنْفِسَاخُ بَعْدَ حُصُوْلِ الرِّبْحِ فَاِنْ رَضِیَ کُلٌّ مِنَ الْمَالِکِ وَ الْعَامِلِ بِالْقِسْمَۃِ فَلَا کَلَامَ وَاِنْ لَمْ یَرْضَ اَحَدُھُمَا اَجْبَرَ عَلَیْھَا۔[1]	معاملہ فسخ کرنے یا فسخ ہونے کی نوبت منافع کے حصول کے بعد ہے تو اگر مالک سرمایہ اور تاجر آپس میں منافع تقسیم کرنے پر راضی ہوتے ہیں تو فبھا ورنہ جو راضی نہیں ہوتا اسے راضی ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔

---

[1] منہاج الصالحین ۲:۱۴۴

مضاربت: مضاربت کی تعریف میں حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی قدس سرہ فرماتے ہیں:

هِیَ اَنْ یَّدْفَعَ الْاِنْسَانُ مَالًا اِلٰی غَیْرِہٖ یَتَّجِرُفِیْہِ عَلٰی اَنْ یَکُوْنَ الرِّبْحُ بَیْنَھُمَا بِالنِّصْفِ اَوِ الثُّلُثِ اَوْ نَحْوِ ذٰلِكَ۔[1]

مضاربت یہ ہے کہ انسان کسی شخص کو تجارت کی غرض سے سرمایہ فراہم کرے تاکہ منفعت میں نصف یا ایک تہائی یا اس طرح کے حساب سے دونوں حصہ دار ہوں.

اسلامی بینکاری کا نظام مضاربت کی بنیادوں پر درج ذیل ارکان پر قائم ہوگا:

فریق اول: مالک سرمایہ

فریق دوم: محنت

درمیان میں کسی ثالث کا ہونا بھی درست ہوگا۔ یہاں بینک ثالث کا کردار ادا کرے گا۔ یہاں ثالث (بینک) کھاتہ داروں کی طرف سے وکیل ہوگا کہ وہ کھاتہ داروں کا پیسہ صنعت کار، تاجر اور زراعت کار وغیرہ کو مقررہ شرائط کے تحت فراہم کرے۔

فریق اول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سرمایہ فراہم کرے اور شرائط کا تعین کرے۔

فریق دوم اس سرمایہ کو پیداوار کے لیے استعمال کرے اور شرائط طے کرے۔

شروط:

۱۔ منافع سرمایہ اور محنت کے درمیان تقسیم ہو۔ مثلاً کل منافع میں سے چند فیصد سرمایہ کو، باقی محنت کو۔

۲۔ فریق اول یہ شرط عائد کر سکتا ہے کہ تاجر سرمایہ کو کسی خاص چیز مثلاً کپڑے کے کاروبار یا زراعت کے لیے مختص کرے۔ اس صورت میں تاجر کو اس کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ پابندی نہ کرنے کی صورت میں وہ خسارے کا ضامن ہوگا۔

ثالث (بینک) اگر کھاتہ داروں کی طرف سے وکیل مقرر ہوتا ہے تو اس صورت میں بینک درج ذیل امور کا ذمے دار ہوگا:

۱۔ کھاتہ دار کی طرف سے تاجر کے ساتھ شرائط طے کرے گا۔

۲۔ بینک کو تاجر، صنعت کار وغیرہ کے پیداواری عمل اور بازار میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھنا ہوگی، جس کی روشنی میں کاروبار میں منافع یا خسارے کی صورت حال بینک سے پوشیدہ نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے بینک کے پاس ایسے ماہرین اقتصادیات کا ہونا لازمی ہوگا جو تجربہ کار تاجر اور صنعت کار کی پہچان رکھتے ہوں اور ان کی کارگزاری اور پیداواری صورت حال پر نظر رکھ سکتے ہوں اور ایسی فضا قائم رکھ سکیں کہ کسی کو خیانت کرنے اور منافع چھپانے کا موقع میسر ہی

---

[1] منہاج الصالحین ج ۲ بحث مضاربۃ

نہ آئے۔

۳۔ بینک کھاتہ دار کے سرمایہ کی ضمانت بھی فراہم کرے کہ خسارہ ہونے کی صورت میں وہ اس خسارے کو ادا کرے گا۔ درج بالا صورت حال میں بینک اس ضمانت کے فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہوگا۔

۴۔ بینک تاجر پر یہ شرط بھی عائد کر سکتا ہے کہ وہ بینک کو تمام تجارتی امور سے آگاہ رکھے۔ مال کی خریداری سے لے کر پیداواری عمل کے اختتام تک تمام مراحل بینک کے علم میں ہوں۔ جدید کمپیوٹرائز سسٹم کے ذریعے اس قسم کی تمام تفصیلات سے آگاہ رہنا نہایت آسان ہوگیا ہے۔

منافع کی تقسیم: سرمایہ اور محنت کے درمیان منافع کی تقسیم میں بینک کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بینک مضاربت میں فریق نہیں ہے، بلکہ بینک کو اپنی بینکنگ خدمات کے مقابلے میں حق الخدمت (Service Charges) ملے گا۔

اس حق الخدمت کی فقہی توجیہ کے لیے درج ذیل عناوین قابل تطبیق ہیں:

جعالہ، اجرۃ المثل، اجارہ وغیرہ۔ بینک اس سلسلے میں متعدد خدمات انجام دیتا ہے:

۱۔ بینک چھوٹے سرمایہ کو عظیم طاقتور بناتا ہے۔ اگر بینک کھاتہ داروں کے چھوٹے سرمایوں کو جمع کر کے طاقتور سرمایہ نہ بناتا تو یہ چھوٹے اور کمزور سرمائے ملکی اقتصاد میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔

۲۔ بینک سرمایہ کو جمود و رکود سے نکال کر اسے متحرک بناتا ہے۔

۳۔ بینک سرمایہ کو متحرک بنانے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

۴۔ بینک کھاتہ داروں کے سرمایہ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

سودی بینکاری کے متبادل دیگر غیر سودی اسلامی بینکاری کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

مشارکت: یعنی سرمایہ میں مشارکت کی بنیاد پر تجارت۔ اس میں بینک بجائے اس کے کہ تاجر کو سودی قرضہ دے، تاجر کے ساتھ سرمایہ میں شرکت کرے گا۔ یہ نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر ہوگا۔ بینک یہ سرمایہ اپنے کھاتہ داروں کی رقوم سے فراہم کرے گا اور حاصل ہونے والا منافع کھاتہ داروں کو اس کی رقم کے مطابق ادا کرے گا۔

وکالت: یعنی بینک تاجروں کو سودی قرض دینے کی بجائے انہیں اپنی طرف سے وکیل بنائے گا اور بینک خود بھی کھاتہ داروں کی طرف سے وکیل ہے تو یہ بجائے اس کے کہ خود تجارت کرے، اپنی طرف سے دیگر تاجروں، صنعت کاروں اور زمینداروں کو وکیل بنا سکتا ہے۔ تاجر بینک کی طرف سے وکالت کی بنا پر

سامان تجارت خریدے گا اور اسی وکالت کی بنا پر بینک کی طرف سے خود اپنے کو فروخت کرے گا۔ البتہ قیمت فروخت، قیمت خرید سے زیادہ ہو گی۔ اس طرح بینک کو منافع ملے گا جو سودی منافع سے زیادہ ہو سکتا ہے۔

مرابحہ بیع مؤجل: یہ اس طرح ہو گا کہ بینک اپنے نمائندوں، تاجروں اور صنعت کاروں وغیرہ کو تجارتی سامان خریدنے کے لیے سودی قرض دینے کی بجائے خود تجارتی سامان خریدے گا اور اس سامان کو تاجروں کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ اس فروخت میں تین باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں:

۱۔ یہ بیع مؤجل ہو گی۔ یعنی قیمت نقداً نہیں لی جائے گی، بلکہ قیمت کی ادائیگی کے لیے مدت کا تعین کیا جائے گا۔

۲۔ قیمت خرید سے زیادہ قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔ اس سے بینک کو آمدنی ہو گی۔

۳۔ بینک یہ سامان تاجر کی طرف سے آرڈر پر خریدے گا اور تاجر اپنے آرڈر شدہ سامان کے خریدنے کا پابند ہو گا، ورنہ خسارہ ہونے کی صورت میں تاجر یہ خسارہ بھرے گا، چونکہ سامان اس کے آرڈر پر خریدا گیا ہے۔[۱]

بیع مؤجل فقہی اعتبار سے درست ہونے کی صورت میں سودی نظام کے متبادل کے طور پر اس بیع کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود فتاویٰ قاضی خان اور سندھ ہائی کورٹ کے ایک ڈویژنل بنچ نے اسے سود ہی کی ایک شکل قرار دیا ہے، جب کہ فقہی مآخذ نے اسے فقہ حنفی کے مطابق درست قرار دیا ہے۔

اسلامی فقہ کی رو سے سرمایہ کے احکام: اپنا مال کسی دوسرے کے حوالے کرنے کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ ودیعت: اپنا مال دوسرے کے حوالے اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے، اسے ودیعت اور امانت کہتے ہیں۔

۲۔ قرض: اگر یہ مال کسی کے حوالے اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کی مثل اسے واپس کرے، یہ قرض ہے۔

۳۔ بضاعہ: اگر یہ مال بغیر اجرت لیے تجارت کے لیے دیا گیا ہے تو اسے بضاعہ (سرمایہ کاری) کہتے ہیں۔

۴۔ اگر یہ مال اس لیے دوسرے کو دیا گیا ہے کہ دوسرے شہر میں اس کو دیا جائے تو یہ "حوالہ" ہے.

۵۔ اگر یہ مال دوسرے کو تجارت کے تحت منافع کے لیے دیا گیا ہے، اسے مضاربت کہتے ہیں۔ اگر منافع کی تقسیم کا ذکر نہیں ہے تو یہ منافع سرمائے کا ہو گا اور تاجر کو اجرۃ المثل مل جائے گی.

---

[۱] احکام البنوک ۔ آیۃ اللہ فیاض

اگر منافع کی تقسیم کا تعین ہو تو منافع ملنے کی صورت میں طرفین منافع کے حقدار ہوں گے۔ اگر خسارہ ہوا تو محنت کو کچھ نہیں ملے گا اور خسارہ صاحب سرمایہ اٹھائے گا۔

مأخذ: مضاربت کے سلسلہ میں امامیہ فقہی مصادر میں صراحت موجود ہے۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

انه قال فی المتضاربین ... الربح بینهما علی ما اتفقا علیه و الوضیعة علی المال۔[1]

مضاربت کے بارے میں فرمایا: ... منافع متفقہ نسبت سے آپس میں تقسیم ہو گا اور خسارہ سرمایہ اٹھائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان غیر امامیہ مصادر میں اس طرح آیا ہے۔ مضاربت کے بارے میں فرمایا:

الوضیعة علی المال و الربح علی ما اصطلحوا علیه۔[2]

منافع متفقہ نسبت سے آپس میں تقسیم ہوگا اور خسارہ سرمایہ اٹھائے گا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے:

الربح بینهما و الوضیعة علی المال۔[3]

منافع آپس میں تقسیم ہوگا، خسارہ سرمائے پر ہوگا۔

غیر امامیہ مصادر میں مضاربت کا کوئی مأخذ نہیں ہے۔

چنانچہ ابن حزم کہتے ہیں:

کل ابواب الفقه فلها اصل فی الکتاب و السنة حاشا القراض فما وجدنا له اصلاً البته۔[4]

فقہ کے تمام ابواب کا کتاب و سنت میں کوئی مأخذ ہوا کرتا ہے، سوائے مضاربہ کے۔ اس کا ہم نے کوئی مأخذ نہیں پایا۔

قرض حسنہ: رہا یہ سوال کہ غیر سودی بینک ضرورت مندوں کے لیے غیر پیداواری قرضے، بلا سود کس طرح جاری کرے گا؟ اور اس کا کیا جواز ہوگا؟ تو جواب یہ ہے کہ خود بینک کو کرنٹ اکاؤنٹ کی مد میں ایک بہت بڑا سرمایہ غیر سودی قرض کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس رقم میں سے ایک حصہ وہ غیر سودی قرضوں کے طور پر دے سکتا ہے۔ بینک اس رقم سے بلا سود غیر تجارتی قرضے اور قلیل المیعاد قرضے جاری کرے گا۔ اول الذکر غیر تجارتی ہونے کی وجہ سے اور مؤخر الذکر کو قلیل مدت ہونے کی وجہ سے مضاربت کی بنیاد پر دینا ممکن نہ ہوگا، لہٰذا بینک اس قسم کے قرضے بلا سود جاری کرے گا۔ البتہ یہ قرضے جاری کرنے کے لیے ان کے حساب و کتاب کی اجرت لینا جائز ہے۔ مثلاً قرض کی درخواست کے لیے فارم کی قیمت لی جائے وغیرہ۔

---

[1] دعائم الاسلام ۲: ۸۶ [2] نیل الاوطار ۵: ۳۹۳ کتاب المضاربة۔
[3] الاستبصار ۳: ۱۲۶۔ [4] اہل حجاز قراض اور اہل عراق مضاربة کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قانون الٰہی میں سود ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔

۲۔ انسانی قوانین نے ہمیشہ سرمایہ داروں کی حمایت میں سود کو جائز قرار دیا ہے۔

۳۔ سود لینا قساوت قلبی اور انسانی اقدار سے عاری ہونے کی علامت ہے۔

۴۔ سود سے اقتصادی توازن ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ قرض لینے والے کی پیداواری صلاحیت ہر روز کم ہوتی چلی جاتی ہے اور قرض دینے والے کی مالی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس معاشی بحران اور ظالمانہ طبقاتی نظام کی وجہ سے معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

۵۔ تجارت اور سود نفسیاتی، معاشی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی اثرات کی وجہ سے نیز اپنی اپنی ماہیت کے اعتبار سے دو الگ اور متضاد چیزیں ہیں۔ تجارت مفید جب کہ سود نقصان دہ ہے۔

۶۔ سودی نظام معیشت معاشرے کے لیے ہلاکت آفرین ہے۔ اسلام نے اسے اللہ اور رسول (ص) کے ساتھ جنگ کے مترادف قرار دیا ہے اور اپنا غیر سودی نظام متعارف کرایا ہے جو شراکت، مضاربت اور قرض حسنہ کے اصولوں پر قائم اور معاشرے میں اقتصادی توازن برقرار رکھنے کا ضامن ہے۔

تحقیق مزید

الکافی ۲ : ۲۸۵ باالکبائر ۔ التہذیب ۷ : ۱۵ باب فضل التجارۃ ۔ مستدرک الوسائل ۱۳ : ۳۳۱ باب تحریم الربا ۔ ۳۳۴ باب ثبوت القتل ۔

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾

۲۷۶۔ اللہ سود کو ناپائیدار اور خیرات کو بابرکت بنا دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

۲۷۷۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل بجا لائیں نیز نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

تفسیر آیات

اگر پورے انسانی معاشرے پر سود اور صدقات کے اثرات کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ محدود نگاہ رکھنے، خصوصاً اغیار کی طفیلی سوچ رکھنے والوں کے خیال کے خلاف، ترقی اور پیشرفت کا راز خیرات میں مضمر ہے، جب کہ سودی نظام کا نتیجہ فقر و تنگدستی ہے۔

سود اور خیرات و صدقات دونوں کا تعلق محتاج اور نادار طبقے سے ہے، جو دنیا کی کل آبادی کی واضح اکثریت پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ تیسری دنیا کا مسئلہ ہے جسے سود کے ذریعے غربت اور افلاس میں محبوس رکھا گیا ہے۔ ان غریب ملکوں کی ساری طاقت سود کی ادائیگی پر صرف ہوتی ہے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ملک کی پوری طاقت صرف ہونے کے باوجود سود کی رقم ادا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سود کی ادائیگی کے لیے مزید سودی قرضے اٹھائے جا رہے ہیں اور ملک کی بے جان معیشت پر مزید ضرب لگائی جا رہی ہے۔ سودی نظام سے سرمایہ داروں کے خلاف غریبوں میں نفرت، عداوت اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے، ان مٹھی بھر استحصالیوں کے خلاف جذبہ انتقام ابھرتا ہے۔ اس طرح فساد اور اضطراب کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ جب کہ صدقہ و خیرات رحم، ہمدردی، محبت، بھائی چارے، ہم آہنگی اور اتحاد و یگانگت کی ایک پرامن فضا وجود میں لاتے ہیں، جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور دولت و ثروت کی منصفانہ تقسیم سے ہر شخص مطمئن ہوتا ہے۔ اس طرح باہمی تعاون بڑھتا ہے اور معاشرہ اپنی ضرورت خود پیدا کرتا ہے نیز لوگ اپنے ملک کی دولت سے خود استفادہ کرتے ہیں۔

اگر لوگ سود جیسے غیر اسلامی و غیر انسانی ظالمانہ نظام کو ترک کرتے تو سرمائے کا ارتکاز چند لوگوں کے ہاتھوں میں نہ ہوتا، بلکہ دولت کی عادلانہ تقسیم ہو جاتی، جس سے ملکی پیداوار میں اضافہ ہوتا اور نعمتیں وافر ہو جاتیں۔ چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ...[1]

اور اگر یہ اہل کتاب توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے۔

----

[1] ۵ مائدہ: ۶۶

اہم نکات

۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام، پیداوار میں اضافے اور امن و خوشحالی کا ضامن ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ....

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾

۲۷۸۔ اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو اور جو سود (لوگوں کے ذمے) باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾

۲۷۹۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تم اصل سرمائے کے حقدار ہو، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں یہ فیصلہ کن حکم دیا گیا کہ آئندہ سود لینا ممنوع ہے اور جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ البتہ جو لے چکے اس کے بارے میں سابقہ آیت میں فرمایا جا چکا کہ جو آئندہ کے لیے سودخوری سے باز آ جائے تو پہلے جو کھا چکا، وہ اسی کا ہو گا۔ یعنی نہ تو اس کی دولت قرق ہو گی اور نہ ہی سود اس سے واپس لیا جائے گا۔ قانون کا نفاذ اس کے صدور کے بعد متحقق ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں سود ترک نہ کرنے کو اللہ اور رسول (ص) کے ساتھ اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ یعنی سود کا ترک نہ کرنا اسلامی نظام کے ساتھ بغاوت ہے۔ اسلامی معاشرے میں طبقاتی تفاوت پیدا کر کے اس معاشرے کو داخلی جنگ سے دوچار کرنے والا مفسد ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ سخت اور عسکری اقدام کیا جائے گا۔ البتہ توبہ کرنے کی صورت میں اسلامی فیصلہ یہ ہو گا کہ وہ آئندہ سود کا ظلم بند کر دے گا اور اسلامی حکومت اس کے اصل سرمائے کو تحفظ دیتے ہوئے اسے واپس کر دے گی۔ کیونکہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے اور مسلمان کا مال محترم ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سودی نظام معیشت اللہ کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ....۔

تحقیق مزید

آیت ۲۷۸: الفقیہ ۳ : ۲۸۶ باب الربا۔ الوسائل ۱۸ : ۲۴ باب تحریم الربا۔ مستدرک الوسائل ۱۳: ۳۳۷ باب حکم من اکل الربا۔

آیت ۲۷۹: مستدرک الوسائل ۱۳ : ۳۳۴ باب ثبوت القتل ۔ الفقیہ ۳ : ۳۳ باب الصلح ۔ الفقیہ ۳ : ۲۸۶ باب الربا۔

وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾

۲۸۰۔ اور (تمہارا قرضدار) اگر تنگدست ہو تو کشائش تک مہلت دو اور اگر سمجھو تو معاف کر دینا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

تفسیر آیات

نزول آیت کے زمانے میں یہ طریقہ رائج تھا کہ قرضدار اگر بروقت قرض ادا کرنے کی گنجائش نہ رکھتا تو مزید مہلت دینے کے لیے سود میں اضافہ کرتے تھے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد سود لینا حرام قرار پایا اور مالک کو اصل سرمائے کا حقدار قرار دیا گیا۔ اب اگر قرضدار قرض کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو گنجائش ہونے تک مہلت دی جائے گی اور اس مہلت کے عوض قرض پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے جملے سے تو اشارہ ملتا ہے کہ اسلامی مہر و محبت سے لبریز قرآنی معاشرے کا رکن بننے کی صورت میں قرضوں کو معاف کر دیا جائے۔ اس میں معاف کرنے والے سمیت سب کی بہتری ہے، بشرطیکہ لوگ اس بہتری کی حقیقت کو سمجھیں۔ اس صورت میں سودی کاروبار جو ایک فاسد عمل اور معاشرے کے لیے زہر قاتل تھا، ایک نیک عمل میں بدل جاتا ہے، جو معاشرے کے لیے خیر و برکت کا باعث ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی معاشرے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مقروض مقررہ مدت میں قرض ادا نہ کر سکے تو اسے

معاف کر دیا جائے یا کم از کم اسے مہلت ضرور دی جائے۔

تحقیق مزید

الکافی ۴: ۳۵ باب انظار العسر، ۵ : ۹۳ باب الدین ۔ الفقیہ ۳ : ۴۹ باب من یجب رد شہادتہ۔ التہذیب ۶ : ۱۸۵ باب الدیون ۔ الوسائل ۱۶ : ۳۲۰ باب وجوب انظار العسر۔

وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

۲۸۱۔ اور اس دن کا خوف کرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر وہاں ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا بدلہ مل جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔

تفسیر آیات

سود کی ممانعت اور اس کے ارتکاب کی قانونی عقوبت بیان فرمانے کے بعد ایمان والوں کے ضمیر اور شعور کو بھی بیدار کیا گیا ہے کہ تقویٰ نفاذ شریعت کے لیے ایک پہرے دار کی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عدالت، متقی کا ضمیر ہے، جہاں بلا تاخیر فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ یہاں نہ کسی کی سفارش کام آتی ہے اور نہ ہی کسی کا زور چلتا ہے۔ یہ عالم آخرت میں لگنے والی اللہ کی عدالت کا ایک دنیاوی نمونہ ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ آیت رسول کریم (ص) پر نازل ہونے والی سب سے آخری آیت ہے۔

احادیث

مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِی الرِّبَا خَمْسَةً: آكِلَهُ، وَمُؤْكِلَهُ، وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ.[1]

رسول کریم (ص) نے سود کے سلسلہ میں پانچ افراد پر لعنت بھیجی ہے: کھانے والے، کھلانے والے، ربویٰ معاہدے کے دونوں گواہوں اور سود کی تحریر لکھنے والے پر.

اہم نکات

۱۔ تقویٰ نفاذ شریعت کا ضامن ہے، جو اہل ایمان کے ساتھ ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتا ہے:

---

[1] الوسائل ۱۸ : ۱۲۷

وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا ....

۲۔ احکام شریعت کی مخالفت کرنے والا دنیا میں بچ بھی جائے تو آخرت میں ہرگز نہیں بچ سکے گا:
وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا ... مَّا کَسَبَتۡ ....۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ بِدَیۡنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکۡتُبُوۡہُ ؕ وَ لۡیَکۡتُبۡ بَّیۡنَکُمۡ کَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۪ وَ لَا یَاۡبَ کَاتِبٌ اَنۡ یَّکۡتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ فَلۡیَکۡتُبۡ ۚ وَ لۡیُمۡلِلِ الَّذِیۡ عَلَیۡہِ الۡحَقُّ وَ لۡیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَ لَا یَبۡخَسۡ مِنۡہُ شَیۡـًٔا ؕ فَاِنۡ کَانَ الَّذِیۡ عَلَیۡہِ الۡحَقُّ سَفِیۡہًا اَوۡ ضَعِیۡفًا اَوۡ لَا یَسۡتَطِیۡعُ اَنۡ یُّمِلَّ ہُوَ فَلۡیُمۡلِلۡ وَلِیُّہٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ وَ اسۡتَشۡہِدُوۡا شَہِیۡدَیۡنِ مِنۡ رِّجَالِکُمۡ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّ امۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّہَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىہُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰىہُمَا الۡاُخۡرٰی ؕ وَ لَا یَاۡبَ

۲۸۲۔ اے ایمان والو! جب کسی معینہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ دیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارے درمیان انصاف کے ساتھ تحریر کرے اور جسے اللہ نے لکھنا سکھایا اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے، وہ دستاویز لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس کے ذمے قرض ہے اور اسے اپنے رب یعنی اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرنی چاہیے، لیکن اگر قرضدار کم عقل یا ضعیف یا مضمون لکھوانے سے عاجز ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے، پھر تم لوگ اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو (گواہ بناؤ) جن گواہوں کو تم پسند کرو تاکہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے اور جب گواہی کے لیے گواہ طلب کیے جائیں تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، مدت کے تعین کے

الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْـَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۸۲

ساتھ اسے لکھنے میں تساہل نہ برتو، یہ بات اللہ کے نزدیک قرین انصاف ہے اور گواہی کے لیے زیادہ مستحکم ہے اور اس سے تم اس بات کے زیادہ نزدیک ہو جاتے ہو کہ شک و شبہ نہ کرو، مگر یہ کہ تم آپس میں جو دست بدست تجارتی معاملات کرتے ہو ان کے نہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ جب خرید و فروخت کیا کرو تو گواہ بنا لیا کرو اور کاتب اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے اور ایسا کرنا تمہاری نافرمانی ہے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں تعلیمات سے آراستہ فرماتا ہے اور اللہ تو ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۲۸۳

۲۸۳۔ اور اگر تم حالت سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا میسر نہ آئے تو قبضے کے ساتھ رہن پر معاملہ کرو، اگر تم ایک دوسرے پر اعتبار کرو تو جس پر اعتبار کیا جائے اسے چاہیے کہ دوسرے کی امانت ادا کرے اور اپنے رب یعنی اللہ سے ڈرو اور شہادت نہ چھپاؤ اور جو شہادت چھپاتا ہے تو اس کا دل گناہگار ہوتا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب آگاہ ہے۔

تشریح کلمات

دَین: (د ی ن) قرض ۔مقروض کو مَدِین اور مَدُیون کہتے ہیں۔

اَجَلٍ: (ا ج ل) کسی چیز کی مقررہ مدت۔ مؤجل وہ چیز جس کی مدت معین ہو۔

یَبۡخَسۡ: (ب۔خ۔س) کم کرنا۔

تَسۡـَٔمُوۡۤا: (س ء م) تساہل برتنا۔

قسط: (ق س ط) برابری۔ ترازو کو القسطاس کہتے ہیں۔ المیزان کی طرح قسطاس سے بھی عدل و انصاف مراد لیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں سودی قرض اور سودی معاملات کو ناجائز اور حرام قرار دیا گیا۔ اب غیر سودی قرض (قرض حسنہ) کے بارے میں ایک نہایت جامع اور دقیق قانون وضع کیا جا رہا ہے۔ اس قانون کے آرٹیکل درج ذیل ہیں:

۱۔ قرض میں مدت معین ہو تو اسے دَین کہتے ہیں۔ لیکن اگر مدت معین نہ ہو تو قرض کہتے ہیں۔

۲۔ قرض اور اس کی مدت کے بارے میں دستاویز تحریر کرنی چاہیے تا کہ قرض کی ادائیگی اور مدت کے تعین کے بارے میں نزاع واقع ہونے کی وجہ سے حقوق ضائع نہ ہو جائیں: فَاكۡتُبُوۡهُ ...۔

۳۔ کاتب کو عادل ہونا چاہیے: وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌ ۢ بِالۡعَدۡلِ ...۔

۴۔ کاتب کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ کتابت سے انکار کرے وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ ...۔

۵۔ اس دستاویز کی تحریر میں قرضدار املا کرائے کہ قرض کی مقدار کیا ہے اور مدت کتنی ہے تا کہ آئندہ ادائیگی کے وقت اس پر حجت واضح ہو جائے اور وہ بہانہ جوئی نہ کر سکے: وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ ...۔

۶۔ املا میں کسی قسم کی غیر حقیقی بات نہ ہو جس سے قرض خواہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو: وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ...۔

۷۔ قرض لینے والا اگر دیوانہ ہو تو اس کا ولی یا سرپرست املا کرائے۔

۸۔ قرضدار اگر ضعیف العقل ہو تو اس کا ولی املا کرائے گا۔

۹۔ قرضدار اگر مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو ولی املاء کرائے گا۔

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ سے درج ذیل احکام حاصل ہوتے ہیں:

الف۔ قرض کے معاملے میں دو مردوں کو گواہ بنایا جائے۔ دو عورتیں کافی نہیں ۔ دو بچے بھی کافی

نہیں۔

ب۔ مِنۡ رِّجَالِکُمۡ ''اپنے مردوں میں سے''، یعنی غیر مسلم نہ ہوں۔

ج۔ دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانا چاہیے۔

سوال: ایک مرد کی جگہ دو عورتیں کیوں؟

اس کا جواب نہایت ہی مناسب الفاظ میں خود قرآن نے بیان فرمایا ہے: اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰی یعنی ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے۔

ایسے معاملات میں مردوں کو اس لیے ترجیح دی جاتی ہے کہ مسلم معاشروں میں عورتوں پر کسب معاش کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور چند ٹکوں کی خاطر عورت کی مامتا کو بیچ کر اس سے اولاد آدم کی تربیت کا سب سے اعلیٰ عہدہ سلب نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا ایسے معاملات میں عورتوں کی معلومات محدود ہوتی ہیں اور وہ ان امور کی باریکیوں سے ناواقف ہوتی ہیں۔ ثانیاً ایسے معاملات میں حقیقت تک رسائی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں حقیقت بینی ضروری ہے۔ اگر دوسرے نفسیاتی اور جذباتی عوامل دخیل رہیں تو حقیقت تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ دو عورتوں کے انضمام سے یہ مسئلہ اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ اگر ایک عورت نسوانی جذبات میں آ کر حقیقت سے دور نکل جائے تو دوسری عورت اسے حق اور حقیقت کی طرف لا سکتی ہے، کیونکہ ایک طرف عورتیں لطیف مزاج ہونے کی وجہ سے جذبات سے مغلوب ہوتی ہیں تو دوسری طرف سے یہ معاملات عورتوں سے نہیں مردوں سے مربوط ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ باتیں جو صرف عورتوں سے مربوط ہوتی ہیں، ان میں عورتوں کی گواہی بلا انضمام قبول کی جاتی ہے۔ آیہ طلاق کی تفسیر میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۱۔ گواہ قابل اعتماد ہوں: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ....۔

۱۲۔ گواہ جب گواہی کے لیے طلب کیے جائیں تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے: وَلَا یَاۡبَ الشُّهَدَآءُ ...۔

۱۳۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ، اسے ضبط تحریر میں لانا چاہیے: وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَکۡتُبُوۡهُ ....۔

۱۴۔ جب معاملہ قرض کا نہ ہو بلکہ نقد ہو تو ضبط تحریر میں لانا ضروری نہیں: اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً.

۱۵۔ نقد معاملات میں بھی گواہ بنا لینا چاہیے: وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَایَعۡتُمۡ ....۔

۱۶۔ کاتب اور گواہ کو حق گوئی کے جرم میں کسی فریق کی طرف سے کوئی نقصان یا ضرر نہ پہنچایا جائے: وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَایَعۡتُمۡ ....۔

۱۷۔ اگر کسی وجہ سے (مثلاً سفر میں) کاتب میسر نہ ہو تو قرض لینے والا قرض خواہ کے پاس کوئی چیز گروی رکھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ رہن کا معاملہ صرف سفر سے مشروط ہے اور نہ

یہ شرط ہے کہ لکھنا ممکن نہ ہو۔
۱۸۔ اگر طرفین کو ایک دوسرے پر اطمینان ہو تو دستاویز لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
۱۹۔ گواہی چھپانا بڑا گناہ ہے۔ ایسا کرنا قلب کی بیماری، مردہ ضمیری اور ایمان سے محرومی کی علامت ہے۔

اہم نکات

۱۔ مالی معاملات کو عدل و انصاف کے مطابق تحریری شکل میں انجام دینا چاہیے: بِالۡعَدۡلِ ۔
۲۔ تحریر اور گواہ ایسے ہوں جو اختلاف کی صورت میں حقیقت کی صحیح عکاسی کر سکیں: اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىہُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىہُمَا الۡاُخۡرٰی ...۔
۳۔ تقویٰ علم آموزی اور علمی ترقی کا سبب ہے: وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ...۔

تحقیق مزید

آیت ۲۸۲: الکافی ۷ : ۳۶۹ باب یدعی الی الشہادۃ ۔ الفقیہ ۳ : ۵۷ باب الامتناع من الشہادۃ ۔ الوسائل ۱۷ : ۱۱ باب استحباب ، ۲۷ : ۲۷۲ باب ثبوت الدعویٰ۔
آیت ۲۸۳: الفقیہ ۲ : ۶۲۶ باب الفروض علی الجوارح

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ ؕ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۸۴﴾

۲۸۴۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے اور تم اپنے دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے حساب لے گا، پھر وہ جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

معاملات میں ایک جامع دستور عنایت فرما کر اسلامی قوانین کے ظاہری نفاذ کے ساتھ ساتھ باطنی نفاذ کی بھی ضمانت دی جا رہی ہے جو اسلامی قوانین کا خاصہ ہے۔ معاشرے میں نفاذ احکام کے لیے ظاہری

اور انتظامی ضمانت کے ساتھ قلب و روح کو بھی نفاذ احکام کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ مروجہ قوانین میں صرف ظاہری اور انتظامی مؤاخذہ ہوسکتا ہے، مگر اسلامی قوانین میں جہاں ظاہری کردار کا محاسبہ ہوتا ہے، وہاں قلبی اور اندرونی گناہوں کا بھی محاسبہ ہوتا ہے۔ یہ محاسبہ صرف نیت پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ ان اعمال کا محاسبہ بھی ہوگا جن کی خوبی یا بدی نیت سے مربوط ہے یا ان کی حقیقت صاحب کردار کے دل میں مخفی ہے۔ اول الذکر کی مثال انفاق ہے، جو ریا اور شہرت طلبی کی نیت سے بھی ہوتا ہے اور فی سبیل اللّٰہ بھی۔ ثانی الذکر کی مثال گواہی ہے جو حق کی بھی ہوتی ہے اور ناحق کی بھی۔ لہٰذا گواہی جھوٹی ہونے کی صورت میں گواہ کا محاسبہ ہوگا۔

یہ آیت ان احادیث سے متصادم نہیں ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ گناہ کی نیت، گناہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے:

اِنّما الْمُرَادَ بالآیه مَا یَتَنَاوَلُهٗ الْاَمْرُ وَ النَّهْیُ مِنَ الْاِعْتِقَادَاتِ وَ الْاِرَادَاتِ و غیر ذلك مِمَّا هَوَ مَسْتُوْرٌ عَنَّا۔[1]

اس سے مراد وہ پوشیدہ اعتقادات اور ارادے ہیں جن کے بارے میں امر و نہی وارد ہوئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظاہری گناہوں پر مواخذے کے علاوہ قلبی گناہوں کا بھی حساب و کتاب ہوگا: وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ ...۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ ۟ وَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ٭۫ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَ اِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ﴿۲۸۵﴾

۲۸۵۔ رسول اس کتاب پر ایمان رکھتا ہے جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور سب مؤمنین بھی، سب اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور وہ کہتے ہیں) ہم رسولوں میں تفریق کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی، پالنے والے ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

تفسیر آیات

یہ آیات اس سورۂ مبارکہ کے اختتامی جملے ہیں۔ اس کے ابتدائی اور اختتامی لہجوں میں ارتباط اور

---

[1] بحار الانوار ۷: ۲۵۵

مضمون و مطالب میں ہم آہنگی ہے۔گویا یہ دو اختتامی آیات پورے سورے کا خلاصہ ہیں۔ اس آیت میں عبودیت اور بندگی کے آداب مذکور ہیں:

۱۔ ایمان رسول(ص) کا مطلب یہ ہے کہ رسول(ص) اپنے پورے وجود کے ساتھ ایمان رکھتاہے، جس طرح اس کا اپنے وجود پر ایمان ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہم نے مقدمہ تفسیر باب وحی میں بیان کی ہے کہ رسول، وحی اور بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ کا ادراک ظاہری حواس سے نہیں، بلکہ اپنے پورے وجود کے ساتھ کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن فرماتا ہے کہ وحی قلب رسولؐ پر نازل ہوتی ہے۔ قلب سے مراد وہ مرکزی قوت ہے جہاں دوسری قوتیں منتہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسی ادراک و ایقان کا لازمی نتیجہ عصمت ہے۔ زیر بحث آیت میں ایمان رسولؐ اسی لیے علیحدہ مذکور ہے۔ چنانچہ وَاُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۔[1] وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۔[2] سے ظاہر ہے۔

۲۔ دوسرے جملے میں مؤمنین کے بارے میں اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔کتنی بڑی فضیلت ہے اس ایمان کی جس کی گواہی خود اللہ دے۔

۳۔ رسولوں کے بارے میں مؤمنین کا موقف کس قدر لطیف انداز میں بیان ہو رہا ہے: لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ... مومن کہتے ہیں: ''ہم رسولوں میں تفریق کے قائل نہیں ہیں۔'' یہ اسلام پر ایمان رکھنے والوں کے لیے ایک نہایت اہم فضیلت ہے کہ وہ بلا تفریق سارے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، جب کہ یہود و نصاریٰ بعض رسولوں پر ایمان نہیں رکھتے۔

۴۔ سَمِعۡنَا سے قبول و تصدیق اور اَطَعۡنَا سے اطاعت و فرمانبر داری کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ ایمان کی حقیقت یہی ہے کہ اقرار باللسان اور عمل بالارکان ہو۔ رب کی بندگی بھی اقرار و اطاعت سے عبارت ہے۔

۵۔ عبد پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی تصدیق، اقرار اور اطاعت کرے۔ چنانچہ اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ انہیں معاف کرے اور بخش دے۔

اہم نکات

۱۔ رسول وحی کا ادراک ظاہری حواس سے نہیں بلکہ پورے وجود کے ساتھ کرتا ہے اور ادراک و ایقان کا لازمی نتیجہ عصمت ہے۔

۲۔ ایمان درحقیقت زبان سے اقرار اور اعضا و جوارح سے عمل کرنے کا نام ہے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۱۲۔ اور مجھے یہ حکم بھی ملا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلم بنوں۔ [2] ۶ انعام: ۱۶۳۔ اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

تحقیق مزید

تفسیر عیاشی ۱: ۱۶۰ ۔ تفسیر القمی ۱: ۹۵۔ الطرائق ۱: ۱۷۲ باب تنصیص الرسول علی اسماء الائمة۔ غیبة الطوسی ص ۱۴۷۔ اخبار المعمرین۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ۚ وَ اعۡفُ عَنَّا ٝ وَ اغۡفِرۡ لَنَا ٝ وَ ارۡحَمۡنَا ٝ اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۸۶﴾

۲۸۶۔ اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا، ہر شخص جو نیک عمل کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کو ہے اور جو بدی کرتا ہے اس کا انجام بھی اسی کو بھگتنا ہے، پروردگارا! ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو اس کا مؤاخذہ نہ فرما، پروردگارا! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈال دیا تھا، پروردگارا! ہم جس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہمارے سر پر نہ رکھ، پروردگارا! ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مالک ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری نصرت فرما۔

تشریح کلمات

یُکَلِّفُ: (ک ل ف) دشوار کام پر لگانا۔ ذمہ داری سونپ دینا۔

اِصۡر: (ا ص ر) سنگین بوجھ۔

تفسیر آیات

اس آیت کے پہلے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تکلیف اور ذمے داری انسان کی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

الف: انسان پر اس کی طاقت کے مطابق ذمے داری اور مسئولیت عائد ہوتی ہے۔ طاقت کا دائرہ

جتنا وسیع ہو گا اسی مقدار میں اس کی مسئولیت بھی وسیع ہوتی جائے گی۔ چنانچہ کم عقل کی نسبت عاقل پر اور کم علم کی نسبت عالم پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

ب: احکام خدا کے بارے میں سَمِعۡنَا اس وقت کہا جا سکتا ہے جب حکم قابل فہم ہو۔ اگر نا قابل فہم ہو تو اس کے بارے میں سَمِعۡنَا کہنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اَطَعۡنَا اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کی طاقت رکھتا ہو۔ اگر طاقت نہیں رکھتا تو اطاعت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں جہاں قرآنی حکم و دستور کی حیثیت رکھتی ہیں، وہاں عقلی حکم بھی یہ کہتا ہے کہ کوئی عاقل کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

آیت کے دوسرے جملے میں ایک اور اصول بیان فرمایا گیا کہ ہر شخص اپنے نیک و بد اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ سابقہ اصول کے ساتھ یہ اس طرح مربوط ہے کہ جب ہر شخص پر اس کی طاقت کے مطابق ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی خود ہو گا: كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ۔[۱] اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اگر انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری عائد ہو جاتی تو وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوتا۔ مثلاً اگر کسی کو باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے تو کپڑے بھیگنے کا وہ ذمہ دار نہیں ہو گا۔ اس آیت سے امامیہ نظریات کے مطابق دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

الف۔ اللہ کسی بندے پر اس کی طاقت و قدرت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ یعنی یہ بات ناممکن اور غیر معقول ہے کہ اللہ ناممکن امر کا حکم دے۔ جب کہ اشاعرہ غیر ممکن چیز کا حکم دینے کو جائز سمجھتے ہیں۔

ب۔ انسان اپنے اعمال میں خود مختار ہے، مجبور نہیں ہے۔ ورنہ وہ اپنے اعمال کا جوابدہ نہ ہوتا۔

بھول اور خطا کی صورت میں عدم مؤاخذہ امت مسلمہ کے ساتھ اللہ کا خصوصی احسان ہے، کیونکہ انسان کسی بات کو اس وقت فراموش کرتا ہے جب اس کے دل میں اس کی کماحقہ اہمیت نہیں ہوتی۔ غلطی کا ارتکاب غالباً اس وقت ہوتا ہے جب اس بات کی طرف پوری توجہ نہیں دی جاتی۔

دعا کے اس جملے میں مومن اللہ سے دو چیزوں کی درخواست کرتا ہے۔

الف: سابقہ امتوں کو جن آزمائشوں کے سنگین بوجھ سے دوچار ہونا پڑا، وہ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے تھا۔ امت مرحومہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہے کہ وہ انہیں ایسی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔ مثلاً بنی اسرائیل کو چالیس سال تک وادی سینا میں سرگرداں رکھا گیا۔ ان پر بعض پاک چیزیں حرام کر دی گئیں۔ انہیں عزیزوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی سزا دی گئی وغیرہ۔ اس کے برعکس امت محمدیہ کے لیے ارشاد ہوا: وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرَىٰ۔[۲]

---

[۱] ۷۴ مدثر: ۳۸۔ ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔ [۲] ۸۷ اعلیٰ: ۸۔ اور ہم آپ کے لیے آسان طریقہ فراہم کریں گے۔

نیز فرمایا:

وَ مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ....[1]	اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا۔
یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ....[2]	اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

ب: جس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت ہم نہیں رکھتے وہ ہمارے سر پر نہ رکھ۔ اس سے غیر ممکن اور محال مراد نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی عاقل کسی دوسرے کو ناممکن چیزوں کا حکم نہیں دیتا بلکہ مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ سے مراد وہ پرمشقت امور ہیں جن سے انسان عام طور پر عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

خطا اور نسیان کی صورت میں اللہ سے عفو، مغفرت اور رحم طلب کرنے کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا: اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ۔ ”تو ہی ہمارا مالک اور کارساز ہے، پس کفار کے مقابلے میں ہماری نصرت فرما۔“ اس جملے میں لفظ مَولَا کا معنی واضح ہو جاتا ہے کہ مدد اور نصرت مَولَا سے طلب کی جاتی ہے۔ یہاں انصُرنَا کو فائے تفریع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مَولَا وہ ہے جو تصرف کا حق رکھتا ہو اور اسے ولایت و حاکمیت حاصل ہو۔

احادیث

رسول اکرم (ص) سے منقول ہے:

وُضِعَ عَنْ اُمَّتِیْ تِسْعَۃُ اَشْیَاءِ اَلسَّھْوُ وَالْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اُکْرِھُوْا عَلَیْہِ وَ مَا لَا یَعْلَمُوْنَ وَ مَا لَا یُطِیْقُوْنَ وَ الطِّیَرَۃُ وَالْحَسَدُ وَالتَّفَکُّرُ فِی الْوَسْوَسَۃِ فِی الْخَلْقِ مَالَمْ یَنْطِقِ الْاِنْسَانُ بِشَفَۃٍ[3]	میری امت سے نو (۹) چیزوں کی تکلیف اٹھا لی گئی ہے: سہو، غفلت، غلطی، بھول، جس پر مجبور کیا گیا ہو، جس کا جاننا ممکن نہ ہو، جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، بدشگونی، حسد، وسوسہ در خلقت اور جب تک انسان منہ سے اظہار نہ کرے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی قوت اور استعداد سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ....۔

۲۔ دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام سب سے زیادہ آسان دین ہے: وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ....۔

---

[1] ۲۲ حج: ۷۸　[2] ۲ بقرہ: ۱۸۵　[3] الفقیہ ۱: ۵۹

۳۔ کفار کے ساتھ اہل ایمان کی جنگ معاشرے پر اللہ کی حاکمیت کے عملی نفاذ کے لیے ہے:
اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ؟۔

تحقیق مزید

الکافی ۲ : ۴۲۶ باب ما رفع عن الامة۔ **الوسائل**۲: ۱۷۹ باب و جوب الغسل ۔ **الوسائل** ۱۵: ۳۱۹ باب جمله ما عفی عنه، ۱۶ : ۲۱۸ باب و جوب التقية۔

فہرست مطالب

معجزہ

قرآن کے تازہ ترین معجزات

جمع قرآن

جمع قرآن درعصر

نسخ

تحریف قرآن

روایات تحریف کے بارے میں مذہب امامیہ کا مؤقف

علوم القرآن سبقت۔خدمات

سورۃ الفاتحۃ